انجمن اسلام اردو، Nos ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردوٗ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی، ایچ، ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونی ورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کُتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کُتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور اُنھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔ جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

اس میں اُردوٗ زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردوٗ کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے اُنھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردوٗ سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

——— نمائندہ خصوصی ———

ترسیلِ زر کا پتہ

رائیڈرس امپوریم لمیٹیڈ

POST BOX NO. 1411, BOMBAY 1.

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

جنوری ۱۹۵۵ء

جلد (۶) نمبر (۱)

چندہ سالانہ .... تین رُوپے

ششماہی .... دو رُوپے

(علاوہ محصول ڈاک)

قیمت فی پرچہ ... ... ایک رُوپیہ

فہرست مضامین

شذرات

کچھ عرصہ ہوا حیدر آباد کے بعض مفکرین نے اکاڈمی آف اسلامک سٹڈیز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس کے صدر ڈاکٹر سید عبداللطیف اور ناظم ڈاکٹر سید یوسف الدین صاحب ہیں، اس ادارہ کا مقصد جہاں ایک طرف اسلامی علوم و فنون کی جدید معلومات کی روشنی میں ازسرنو مطالعہ ہے وہیں اس کا یہ مقصد بھی ہے کہ موجودہ حالات میں اسلام اور اس کی تعلیمات اور ان کے ذرائع سے متعلق ارباب علم و فضل کی آراء کی روشنی میں، تعمیری کام انجام دیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے ماتحت، اس ادارہ نے احادیث سے متعلق ایک سوال نامہ شائع کیا تھا، اور اس سلسلہ میں جو جواب آئے ہیں ان کو مرتب کرکے شائع کیا گیا، لیکن اس وقت اس کا سب سے بڑا کارنامہ اسماعیلی مذہب سے متعلق وہ گرانمایہ کتاب ہے، جسے ڈاکٹر زاہد علی صاحب نے "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" تصنیف کیا ہے، ڈاکٹر زاہد علی خود اسی جماعت کے ایک ممتاز عالم رکن ہیں، اور ان کی مشہور تاریخ "فاطمیئین مصر" تمام اصحاب تحقیق سے داد تحسین حاصل کرچکی ہے، کتاب تقریباً پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور جو لوگ اسلامی تاریخ اور اس میں اس جماعت کے اثرات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے، اکاڈمی کی ایک اور اہم تصنیف اس کے معتمد ڈاکٹر یوسف الدین کا وہ رسالہ ہے جس میں انھوں نے دنیا کے مختلف جامعوں اور علمی اداروں میں اسلامی علوم و فنون اور عربی و فارسی ادب سے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس کا مفصل حال درج کیا ہے اور ان تمام مستشرقین سے متعلق جو اس سلسلہ میں کام کر رہے ہیں تحقیق دوست لوگوں کو روشناس کر دیا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا وصال اگرچہ پاکستان میں ہوا، لیکن ان کی تمام تر زندگی ہندوستان ہی میں گزری اور اس ملک کا ہر گوشہ اپنی استعداد کے مطابق اس ابر علم و فضل سے سیراب ہوا، لیکن جس جگہ کو ان کی وجہ سے سب سے زیادہ شرف و عزت اور شہرت و امتیاز حاصل ہوا وہ ان کا وطن دیسنہ (بہار) تھا۔ اگرچہ دیسنہ ابتداء ہی سے ایک علمی و ادبی مرکز رہا ہے اور یہاں ۱۸۹۹ء سے اردو کا ایک کتب خانہ قائم ہے لیکن اس کتب خانہ کی ترقی کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے جب مولاناؒ دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہو کر نکلے ہیں، اس کتب خانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف اردو کی تقریباً تمام مطبوعات خواہ کسی موضوع پر ہوں مل سکتی ہیں، بلکہ اردو کے پرانے رسائل و اخبارات کے مکمل فائل بھی موجود ہیں، ان کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو مخطوطات بھی ہیں اور ان موضوع پر کام کرنے والے ان تمام سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ پھر دیسنہ کو علمی و ادبی دنیا کے نقشہ پر لانے میں مولاناؒ کا بڑا حصہ ہے،

ان کی وجہ سے، نہ معلوم کتنے علماء و فضلا دیسنہ آتے اور اس کی عزت بڑھاتے۔ اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی اہل دیسنہ کے دل میں یہ جوش پیدا ہوا کہ وہ ان کی یاد میں ایک ایسی عمارت تعمیر کرائیں جو ان کے نام و کام کے شایان شان ہو اسی لئے ہندوستان کے متعدد اصحاب علم و فضل نے اہل دیسنہ کی اس تجویز کی تکمیل کیلئے تمام ایسے لوگوں سے جو مولانا کے مداحوں، معتقدوں اور مریدوں میں ہیں اپیل کی ہے کہ وہ اس کار خیر میں ارباب دیسنہ کا ہاتھ بٹائیں اور ہندوستان میں کم از کم ایک ایسی علمی و تعلیمی عمارت بنانے میں ان کی مدد کریں جو ہندوستان میں مولانا کے بلند مرتبہ کے مطابق ہو۔

اس سلسلہ میں خرچ کا اندازہ صرف اٹھارہ ہزار روپے ہیں، دیسنہ میں اس رقم کی فراہمی کیلئے ایک مجلس بھی مرتب ہوئی ہے، اس کے خازن، جناب پروفیسر سعید رضا صاحب، دیسنہ، ضلع پٹنہ (بہار) ہیں، جو صاحب اس سلسلہ میں مالی مدد کرنا چاہیں وہ اپنی رقم پروفیسر صاحب موصوف کی خدمت میں بھیج دیں، ہم کو امید ہے کہ یہ رقم انشاء اللہ بہت جلد جمع ہو جائے گی۔

انجمن ترقی اردو (شاخ بمبئی) نے اس سال دسمبر کے وسط میں دس سالہ جشن منایا۔ ۶ر دسمبر (دوشنبہ) سے ۱۱ر دسمبر (سنیچر) تک ہر روز مختلف نوعیت کے پروگرام ہوتے رہے۔ آخری دن انجمن کی دعوت پر جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد سے تشریف لائے اور ان کے زیر صدارت ایک عام جلسہ ہوا جس میں انجمن کے سکریٹری نے انجمن کی دہ سالہ روئداد پڑھ کر سنائی، جشن کے سلسلہ میں مختلف تحریری مقابلے بھی ہوئے تھے ان کے کامیاب امیدواروں کو انعامات تقسیم کئے گئے، ادبی تقریریں ہوئیں اور شہر کے ممتاز شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

بمبئی کی انجمن ترقی اردو پچھلے دس برسوں سے نہایت خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دے رہی ہے ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنی گذشتہ روایات کو برقرار رکھے گی اور بمبئی میں اردو زبان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے گی۔ اگر انجمن اپنے پروگرام میں ہر سال (۱) توسیعی لکچروں کا سلسلہ (۲) بمبئی میں شائع شدہ اردو کی بہترین تصنیف پر مصنف کو معقول انعام (۳) کسی ادبی یا لسانی موضوع پر تحریری مقابلہ کو شامل کر لے تو یہ ایک مفید خدمت ہوگی اور معیاری اردو ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوگی۔

افسوس ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے 'نوائے ادب' کے ہر شمارہ میں نوائے کرب ضرور ہوتی ہے۔ گذشتہ سہ ماہی میں ہم نے علم و ادب کی محفل کے ایک رکن (شمس العلما مولانا عبدالرحمن مرحوم) کا ماتم کیا تھا اس بار ہمیں سیاست و تدبر، وطن پرستی، وملت پروری کی دنیا کی ایک اہم شخصیت کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے۔ رفیع المرتبت جناب رفیع احمد قدوائی کی موت ایک ایسا سانحہ ہے جس نے سارے ہندوستان کو ماتم کدہ اور ہر ہندوستانی

کو سوگوار بنا دیا۔ مرحوم کی سیاسی خدمات، ایثار اور قربانیوں اور وزارتی کارناموں پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ یہ مورخ کا کام ہے۔ ہم ان کی صرف ان تہذیبی خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خلوص، یقین محکم اور عمل پیہم ہماری قوم و ملت کے نوجوانوں کے لئے ایک عملی درس ہے۔ ان کی بیدار مغزی جفاکشی اور تدبر کا ہر شخص قائل تھا۔ ان کی اخلاقی عظمت کو ان کے مخالفوں نے بھی تسلیم کیا اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔ ان کی وفات سے نہ جانے کتنے علمی و ادبی اداروں، رسالوں اور اخباروں کی سرپرستی ختم ہو گئی ابھی گذشتہ 'نوائے ادب' کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا کہ دارالمصنفین کو جناب سیدنا ملا سیف الدین طاہر مدظلہ بوہروں کے امام کے توسط سے ایک کثیر رقم ملی۔ یہ درحقیقت مرحوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس طرح مرحوم کی وفات نہ صرف سیاسی دنیا کا ایک حادثہ ہے بلکہ علمی و ادبی دنیا کا بھی سانحہ ہے۔

ابھی مرحوم قدوائی کے ماتم سے ہمارے آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ صوبہ بمبئی کے گورنر جناب گرجا شنکر باجپئی کی وفات کی خبر ملی۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے میل جول سے جو ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی تھی اور جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کہا جا سکتا ہے، مرحوم اس کا ایک نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ اُردو زبان سے انھیں بڑی دلچسپی اور محبت تھی۔ انھوں نے بارہا اپنی تقریروں میں اس بات کا اعادہ کیا کہ اُردو میری مادری زبان ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔ ایک بار بمبئی میں ایک پبلک جلسہ میں غلام محمد بخشی نے نہایت فصیح اُردو میں تقریر کی۔ مرحوم تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے

ع "دعوا زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے" اور نہایت شگفتہ اور فصیح تر زبان میں تقریر کی۔ فارسی زبان و ادب سے بھی انھیں بہت لگاؤ تھا۔ بمبئی میں شاید ہی ان کی کوئی ایسی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے فارسی کا کوئی شعر نہ پڑھا ہو۔ وہ فارسی زبان میں بے تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کی علم دوستی، اصابت رائے اور بے تعصبی کا نقش ہر دل پر بیٹھا تھا۔ افسوس ہے کہ دو مقتدر قوموں کی مشترکہ تہذیب کے نام لیوا ایک ایک کرکے اٹھتے جا رہے ہیں اور محفل اجڑتی جا رہی ہے۔

ایک اور افسوسناک حادثہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کا انتقال پر ملال ہے، ہندوستان اور باہر کی سائنسی دنیا ان کو ایک بڑے سائنسداں کی حیثیت سے جانتی ہے انھوں نے آزادی کے سات برسوں میں علمی تحقیقات کے مرکزوں کا جال بچھا دیا تھا، اور ہندوستان میں سائنس کی ترقی کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس میں سر فہرست ان کا نام ہوگا۔ لیکن اس حقیقت سے کتنے واقف ہیں کہ وہ اُردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے اور ان کے کلام کا مجموعہ لاجونتی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ غالب کے عزیز ترین شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے تھے اور اس طرح ان میں قدیم مشترک تمدن، تہذیب اور زبان کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی تھی، افسوس کہ اس کارواں کا ہر مسافر ہم سے الگ ہو رہا ہے۔

امین گجراتی کی "یوسف زلیخا"

(از ڈاکٹر محمد عبدالحمید صاحب فاروقی، صدر شعبۂ فارسی و اردو، کرناٹک کالج، دھاروار)

زیر نظر مقالہ استاذی پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے ایماء سے اور انھیں کی زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔ مندرجۂ ذیل باتیں خصوصیت سے اس کی محرک ہیں:

(۱) امین کی "یوسف زلیخا" ایک اہم کلاسیکی مثنوی ہے۔

(۲) ہندوستان میں اُردو زبان اور اردو ادب کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لینے میں یہ مثنوی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳) مثنوی کا موضوع اگرچہ ہمہ گیر اور عام ہے تاہم اس مشہور عالم رومان کو شاعر نے ان رسم و رواج اور معاشرتی حالات کی روشنی میں پیش کیا ہے جن میں وہ خود پروان چڑھا، چنانچہ معاشرتی تاریخ کے لحاظ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۴) اس کی لسانی خصوصیات

(۵) اس نادر و نایاب کلاسیکی مثنوی کو جدید طرز پر مرتب کرنے کی یہ اولین کوشش ہے۔

اس مثنوی کے متن کی تیاری میں مندرجہ ذیل تین نسخوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) الف : یہ نسخہ استاذی پروفیسر ندوی ملکیت ہے۔

(۲) ب : یہ نسخہ سابق انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) کی ملکیت تھا، جسے قبلہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بہ کمال شفقت مقالہ نگار کو بہ غرض تقابل مستعار دیا۔

(۳) (ج) : یہ نسخہ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری کا مملوکہ ہے۔

امین کے معاصرین

امین کا دور گیارھویں صدی ہجری کے آخری اور بارھویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں پر مشتمل ہے، یہ بات واقعی تعجب خیز ہے کہ خوب محمد چشتی کے بعد جو گیارھویں صدی ہجری کے غالباً آخری شاعر

ہیں، ہمیں تقریباً ایک صدی تک گجرات میں کوئی قابلِ ذکر مثنوی گو نظر نہیں آتا، ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں اس خلاء کے متعدد اسباب ہیں، مثلاً ملک میں طوائف الملوکی، گجرات اور مالوہ کی خانہ جنگیاں، گولکنڈا اور بیجاپور کے سلاطین کی شعر دوستی و مربی گیری، اور اکبر کا حملۂ گجرات، آخرالذکر سبب غالباً زیادہ اہم ہے، اکبری فوجوں نے ۹۸۰ھ میں گجرات فتح کیا، اور وہ علاقہ مغلیہ سلطنت کے زیرِ نگین آگیا، نئی حکومت کے ماتحت اغلب ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کا رجحان مقامی زبان سے ہٹ کر شہنشاہِ وقت کی زبان فارسی کی طرف ہو گیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ مغلیہ تاخت و تاراج نے گجرات کے ادیبوں اور شاعروں کو نقلِ مکانی پر مجبور کیا ہو اور وہ گجرات سے نکل کر دوسرے اسلامی صوبوں میں چلے گئے ہوں۔

اس عہد کی تاریخ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابراہیم عادل شاہ (۹۴۱ھ تا ۹۶۵ھ) کی علمی سرپرستی اور فیاضی نے گجرات کے بہت سے ادیب اور شاعروں کو بیجاپور کی طرف متوجہ کیا، اس دعوے کی دلیل میں ہم یہاں صرف ایک اہم نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں:

شیخ برہان الدین جانمؒ (متوفی ۹۹۰ھ) بیجاپور کے صوفیائے عظام میں سے ہیں، انھوں نے اپنی تصنیف "حجتہ البقا" میں لکھا ہے:

جے ہو ویں گیان بچاری ‌ ‌ ‌ تا دیکھیں بھاکا گجری

اور اپنی دوسری تصنیف "ارشاد نامہ" میں ارشاد فرماتے ہیں:

یہ سب گجری کیا زبان ‌ ‌ ‌ کر یہ آئینہ دیا نمان[۵۱]

شیخ جانم بیجاپور یعنی دکن میں تھے اور ظاہر ہے کہ جو زبان وہ لکھتے تھے وہ دکنی تھی، اس کے باوجود وہ اپنی زبان کو گجراتی کہتے ہیں، اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، یعنی جانم کے وقت دکن میں عموماً اور بیجاپور میں خصوصاً گجراتی کا کافی اثر پھیل چکا تھا اور شعرائے وقت عوام تک پہنچنے کے لئے اس زبان میں طبع آزمائی کرنا ضروری سمجھتے تھے ورنہ گجراتی میں لکھنے کی تخصیص کا ذکر وہ اپنی تصنیفوں میں کیوں کرتے، مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

"...... لیکن خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، کلام کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے[۵۲]۔"

یہ بھی ممکن ہے کہ شیخ جانم گجرات کے رہنے والے ہوں اور اکبری حملوں نے انھیں بیجاپور جانے پر مجبور کیا ہو جیسا کہ پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے:

---

۵۱ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۸۶، ۵۲ اردو - جولائی ۲۷ء ص ۵۴۲۔

"...... اگر شیخ برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو گجراتی الاصل تسلیم کرتے ہیں[۵۱]......"

بہرحال ان آثار سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اکبری حملوں نے گجرات کے ادیبوں اور شاعروں نیز صوفیائے کرام کے ایک خاص گروہ کو گولکنڈا اور بیجاپور جانے پر مجبور کر دیا اور گجرات کا علمی و ادبی مرکز گولکنڈا اور بیجاپور منتقل ہو گیا اور تقریباً ایک صدی تک کوئی قابل ذکر شاعر گجرات میں نظر نہیں آتا۔

گجراتی شاعروں کا دوسرا دور گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوتا ہے، عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈا کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، اس مدبر بادشاہ نے جہاں سیاسی نظریوں اور جہاں بانی کے اصولوں میں انقلابی تبدیلیاں کر کے سلطنتِ مغلیہ کو استحکام پہنچایا وہیں شاعروں اور ادیبوں کی بھی فیاضانہ حوصلہ افزائی کی چنانچہ گیارھویں صدی ہجری میں دکنی شعراء کا اثر سارے ہندوستان میں پھیل چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ دکنی لٹریچر کا کافی ذخیرہ اس دور میں دستیاب ہوتا ہے، گجرات بھی جو پہلے شعر و شاعری کا مرکز رہ چکا تھا کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا، ذیل میں ہم اس دور کے بعض شعراء کا ذکر کرتے ہیں:

وَلی:

دکنی شاعری کی سب سے بڑی شخصیت وَلی ہے، وَلی سے پہلے دکنی زبان میں ہندی کے غیر مانوس اور اجنبی الفاظ کی بہتات تھی، کلام میں روانی، صفائی اور بے ساختگی کا فقدان تھا، لیکن وَلی نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اُردو شاعری میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ سارے ہندوستان میں جنوب سے لے کر شمال تک اس کی دھاک بیٹھ گئی، اور شعراء میں پہلی مرتبہ یہ احساس پیدا ہوا کہ اُردو زبان میں بھی ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنھیں اگر بروئے کار لایا گیا تو وہ فارسی کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔

وَلی کی عظمت کا راز صرف اس کی شاعری ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی مجتہدانہ طبیعت میں بھی مضمر ہے، اس نے فارسی کی تمام بحروں کو اُردو میں بلا تکلف استعمال کیا اور اس میں اُسے پوری پوری کامیابی ہوئی، "شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا، ردیف وار دیوان بنایا"[۵۲] غیر مانوس، ثقیل اور بھدّے الفاظ کو ترک کر کے سادہ، سلیس اور مترنم الفاظ استعمال کئے جس سے کلام میں زور، کشش تازگی اور توانائی پیدا ہو گئی۔ وَلی کی عظمت کے قائل خود میر تقی میر ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

خوگر نہیں کچھ یونہیں ہم ریختہ گوئی کے		معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور اپنے مشہور تذکرے میں لکھتے ہیں:

"از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد"[۵۳]

---

۵۱ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء ص ۷، ۵۲ آبِ حیات ص ۸۸۔ ۵۳ نکات الشعراء ص ۹۰

مثنوی نگاری ولی کے دور کی اہم خصوصیت ہے اور چونکہ ہمارا نفس مضمون بھی اسی صنف سے متعلق ہے لہذا ولی کی بعض مثنویوں کا ذکر کر کے ہم آئین کے دوسرے معاصرین کی طرف متوجہ ہوں گے۔

ولی کی ایک مشہور مثنوی شہر سورت سے متعلق ہے، اکثر تذکرہ نویس جو ولی کو گجراتی مانتے ہیں وہ ثبوت میں اس مثنوی کو پیش کرتے ہیں، مثنوی میں تقریباً سو اشعار ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ولی نے اس میں خوب خوب دادِ سخن وری دی ہے۔

ولی کی دوسری مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

الٰہی دل اُپر دے عشق کا داغ	یقیں کے نین میں سٹ کحل مازاغ
الٰہی عشق میں مشتاق کر مجھ	اپس کے شوق کا مشتاق کر مجھ
شریعت کا جہاں ہے شارعِ عام	بہ تن کر وہانچہ کر آغاز و انجام
عیاں کر دل اوپر رازِ طریقت	سنے پر کھول ابواب حقیقت[۵۱]

ضعیفی:

اس کا نام شیخ داؤد ہے، اس دور کے مثنوی نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے، اس کی دو مثنویاں کافی مشہور ہیں، پہلی "ہدایتِ ہندی" ہے، یہ ایک طویل مثنوی ہے جو ۴۶۳۸ اشعار پر مشتمل ہے[۵۲] اس کا موضوع خالص مذہبی ہے جس میں فقہ حنفی کے عقائد اور بعض اہم معجزات کا ذکر ہے، اس کے مطالعے کے بعد ضعیفی کے تبحر علمی کا قائل ہونا پڑتا ہے، مثنوی ۲۵ ابواب پر مشتمل ہے آخری باب میں شاعر نے شہنشاہ اورنگ زیب کی یوں مدح لکھی ہے:

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب	کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
شہنشاہ عادل اہے در امور	کہ بدعت ضلالت ہوا جس تے دور
دیا حق تعالٰی نے یوں جس کوں جس	جو دشمن ہوا اس انگے خوار و خس
....	....
اہے اس میں سنے بھی ولی کی صفات	کہ ہو آئے جو موں سوں کانہے سو بات
بڑا دین اسلام کا کارساز	الٰہی توں کر عمر اس کی دراز

ضعیفی کی دوسری مثنوی "عشق صادق" ہے، ایک فرضی قصے میں ایک عورت کا آنحضرت صلعم کے ساتھ محبت و الفت کا ذکر ہے، بقول ڈاکٹر زور یہ مثنوی اگرچہ مذہبی موضوع پر لکھی گئی ہے تاہم ادبی خوبیوں سے معرا ہے[۵۳]۔ اس میں ہندی الفاظ کی بہتات ہے۔

---

[۵۱] کلیات ولی احسن ص۳۸-۳۸۱ ، [۵۲] اردو مخطوطات زور ص۲۵ ، [۵۳] دکن میں اردو ص۱۳۴

مجرمی :

اس کا نام شاہ بیر اللہ ہے، بیجاپور کا رہنے والا تھا، ۱۱۴۱ھ میں وجہی کے قصے "سب رس"[۵۱] کو منظوم کیا اور "گلشنِ جبشنِ دل" نام رکھا[۵۲]۔ اس کی زبان شعری تکلفات سے پاک ہے۔

وجدی :

ڈاکٹر زور نے ان کا نام وجیہہ الدین لکھا ہے[۵۳] لیکن ترقیمے میں شیخ وحیدالدین لکھا ہے[۵۴]۔ ہاشمی صاحب نے وجیہہ الدین بتایا ہے[۵۵]، شمس اللہ قادری نے ہدایت اللہ لکھا ہے[۵۶] جو غلط معلوم ہوتا ہے۔

صوبۂ اورنگ آباد کی سرکار دھارور میں کیج نامی ایک قصبہ ہے وجدی وہیں کے رہنے والے ہیں، طبابت ان کا پیشہ تھا لیکن علوم معرفت میں کافی دستگاہ رکھتے تھے چنانچہ ان کا شمار اپنے وقت کے مشہور صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ عطار کی مثنویوں سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ان کی اکثر مثنویوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی تین مثنویاں بہت مشہور رہیں:

(۱) "مخزن عشق" یا "باغ جانفزا": اس کی اصل فارسی ہے۔

(۲) مثنوی "تحفۂ عاشقاں": عطار کی مثنوی "خسرو وگل" یا "خسرونامہ" یا "گل و ہرمز" کا ترجمہ ہے۔

(۳) "پنچھی باچھا": یہ بھی عطار کی شہرۂ آفاق مثنوی "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے۔ "پنچھی باچھا" کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی مدراس ۱۲۷۳ھ اور ۱۳۱۴ھ میں اور بمبئی میں ۱۲۸۰ھ اور ۱۳۱۹ھ میں طبع ہو چکی ہے۔

وجدی ایک پُرگو شاعر ہیں، دکنی پر پورا عبور حاصل ہے، کہیں کہیں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔

بحری :

اصل نام قاضی محمود اور بحری تخلص ہے، بیجاپور کے علاقے میں گوگی ایک مقام تھا وہیں کے قاضی تھے، ۱۰۹۵ھ میں ترک وطن کر کے بیجاپور آ گئے تھے، قریباً دو سال تک سکندر عادل شاہ (۱۰۹۵ھ) کے دربار میں رہے لیکن ۱۰۹۷ھ میں جب بیجاپور کی سلطنت تباہ ہو گئی تو حیدرآباد کا رُخ کیا، بحری نے تمام اصناف سخن

---

۵۱ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۲۳۵ ، ۲۳۶ ، ۵۲ رسالۂ اردو جلد پنجم میں مولوی عبدالحق نے ایک مضمون اس مثنوی پر سپرد قلم فرمایا تھا اس میں کاتب نے غلطی سے "گلشنِ جبشنِ دل" کی بجائے "گلشن حسن دل" لکھ دیا "اردوئے قدیم" "اُردو شہ پارے" اور "دکن میں اردو" کے مصنفین نے یہی غلط نام نقل کر دیا، لیکن مولانا عبدالحق نے "تنقیدات عبدالحق" صفحہ ۶۱ پر اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

۵۳ اردو مخطوطات ص ۶۰ ، ۵۴ ایضاً ص ۶۱ ، ۵۵ دکن میں اردو ص ۳۲۲

۵۶ اردوئے قدیم ص ۱۰۳ ۔

میں طبع آزمائی کی ہے چنانچہ بقول ڈاکٹر زور:

"بحری کی عروسِ عرفاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مرثیے، غزل، رباعی اور قصیدہ وغیرہ ملا کر کل پچاس ہزار شعر لکھے تھے لیکن بیجاپور سے حیدر آباد جاتے وقت، چوروں نے سب لوٹ کر غارت کر دیا۔[۵۱]"

اس میں شک نہیں کہ بحری پُرگو شاعر تھے، زبان میں سلاست اور شیرینی ہے خیالات بھی صاف اور سادہ ہیں، چونکہ صوفی مشرب تھے اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے؛ ان کی مشہور مثنوی "من لگن" اسی رنگ میں ہے اور دکنی لٹریچر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے، یہ مثنوی غالباً بارھویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہے جس کے متعلق ایک شعر مثنوی میں ملتا ہے ؎

اے بھائی یہ بارھویں صدی ہے   نیکی کوں دبا بدی بدی ہے[۵۲]

بحری پر ایک محققانہ مقالہ مع ان کی چند غزلوں کے ترجمے کے ڈاکٹر حفیظ سید نے تحریر فرمایا ہے۔

اشرف:

سید محمد اشرف نام ہے، اس کے متعلق دیوان میں ایک شعر ہے ؎

نام میرا ہے اس سبب اشرف   مشت از خاک پائے احمد ہوں[۵۳]

تذکروں میں اس کا ذکر نہایت اختصار سے کیا گیا ہے، میر تقی میر نے تو صرف نام لکھ کر نیچے یہ شعر درج کر دیا ہے ؎

توں شاہ ہے شہوں کا بندے ہیں تیرے سب شا   میں بھی ایسں کوں بندہ تیرا نہ کہوں تو کیا کہوں[۵۴]

شفیق نے صرف چند الفاظ پر اکتفا کیا ہے:

"از معاصران ولی است، چنانچہ ولی جائے مصراع او را تضمین می نماید و می فرماید:

اشرف کا یو مصراع ولی مجھ کو ہے دلچسپ   الفت ہے دل و جاں کو میرے یتیم نگر سوں؟[۵۵]

اور پھر میر کے منتخبہ شعر کو نقل کر کے اشرف سے منسوب کیا ہے، گلشنِ گفتار میں بھی مختصر سا ذکر ہے:

"محمد اشرف، اشرف تخلص۔ گجراتی۔ بلاواسطہ شاگرد ولی محمد، طبع رنگین داشت، شعرش در نواحِ گجرات شہرت دارد، دیوان لطیف تصنیف نمودہ[۵۶]"

اس سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشرف گجرات کا رہنے والا تھا چنانچہ اشرف کے ایک شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے ؎

---

۵۱ اردو شہ پارے ص ، ۵۲ من لگن ص۱۱، ۵۳ دیوان اشرف مخطوطہ مملوکہ پروفیسر ندوی ۵۴ دیوان اشرف مخطوطہ مملوکہ پروفیسر ندوی ۵۴ نکات الشعراء ص۱۰۱ ، ۵۵ چمنستان شعراء ص۳۵ ، ۵۶ گلشن گفتار ص۱۲

ملک گجرات میں حبیب اللہ　　تیری فرقت نے ہم کو مارے ہیں[۵۱]

اشرف کی سب سے بڑی خصوصیت مرثیہ نگاری ہے چنانچہ بقول ڈاکٹر زور، "اس نے نہایت لاجواب مرثیے بھی لکھے ہیں۔"[۵۲] اشرف کی غزلوں کا ایک دیوان بھی ہے، اس کا ایک مخطوطہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے کتب خانے میں موجود ہے، اس میں تقریباً دو سو غزلیں ہیں، غزلوں میں جابجا ولی کا تتبع پایا جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔

اشرف کی مشہور مثنوی "جنگ نامہ حیدر" ہے جو ۱۱۲۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے، موضوع حضرت علی کے جنگ جویانہ کارنامے ہیں،

اشرف کے مرثیے اس دور کی امتیازی پیداوار ہیں ان میں خلوص بھی ہے اور ادبیت بھی، زبان میں سلاست اور روانی ہے خود اشرف کا قول ہے ؎

کہیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا　　ہوا مشتاق ہر ایک شاعر ملکِ دکن میرا

ولی ویلوری

پورا نام میر ولی فیاض ہے، ویلور کا رہنے والا تھا ۱۱۵۰ھ کے قریب انتقال ہوا۔[۵۳]

ولی پرگو شاعر تھا چنانچہ اس کی دو ضخیم مثنویاں کافی مشہور ہیں، طبقات الشعراء میں اس کا مختصر سا ذکر ہے، اس کے اپنے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھا، سلاست اور متانت کے سوا کلام میں پختگی بھی ہے، معاصرانہ مذہبی رنگ تمام مثنویوں میں جھلکتا ہے، ولی کی تین مثنویاں اب تک دریافت ہوئی ہیں:

(۱) رتن و پدماوت: یہ مثنوی نایاب ہے، اسپرنگر نے اس کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے قصے کی بنیاد رانی پدماوت اور چتوڑ کے راجہ رتن سین کی عشقیہ داستان پر رکھی گئی ہے۔[۵۴] بقول ڈاکٹر زور اس مثنوی کے لکھتے وقت شاعر کے پیش نظر ملک محمد جائسی کی "پدماوت" رہی ہے، اس میں چار ہزار اشعار ہیں۔[۵۵]

(۲) روضۃ الشہداء: یہ مثنوی ملا حسین واعظ کاشفی کی اسی نام کی مشہور مثنوی کا ترجمہ ہے، لیکن شاعر نے ترجمے میں فارسی ترتیب کو برقرار نہیں رکھا بلکہ حسب ضرورت ترمیم و تجدید کی ہے جس سے کتاب دلچسپ ہوگئی ہے چنانچہ یہ مثنوی کئی بار طبع ہو چکی ہے، ۱۱۳۷ھ میں تالیف ہوئی۔

(۳) "دعائے فاطمہ" ولی کی تیسری مثنوی ہے، ڈاکٹر زور نے اس کا ذکر اپنے شہ پارے میں نہیں فرمایا۔

---

۵۱ دیوان اشرف ص　۵۲ اُردو شہ پارے ص ۱۴۸　۵۳ تذکرۂ اردو مخطوطات ص ۵۸

۵۴ اردو شہ پارے ص ۱۴۵　۵۵ ایضاً

لیکن مولوی ہاشمی نے اس کا مخطوطہ یورپ میں دیکھا ہے اور نمونے کے طور پر صرف پانچ شعر درج فرمائے ہیں جن سے کوئی مفید مطلب بات نہیں ملتی موضوع کے متعلق بھی ان سے کوئی مدد نہیں ملتی۔

فتح:

محمد فتح نام، گودھرا (گجرات) کا رہنے والا تھا حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے، اس کی ایک تصنیف "یوسف ثانی" یا "زلیخائے ثانی" سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے شاعر آئین کا ہم عصر تھا، مثنوی کے ابتدائی اشعار سے سبب نظم کتاب اور دوسری ضروری باتوں پر روشنی پڑتی ہے مثلاً یہ کہ فتح ایک دن گودھرے کی جامع مسجد میں بیٹھا تھا اور لوگوں سے قصۂ "یوسف زلیخا" کے نظم کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا، اتفاق سے ہمارا شاعر آئین بھی وہیں موجود تھا اس نے کہا:

سن محمد توں فتح مجہ سیں اے بات گودھرے کے بیچہ توں ہے نیک ذات

اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصا اے فتح اس بات میں تو سخن کیا

اور جب فتح کو معلوم ہوا کہ آئین نے پہلے ہی اس قصے کو نظم کیا ہے تو اس نے "یوسف ثانی" کا قصہ نظم کرنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ آئین نے اپنی مثنوی ۱۱۰۹ھ میں لکھی تھی اس لئے فتح کی مثنوی اس کے بعد لکھی گئی ہے، اس کا ایک نامکمل نسخہ پروفیسر ندوی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے دوسرا نسخہ کتب خانہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ہے۔

فتح کی زبان گوجری ہے اور گجرات کے شعراء کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں، غالباً فتح کو فارسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی کیونکہ مثنوی میں دس دس، پندرہ پندرہ فارسی کے اشعار بھی ملتے ہیں جو اس دور کے شعراء میں ایک نئی چیز ہے،

عشرتی

سید محمد خان نام ہے، حیدر آباد کا رہنے والا تھا، ایک عرصے تک عادل شاہی دربار میں داد سخنوری دیتا رہا، بیجاپور کی سلطنت کی تباہی کے بعد اس کی علمی لیاقت اور شاعرانہ کمالات کو دیکھ عالمگیر نے بھی اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور عشرتی جاگیر و منصب پر فائز رہا۔

عشرتی پُر گو شاعر تھا، اکثر مثنویاں لکھی ہیں، غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے، کلام سے کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے اپنے دور میں بہت مقبول تھا، رومان اس کا مرغوب موضوع معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بقول ڈاکٹر زور عشرتی نے "ابن نشاطی"[1] کے

[1] ابن نشاطی شعراء دکن میں امتیازی درجہ رکھتا ہے، گولکنڈہ کا رہنے والا تھا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا درباری شاعر، اس کی مثنوی "پھول بن" رومانی مثنویوں میں بہت مقبول ہے جو ۱۰۶۶ھ میں تصنیف ہوئی۔

مقابلے میں نہایت کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے"۔[۵۱]

عشرتی کی مثنویوں میں "دیپک پتنگ"، "نیہ درپن" اور "چت لگن" وغیرہ مشہور ہیں۔

ذوقی:

ان کا نام سید شاہ حسین ہے، طبیعت صوفیانہ تھی، ان کے مرشد شاہ خان محمد نے ان کو "بحر العرفان" کا خطاب دیا تھا، اپنی قادر الکلامی پر اکثر جگہ تعلی کرتے نظر آتے ہیں، اور خود کو نصرتی سے بلند پایہ شاعر تصوّر کرتے ہیں۔[۵۲]

اس میں شک نہیں کہ ذوقی کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے اور دکنی شاعری کے سنوارنے اور نکھارنے میں ان کا کافی حصہ ہے، مرثیہ، مثنوی اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے، "وصال العاشقین"، "غوث نامہ"، "وفات نامہ"، "منصور نامہ" اور "ماں باپ" وغیرہ مثنویاں ان سے یادگار ہیں۔

اس دور پر تبصرہ

اس دور کے ادب پر تفصیلی نگاہ ڈالنے سے مندرجۂ ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں:

(۱) اس دور کے سب سے بڑے شاعر ولی نے غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی میں بھی وسعت اور بلندی پیدا کرنے کی کوشش کی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مثنوی نے لکھنؤ پہنچتے پہنچتے ایک خاص درجہ حاصل کر لیا تھا۔

(۲) ولی نے معنوی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ لفظی اصلاح و تنسیخ کو بھی وسیع تر اور پاکیزہ تر بنایا، اگرچہ اس دور کی بعض تصنیفوں میں زبان کی وہ صفائی اور بے ساختگی نہیں ہے جو ولی کا خاصہ ہے تاہم، بہ حیثیت مجموعی ان مثنویوں کی زبان ماسبق شعراء کے مقابلہ میں بہت کچھ صاف اور رواں ہے اور اس میں ایک قسم کی جدّت اور تازگی پائی جاتی ہے،

(۳) اس دور کی تقریباً تمام مثنویاں مذہبی اور متصوفانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، لیکن ولی نے صوفیانہ و عاشقانہ مثنویوں سے ہٹ کر حقیقت نگاری کی طرف توجہ کی چنانچہ اس کی مثنوی "در بابِ گجرات" اور "در تعریفِ سورت" اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

(۴) ایک لحاظ سے اس دور کو ترجمے کا دور بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ دو ایک شعراء کو چھوڑ کر تقریباً سبھوں نے فارسی کی کسی نہ کسی مثنوی کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور ان سب پر انفرادیت کی مہر ثبت ہے، لیکن ولی اس کلیے سے مستثنیٰ ہے، اس نے اپنے ہم عصر اور ما بعد کے مثنوی نگاروں کی طرح دوسروں کی مثنویوں کو شمعِ راہ نہیں بنایا ہے۔

---

[۵۱] اردو شہ پارے صفحہ ۱۴۷، [۵۲] ملاحظہ کیجئے مولانا عبد الحق کی گراں قدر تصنیف "نصرتی"۔

(۵) اس دور کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت مرثیہ نگاری ہے، اس سے قبل بھی اردو میں مرثیے لکھے گئے ہیں لیکن اس دور کے مرثیوں میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی نمایاں ہے،

چونکہ ہمارا موضوع شاعری کی ایک خاص صنف کی ایک اہم تصنیف سے متعلق ہے اس لئے ہم نے عمداً اردو نثر کے سلسلے میں کچھ لکھنے کی کوشش نہیں کی اور ادب کی اس صنف کو بخوف طوالت نظرانداز کر دیا ہے۔

آئین کے حالات زندگی

افسوس ہے کہ آئین کے سوانح حیات پر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور انتہائی کوششوں اور کاوشوں کے بعد بھی ہمیں آئین کے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے، تذکروں میں اس کا ذکر نہایت مختصر اور سرسری طور پر کیا گیا ہے جس سے شاعر کی زندگی پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔ ان تذکروں کے ماخذ بھی بیرونی شواہد پر مبنی ہیں اس لئے اکثر جگہ ہمارے شاعر آئین کی شخصیت کو اس کے دوسرے ہم نام شاعروں کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے، لہٰذا سب سے پہلے اس التباس کو دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، دکن اور گجرات میں کئی شاعر ایسے گذرے ہیں جن کا تخلص آئین تھا، ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ملک امین الدین کمال (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ): بہ قول شمس اللہ قادری یہ گجرات کا درباری شاعر تھا، اس نے بہرام اور حسن بانو کے عشقیہ افسانے کو نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن تکمیل سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا

(۲) امین الدین اعلیٰ: یہ علی عادل شاہ (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۲ھ) کے زمانے میں گزرا ہے۔

(۳) آئین: یہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ) آخری بادشاہ گولکنڈا کا درباری شاعر تھا۔[۵۱] لیکن ڈاکٹر زور پہلے اسے عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے دور کا شاعر بتایا ہے۔[۵۲]

اس نے "قصہ ابوشحمہ" کے نام سے ایک مثنوی ۱۰۹۰ھ میں لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔

(۴) شیخ محمد امین: یہ ہمارا شاعر مصنف "یوسف زلیخا" ہے۔

"اردو شہ پارے" میں ہمارے شاعر آئین کو گولکنڈہ کا شاعر بتایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"یہ گولکنڈا کا دوسرا شاعر آئین ہے، اس کا نام شیخ محمد آئین تھا، اس کی کتاب "یوسف زلیخا" اورنگ زیب کے عہد میں ۱۱۰۹ھ میں ختم ہوئی[۵۳]......"

اس شاعر کی بابت کریم الدین کا بیان ہے:

"آئین تخلص، میر محمد امین دکھنی ایک مشہور شاعر ہے جس کی سوائے اور تصانیف کے ایک ساقی نامہ ہے اور ایک مثنوی "یوسف زلیخا"......

---

۵۱ دکن میں اردو صفحہ ۸۰، ۵۲ شہ پارے صفحہ ۱۳۶، ۵۳ ایضاً صفحہ ۸۰

"یہ شخص قوم سے سید ہے رہنے والا بنارس کا شاگرد میر غلام علی آزاد بلگرامی کا..... اخیر عمر میں ممالک جنوبیہ کے گیا اور وہیں فوت ہوا[۵۱]......"

افسوس ہے کہ مندرجۂ بالا دونوں باتیں محض قیاس آرائیاں ہیں، آمین نہ گولکنڈا کا رہنے والا تھا نہ بنارس کا بلکہ وہ گجرات کا شاعر ہے پہلے بیرونی شواہد ملاحظہ کیجئے، ہاشمی صاحب فرماتے ہیں:

"شیخ محمد امین ان کا نام تھا، گجرات کے باشندے تھے[۵۲]......"

مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

"آمین گجراتی نے یوسف زلیخا ۱۰۹۸ھ میں لکھی[۵۳]"

پروفیسر محمود شیرانی نے بھی آمین کو گجراتی تسلیم کیا ہے[۵۴]۔

اب اندرونی شواہد ملاحظہ فرمائیے، آمین نے مثنوی میں اپنی زبان کو متعدد بار گوجری یعنی گجراتی کہا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ گجراتی تھا، اشعار سنئے:

سنو مطلب اہے اب یوں آمیں کا　　لکھے گجری منیں یوسف زلیخا
ہر ایک جاگے قصا ہے فارسی میں　　آمیں اس کوں اوتارے گوجری میں
کے بوجے ہر کدام اس کی حقیقت　　بڑی ہو گوجری جگ بیچہ نعمت

پھر جہاں مثنوی لکھی گئی ہے اس جگہ کا نام بتایا ہے:

بتیاں چالیس سو پر چودہ اور سو　　ہے لکھیاں گودھرے کے بیچہ سن لیو[۵۵]

گودھرا گجرات کا مشہور مقام ہے جو غالباً امین کا وطن تھا۔

اس سلسلے میں محمد فتح کی مثنوی "یوسف ثانی" کے اشعار بھی بطور سند پیش کئے جا سکتے ہیں:

سنتا تھا محمد امیں کو بر چشم　　مجہ کوں تب مسجد منیں دیتی قسم
سن محمد توں فتح مجہ سیں اے بات　　گودھرے کے بیچہ توں ہو نیک ذات
اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصا　　اے فتح اس بات میں تو سخن کیا

فتح خود گودھرے کا باشندہ اور آمین کا ہم عصر شاعر تھا بہت ممکن ہے کہ دونوں میں معاصرانہ چشمک

---

۵۱ طبقات الشعراء صفحہ ۲۲۸ ، ۵۲ دکن میں اردو صفحہ ۲۱۵ ، ۵۳ مخزن الشعراء مقدمہ صفحہ ۳ ، ۵۴ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۴ ، ۵۵ ہاشمی صاحب نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں صفحہ ۳۴۸ پر "گودھرے" کو "گودھری" لکھ کر یہ بتایا ہے کہ یہ (یوسف زلیخا) گودھری (گجراتی) زبان میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ درست نہیں، آمین ہر جگہ اپنی زبان کو گجری یا گوجری کہتا ہے، گودھرا گجرات کا مشہور مقام ہے نیز گودھری بھی غلط ہے، بمبئی یونیورسٹی اور مولوی عبدالحق کے نسخوں میں صاف "گودھرے" لکھا ہے۔

بھی ہو چنانچہ مندرجۂ بالا اشعار اس کی غمازی کرتے ہیں۔

جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے، آمین کے حالات کے متعلق تذکروں میں کوئی مفید مطلب بات نہیں ملتی، ہاشمی صاحب صرف اتنا کہتے ہیں:

"آمین مذہبی آدمی تھا، قادریہ طریقے میں بیعت کی تھی۔"[۵۱]

پروفیسر محمود شیرانی صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں:

"محمد امین کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں، صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ "یوسف زلیخا" کا مصنف ہے۔"[۵۲]

مثنوی سے بھی آمین کے حالاتِ زندگی پر روشنی نہیں پڑتی، البتہ ساقی نامہ کے مندرجۂ ذیل اشعار سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آمین نے اپنی مثنوی بڑھاپے میں لکھی تھی:

پلا ساقی شراب ارغوانی — آمیں کوں دے کہ پھر پکڑے جوانی
ضعیفی ذات کی جاوے سو سب ٹل — آوے ہاتھوں پگوں میں پھیر کر بل
بدن سب ہو گیا ہے لاجوردی — ہوا مکھ زعفران مانند زردی

آمین کی شخصیت

مثنوی میں ہمیں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے آمین کی شخصیت کی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے، ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین واقعی ایک مذہبی، خدا ترس، راستباز اور رمرنجان و مرنج قسم کا آدمی تھا، غرور تعلی اور جھوٹی تعریف کا اس کی تصنیف میں کہیں پتہ نہیں ملتا، "حسن ازلی" اور "عشق حقیقی" اس کے موضوع ہیں، بعض اشعار سنئے:

ارے بندے حقیقی عشق جانو — مجازی عشق کوں دل پر نہ آنو
مجازی عشق کوں جن یوں کیا ہے — دغا ان کوں سو شیطاں نے دیا ہے
حقیقی عشق پیچہ جو کوئی جذب ہونا پیٹھے — وے تو غا جے خدا کے ہو کے بیٹھے
دغا انہوں دیا شیطان کوں رے — رکھا ثابت انہوں ایمان کوں رے

ایک جگہ زلیخا کے عشق مجازی کو اس کے آلام و مصائب کا باعث ٹھہرایا ہے:

مجازی عشق جو رکھتے ہیں جگ ماں — اونوں کوں خوار کرتا ہے زمانہ
حقیقی عشق جو رکھتے ہیں در دل — نہیں پڑتا انہوں کوں کدھی مشکل

---

[۵۱] دکن میں اردو صفحہ ۲۱۶ ، [۵۲] ا۔ک۔ میگزین فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۵

خدا کے عشق بھیتر وہ شب و روز رہتے ہیں دل خوشالی سوں دل افروز
جو عاشق ہوئی انساں پر زلیخا پڑی تو اوس اوپر دیکھو بپت کیا
اگر اللہ پر عاشق وہ ہوتی انسے انسان کے سانٹے نہ جوتی
کچھو مشکل نہ پڑتی اوس کے تئیں ہاں رتی ہو مست دائم عشق کے ماں

آئین کے نزدیک دنیا میں ہر مصیبت کا سبب خود انسان کے اپنے فعال ہیں، حتیٰ کہ پیغمبر بھی اس سے بری نہیں، چنانچہ جب حضرت یوسف کے بھائی ان کو مالک کے ہاتھ بیچتے ہیں اور وہ ان کو "کھوٹے دام" دے کر خریدتا ہے تو اس تذلیل و تحقیر حسن کی آئین یہ تاویل پیش کرتا ہے:

کہتے ہیں ایک دن لے آرسی ہیں دیکھا آپس کا درسن یوسفجی ہیں
دیکھی بے مثل صورت اپنی جب کرے دل میں فکر اولہوں یوں تب
کہ ہاں البتہ مجھ سا کوئی انساں نہیں پیدا کیا رب نے جگت ماں
میری صورت اوپر سورج انچھاوے کہاں تب چاند میرے تول آوے
نہیں پاسنگ کے بھیتر ستارے میرے آگل خجل ہو جائیں سارے
نہیں مجھ سار کا کوئی حور رضواں فرشتوں کے بھیتر مجھ سا دگر کاں
خدا کے درگا بھیتر غیر بچ گئی کہ یوسف نے ثنا کیوں اپنی کئی
حکم اللہ کا آیا سو تب یوں تجے بکواؤں کھوٹے دام سر ہوں
جو تیں اپنے حسن کا گرب کیتا اہیں کوں اس روش ربنا سو دیتا
کپت وس حق تعالیٰ کوں نہ بھایا یوسف کو کھوٹے داموں میں بکایا

تکبر، غرور اور بیجا تعلی سے آئین کو خود بیحد نفرت تھی چنانچہ وہ اکثر جگہ ان کی مذمت کرتا ہے:

گرب کوئی اس جگت میں کیجیو نا غروری کا پیالا پیجیو نا،
نظر اپنے اوپر کر یو نہ کوئی تکبر دل اوپر دھریو نہ کوئی
غروری کا پیالہ جن پیا ہے اونے اپنے سراد پر دکھ لیا ہے
گرب کرنار کوں پڑتی ہے مشکل گرب سونا کرے جو ہوئے عاقل
تکبر ہے برا ہشیار ہشیار کپٹ نا کیجیو زنہار زنہار

اسی طرح وہ زلیخا کی تمام مصیبتوں کا واحد سبب بے دینی اور بت پرستی کو بتاتا ہے:

کنیزوں نے کیا یوسف کوں سجدا ہموں نے نا کیا سن اے زلیخا

کیا ہم نے اسے یوسف کے خدا کوں — جو ہے کرتار اس ارض و سما کوں
ہمیں سب کفر کھو، دینچ میں آیاں — یوسف کے رب اوپر ایمان لایاں
ہموں کوں دی خدا نے دل میں توفیق — تو ہم ہوں یا سبی دینداِر تحقیق
تجے توفیق گر ہووے تو توں آ، — یوسف کے رب اوپر ایمان توں لیا
نہ ہوئے توفیق تو جا اپنے جا گے — عبادت کر اوسی پتھر کے آگے

....

ہوا اک رات اوس کوں عشق کا ہوش — پڑی بت کے اگل وے ہو کے بے ہوش
سچیوں پھر ہوش بیچہ آئی سو جب او — کنے لاگی اپس کے بُت کوں تب او
کہ میں تجہ کوں خدا کر کر کے پوجا — تو بھی تیں درد دکھ میرا نہ بوجا
برس اتّی ہوئے میری عمر کے — کہ نس دن میں تجے کرتی ہوں سجدے
توں میرا کام اتیا کر سکا ناں — کہ یوسف کوں ملا دے مجہ کوں جگ ماں
یوسف کے رب نے کیا کیا ہے کئے کام — بچایا ہے یوسف کوں ربنے سب ٹھام (جگہ)
بھی اوس کے ربنے اوسکوں شاہ کیتا — مصر کے ملک جیسا تخت دیتا
تجے لعنت خدا کی ہیچ کارا — کیا تیں کام نہ اتنا ہمارا
تجے یوسف کے رب اوپر سوں واروں — بے عزت کر کے دھرتی پر پچھاروں
یوں کہہ کر بت پکڑ دھرتی سوں کوٹا — قدم تا سر دے بندوں بند سیں چھوٹا

امین غالباً اپنی مثنوی کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کے حریف پیدا ہو گئے تھے جو اس کے درپے آزار رہتے چنانچہ اس کے ہم وطن و ہم عصر شاعر محمد فتیح کے اشعار ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، امین بھی آخر انسان تھا وہ بھی ان رقیبوں اور حریفوں کا تذکرہ ایک خاص انداز سے کرتا ہے:

امیں پیوے پیالا مست ہووے — رقیب افسوس کھا کے پست ہووے

امیں کوں دے پیالے ہوئے خرم — رقیباں تلملا کے کھائیں سب غم

رقیباں دیکھ اوس کوں جل مریں سب — بُوت (بہت) افسوس مل مل کر کریں سب

آمین کا مذہب

آمین سنی فرقے سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ چار یاروں کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

اول حضرت ابوبکرؓ ہیں صدیق — ہموں کوں اون کے صدقے بخشیں تحقیق
عمرؓ دوجے نبی کے یار ہمانی.. — ہیں بے شک ان میں کچہ توں شک نہ آنی
بخشس کر ڈالیں ہم کوں بیچہ جنت — کرے سگلے گنہگاروں کوں رحمت
اہیں تیجے نبی کے یار عثمان — اونوں کیتے سخاوت بوت جگ مال
اہیں چوتھے نبی کے یار حیدر — جنے لیتا قوت سوں قلعہ خیبر

آمین کو خانوادۂ جیلان سے بھی خاص عقیدت ہے چنانچہ حضرت پیر محی الدین جیلانی کی صفت میں بھی اشعار کہے ہیں:

محی الدین حضرت پیر میران — جنوں کے ہیں ہمیں سب دستگیراں
الہٰی اون کے بدلے توں سنبھالیں — ہموں کوں دوزخوں کے بیچہ نہ ڈالیں

(باقی)

فہرست کتب موصولہ برائے تبصرہ

	کتاب	مصنف یا مرتب	ناشر
(۱)	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
(۲)	کلیات ولی طبع سوم	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو کراچی
(۳)	وجیہ الدین ویدی	محمد بن عمر	کتب خانہ عابد روڈ حیدرآباد
(۴)	چند نظمیں	پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی
(۵)	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
(۶)	جوئے رواں	حامد اللہ افسر	انوار بکڈپو لکھنؤ
(۷)	تماشائے محبوب	بہزاد لکھنوی	ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ
(۸)	مقالہ در مسئلہ وحدت الوجود	ڈاکٹر محمد احمد صدیقی	مطبع اسرار کریمی الہ آباد
(۹)	بنا بازار		
(۱۰)	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
(۱۱)	اپنی موج میں	آوارہ	
(۱۲)	دیوان صفی صحیفہ الغزل	صفی لکھنوی	قومی گھر، نادان محل روڈ لکھنؤ

رسائل

سالنامہ کاروان ادب	بزم ادب اردو	سینٹ زیویرس کالج بمبئی
آج کل۔ جنوری ۱۹۵۵ء	جوش ملیح آبادی	پبلیکیشنز ڈیویژن گورنمنٹ آف انڈیا دہلی

"دستنبو" کا ایک خاص نسخہ

(سید جمیل الدین)

مرزا غالب، اپنے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں، منشی شیو نرائن[۵۱] کو لکھتے ہیں:

"کتاب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے، جس کو دی ہو، دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں[۵۲]"

غالب نے یہ "دو تین غلطیاں" بنا کر اور سرورق کے اندرونی صفحے پر، اپنے قلم سے، ایک قطعہ لکھ کر "دستنبو" کی پہلی اشاعت (۱۸۵۸ء) کا ایک نسخہ نواب وزیر الدولہ[۵۳] والی ٹونک کی خدمت میں بطور نذر بھیجا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے سے متعلق مزید کچھ بیان کرنے سے پہلے خود "دستنبو" سے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

دستنبو:

اس کتاب میں، غالب نے، گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا اپنا حال، روداد شہر اور دوستوں کی سرگذشت لکھی ہے۔ ایک خط میں چودھری عبد الغفور سرور[۵۴] کو لکھتے ہیں:

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی، اپنی سرگذشت لکھنی شروع کی، جو سنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگذشت کرتا گیا[۵۵]"

یہ سلسلہ جاری تھا کہ اس سرگذشت کے چھپنے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ غالب نے آگے لکھنا موقوف کیا "دستنبو" اس کا نام رکھا اور مسودہ آگرے چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ میر مہدی مجروح[۵۶] کو لکھتے ہیں:

---

[۵۱] منشی شیو نرائن کے حالات کے لیے دیکھیے: "تلامذہ غالب" از مالک رام ایم اے۔ اردو ادب جنوری اور اپریل ۱۹۵۱ء ص ۵۶ ، [۵۲] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، سٹی پریس، الہ آباد، ۱۹۴۱ء ص ۳۹۴ [۵۳] ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد نواب امیر خاں، بانی ریاست ٹونک، کے انتقال پر ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں مسند نشین ہوئے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں وفات پائی۔ [۵۴] چودھری عبد الغفور سرور کے حالات کے لئے دیکھیے: "تلامذۂ غالب" اردو ادب جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۱۳، ص ۱۱۴ ، [۵۵] عود ہندی مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء ص ۱۱

[۵۶] مجروح کے حالات کے لئے دیکھیے: "تلامذۂ غالب" اردو ادب اپریل تا جون ۱۹۵۲ء ص ۹۴-۹۵۔

"میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے؛ کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ، اندور والے، دلی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اون کو میرے گھر لے آیا۔ اونھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اوس کو میں نے لکھا۔ اوس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا "۸ آنے" فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطریق ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اوس پچاس جلدیں شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا ..... بھائی، میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر ملنے کا حال، اور بادشاہ کی روانگی کا حال، کیوں کر لکھتا؟ اون کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کر مسودہ اون کے سامنے آگرے نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟"[۵۱]

"دستنبو" کی زبان:

غالب منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اوس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمھارا نام منشی ہرگوپال، "منشی" لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ شیوا زباں لکھ دیا ہے"[۵۳]

چودھری عبدالغفور سرور[۵۴] کو لکھتے ہیں:

"بطریق لزوم مالایلزم اس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم جو "دساتیر" کی زبان ہے اس میں یہ نسخہ لکھا جائے اور سوائے اسماء کے، کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی

---

۵۱ خطوطِ غالب ص ۲۳۹-۲۴۰۔ ۵۲ منشی ہرگوپال تفتہ کے حالات کے لئے دیکھیے: "تلامذۂ غالب" اردو ادب جنوری، اپریل ۱۹۵۱ء ص ۲۷۹-۲۸۰۔ ۵۳ خطوط غالب ص ۱۴۰، ۵۴ سرور کے حالات کے لیے دیکھیے "تلامذہ غالب" اردو ادب جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۱۳، ص ۱۱۴۔

اس میں نہ آوے[51]۔"

نواب انورالدولہ شفق[52] کو لکھتے ہیں:

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء عیسوی سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے[53]۔"

یوسف علی خاں عزیز[54] کو لکھتے ہیں:

"مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء عیسوی، سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے اور وہ نثر فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے[55]۔"

"دستنبو" کی تصحیح کا بہت خیال تھا۔ مرزا حاتم علی مہر[56] کو لکھتے ہیں:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے، صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے، بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب[57] کے، صحت الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں[58]۔"

غالب کو یقین تھا کہ "دستنبو" کی فارسی قطعی "بے آمیزش لفظ عربی" ہے، چنانچہ تصحیح کے سلسلے میں فرہنگ کا دیکھا جانا تک ناگوار تھا۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب اون اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اوس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق اون اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی لکھ چکا ہوں اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں[59]۔"

---

۵۱ عود ہندی: ص ۱۲۰ ۵۲ نواب انورالدولہ شفق کے حالات کے لئے دیکھیے: تلامذہ غالب اردو ادب جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۲۱ ۔ ۵۳ خطوط غالب: ص ۱۳۸ ۔ ۵۴ یوسف علی خاں عزیز کے حالات کے لئے دیکھیے: "تلامذۂ غالب" اردو ادب جنوری تا مارچ ۱۹۵۵ء ص ۱۲۶-۱۲۷ ۔ ۵۵ خطوط غالب ص ۱۷۵

۵۶ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے حالات کے لیے دیکھیے: تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ، مترجمہ مرزا محمد عسکری مطبع نولکشور لکھنؤ ص ۲۷۹ ۔ ۲۸۰ ۵۷ منشی نبی بخش حقیر کے حالات کے لیے دیکھیے: "تلامذۂ غالب" اردو ادب جنوری، اپریل ۱۹۵۱ء ص ۹۵-۹۶ ۔

۵۸ خطوط غالب ص ۲۹۹ ۵۹ خطوط غالب ص ۵۲

کتاب چھپنے کے دوران میں جب یہ متنبہ ہوئے کہ ان کی "عبارت فارسی ناآمیختہ بہ عربی" میں آیا ہوا ایک لفظ: "نہیب" عربی ہے تو اس کے بدلوانے کی انتہائی کوشش کی۔

۳ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"بہت ضروری یہ امر ہے، اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں۔

تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے:

اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند۔

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا:

بہ نوائے مباش بہم زند۔

"نہیب" لفظ عربی ہے؛ اگر رہ جائے گا، تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاکو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔"[۵۱]

۷ ستمبر کو لکھتے ہیں:

"آن کہ ہمہ را در یک دم بہ نوید بشنو پدید آورد اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ۔

اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاکو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا۔ یعنی:

بہ نوائے مباش بہم زند۔

ضرور ضرور؛ اس کا انتظار نہ کیجو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا، تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میر امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں، تو اون کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔"[۵۲]

۱۶ ستمبر کو لکھتے ہیں:

"اچھا، میرا بھائی، "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبا لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہرچند کہ مسودہ میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔"[۵۳]

غالب کے گمان کے مطابق ساری کتاب میں صرف ایک لفظ عربی آگیا تھا اور وہ اس سے اس حد تک مضطرب تھے کہ لکھتے ہیں:

---

۵۱ خطوط غالب صـ ۴۵، ۵۲ خطوط غالب صـ ۴۹، ۵۳ خطوط غالب صـ ۴۹-۵۰

"نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں۔ اوس کی درستی کی خبر بھیجو۔"[۵۱]

جب "نہیب" کی جگہ "نوائے" بن جانے کی اطلاع ملی تو خاطر جمع ہوئی۔ ۲۱ ستمبر کو لکھتے ہیں:

"نہیب" کے "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔"[۵۲]

غالب کے سوانح نگاروں کا بیان:

غالب کے بلند پایہ سوانح نگاروں اور غالب کی تصانیف پر تحقیقی نظر ڈالنے والے فاضلوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ تمام کتاب میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا:

"اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبوہ میں، جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے، التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔"[۵۳]

"دستنبو.... اس کتاب کی زبان "مہر نیمروز" سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی الفاظ ترک کرنے سے جا بجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں تاہم شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب خبط نہیں ہوتا[۵۴]......

"دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کے اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی جس کے لئے انھوں نے مشہور فارسی لغت "برہان قاطع" کا غائر مطالعہ کیا۔"[۵۵]

"دستنبو: میرزا صاحب نے "آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا..... اور التزام اس کا کیا..... کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے، اور کوئی لفظ عربی نہ آئے" اور منشی شیو نرائن کے مطبع مفید خلائق واقع اکبر آباد (آگرہ) میں بڑے اہتمام و صحت کے ساتھ طبع کرایا۔"[۵۶]

---

۵۱ خطوط غالب ص۱۸۰ ۵۲ خطوط غالب ص۱۸۲

۵۳ یادگار غالب از خواجہ الطاف حسین حالی، مطبع فیض عام علی گڈھ، بار دوم، ص۳۲۵

۵۴ آثار غالب شیخ محمد اکرام مرکنٹائل پریس لاہور ص۱۰۵-۱۰۶

۵۵ ایضاً ص۱۳۹

۵۶ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں، عرشی، ناظم برقی پریس رام پور، طبع سوم، ۱۹۴۵ء ص۸۳

"دستنبو غدر کے پر آشوب ہنگامے کے دوران میں لکھا گیا۔ اس میں التزام یہ کیا ہے کہ خالص پارسی زبان کے علاوہ عربی یا کسی اور زبان کا لفظ استعمال نہیں کیا سوائے ناموں کے کہ انھیں جوں کا توں لکھنے پر وہ مجبور تھے۔[۵۱]"

"دستنبوے خالص فارسی میں ہے اور اس میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔[۵۲]"

"دستنبو: اس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی باتیں ٹھیٹ فارسی میں ہیں، یعنی جس میں فارسی میں کتاب لکھی گئی ہے، اس میں عربی، ترکی وغیرہ کا کوئی لفظ نہیں مستعمل ہوا۔ اور ساری کتاب خالص فارسی میں لکھی گئی ہے۔[۵۳]"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں عربی الفاظ خاصی تعداد میں ہیں۔ ذیل میں تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

(باقی آیندہ)

۵۱؎ ذکر غالب از مالک رام ایم۔اے، جید پریس دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۲۱

۵۲؎ خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر پاکستان ٹائمز پریس لاہور صفحہ ۱ (مقدمہ)

۵۳؎ "تصانیف مرزا غالب کی ابتدائی اشاعتیں" از مہیش پرشاد،

ماہنامہ سب رس حیدر آباد (دکن) جون ۱۹۵۱ء صفحہ ۷

"مرزا غالب اور امیر مینائی"

(از جناب مالک رام صاحب)

اکتوبر ۱۹۵۴ء کے "نوائے ادب" میں مخدومی جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی کا مضمون "مرزا غالب اور امیر مینائی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، مجھے اس سے متعلق دو ایک باتیں عرض کرنا ہیں۔

قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے میں غالب کے طرفداروں میں ایک صاحب محمد امیر امیر لکھنوی بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی حمایت میں ایک اردو قطعہ لکھ کر اودھ اخبار میں چھپوایا تھا۔ اس کے بعد یہ وہیں سے ہنگامۂ دل آشوب (۲) میں نقل ہوا۔ قبلہ قاضی صاحب موصوف نے اپنے اس مضمون میں بھی یہ قطعہ شامل کیا ہے (بلکہ یہی ان کے مضمون لکھنے کا باعث ہوا ہے) اور ان کا خیال ہے کہ یہ منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس کے لئے انھوں نے اس کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی کہ "امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔" میرے خیال میں موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ قطعہ امیر مینائی کا نہیں۔

اول تو یہ کوئی دلیل نہیں کہ چونکہ امیر تخلص کا کوئی اور لکھنوی شاعر "مشہور نہیں ہوا" اس لئے لازماً یہ نظم امیر مینائی کی ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کوئی غیر مشہور امیر لکھنوی ہوں۔ آخر یہ کس نے کہا ہے کہ یہ قطعہ "مشہور" امیر کا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ عنوان میں امیر احمد (امیر مینائی کا اصلی نام) کی بجائے "محمد امیر" غالباً دبیر اور بے نظیر کے قافیہ کی رعایت سے درج ہوا ہے۔ تو یہ بھی بہت کمزور دلیل ہے۔ نظم کی حد تک تو لوگوں نے ضرورتِ شعری کو تسلیم کیا ہے، لیکن نثر میں یہ باتیں نہ تسلیم کی جاتی ہیں، نہ کسی نے لکھی ہیں، کہ امیر احمد کی جگہ آپ کا نام محمد امیر لکھ سکیں۔ اس سے یقیناً التباس کا قوی امکان تھا اور ہنگامۂ دل آشوب کے مرتب ضرور اس کی طرف اشارہ کر دیتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اخبار میں بھی نام محمد امیر ہی چھپا تھا۔ اگر تلاش کی جائے تو ممکن ہے کہ اودھ اخبار کا وہ اصل پرچہ کہیں سے مل جائے، جس میں یہ قطعہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس سے یہ عقدہ حل ہو جائے گا۔

میرے شبہہ کو ایک اور بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ اس قطعہ میں شاعر لکھتا ہے:

لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب   کئے ہیں اس میں قلم بند ہفت صد اشعار

امیر مینائی اس کے بعد ایک زمانے تک زندہ رہے اور ان کے کلام کے متعدد مجموعے بھی ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ اگر انھوں نے یہ جہاں آشوب لکھا ہوتا، تو نا ممکن ہے، کہ وہ اسے کسی مجموعے میں شامل نہ کرتے۔ سات سو شعر کی طویل نظم! اور وہ اس کا ایک شعر بھی کہیں شائع نہ کریں، باور نہیں کیا جا سکتا

نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے کہیں اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ بلکہ جہاں آشوب تو رہا ایک طرف، زیرِنظر قطعہ بھی امیر مینائی کے کسی دیوان میں نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

غرضکہ جب تک کوئی اور اس سے زیادہ قوی قرینہ نہ ہو، محض امیر تخلص کی بنا پر اس قطعہ کو امیر مینائی سے منسوب کرنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہوگا۔

اس مضمون میں فاضل مضمون نگار سے بعض اور جگہ بھی تسامح ہوا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف بھی اشارہ کردیا جائے۔

(۱) عنوان میں میرزا غالب کے بعد لکھا ہے "(۱۷۹۶ء — ۱۸۶۹ء)" غالب کی پیدائش ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی جو مطابق ہے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کے۔ اس لئے ۱۷۹۶ء کی جگہ ۱۷۹۷ء لکھنا چاہیئے تھا۔

(۲) نواب یوسف علی خاں ناظم نے غالب کی شاگردی ۱۸۵۵ء میں اختیار نہیں کی۔ ان کا پہلا خط جس میں انھوں نے شعر اصلاح کے لئے بھیجے ہیں، ۵۔ فروری ۱۸۵۷ء کا ہے، اس لئے صحیح ۱۸۵۷ء ہے (اگرچہ خود غالب نے بھی غلطی سے ایک خط میں جو انھوں نے تجر کے نام لکھا ہے، سالِ شاگردی ۱۸۵۵ء ہی لکھا ہے)

(۳) قاطع برہان ۱۸۶۳ء میں نہیں بلکہ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں شائع ہوئی، جیساکہ اس کی متعدد تاریخوں سے ظاہر ہے۔ (عمدہ سخن غالب وغیرہ)

(۴) لکھا ہے:-

"آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں فدا اور سخن نے ایک رسالہ ہنگامہ دل آشوب کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۷ء/۱۲۸۳ھ میں آرہ سے ..... شائع ہوا۔"

(ا) آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں نے رسالہ ہنگامہ دل آشوب نہیں لکھا۔ سب سے پہلا قطعہ

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ؛ درخصوصِ گفتگوئے پارس انشا کردہ است

غالب نے لکھا۔ اس کے جواب میں آغا احمد علی کے صرف "ایک شاگرد" عبدالصمد فدا سلہٹی نے اسی زمین میں قطعہ لکھا تھا اور غالب کے شاگردوں نے فدا ہی کا جواب دیا تھا۔

(ب) غالب کے دو شاگردوں کے تخلص فدا اور سخن لکھے گئے ہیں۔ فدا کی جگہ باقر (سید باقر علی بہاری) ہونا چاہئے تھا۔

(ج) ہنگامہ دل آشوب بھی انھوں نے نہیں لکھا تھا۔ بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف اصحاب کی منظومات کا وہ زیادہ سے زیادہ مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

(د) ہنگامۂ دل آشوب کی تاریخ اشاعت ۱۸۶۷ء (۱۲۸۳ھ) لکھی گئی ہے۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ اپریل ۱۸۶۷ء (ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ) میں چھپا۔ اس میں چار قطعے تھے۔ جو غالب، قدر، باقر اور سخن نے لکھے تھے۔ بعد کے منظوم اور نثری سوال جواب دوسرے حصے میں چھپے جو ستمبر ۱۸۶۷ء — (جمادی الاول ۱۲۸۴ھ) میں شائع ہوا۔ صراحت کی ضرورت تھی۔

اب صرف ایک بات رہ گئی ہے کہ غالب نے جو خط منشی شیو نرائن کو لکھا اور جس میں امیر مینائی کا کلام معیار الشعرا میں چھاپنے کی سفارش کی تھی، اس کی علت غائی کیا تھی۔

میرا اپنا یہ خیال ہے کہ انھوں نے یہ کسی دوستی کی بنا پر نہیں لکھا۔ اس کی تہ میں دور اندیشی بلکہ زمانہ سازی کام کر رہی ہے۔ خود غالب ۱۸۵۷ء (فردوس) سے نواب فردوس مکان کے استاد اور اس دربار کے وظیفہ خوار ہوئے۔ امیر مینائی بھی اسی سال کے نصف آخر میں رامپور پہنچے اور دربار سے وابستہ ہو گئے۔ غالب نے خیال کیا کہ اگر رامپور میں کوئی ایسا شخص ہو، جو وقتاً فوقتاً میرے حق میں کلمۂ خیر کہتا رہے اور ضرورت پڑے پر میرے مفاد کی حفاظت کرتا رہے، تو یہ پسندیدہ بات ہے۔ اسی لئے انھوں نے یہ خط منشی شیو نرائن کو لکھا۔ اس سے مقصود امیر مینائی کو ممنونِ احسان بنانا تھا، تاکہ حسب ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔

میرے اس شبہہ کی دلیل یہ ہے۔

غالب نے آرام کو لکھا ہے :-

"ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان (امیر) کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا ....
اس کو اب کے معیار الشعرا میں چھاپ کر دو ورقہ یا چار ورقہ رامپور ان کے پاس بھیج دو .....
مجھ کو اس کی اطلاع دو۔"

اگر یہ محض دوستی کے باعث تھا، تو محض اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ میں امیر کو جانتا ہوں، تم ان کا کلام چھاپ دو۔ لیکن وہ اس پر کفایت نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ بات اخبار میں بھی چھاپ دی جائے کہ امیر کا یہ کلام غالب کی سفارش پر چھاپا جا رہا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں کرتے، بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ خاص پرچہ امیر کے پاس پہنچے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ غالب کے لکھنے پر ان کا کلام گلدستہ مذکور میں چھپا ہے۔ یہی بات ہے، جسے زمین ہموار کرنا کہتے ہیں۔ ان کی نظرِ مستقبل یہ ہے کہ اس طرح امیر کو زیر بارِ احسان بنایا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

رونق بنارسی

(از جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نامی ایم اے، بی ٹی، پی ایچ ڈی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

عجائبات پرستان عرف بہارستان عشق

اس منظوم ڈرامے پر ۱۸۸۳ء درج ہے۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید حسن کی لائبریری میں بخط گجراتی موجود ہے۔

پلاٹ:۔ شاہزادہ مصر (مہ لقا) ماہرو پری کو خواب میں دیکھ کر بصد جان عاشق ہو جاتا اور فقیرانہ لباس میں اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ دوسری طرف ماہرو پری شاہزادہ مہ لقا کو خواب میں دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی اور اس خواب کا ذکر اپنی سہیلی وزیرزادی سے کرتی ہے۔

وزیرزادی کہتی ہے کہ اس نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ اس کی شاہزادی ایک بنی نوع انسان پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی ہے۔ وہ شاہ وقت سے شاہزادی کی شادی کی اجازت طلب کرتی ہے۔

راستے میں شاہزادہ مہ لقا کو ایک بزرگ ملتے اور اپنا عصا دے کر کہتے ہیں کہ تو اس کی امداد سے بڑی بڑی دشوار گذار گھاٹیاں عبور کرے گا۔ چنانچہ شاہزادہ آلام و مصائب برداشت کرتا اور طلسمی قلعہ کو نیست و نابود کرتا شاہزادی ماہرو کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ بادشاہ شاہزادہ سے مل کر خوش ہوتا اور مہ لقا کی شادی ماہرو سے کر دیتا ہے۔

عبد اللہ فتح پوری نے اس ڈرامہ کو "ہوائی مجلس ہفت نیرنگ طلسم عرف عجائبات پرستان قسم قسم" کے نام سے شائع کیا۔ حافظ محمد عبد اللہ لکھتے ہیں۔ "میں نے یہ ناٹک اپنی جماعت "انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی" کے لئے مارچ ۱۸۸۳ء میں مقام دھول پور میں تالیف کرکے اس کو بنام ہوائی مجلس ہفت نیرنگ طلسم عرف عجائبات پرستان قسم قسم موسوم کیا اور مطبع الہی آگرہ میں چھپوا دیا تھا اب ماہ فروری ۱۸۹۰ء میں بمقام شہر علی گڈھ پھر اس کو ترمیم کیا ہے"۔

میری لائبریری میں اس ڈرامہ کا ایک اور بھی نسخہ موجود ہے جس پر تحریر ہے "اس کے بعد اس کو مارچ ۱۸۸۶ء میں بمقام شہر الہ آباد احقر نے دوبارہ ترمیم کرکے بہ طرز جدید ترتیب دیا۔ اس ناٹک میں ہر چیز کی دھن معہ تال باعانت بی امیرجان ادا متوطن شہر باندہ چیف ایکٹریس مذکورۂ بالا قائم کی گئی ہے"۔

ظلم اظلم عرف جیسا بونا ویسا پانا

رونق کا یہ منظوم ڈراما دو ڈراپ پر مشتمل ہے۔ اس پر تاریخ ۱۸۸۳ء درج ہے۔ یہ ڈراما ۱۲ اور

جون کو پہلی بار دکھلایا گیا۔

پلاٹ:۔ جزیرہ توران میں دو بھائی بہن ــ شمسرو اور نورالنساء ــ اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ ایک دن جزیرہ کے ظالم رئیس اظلم کی نگاہ نورالنساء پر پڑتی، اور وہ اس سے شادی کا خواستگار ہوتا ہے۔ شمسرو اور نورالنساء دونوں اس رشتے کو نامنظور کر دیتے ہیں۔ اظلم ظلم پر اتر آتا ہے شمسرو اپنی عزّت اور نورالنساء اپنی عفت بچانے کے لئے راہ فرار اختیار کرتے اور بصرہ جانے والے جہاز میں پناہ لیتے ہیں۔ بصرہ کے قریب جہاز تباہ ہو جاتا ہے۔ امیر بصرہ نورالنساء کی جان بچاتا اور اس کو اپنے یہاں لیجاتا ہے۔ امیر اس سے بہت عزّت کے ساتھ پیش آتا ہے لیکن اس کا گاڑی بان نورالنساء کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتا ہے۔ نورالنساء پہلے اس کو زبان سے منع کرتی ہے لیکن اس کے پیہم اصرار پر جوتیوں سے اس کی مرمّت کرتی اور اس کا سارا عشق ہوا ہو جاتا ہے۔

امیر توران یہ سن کر کہ نورالنساء امیر بصرہ کی مہمان ہے بصرہ کے لئے روانہ ہوتا ہے راستہ میں اس کا جہاز بھی غرق ہو جاتا ہے لیکن وہ کسی صورت سے بچ کر بصرہ پہنچتا اور امیر کا مہمان ہوتا ہے۔ وہ نورالنساء سے ملتا اور پھر اس کو شادی کا پیغام دیتا ہے لیکن وہ پھر نامنظور کر دیتی ہے امیر بصرہ یہ سن کر بہت برافروختہ ہوتا اور دونوں (اظلم اور نورالنساء) کو سر بازار نیلام کرنے کا حکم دیتا ہے۔

شمسرو بچتا بچاتا ہوا آتا اور دونوں کو خرید لیتا ہے۔ وہ اظلم کو چھوڑ دیتا اور اپنی بہن کو گنہگار سمجھ کر قتل کرنا چاہتا ہے کہ ملک شام کا ولی عہد (منوّر) اس کو بچانا چاہتا ہے کہ شمسرو تلوار نکال لیتا ہے۔ دونوں میں لڑائی ہونے لگتی ہے اور وہ لڑتے ہوئے دور نکل جاتے ہیں۔ اظلم آتا اور پھر نورالنساء سے اظہار محبّت کرتا ہے۔ اسی وقت امیر بصرہ کی سواری آتی اور وہ دونوں کو گرفتار کر کے لے جاتا ہے۔

میری لائبریری میں جو کاپی ہے وہ نامکمل ہے۔ اس میں صرف ایک جگہ " رونق " تخلص آیا ہے اندرونی سرورق پر تحریر ہے " یہ ناٹک ۱۸۴۵ء کے قانون بیس اور ۱۸۶۷ء کے قانون ستائیس کے مطابق رجسٹر ہو چکا ہے اور اس کے تمام حقوق بحق وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مالکان مسرز دادابھائی رتن جی ٹھوٹھی۔ خورشید جی مہروان جی بالیوالا۔ دھنجی بھائی خورشید جی گھڑیالی اور دوسابھائی فریدون جی مغل محفوظ ہیں "

حافظ محمد عبداللہ فتح پوری۔ غلام حسین ظریف اور سید بزرگ شاہ بزرگ لاہوری نے اس ڈرامہ کو اپنے الفاظ میں ازسرنو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔ عبداللہ فتح پوری نے اس کا نام " ظلم اظلم عرف انجام ستم " رکھا اور نومبر ۱۸۸۷ء میں شائع کیا۔ ظریف نے " ظلم اظلم عرف تماشائے ستم پُرالم " نتیجہ ستم نام رکھا۔ اس پر ۱۸۸۸ء درج ہے۔ بزرگ لاہوری نے اسے " کھیل طلسمات سلیمانی " کے

نام سے شائع کیا۔ اس پر ۱۲؍جون ۱۸۸۸ء تحریر ہے۔

خوابگاہ عشق عرف بیداد وحشت

یہ منظوم ڈراما چار ڈراپ پر مشتمل ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۳ء درج ہے اس میں رونق نے عاشق کا تخلص اختیار کیا ہے۔ سرورق پر تحریر ہے۔ "تصنیف کیا منشی محمود میاں متخلص بہ عاشق نے"

پلاٹ: شاہزادہ خورشید شعلہ پری کو اور شعلہ پری شاہزادہ خورشید کو خواب میں دیکھتے اور ایک دوسرے کی تلاش میں روانہ ہوجاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بھٹکنے کے بعد عاشق و معشوق ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شعلہ پری شاہزادہ کو اپنے وطن 'کوہ قاف' میں لے جاتی اور ایک طلسمی باغ میں رکھ کر اس کی نگرانی پر ایک دیو مقرر کر دیتی ہے۔

دوسری طرف زمرد پری بھی شاہزادہ کو خواب میں دیکھ کر دل و جان سے عاشق ہوجاتی اور جوگن کے بھیس میں اس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ایک پیر مرد اس کی حالت پر رحم کھا کر اس کو ایک طلسمی لکڑی عطا فرماتے ہیں جس کی غیبی طاقت سے وہ شعلہ پری کے باغ میں داخل ہو کر شاہزادہ کو اٹھا لے جاتی اور ایک دیو کو طلسمی لکڑی دے کر اس کے پہرے پر مقرر کرتی ہے۔ شعلہ پری بحالت پریشانی زمرد پری کے محل میں داخل ہوتی اور دیو کو غفلت میں پاکر اور طلسمی لکڑی اڑا کر شاہزادہ کو اپنے یہاں اٹھا لے جاتی ہے زمرد پری اپنی قسمت کی نارسائی پر افسوس کرتی اور شعلہ پری کے محل میں عاشق و معشوق کو یکجا دیکھ کر وہیں خودکشی کرلیتی ہے۔ شعلہ پری کے والد گلزار شاہ اس کی شادی شاہزادہ خورشید سے کر دیتے ہیں۔

خواب محبت عرف نادان کی دوستی اور جی کا جنجال

میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۳ء درج ہے۔ اس کی ایک اور نقل بھی ہے جس پر ۱۸۸۶ء تحریر ہے۔ سرورق پر لکھا ہوا ہے "تصنیف کیا ہوا مرحوم منشی محمود میاں متخلص بہ رونق نے"

پلاٹ: والئ عراق (شاہ زمان) اپنی بیٹی (جان عالم) کی شادی اپنے بانکڑے بیٹے (پرشعور) سے کرنا چاہتا ہے۔ شاہزادہ مہرزبان (ولی عہد) اس بناء پر اس کی مخالفت کرتا ہے کہ جان عالم اور پرشعور نے ایک ہی دایہ کا دودھ پیا ہے۔ ملکہ نورجہاں (پرشعور کی ماں) اس انکار پر بہت ناراض ہوتی اور مہرزبان کو قتل کرانے کا انتظام کرتی ہے لیکن قاتل شاہزادہ پر رحم کھا کر اور اس سے زر و جواہر لے کر اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ شاہزادہ ملک شام چلا جاتا ہے۔

شام کی حکمراں ملکہ (راحت روح) شاہزادہ مہرزمان کو خواب میں دیکھتی اور اس کی تلاش میں روانہ ہوتی ہے۔ وہ عراق پہنچتی اور شاہ زمان سے اپنا دلی مدعا کہتی ہے۔ شاہ زمان "شاہزادہ"

سے مراد پُرشعور ہے کہ اس کو (راحت روح کو) پرشعور کے پاس بھیج دیتا ہے۔ راحت روح پرشعور سے ملتی اور اس کو بہت بُرا بھلا کہتی ہے۔ پُرشعور یہ سمجھ کر کہ اس میں اس کے باپ کی شرارت شامل ہے وہ اس کو (اپنے باپ کو) قتل کر دیتا ہے۔ وزیر حکومت (نیک بخت) اسی وقت راحت روح۔ نورجہاں اور پُرشعور کو نظر بند کر کے کوتوال شہر عزیز کو شام روانہ کرتا ہے۔

شاہزادہ مہرزمان اپنے باپ کے انتقال پُر ملال کی خبر سن کر بہت افسوس کرتا۔ وطن واپس ہوتا اور تخت عراق پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی شادی راحت روح سے ہو جاتی ہے۔ شاہ مہرزمان اپنی سوتیلی ماں (نورجہاں) اور سوتیلے بھائی (پُرشعور) کو قتل کرا دیتا ہے اور اپنی بہن جان عالم کی شادی راحت روح کے بھائی جان جہان سے کر دیتا ہے جس کا راز مرنے سے قبل نورجہاں افشا کرتی ہے۔

اس ڈرامہ میں سات جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔

محمد عبدالوحید قیس رامپوری نے اس ڈرامہ کو "نیرنگ الفت عرف خواب محبت" کے نام سے تالیف کیا اور مارچ ۱۸۹۰ء میں شائع کیا۔ قصہ بعینہ یہی رونق سے ماخوذ ہے یہانتک کہ متعدد جگہ رونق تخلص بھی آیا ہے۔

پروفیسر سید حسن کی لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

غرور رعد شاہ عرف چندراحور (خورشید نور)

پروفیسر سید حسن کی لائبریری میں اس منظوم ڈرامہ کا ایک نسخہ ہے۔ اس پر ۳۰ ستمبر ۱۸۸۵ء تحریر ہے۔ برٹش انڈیا میوزیم لائبریری (سپلیمنٹری لسٹ) میں ایک اور نسخہ ہے۔ اس پر ۱۸۹۱ء درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈراما دو ڈراپ اور تیئس صفحات پر مشتمل ہے۔

عبداللہ فتح پوری نے ایک ڈراما اسی نام سے لکھا ہے۔

سنگین بکاؤلی

یہ منظوم ڈراما دو ڈراپ پر مشتمل ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۶ء درج ہے۔

پلاٹ: راجہ اندر کی رقاصہ (بکاولی) شرقستان کے شاہزادہ تاج الملوک پر عاشق ہو کر اس کو پرستان لے جاتی ہے۔ واپسی پر وہ پکڑا جاتا ہے اور ایک دیو اس کو گرفتار کر کے راجہ اندر کے حضور پیش کرتا ہے۔ راجہ بکاؤلی کو طلب کرتا اور غصہ میں اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ وہ اس کو پھر زندہ کرتا اور اس کا نصف زیریں حصہ پتھر کا بنا کر اس کو بارہ سال قید سخت میں رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن بکاؤلی چار سال کے اندر ہی راجہ کو گا بجا کر خوش کر لیتی ہے۔ راجہ اس کی شادی تاج الملوک سے کر دیتا ہے۔

اس ڈرامہ میں دو جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔

اندرونی سرورق پر تحریر ہے۔ "تمام حقوق اس کے خورشید جی مہروان جی بالیوالا مالک وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے لئے محفوظ ہیں۔"

بکاؤلی کا موضوع بہت ہی فرسودہ ہے اور متعدد ڈراما نویسوں نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ غلام حسین ظریف نے "بکاؤلی عرف غنچۂ عشق" کے نام سے ۱۸۸۷ء میں ایک ڈراما لکھا۔ عبداللہ فتح پوری اور نظیر اکبرآبادی (۱۸۹۴ء) نے چترا بکاؤلی کے نام سے ڈرامے لکھے۔ منظر بریلوی نے اس کو "چندراولی" کا نام دیا۔ عبداللہ فتح پوری نے اس کو "چندر بکاؤلی" سے موسوم کیا۔ مولوی بخش الٰہی نامی (۱۸۹۲ء) اور وحشت دہلوی نے "گل بکاؤلی" کا نام دیا۔ عبداللہ فتح پوری نے "گل بکاؤلی عرف ثمرہ نیک و بد سلوک" کے نام سے اس کو لکھا۔

رونق کے اس ڈرامہ پر طالب بنارسی نے بھی حسب منشا کتر بیونت کی۔ طالب بنارسی کے نام سے جو ڈراما شائع ہوا ہے اس میں دو جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔ دو جگہ طالب نام بھی آیا ہے یہ ڈراما ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔

نقش سلیمانی عرف شدادی بہشت

اس کا ایک معلوم نسخہ پروفیسر سید حسن کی لائبریری میں بخط گجراتی موجود ہے اور اس پر ۱۸۸۸ء درج ہے۔

فریب فتنہ عرف چاہت زر

میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ۱۸۸۵ء میں پہلی بار شائع ہوا ہو۔ ۱۸۹۹ء میں یہ منظوم ڈراما تیسری بار بمبئی سے شائع ہوا۔

پلاٹ: مصر کے ایک ناقص العقل امیر (مختار) کا لڑکا (خود پسند) اپنے دوست (جعلی) سے جوا کھیلتا اور بار بار ہار جاتا ہے۔ خود پسند جھلا کر اپنی معشوقہ اور منگیتر سے لڑتا اور اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے مختار فتنہ سے شادی کرتا اور خود پسند کو کل ترکہ سے محروم کر دیتا ہے۔ خود پسند اپنے ایک عزیز دوست (نیک بین) اور اس کی بہن سے امداد کا طالب ہوتا ہے۔ دونوں بدل و جان اس کی مدد کرتے ہیں۔ فتنہ روز بروز برائیوں میں گرتی جاتی ہے اور آخر میں اپنے کئے کی سزا پاتی ہے۔ خود پسند کی شادی نیک بین کی بہن سے ہو جاتی ہے۔

پروفیسر سید حسن کے گجراتی نسخہ پر ۱۸۸۶ء درج ہے۔

عبداللہ فتح پوری نے اسی ڈرامہ کو "فریب فتنہ عرف نتیجہ بدی یعنی تحفہ سیزدہم صدی" کے نام سے از سرِ نو لکھا ہے۔

رونق کے مندرجہ ذیل چار مذاحیہ ڈراموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ چاروں ڈرامے برٹش میوزیم لائبریری

میں موجود ہیں اور رجوم ہارت ے جو سپلیمنٹری لسٹ شائع کی ہے اس میں درج ہیں۔ گھڑی کی گھڑیال کا ایک گجراتی نسخہ پروفیسر سید حسن کی لائبریری میں بھی موجود ہے اور اس کا نام "جفائے ستمگر عرف گھڑی کی گھڑیال" ہے یہ ۱۸۸۶ء بمبئی کا مطبوعہ ہے۔

کالکا بھوگ عرف گھڑی کی گھڑیال

یہ مذاحیہ ڈرامہ چار ایکٹ اور انتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۸۹۰ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

نورالدین اور حسن افروز

یہ ایک ایکٹ کا مذاحیہ ڈراما سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۰ء میں دہلی سے شائع ہوا اس ڈرامہ کو عبداللہ فتح پوری اور بزرگ لاہوری نے ازسرنو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔

چمبیلی گلاب

یہ مذاحیہ ڈرامہ چھبیس ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ بخط گجراتی ۱۸۹۶ء بمبئی کا مطبوعہ ہے۔ عبداللہ فتح پوری نے اسے اپنے الفاظ میں لکھ کر شائع کیا ہے۔

میاں پسو اور بیوی کھٹمل

یہ اٹھائیس صفحات پر مشتمل بخط گجراتی مذاحیہ ڈرامہ ہے۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔

۲- ڈرامے کا عہد منظوم

عام خیال یہ ہے کہ اُردو کا قدیم ترین اور منظوم ڈراما اندرسبھا ہے جو ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا ازروے تقویم ۱۲۷۰ھ (یکم محرم تا ۲۹ ذی الحجہ) مطابق ہوتا ہے ۵ اکتوبر ۱۸۵۳ء (یوم چہارشنبہ) تا ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء (یوم شنبہ) کے چونکہ ۱۲۷۰ھ (زمانہ تحریر اندرسبھا) مطابق ہے ۱۸۵۳ء کے اس لئے اندرسبھا ۵ اکتوبر سے ۳۱ دسمبر ۱۸۵۳ء کے درمیان لکھی گئی کیونکہ ۱۲۷۰ھ کا یہی حصہ سال ۱۸۵۳ء میں آتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بمبئی کے ایک اعلیٰ درجہ کے مغربی تھیٹر میں اردو ڈرامے معیاری اصول پر دکھلائے جاتے تھے۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اندرسبھا اُردو کا سب سے پہلا ڈراما نہیں ہے یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ وہ اُردو کا پہلا منظوم ڈراما بھی نہیں ہے۔ بمبئی تھیٹر کی تاریخ [a] کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو کا پہلا منظوم ڈراما "رستم و سہراب" ہے جسے فرام جی مہتا۔ نسروان جی فاربس اور آجکتیار نے زوراسٹرین ڈرامیٹک کلب کی طرف سے پیش کیا لیکن پارسی قوم میں گانے والوں کی کمی کے باعث زیادہ کامیاب نہ ہوسکا۔

---

a Theatre in western India 1855 by Dr. Nami

۱۸۷۳ء میں کنور جی ناظر مالک الفنسٹن ڈرامیٹک کلب نے اپنے دو دوستوں یعنی نسروان جی نوروزجی پارکھ اور سیادکش رستم جی ماسٹر کو ایک منظوم ڈرامہ میں کام کرنے کے لئے تیار کیا اور اندرسبھا کا پلاٹ اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے منتخب کیا۔ کنور جی ناظر چونکہ ایک شوقین مزاج نوجوان تھے۔ رستم و سہراب اور بے نظیر بدر منیر کی کمزوریوں سے واقف ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے اندرسبھا کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے۔

اول: مشینوں کے ذریعہ سین سینریاں دکھلانے کا انتظام کیا۔ کنور جی ناظر اس سے قبل کرن گھیلا اور الہ دین چراغ پیش کر چکے تھے اور کلون کے ذریعہ طلسماتی مناظر دکھلا چکے تھے۔

دوم: جب کوئی پری راجہ اندر کے دربار میں داخل ہوتی تو سارا دربار اس کی پوشاک کے رنگ میں رنگ جاتا۔ یہ منظر وہ لائم لائٹ سے دکھلاتے تھے۔

سوم: پورا ڈراما ایک ہی راگ راگنی میں اسٹیج کیا۔[۵]

اس میں راجہ اندر کا پارٹ خورشید جی بہرام جی ہاتھی رام۔ سبز پری کا شیاوکس رستم جی ماسٹر اور گلفام کا نسروان جی پارکھ نے ادا کیا۔ یہ تماشا کامیاب ضرور رہا لیکن کنور جی ناظر اُس سے مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے ایک سال کی جد و جہد کے بعد "بچوں کی اندر سبھا" پیش کی۔ یہ اندرسبھا بے حد کامیاب ہوئی اور کنور جی ناظر نے اُس سے خوب روپیہ کمایا۔

۱۸۷۴ء میں دادا بھائی پٹیل نے اس جدت میں کچھ اور اضافہ کیا یعنی بے نظیر بدر منیر کا پورا ڈراما لکھوا کر مختلف راگ راگنیوں میں پیش کیا۔ جمشید جی کھمباتہ اس کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"دکشوریہ منڈلی میں ایک ایکٹر نسروان جی خان صاحب تھا۔ اس کو اُردو زبان پر عبور حاصل تھا اور گانے بھی لکھ سکتا تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مسٹر پٹیل کو ایک منظوم ڈرامے کی ضرورت ہے تو اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس میں بے نظیر کا پارٹ خورشید بالیوالا اور بدر منیر کا پارٹ بپیو آرا ن نے کیا۔"

اس تماشہ کی بے حد کامیابی سے متاثر ہو کر کنور جی ناظر نے اندرسبھا کو بھی مختلف راگ راگنیوں کے ساتھ پیش کیا۔ یہ تماشہ بھی بہت کامیاب رہا۔ عوام نے منظوم ڈراموں کی اس قدر سرپرستی کی کہ یہ سلسلہ کم و بیش ۱۸۹۰ء تک جاری رہا اور مندرجۂ ذیل ڈراموں نے خاص شہرت پائی۔ آرائش محفل۔ بہار پرستان۔ بادشاہ خداداد دست۔ بلبل بیمار۔ بزم سلیمان۔ بہار سخن۔ تبدیل قسمت۔ تیمور شاہ۔ زہرا پری۔ حلبۂ گلنار۔ حسن آرا۔ خداداد۔ خسرو حسینہ۔ خون ناحق۔ خدابخش۔ دلفروش۔

---

[۵] میرے ناٹکی تجربات (بزبان گجراتی) از جمشید جی پیستن جی کھمباتہ۔ ۱۹۱۴ء

داغ حسرت۔ داد دریا، رنج و راحت۔ رات چرتر۔ راج ہٹ تریا ہٹ۔ راجہ چندن۔ راحت عشق۔ روپ بسنت۔ سوبھاگ سندری۔ ستم شیطان۔ سدیونت ساولنگا۔ شہید وفا۔ شکستہ دل شان اسلام۔ شیریں فرہاد۔ صابر و شیریں۔ طلسم عشق۔ ظلم وہمی۔ عشرت سبھا۔ عبرت افزا۔ عالم شاہ۔ علی بابا۔ عشق نوبہار۔ فریب شیطان۔ قمرالزمان۔ گل وصنوبر۔ گل بکاؤلی۔ گلدستہ عشق۔ مادر اندر۔ ملک محی گیتی افروز۔ نیک انجام۔ نتیجہ عصمت۔ نوشتہ تقدیر۔ ہامان۔ ہریش چندر وغیرہ۔

منظوم ڈراموں کے اس عہد میں رونق پیدا ہوئے۔ ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی منظوم ڈرامے لکھتے چنانچہ ان کے ابتدائی ڈرامے سو فی صدی منظوم ہیں لیکن زمانہ کے ردّوبدل کے ساتھ اُن میں نثر شامل ہوتی گئی۔ پلاٹ میں بھی اُسی اعتبار سے تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

رونق کے ابتدائی ڈراموں میں سوائے دو چار مذہبی ڈراموں کے باقی سب عشقیہ اور ملکوتی منظوم ڈرامے ہیں جن میں پریوں کا آنا۔ عاشق ہونا۔ دیوؤں کے ذریعے اپنے معشوق کو بلانا۔ ایک کے معشوق پر دوسرے کا عاشق ہوجانا۔ عاشق و معشوق کا ملنا اور انجام بخیر ہونا یا خواب میں ایک دوسرے کو دیکھنا۔ عاشق ہونا۔ تلاش یار میں نکلنا۔ دربدر کی خاک چھاننا۔ کسی بزرگ یا فقیر کا ملنا۔ اکسیر اعظم۔ طلسماتی لکڑی یا سلیمانی تختی دینا۔ دیوؤں اور جادوگروں سے مقابلہ۔ فتح پانا اور نصرت و کامیابی کا جھنڈا اڑاتے ہوئے گھر واپس آنا۔

غرضکہ رونق جب اس طلسم زار میں داخل ہوئے تو ان کو مختلف پریوں اور دیوؤں اور راجاؤں سے سابقہ پڑا۔ رونق کے ہم عصروں نے جو ڈرامے لکھے وہ بھی اسی قسم کے تھے ان کے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس دعوے کی تردید ہوجائے کہ رونق نے اس میدان میں قدم رکھتے ہی راجہ اندر کے جھنڈے گاڑ دئے اور "امانت کے بعد انہی کا نام ہمارے سامنے آتا ہے"۔

اندرسبھا میں دکھلایا گیا ہے کہ سبز پری گلفام پر عاشق ہوجاتی ہے۔ عاشقی کا یہ سلسلہ (ایک پری کا ایک حسین نوجوان پر عاشق ہوجانا) کچھ عرصہ جاری رہتا ہے اور مندرجۂ ذیل ڈراموں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

نام ڈرامہ	مصنف	پلاٹ
خورشید سبھا	سید اسمٰعیل	لال پری راجہ اندر کے دربار میں جاتے ہوئے شاہزادہ ماہ منور پر عاشق ہوجاتی ہے۔
سنگین بکاؤلی	رونق بنارسی	راجہ اندر کے دربار میں جاتے ہوئے بکاؤلی شاہزادہ تاج الملوک پر فریفتہ ہوجاتی اور اس کو اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔

نام ڈرامہ	مصنف	پلاٹ
عشرت سبھا	امیر الدین	زمرد پری شاہزادہ فیروز بخت پر عاشق ہو جاتی ہے اور کالے دیو کو بھیج کر شاہزادہ کو بلوالیتی ہے۔
غزالہ ماہرو	حباب فتحپوری	لال پری شاہزادہ ماہرو پر عاشق ہو جاتی ہے اور لال دیو کو بھیج کر شاہزادہ کو کھینچ بلاتی ہے۔
بے نظیر بدر منیر	رونق بنارسی	مہ رخ پری شاہزادہ بے نظیر پر عاشق ہو جاتی اور اس کو اپنے چھپر کھٹ پر اڑا لے جاتی ہے۔
آئینہ سکندری	سید میر عباس علی	مرجان پری شاہزادہ شمس پر عاشق ہوجاتی اور اس کو اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔
صنوبر و شمشاد	محمد عبدالوحید قیس	صنوبر پری شاہزادہ شمشاد پر عاشق ہوجاتی ہے۔
افسون عشق	میر حسین جان بلبل	گل رخ پری شاہزادہ گل بدن پر عاشق ہوجاتی ہے۔
تماشائے خوش گلو	حباب فتحپوری	مشکبو پری شاہزادہ خوش اطوار پر عاشق ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ پلاٹ میں تبدیلیاں ہونا شروع ہوئی ہیں۔ شاہزادہ گل رو نسیم (چراغ الدین چراغ) میں نسیم پری شاہزادہ گلرو کو خواب میں دیکھ کر الگن پری اور لالہ پری کو اس کی تلاش میں بھیجتی ہے۔ تماشائے نادر (ظریف) میں چند پریاں شاہزادہ لال کو محو خواب دیکھ کر اُس کے حسن کی تعریف کرتی اور اس کو اُٹھا لے جاتی ہیں۔ قمر الزماں و بدورا (بزرگ لاہوری) میں پریاں بدورا کو شاہزادہ قمر الزماں کے قید خانہ میں پہنچا دیتی ہیں۔ تماشائے نادر (ظریف) میں پریاں شاہزادہ لال کو بدورا کے قید خانے میں لے جاتی ہیں۔ تنبیہ الغرور (حباب فتح پوری) میں پری کی بجائے ایک دیو کو شاہزادی پر عاشق ہوتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ جو شہزادۂ ماہ پرور کو اٹھا لے جاتا اور اپنے سردار عقرب کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔

اندر سبھا میں لال دیو گلفام کی چغلی کھاتا ہے لیکن بکاؤلی (رونق بنارسی) میں لال دیو شاہزادہ تاج الملوک کو ایک سائیس کے لباس میں دیکھ کر راجہ اندر کو مطلع کرتا ہے۔ بے نظیر بدر منیر (رونق بنارسی) میں فریب دیو بے نظیر کی شکایت مہ رُخ پری سے کرتا ہے۔

راجہ اندر (اندر سبھا میں) شاہزادہ گلفام اور سبز پری کو سزا دیتا ہے۔ سنگین بکاؤلی (رونق بنارسی) میں راجہ اندر بکاؤلی کو جلا کر بھسم کر دیتا۔ پھر جلاتا اور بارہ برس اس کو قید میں رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ شاہزادہ گلرو نسیم (چراغ الدین چراغ) میں نسیم پری کا باپ شاہزادہ گلرو کو دشت طلسم میں بھیجتا اور نسیم کو طلسمی

احاطہ میں بند کر دیتا ہے۔

اندر سبھا (امانت) میں سبز پری کو یاد گلفام میں کوبکو پھرتے اور آہ و زاری کرتے دکھلایا گیا ہے لیکن بعد کے مصنّفین نے صنف نازک پر یہ ظلم روا نہیں رکھا ہے بلکہ مردوں کو تلاش یار میں جنگل جنگل پھرایا ہے خورشید سبھا (سید اسمٰعیل) میں شاہزادہ ماہ منور جوگیوں کے لباس میں ملکہ کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ خوابگاہ عشق (رونق بنارسی) میں شاہزادہ خورشید شعلہ پری کی یاد میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ ہوائی مجلس (عبداللہ فتح پوری) میں شاہزادہ ماہ لقا، ماہ رو پری کی یاد میں دشت و بیابان ایک کرتا ہے۔ صنوبر و شمشاد (قیس) میں شاہزادہ شمشاد بخت صنوبر کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا، مصائب برداشت کرتا اور قاصد کے لباس میں اپنے معشوق تک پہنچتا ہے۔

سبز پری جوگن کے لباس میں دشت نوردی کے بعد جب راجہ اندر کے دربار میں داخل ہوتی ہے تو وہ اپنے معشوق کی یاد میں دل سوز نغمے گاتی ہے۔ کالا دیو جس نے سبز پری کو دربار تک پہنچایا تھا اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ خورشید سبھا (سید اسمٰعیل) میں سفید دیو راجہ خورشید سے ملکہ نور آرا کی تعریف کرتا اور اس کو ملکہ حُسن کا نادیدہ عاشق بناتا اور نور آرا کو دربار خورشید میں پیش کرتا ہے۔

اندر سبھا میں پریاں انسان پر عاشق ہوتی ہیں رونق اور بعد کے ڈرامہ نگاروں نے انسان کو انسان اور پریوں پر خواب میں عاشق ہوتے ہوئے دکھلایا ہے۔ طلسم زہرہ (رونق بنارسی) میں شاہزادہ طلعت زہرہ پری پر عاشق ہو جاتا ہے۔ خوابگاہ عشق (رونق بنارسی) میں شاہزادہ خورشید والئ قاف (گلزار شاہ) کی بیٹی (شعلہ پری) پر فریفتہ ہو جاتا ہے، ہوائی مجلس (عبداللہ فتح پوری) میں شاہزادہ مہ لقا ماہرو پری پر دل و جان سے عاشق ہو جاتا ہے۔ ماہرو بھی خواب میں شاہزادہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔

قمر الزماں و بدورا (بزرگ لاہوری) میں انسان انسان سے عشق کرتا ہے شاہزادہ قمر الزماں شاہزادی بدورا کو اپنے پاس قید خانہ میں دیکھ کر ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ جب پریاں شاہزادی کو خوابگاہ قمر الزماں میں پہنچا کر اس کو بیدار کرتی ہیں تو وہ بھی اس کو دیکھ کر اپنا دل کھو بیٹھتی ہے۔

اسی دَور کے بعض ڈراما نویسوں نے ایک پری کے معشوق پر دوسری کو بھی عاشق ہوتے ہوئے دکھلایا ہے مثلاً خورشید سبھا (سید اسمٰعیل) میں لال پری کے معشوق شاہزادہ مہ منور پر زمرد پری بھی عاشق ہو جاتی ہے۔ خوابگاہ عشق (رونق بنارسی) میں زمرد پری کے معشوق شاہزادہ خورشید پر شعلہ پری فریفتہ ہو جاتی ہے۔ تماشائے نادر (ظریف) میں گوہر پری کے معشوق شاہزادہ لال پر ہیرا پری مفتون ہو جاتی ہے۔

رونق کے دَور کے ڈراموں میں ستر فی صدی ڈرامے (سو فی صدی) منظوم۔ پچیس فیصدی ڈرامے (نوے فی صدی منظوم) اور پانچ فی صدی ڈرامے ایسے ہیں جو منثری ڈرامے کہے جا سکتے ہیں۔ اس عہد

کے پچانوے فی صدی ڈرامے ملکوتی ہیں۔

۳۔ رونق اور ملکوتی ڈرامے

منظوم ڈراموں کا بڑا حصّہ ملکوتی ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی ڈرامے اندر سبھا کے طرز پر ہیں۔ پھر جن دیو اور پریوں کی بجائے جیتے جاگتے انسان اپنے اصلی رنگ روپ اور اپنے زمانہ کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ منظوم ڈراموں کا یہ دَور اردو ڈرامہ کی تاریخ میں "سنہرا باب" کہلاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بغیر جن و ملک اور پریوں کے جو شاہزادوں پر عشق ظاہر کریں ڈرامانا مکمل سمجھا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان ڈراموں میں دوسرے لوازمات بھی شامل ہوتے گئے مثلاً اولاد نہ ہونے کے باعث مایوس و پریشان ہوتا۔ جوگیوں۔ فقیروں اور بزرگوں کی دعا سے اولاد ہونا وغیرہ وغیرہ۔

آدھا نکاح (امیر حمزہ) میں بادشاہ اولاد سے محروم ہوتا ہے اور اپنے وزیر باتدبیر کو کسی پیر کامل کی تلاش میں بھیجتا ہے۔ راستہ میں اس کو ایک بزرگ ملتے اور ایک لکڑی دے کر حکم دیتے ہیں کہ وہ سامنے والے درخت پر مارے۔ اُس سے جو پھل گریں اُن میں سے ایک خود کھائے اور دوسرا بادشاہ کو کھلائے۔ قمرالزماں و بدورا (بزرگ لاہوری) میں شاہ زمان عابدوں اور زاہدوں کی خدمت کرتا ہے اور ان کی دعاؤں سے قمرالزماں پیدا ہوتا ہے۔ افسونِ عشق (میر حسین جان تبلؔ) میں شاہ فغفور اولاد نہ ہونے سے سخت مضطرب ہے۔ وہ بھی بزرگانِ دین سے دعاؤں کا طالب ہوتا ہے اور اس کے گھر میں گلبدن پیدا ہوتا ہے۔ گلشن جانفزا (عطا شمس آبادی) میں شاہ سلیمان ہر طرف سے ناامید ہوکر درویشوں سے دعا کا خواستگار ہوتا ہے۔ ان کی دعاؤں سے راحت جان پیدا ہوتا ہے۔ ثمرہ الفت (قدرت فرخ آبادی) میں شاہ دہلی اولاد نہ ہونے کے باعث جنگل جنگل کی خاک چھانتا ہے۔ آخر ایک درخت پھٹتا اور اس میں سے ایک فقیر نمودار ہوکر اس کو اولاد کی بشارت دیتا ہے۔

اسی طرح سالکین اور فقرا اپنے مریدوں اور معتقدوں کو ایسی چیزیں بخشتے ہیں جن سے ان کے مقاصد دلی حاصل ہوتے ہیں۔ رؔونق بنارسی کے ڈرامے طلسم زہرہ میں شاہزادہ ماہ طلعت جب زہرہ پری کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایک بزرگ اس کو طلسمی آئینہ دیتے ہیں۔ عشرت سبھا (امیرالدّین) میں جب زمرد پری شاہزادہ فیروز بخت پر عاشق ہوکر کالے دیو سے اس کو اٹھوا منگواتی ہے تو ایک فقیر وزیر زادہ کو ایک تحفہ دیتا ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں پر غالب آتا ہے۔

طلسمات سلیمانی (بزرگ لاہوری) میں ایک بزرگ دلآرام کو ایک "سلیمانی شیشی" عطا کرتے ہیں جس سے جُملہ امراضِ انسانی کافور ہو جاتے ہیں۔ دلآرام اس فقیری چٹکی سے جو ہر شاہ کی بیٹی کا علاج کرتی اور

پھر شاہی اختیارات سے کام لے کر اپنے دشمنوں پر فتح پاتی ہے۔ خواب گاہ عشق (رونق بنارسی) میں نذر مرد پری جب شاہزادہ خورشید کی تلاش میں روانہ ہوتی ہے تو ایک پیر مرد اس کو ایک طلسمی لکڑی دیتے ہیں جس سے وہ شعلہ پری کا محل جلا کر خاک کر دیتی اور شاہزادہ کو چھڑا کر لاتی ہے۔ آئینہ سکندری (سید میر عباس علی) میں وزیرزادہ جان نثار اپنے دوست شاہزادہ شمس کی تلاش میں نکلتا ہے (جسے مرجان پری اٹھا لے گئی تھی) راستہ میں اس کو ایک بزرگ ملتے اور آئینہ سکندری دیتے ہیں جس سے وہ طلسم پر فتح پاتا اور شاہزادہ کو قید سے چھڑاتا ہے۔

بعض ڈراما نویسوں نے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا کام ـــــ دیووں۔ پریوں اور جنوں سے بھی لیا ہے۔ مثلاً قمر الزماں و بدورا (بزرگ لاہوری) میں جب بادشاہ شاہزادہ قمر الزماں کو قید کر دیتا ہے تو ایک جن اس کے حسن و جمال سے خوش ہو کر اس کی امداد کرتا ہے۔ غزالہ ماہرو (حباب فتحپوری) میں غزالہ جب اس کو شاہزادہ ماہرو سے ملنے جلنے کے باعث قید کر دیتی ہے تو سبز قبا جن اس کو اپنے گھر اٹھا لے جاتا اور ماہرو کو وہیں طلب کر کے عاشق و معشوق کو بغل گیر کراتا ہے بے نظیر بدر منیر (رونق بنارسی) میں جب مہ رخ پری شاہزادہ بے نظیر کو گرفتار کر لیتی ہے تو شاہزادی بدر منیر کی سہیلی (وزیرزادی) نجم النساء شاہ اشیاء فیروز شاہ سے امداد کی طالب ہوتی ہے جو حسب الطلب اس کو امداد دیتا ہے۔ لعل و گوہر (آرام) میں پکھراج پری شاہزادہ جہانگیر کو ایک بہت بڑے خزانہ کا پتہ بتلاتی اور شاہ اشیاء سے درخواست کرتی ہے کہ وہ شاہزادہ کی شادی گوہر سے کر دے چنانچہ شاہ یہ درخواست منظور کرتا اور عاشق و معشوق کو گلے ملاتا ہے۔ چھل بٹاؤ موہنا رانی (آرام) میں جب موہنا کا شوہر چھل بٹاؤ کو قتل کر دیتا ہے تو وہ اپنے عاشق کی موت پر بے حد دلگیر ہوتی اور خودکشی کر لیتی ہے۔ ایک پری اس سے بیحد متاثر ہو کر دونوں عاشق و معشوق کو زندہ کرتی اور ان کے ہاتھ ملا دیتی ہے۔

حیدر آباد (دکن) کے عجائب خانہ کی اُردو قلمی کتابیں

(جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

(انجمن ترقی اردو (ہند) کے حسب ایماء حیدر آباد کی اُردو قلمی کتابوں کی فہرست کا جو کام ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے، انجمن ترقی اردو کے معتمد صاحب سے حصول اجازت کے بعد اسے 'نوائے ادب' میں شائع کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں)

حیدر آباد (دکن) کے عجائب خانہ کی بنیاد ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ حکومت سرکار آصفیہ کے مساعی جمیلہ سے ۱۹۳۲ء میں رکھی گئی، عجائب خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں بہادر نے ارشاد فرمایا تھا۔

"آج مجھے حیدر آباد میوزیم کے افتتاح کرنے سے مسرت حاصل ہوئی اور مجھے امید ہے کہ آیندہ ضرور زمانہ کے ساتھ یہ ترقی کرتا جائے گا۔ اور آخر میں حیدر آباد کی دوسری مشہور اور تاریخی اشیاء میں اس کا شمار ہوگا۔"

سابق ناظم ڈاکٹر غلام یزدانی اور حال کیورٹیر مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کی دل چسپی اور کوشش سے حیدر آباد کے میوزیم کو تھوڑی سی مدت میں ایسی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس کو ملک کے دوسرے قدیم عجائب خانوں کے مقابلہ میں بعض نادر اشیاء کے باعث فضیلت دی جاسکتی ہے، چنانچہ قدیم چینی اشیاء، بیدری سامان، اسلحہ اور سکوں کا ذخیرہ ایسا جمع ہوگیا ہے جو دوسرے عجائب خانوں میں مشکل سے ملے گا۔

عجائب خانہ میں دوسری نادر چیزوں کے ساتھ چند قلمی کتابیں بھی محفوظ ہیں جو یا تو خوش خطی کے لحاظ سے نایاب ہیں یا تصاویر کے لحاظ سے ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

'نوائے ادب' کے مقاصد کے پیش نظر ہم نے صرف اُردو کتابوں کو اپنے کام کے لئے مختص کیا ہے، آیندہ صفحات میں اُنھیں کا حال لکھا گیا ہے۔

اس کام کے سلسلہ میں قاضی عبد الغفار صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو شاخ حیدر آباد اور مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کیوریٹر عجائب خانہ کا نام لینا ضروری ہے، جن کی دلچسپی اور ہمدردی سے یہ کام کیا جا سکا، اگرچہ کتابوں کی تعداد کم ہے مگر بلحاظ قدامت وغیرہ ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

(۱) جواہر اسرار اللہ

نمبر (۲۲۶۳) سائز (۹×۵)، صفحہ (۵۳۲)، سطر (۷)، خط نسخ کاغذ دیسی۔
مصنف: شاہ علی محمد گاؤن دھنی تاریخ تصنیف قبل ۹۷۳ھ کتابت قبل ۱۱۲۵ھ

شاہ علی محمد گاؤن دھنی شاہ ابراہیم جان اللہ کے فرزند تھے۔ ان کا دادیہالی سلسلہ نسب سید احمد کبیر رفاعی سے ملتا ہے اور ننھیال کا سلسلہ سیدنا عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ شاہ علی محمد گجرات میں پیدا ہوئے، وہاں ہی نشو نما ہوا۔ وہ اپنے وقت بہت بڑے صوفی اور صاحب ارشاد و ہدایت بزرگ تھے گاؤن دھنی یعنی گاؤں کے مالک کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ "معشوق اللہ" بھی ان کا لقب تھا۔ آپ کے کشف اور کرامات بھی مشہور رہیں۔

۹۷۳ھ میں انتقال ہوا۔ محلہ سید واڑہ احمد آباد (گجرات) میں مدفون ہیں۔ جس محلہ میں آپ کا مزار ہے وہ اب تک گاؤن دھنی سے موسوم ہے۔ ان کے مقبرہ میں ایک اُردو کتبہ کندہ ہے جس کا تاریخی شعر یہ ہے

تاریخ اسی مسیست کی ہوئی سون پون مشہور ؎ مسجد جامع بیچ ٹھانہ یا بتی نور
۹۶۱ھ

آپ کے ارشادات جو قدیم اردو کی ایک طویل نظم کی صورت میں ہیں۔ جواہر اسرار اللہ کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ ان کو دو بزرگوں نے مرتب کیا ہے، پہلا نسخہ ان کے ایک مرید ابوالحسن نے جمع کیا۔ اور اس کے بعد اضافہ کے ساتھ ان کے پوتے شاہ ابراہیم نے مرتب کیا، عجائب خانہ کا نسخہ شاہ ابوالحسن کا مرتبہ ہے۔ اس نسخے کے ابتدا میں چار صفحوں کا دیباچہ ہے۔ یہ دیباچہ فارسی نثر میں ہے۔ اس کے بعد ایک صفحہ پر فارسی مدحیہ نظم ہے۔ اس کے بعد اصلی نظم شروع ہوتی ہے۔

آغاز

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین الخ .... امابعد حمد و درود می گوید بندہ فقیر یکے کمینہ مریدان و خاکروبانِ حضرت بندگی غوث الاعظم تاج الفقراء و سلطان العارفین سلطان سیدی احمد کبیر معشوق اللہ ......"

مدحیہ نظم کا پہلا شعر یہ ہے۔

آں ولی اللہ کہ نامش مظہر اسم خدا است
قطب عالم در جہاں گفتن کنوں اورا سزا است

اسی نظم میں کل بارہ شعر ہیں۔

آغاز کتاب

در بیان توحید باری تعالی مکاشفہ نکتہ اول در عقدہ

آپین کھیلون آپ کھلاؤن آپین آپس لبکل لاؤن

دیباچہ میں اس کتاب کے مرتب کرنے والے ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن قریشی احمدی نے بیان کیا ہے کہ شاہ علی محمد معشوق اللہ حسینی الاحمدی قادری ابن حضرت شاہ ابراہیم جمال اللہ جو کچھ اپنی زبان سے توحید اور اسرار الٰہی کے متعلق فرماتے تھے اس کو انھوں نے مرتب کر لیا ہے۔

حروف تہجی کے لحاظ سے باب قرار دئے گئے ہیں۔ یعنی باب الف۔ باب ب "ت" وغیرہ اور ہر باب کو مکاشفہ پر اور ہر مکاشفہ کو "نکتہ" کے زیر عنوان تقسیم کیا گیا ہے اس طرح ہر باب میں کئی کئی مکاشفے اور نکتے ہیں۔ ہر ایک نکتہ میں اکثر و بیشتر دو۔دو شعر ہیں۔ بعض میں ایک شعر ہی ہے اور بعض میں دو سے زیادہ بھی ہیں۔

جیساکہ دیباچہ میں جامع کتاب نے بیان کیا ہے اس میں توحید الٰہی، در اسرار باری تعالی کا ذکر ہے ان کے علاوہ ضمناً تصوف کے بعض دوسرے مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اختتام۔

نکتہ ششم در تخلص

شاہ علی جیو یو چھپانوں علی محمد دوئی کجا نوں

ایک وجود ہے یوں انوں

نکتہ

یہ ناتھی ہور جن موٹی سب باتیں کری بیوتی

نکتہ

یہ چوکیدان (چوکیدالا) ان دیکھے عالم۔ یونھی جانی جہان جھوٹی بند (دیر) دکھائی جیون تیوری

صفحہ اول پر سرخی سے حسب ذیل عبارت درج ہے۔

جز اول من جواہر اسرار اللہ دیوان حضرت شاہ علی جیون گانو دھنی .... دارالسرور برہان پور ۴۷ سنہ جلوس خریدہ نمود۔

ایک مہر بھی ثبت ہے جس میں صرف قلی بیگ پڑھا جاتا ہے۔ لفظ قلی کے پہلے ایک اور لفظ ہے جو صاف نہیں ہے مہر پر ۱۱۲۵ھ ثبت ہے لیکن ہندسہ پانچ بھی صاف نہیں ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے جواہر اسرار اللہ کو اولاً ابوالحسن نے مرتب کیا تھا اس کے بعد شاہ ابراہیم نے دوبارہ بعد نظر ثانی اضافہ کیا۔ یہ کتاب شائع نہیں ہوئی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں شاہ ابراہیم کے مرتب کردہ جواہر اسرار اللہ کے دو نسخے ہیں۔ (تصوف ۶۶۹) و (۲۱۸) عجائب خانہ کا نسخہ بہت زیادہ نایاب ہے کیونکہ شاہ ابوالحسن کا مرتب کردہ یہ نظم (جواہر اسرار اللہ) کسی اور کتب خانہ میں نہیں ہے۔

کتب خانہ نواب سالار جنگ میں ہی شاہ ابراہیم کے مرتبہ نسخہ کے دو نسخے ہیں۔[۵]

(۲) نورس

نمبر (۱۶۸۹) سائز (۱۰ × ۷) صفحہ (۷۰) سطر (۶) تین سطر جلی اور تین خفی لکھی گئی ہیں۔ خط ثلث و نسخ، کاغذ دیسی، جدول مطلا۔ پہلا صفحہ سبز رنگ سیاہی مائل۔ مصنف۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ تاریخ تصنیف درمیان ۱۰۰۰ھ و ۱۰۱۰ھ۔ سن کتابت درج نہیں ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی بیجاپور کا چہیتا حکمران تھا جو مختلف وجوہ سے تاریخ دکن میں مشہور ہے، اس کا عہد رزم و بزم دونوں کی ہنگامہ آرائیوں کے لئے مشہور ہے۔ جہاں ایک طرف وہ میدان جنگ میں ایک بہادر سپہ سالار تھا وہیں دوسری طرف علم و فن کا بھی ماہر تھا چنانچہ اس کا دربار علماء۔ فضلاء۔ شعراء اور دوسرے اصحاب کمال سے بھرا ہوا تھا اگر ایک وقت شعر و سخن کا بازار گرم رہا تو دوسرے وقت فضا موسیقی سے پر رہی وہ خود بھی ایک باکمال شاعر تھا اور موسیقی میں استاد فن تسلیم کیا جاتا تھا۔

ابراہیم عادل شاہ طہماسپ شاہ کا فرزند تھا۔ ۹۷۰ھ میں پیدا ہوا اور اپنے چچا علی عادل شاہ اول کے مارے جانے پر ۹۸۸ھ میں مسند حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ (۴۸) سال کی طویل حکمرانی کے بعد ۱۰۳۷ھ میں اس نے انتقال کیا۔ وہ بیجاپور میں دفن ہے۔ چونکہ ابراہیم کی کم عمری میں بادشاہ ہوا تھا اس لئے عرصہ تک حکومت کی باگ نائب السلطنتوں کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کے زمانہ میں کئی مرتبہ لڑائی جھگڑے ہوئے اور فتنہ و فساد کی آگ شعلہ زن ہوئی۔

ابراہیم کی تعلیم عرصہ تک دلاور خاں کے بھائی محمد خاں کے ذمہ تھی۔ اس نے عربی اور فارسی کی معمولی تعلیم دی تھی۔ اس لئے سلطان نے علمی حیثیت سے زیادہ ترقی نہیں کی مگر اس کے باوجود وہ علم و فن کا قدردان اور اصحاب کمال کا سرپرست رہا۔ اس کی وجہ سے کئی مشہور علماء نے اس

---

[۵] دیکھو اردو شہ پارے، تاریخ اردوے قدیم اور پنجاب میں اردو۔

کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کی حیثیت سے نام آوری حاصل کی۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔
ابوالقاسم فرشتہ نے ۱۰۱۵ھ میں اپنی مشہور تاریخ "تاریخ فرشتہ" قلمبند کی، ظہوری نے سہ نثر ظہوری اور اس کی بعض دوسری تصانیف ملا ملک قمی نے مخزن اسراری کمال کا جواب لکھا۔ عبدالرشید نے علاء الدین محمد بن ذکریا قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا رفیع الدین شیرازی نے روضۃ الصفاء کا خلاصہ کیا۔ مولانا باقر۔ خواجہ سعد الدین۔ مولانا عنایت اللہ۔ علاء الدین شیرازی وغیرہ دوسرے باکمال علماء تھے۔
ابراہیم کی علمی سرپرستی اور اصحاب کمال کی قدردانی کا تذکرہ دکن کے تمام مورخوں نے کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا دور حکومت ترقی علم و فن کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھا۔ علمی سرپرستی کے لحاظ سے اس کو ہندوستان اور دکن کے دوسرے علم دوست بادشاہوں کے ساتھ صف اول میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ تاریخ۔ ادب۔ شاعری۔ موسیقی وغیرہ کے علاوہ جو اس عہد کے اہم موضوعات ہیں۔ دوسرے کئی موضوع پر بھی کتابیں مرتب ہوئیں۔ علوم و فنون کے علاوہ شعر و شاعری کو جو ترقی ہوئی وہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ فارسی اور قدیم اردو کے ممتاز شعراء اس کے گرد و پیش جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ملا ظہوری۔ شکیبی۔ مولانا فہمی۔ حیدری۔ ابوطالب۔ کلیمی۔ ملک قمی وغیرہ جیسے زبردست شعراء اور باکمال اصحاب سخن موجود تھے۔ قدیم اردو کے شعراء میں شوقی۔ مقیمی۔ امین نوری وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔
ابراہیم خود شاعر تھا۔ ابراہیم اس کا تخلص تھا اس کو شاعری کے ساتھ موسیقی سے بھی پوری دلچسپی تھی۔ بلکہ وہ موسیقی کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے زمانہ میں دور دور سے ارباب موسیقی بیجاپور میں جمع ہو گئے تھے۔ ابراہیم کو موسیقی کے لحاظ سے نائی فیسا غورث کہتے تھے۔
لفظ "نورس" سے ابراہیم کو بڑی محبت اور انسیت تھی اس کی وجہ دکن کے ایک مورخ نے حسب ذیل بیان کی ہے۔ ایک گاؤں "تورہ" نام سے موسوم تھا یہاں ایک عراقی شخص نے ایک شیشہ شراب پیش کیا۔ اس شراب سے بادشاہ کو بڑی لذت ملی اور سرور حاصل ہوا۔ ابراہیم نے اس شراب ساز سے دریافت کیا کہ شراب کہاں بنی ہے اور کس نے بنائی ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ اس شخص نے اسی گاؤں میں بنائی ہے تو بادشاہ یہ سنکر بہت خوش ہوا اور کہا مارا کیفے نورسیدہ" اور پھر اس کو لفظ نورس مرغوب الطبع ہو گیا۔
۱۰۰۸ھ میں ایک قلعہ بنا، نورس نام رکھا۔ ایک شہر آباد کیا اس کو نورس پور سے موسوم کیا شاہی مہر پر نورس کندہ تھا۔ سکہ پر نورس مضروب تھا۔ درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی کا تخلص

عطا کیا۔ سالانہ دربار "نورس" کے نام سے منعقد کرتا تھا اور اپنی کتاب کا نام بھی "نورس" رکھا۔

"نورس" ابراہیم کی شاعری اور موسیقی کی دلچسپی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں موسیقی کے راگ اور راگنیوں میں گانے کے لئے گیت لکھے گئے ہیں۔

نورس کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۰۰۵ھ اور ۱۰۱۰ھ کے درمیان اس کی تصنیف ہوئی ہے۔

ظہوری کی سہ نثر ظہوری کا پہلا خطبہ اس کتاب نورس کا مقدمہ ہے۔

آغاز

سید محمد میرے دل پر نانو	جیون رسول کر لکھے عرش تھانو
کمت دسی جیون خسرد مدنیا	کی غفلیت دھر موبتون جونا
جیون دیپک ہیں دسی مدہ تایک نیکنا	مشک عبیر بچھائے انگنا

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے "نورس" ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف راگ اور راگنیوں میں گانے کے لئے موزوں کئے گئے ہیں۔ صفحہ اول کی صراحت سے واضح ہے کہ اس کتاب میں سولہ راگ اور دس دوہرہ چالیس گیت ہیں۔

اختتام

سکیان سمیت سندری کھیلتی چاندی، پترم ان کھین عین

ابھوک

مکتا بھوش بھو شیشا سب تیر جیا چھلا۔

رام گیری راگنی کستوری سیا سو کیس کیسی دھملا۔

خاتمہ پر دو سطر عبارت ہے مگر پوری پڑھی نہیں جاتی۔ جس قدر پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے :-

کتب .... خلد اللہ ملکہ

عجالہ .... بید الفقیر عصمت اللہ۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر جو سنہری مائل بہ سیاہی ہے چند عبارتیں لکھی ہوئی ہیں ۔

(۱) حسنات

عروض

(۲) کتاب نورس بخط شکوہ .... قلمی مجلد سیاہ ...... جمع کتاب خانہ معمو ...

(۳) درین کتاب راگ شانزدہ و دوہرہ دہ وگیت چہل ....

اس کے علاوہ زمانہ ما بعد کی یعنی ۱۲۴۸ھ کی ایک تحریر حسب ذیل۔

نورس نامہ تصنیف ابراہیم عادل شاہ داخل کتاب خانہ احقر مظفر حسین. گویا وی ۲۳ رمضان ۱۲۴۸ھ

نورس شائع نہیں ہوئی۔ حیدرآباد میں اس کے چند نسخے حسب ذیل کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) دفتر دیکارڈ آفس۔ یہ نسخہ بہت اہم ہے کیونکہ شاہی کتب خانہ بیجاپور کا اصل نسخہ ہے۔

(۲) کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں اس کے تین نسخے ہیں۔ اس میں خط ثلث کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط میں بھی تحریر ہے۔

(۳) کتب خانہ آقا حیدر حسین صاحب

(۴) کتب خانہ مرزا حسین علی خاں صاحب

اس کے علاوہ بمبئی میں اس کا ایک نسخہ وہاں کے عجائب خانہ میں بھی موجود ہے۔

اس وقت لکھنؤ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی مختلف نسخوں کو پیش نظر رکھ کر نہایت فکر و کاوش سے اس کو شائع کرنے کے لئے مرتب کر رہے ہیں موصوف کی تحقیقات کے بموجب ان نسخوں میں کمی و بیشی اور اوراق کے تقدیم و تاخیر وغیرہ بھی پائی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت غور و فکر سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ توقع ہے کہ یہ گراں قدر کتاب جلد طبع ہو کر شائع ہو جائے گی۔

(۳) گلشن عشق

نمبر (پی ... ۲۸) سائز (۹×۵)، صفحہ (۲۴۰)، سطر (۱۲ تا ۱۴)، خط شکستہ، کاغذ دیسی، مصنف نصرتی تاریخ تصنیف ۱۰۶۸ھ، تاریخ کتابت ندارد،

محمد نصرت نام، نصرتی تخلص، بیجاپور کا نامور شاعر اور وہاں کے دربار کا ملک الشعرا تھا سچ تو یہ ہے کہ نصرتی نے دکھنی شاعری کو اپنے کلام سے چار چاند لگا دئے ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ ارکاٹ کا باشندہ تھا، ہم اس کی پیدائش کے سنہ سے واقف نہیں ہیں، قیاس یہ ہے کہ گیارہویں صدی کے وسط میں اس کی پیدائش ہوئی ہوگی، علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے دور میں اس کی شاعری چمکی اور اسے ملک الشعراء کا رتبہ ملا، نصرتی کی حسب ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) گلشن عشق (۲) علی نامہ (۳) تاریخ اسکندری اور (۴) دیوان ان میں سے آخرالذکر کتابیں نایاب ہیں گلشن عشق اور علی نامہ کے متعلق قدیم اور جدید تذکرہ نگاروں اور مورخین ادب نے بہت کچھ لکھا ہے یہ دونوں کتابیں نصرتی کے کمال فن کی ضامن ہیں، گلشن عشق انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے شائع ہوگئی ہے۔
نصرتی کے انتقال کے متعلق فتوحات کے تذکرہ ریاض حسینی کے بموجب ۱۱۰۰ھ کے بعد بھی وہ زندہ تھا مگر اب ہم کو نصرتی کی شہادت کا تاریخی قطعہ دستیاب ہوا ہے اس کے لحاظ سے ۱۰۸۵ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے، قطعہ تاریخی یہ ہے۔

ضرب شمشیر سوں یو دیتا چھوڑ جا کے جنت کے گھر میں خوش اہے
سال تاریخ آ ملایک تے یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ھ نکلتے ہیں۔

آغاز

ثنا صانع کی ہے جب یو کتاب عشق کا بانی
دیا ہے حسن کون خلعت کے ہر یک جز پہ عنوانی
رکھیا ہوں گلشن اسم رنگیں قصہ کا
کرے جس حیب کے پھولاں کی فلک شوق سوں گلانی

صفت اوس کی قدرت کی اول سراؤن دھریا جس نے یو گلشن عشق نانون

تاریخ تصنیف کا شعر

کہیا اوس کی تاریخ یوں ہجرتی مبارک یو ہے ہدیہ نصرتی

نصرتی نے اپنی اس مثنوی میں کنور منوہر اور مدمالتی کے عشقیہ قصہ کو دکھنی اردو میں نظمایا ہے، اس لئے نہ صرف فارسی مثنویوں سے اپنے قصہ کا مواد لیا ہے بلکہ ہندی افسانہ سے بھی معلومات فراہم کئے ہیں اس کی پوری تفصیل ہم نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں دی ہے (صفحہ ۲۷۵ تا ۲۸۶)

اختتام

لکھا ہوں یو قصہ خوش دہات سون علی شاہ عادل کرے نانوں سوں

ترقیمہ ـــ "مرتب شد کتاب گلشن عشق در قصہ منوہر کنور و مدمالتی گفتار نصرتی این کتاب قادر محی الدین عطار است عطار ۱۲۴۹ھ"

یہ کتاب شائع ہوگئی ہے، قلمی نسخے حیدرآباد کے کئی کتب خانوں میں ہیں۔ (باقی آئندہ)

تبصرے

(تبصرے کے لئے کتابوں کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے)

تنقیدی اصول اور نظریے

مصنف :- حامد اللہ افسر، صفحات ۲۰۶
قیمت :- ۶؍

ملنے کے پتے :- (۱) انوار بک ڈپو، ایجوکیشنل پبلشرز، لکھنؤ
(۲) نیجر مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، مقابل ڈینسو ہال کراچی ۲

تنقیدی اصول اور نظریوں سے متعلق بحث کرتی ہوئی افسر صاحب کی یہ کتاب "نقد الادب" کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن "نقد الادب" سے کتاب کے مقاصد اور مندرجات کی توضیح نہیں ہوتی تھی۔ اس اشاعت میں کتاب کا نام بدل دیا گیا ہے۔ موجودہ نام قطعی موزوں اور مناسب ہے۔ تنقیدی اصول اور نظریے ایک اہم وقتی ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔ "روح تنقید" اور "مبادیات تنقید" کے علاوہ اس موضوع پر غالباً یہ تیسری کتاب ہے اور خوب ہے۔ البتہ آخر میں افسر صاحب نے، ترقی پسند ادب اور نیا ادب میں فرق نہ کرتے ہوئے، نیا ادب کے ساتھ ترقی پسند ادب کو بھی برا بھلا کہا ہے۔ یہ کتاب بارہ ابواب (مثلاً تنقید یونانی قدیم میں، تنقید ہند قدیم میں، تنقید زمانہ ما بعد میں، اصول تنقید کی تشکیل وغیرہ) پر مشتمل ہے۔ اور اردو کے طالب علموں کے لئے مفید ہوگی۔ "ع ج"

پیام ساوتری

مصنف :- جگر بریلوی، ضخامت : ۵۶ + ۱۰۶ صفحات
قیمت : دو روپے چار آنے۔ ناشر :- نیجر راجہ رام کمار پریس لکھنؤ۔

"پیام ساوتری" اردو کے مشہور شاعر شام موہن لال المتخلص بہ جگر کی مثنوی ہے۔ اس میں ساوتری جی کے مشہور و دل نشین واقعہ کو، تمام قسم کی پابندیوں کے باوجود، جگر صاحب نے نہایت ہی فنکارانہ اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے افسانوی مثنویوں مثلاً سحر البیان و گلزار نسیم وغیرہ کے مقابلہ میں اپنے موضوع اور انداز پیشکش کے سبب پیام ساوتری نمایاں مقام کی مالک ہے۔

شروع کے ۵ صفحوں میں مصنف نے اپنے حالات درج کئے ہیں۔ اس کے بعد ۸ صفحوں میں "پیام ساوتری کیا ہے" کے عنوان سے محترمہ شوکماری دیوی دربابنت جگر بریلوی نے "پیام ساوتری" کے ادبی اور فنی محاسن پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ "ع ج"

فن شاعری

از علامۂ اخلاق دہلوی، تقطیع ۵×۷۔ صفحات ۱۹۲، قیمت مجلد ۶؍
پتہ :- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

اگرچہ فن شاعری پر اردو میں اب سے پہلے بھی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان میں سے بعض کمیاب ہیں اور بعض اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے خاصی مشکل اور غیر دلچسپ۔ اخلاق صاحب نے ترجمۂ حدائق البلاغہ، مترجمہ

سہبائی کے حدیقہ سوم و چہارم (علم عروض و علم قافیہ) سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق پیش کیا ہے۔ عروض اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب نہایت مفید اور آسان انداز میں لکھی گئی ہے اس علم سے ذوق رکھنے والے حضرات اور طلباء کیلئے، فن شاعری میں یہ ایک مفید اضافہ ہے۔

نئی رہگزر نئی کہکشاں

از اختر انصاری اکبرآبادی: سائز ۵×۷ صفحات ۱۴۴
قیمت ۲/۸ ملنے کا پتہ:۔ مرکز ادب، مشن روڈ کراچی۔

اختر انصاری ہماری زبان کے جواں سال و جواں فکر شاعر ہیں، زیرنظر مجموعہ ان کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعوں پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں زندگی کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان کی شاعری تکلف اور زور سے پاک ہے اور یہی شاعر کی بڑی کامیابی ہے۔ کتاب معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

وہ تین

مترجمہ:۔ یونس احمد۔ سائز ۵×۷۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۱/۸
ملنے کا پتہ:۔ مرکز ادب مشن روڈ، کراچی۔

یونس احمد کے بنگالی کہانیوں کے ترجمے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ ایک مدت سے بنگالی ادب کو اُردو زبان میں منتقل کرتے رہے ہیں۔ انھیں ترجمے کا شعور اور سلیقہ ہے ان کے ترجمے میں سلاست اور روانی ہے، زیرنظر مجموعہ بھی ۶ بنگالی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اردو داں طبقہ انھیں پڑھ کر بنگالی افسانہ نگاروں سے روشناس ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

کارواں چلتا رہا

از ریاض رؤفی، سائز ۵×۷، صفحات ۱۳۷۔ قیمت ۱/۸
پتہ:۔ مرکز ادب مشن روڈ کراچی۔

زیرنظر مجموعہ ریاض رؤفی کے ۵ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے زیادہ تر تقسیم ملک کے بعد ہجرت سے متعلق ہیں۔ راستہ اور کیمپ میں ہونے والے واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ رؤفی افسانوی دنیا میں نوآمد ہیں لیکن امید ہے کہ وہ اس دنیا میں بہت جلد اپنا مقام پیدا کرلیں گے۔ مطالعہ غور و فکر اور شعور ان کی صلاحیتوں کے گواہ ہیں۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

تری دُنیا میں ہم

از امیر علی امام، سائز ۵×۷ صفحات ۱۶۰، قیمت ۱/۸
پتہ:۔ ادب کدہ۔ کوی روڈ (عقب الائیز کیفے فریر روڈ) کراچی۔

زیرنظر کتاب امیر علی امام کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ موجودہ سماج میں جو غیر صحت مند فضا پیدا ہوگئی ہے اور اس سے ہمارے بلند اخلاق و کردار پر بُرا اثر پڑ رہا ہے اس کا افسانوں کی شکل میں نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے مناظر کی عکاسی عُریانی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے بہتر اور شائستہ اسلوب نگارش بھی ہے۔ طباعت و کتابت گوارا۔

"ف"

ماہنامۂ "شاعر" افسانہ نمبر جلد ۲۵ شمارہ ۸-۹ (۱۹۵۴ء)

ادارہ:- اعجاز صدیقی ، مہندر ناتھ شکیل الرحمٰن

ضخامت:- ۲۱۰ صفحات ، قیمت:- ایک روپیہ بارہ آنے

پتہ:- مکتبۂ قصر الادب ، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۷ بمبئی ۸

رسالۂ شاعر کا موجودہ نمبر ۲۸ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تین کہانیاں ترجمہ ہیں۔ باقی پچیس کہانیوں کے لکھنے والے اردو کے مستند افسانہ نگار ہیں مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس سہیل عظیم آبادی، مہندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، سرلا دیوی، ریوتی سرن شرما وغیرہ۔ ان کے دوش بدوش نئے لکھنے والے یوسف ناظم، رفعت بلخی، اور زکی انور وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ ان نئے اور پرانے لکھنے والوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ شاعر کے اس افسانہ نمبر کو بڑا بلند معیار بخشا ہے۔ بھومی دان (کرشن چندر)، دیوالہ (بیدی) کارٹون (احمد عباس) جینے کے لئے (سہیل) ترغیب (مہندر ناتھ) وغیرہ بڑے ہی کامیاب افسانے ہیں۔ ترجموں میں برفستانی بطخ (مسز خواجہ احمد عباس) بہت عمدہ ہے۔ ترجمہ بھی بہت کامیاب ہے۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت جہاں یہ ہے کہ اس نے افسانہ نگاروں کا تعارف پیش کیا ہے، وہیں اس کی یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ نام کی رعایت سے اس میں محض افسانے پائے جاتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ نظموں اور غزلوں سے اجتناب برتا ہے۔

ایک روپیہ بارہ آنے میں اتنا اچھا افسانہ نمبر، خصوصاً اس زمانے میں، پیش کرنے پر ہم ادارۂ شاعر کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

"ع ج"

ماہنامہ مشرب کراچی (سالنامہ)

مجلس عاقبت اندیش لمیٹڈ، تین ہٹی، کراچی اپنی دوسری مشغولیتوں کے ساتھ اردو زبان و ادب کی بھی خدمت کر رہی ہے۔ اس کی ایک مثال خود ماہنامہ مشرب ہے، جس کی پانچویں جلد کا پانچویں اور چھٹے شمارہ کو شامل کر کے یہ سالنامہ پیش کیا گیا ہے۔ آرٹ پیپر کا خوبصورت ٹائیٹل ہے۔ اس کے سوا کاغذ، طباعت کتابت عمدہ ہے۔

اس سالنامہ میں پرانے لکھنے والوں سے کہیں زیادہ نئے لکھنے والے ہیں، یہ بڑی اچھی بات ہے، خصوصاً اس لئے کہ یہ نئے لکھنے والے اچھے بھی ہیں۔ نظموں، غزلوں اور افسانوں کا حصہ خاصا ہے۔ مضامین بھی اچھے اور قابل مطالعہ ہیں۔ مشرب کے لکھنے والوں کی تصویریں بھی اس میں شامل ہیں۔

۲۰۰ صفحوں کے اس سالنامہ کی قیمت پاکستان میں ۱۲ اور پاکستان کے باہر دو روپیہ چار آنے ہے۔

"ع ج"

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

جنگ نامۂ عالم علی خاں

مُصنّف: غضنفر حسین، سنہ تصنیف ندارد۔ صفحات ۲۹، شعر فی صفحہ ۱۲، خط نستعلیق، سائز ۵ × ۹۔

مصنّف کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر عبدالحق[1] کی تصریح کے مطابق دلی کے معاصرین میں سے تھا، اس مثنوی میں اس نے نواب آصف جاہ نظام الملک اور عالم علی خاں صوبیدار دکن کی جنگ کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے مصنّف کی تصریح کے مطابق جنگ کے وقت سیّد عالم علی کی عمر صرف بیس سال کی تھی، وہ نہایت خوبرو جوان تھا، بہادری اور جوانمردی اس کے رفیق تھے، اس کی شرافت، اس کا جمال اور اس کی نیک فطرت کا نقشہ شاعر نے اس طرح کھینچا ہے:۔

کہ عالم علی سیّد نامدار	دکن بیچ صوبہ میں صاحب مدار
نہ دشمن کسی کا نہ کس سوں فساد	او سیّد جوانمرد عالی نہاد
رہے شہر میں صوبہ داری کرے	تماشے کوں سواری شکاری کرے
رہے رات دن سب سوں اخلاص سوں	نہ دھوکہ دھمک کس کے دسواس سوں
نپٹ خوب صورت و صاحب جمال	کہ ثانی نہیں کوئی اس کے مثال
عجب قد و قامت بڑی بہار کا	نہ راضی اتھا کس کے آزار کا
لٹکتا چلے جب نکل ناز سوں	امیری کی پوشاک ہور ساز سوں
سگل جگ کے پیاراں میں پیارا لگے	چلن چال سگلوں سوں نیارا لگے
جوانی منے ریشں آغاز تھا	کھنی عمر سیں صاحب راز تھا
بڑا قدر دسے جیوں برس تیس کا	ولے عمر تھا بیس یکو یس کا
رہے سب سوں ہل مل کے آرام سوں	نہ مطلب صبح سوں نہ کچھ شام سوں

یکایک خبر آشکارا ہوا	گھرے گھر تھے غل کا پکارا ہوا
کہ لے کر نظام الملک فوج سات	چل آتا ہے سید سے دکن بیچ بات

حسب دستور مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے کی گئی ہے یہ تقریباً بتیس اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد اصل مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے

---

[1] دیکھو۔ مقدمہ جنگ نامہ عالم علی خاں مرتبہ عبدالحق۔

سنو دوستاں ابتدا جنگ کا		زمانہ کی گردش و نیرنگ کا

خاتمہ میں درود و سلام کے بعد دُنیا کی بے ثباتی پر روشنی ڈالی ہے۔

ابتدا:-

اول حمد واجب ہے کرتار کا		دو عالم کا وارث خسم بدار کا
قضا و قدر اس کے ہے ہاتھ میں		نہیں شک شبہ کچھ سو اس بات میں
قلم ہاتھ اس کے ہے حاکم وہی		سگل خیر و شر کا ہے عالم وہی

خاتمہ:-

جو آیا ہے جگ میں سو مہمان ہے		یو جیو نا سو جیوں پھول اور پان ہے
خبردار ہو نئیں تو کملائے گا		حیاتی کے دم سوں نکل جائے گا
نہ دل کوں ہے راحت نہ خاطر کوں چین		کہا ہے یہ قصہ غضنفر حسین

ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۹۳۳ء میں اس مثنوی کو مرتب کرکے انجمن ترقی اُردو ہند کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے اِس جنگ کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے بعد اس مثنوی کے تین نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اِن تینوں میں ان کا اپنا نسخہ مکمل ہے۔ خوش قسمتی سے جامع مسجد کا یہ نسخہ بھی تقریباً مکمل ہے۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جامع مسجد کے نسخہ میں سنہ تصنیف سے متعلق کوئی شعر نہیں ہے۔ جب کہ اس مرتب شدہ نسخہ میں اس سے متعلق چار شعر موجود ہیں۔ جن میں ۱۱۳۲ھ کو سنہ تصنیف بتلایا گیا ہے۔

علاوہ ازیں اس مرتب شدہ نسخہ میں خاتمہ کے اشعار کی ترتیب بھی زیر تعارف نسخہ کی ترتیب سے کچھ مختلف ہے۔

اطلاع نامہ امیر علی

مصنف، شاہ امیرالدین علی، سنہ تصنیف ۱۲۷۱ھ، صفحات ۴، شعر فی صفحہ ۵۶،
خط نستعلیق، سائز ۶" x ۹"

یہ ایک منظوم درخواست ہے جو شاہ امیرالدین علی نے ہنومان گڑھی کے ہندوؤں کے مظالم سے متاثر ہوکر واجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ شاہ صاحب کے حالات اور اس نظم کے پس منظر سے متعلق خود جامع مسجد میں ایک فارسی مخطوطہ موجود ہے، لیکن اس سے زیادہ دلچسپ مولانا انتظام اللہ شہابی کی وہ تحریر ہے جو اس سلسلہ میں ان کی کتاب "علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" میں ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"امیر علی شاہ کے نانا ضلع گونڈہ کے چکلہ دار تھے، ابتدائی کتابیں اہل خاندان سے پڑھیں، لکھنؤ جا کر مولانا عبدالرحمٰن صوفی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، علوم معقول و منقول کے ساتھ علوم باطنی بھی حاصل کئے، فقر کا غلبہ بڑھا ہوا تھا گھر بار چھوڑ کر ملا بڈھن کی مسجد میں چلہ کش ہوئے، حج کا ارادہ کر کے وطن سے لکھنؤ آئے، مولانا عبدالرحمٰن صوفی نے سفر ملتوی کیا، سکان لوٹ لئے گئے، گل درگل کی مسجد میں چلہ کھینچا، کنیر تالاب کے نزدیک اپنے لئے مسجد اور ایک حجرہ بنوایا وہیں درس و تدریس میں لگ گئے ۲ ذی قعدہ ۱۲۵۹ھ کو صوفی صاحب کا انتقال ہو گیا، اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شاہ صاحب ایمٹھی سے حج کے لئے روانہ ہو گئے کابل، قندھار ہوتے ہوئے سرزمین عرب میں پہنچے، فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد انھیں راستوں سے وطن لوٹ آئے۔"

"یہ زمانۂ پر ظلمت نواب واجد علی شاہ کی حکومت کا تھا، یہ شب و روز عیش و عشرت میں مبتلا رہتا ارد گرد کمینہ ڈوم دھاڑی مصاحب بنے ہوئے تھے، رشوت کا بازار گرم تھا جس سے لوگ خود سر ہو رہے تھے، مسجدیں ڈھائی جاتیں، قرآن مجید کی بے حرمتی لوگ کرتے، بادشاہ تک رشوت پہنچ جاتی اس کی زبان بند رہتی، بدکاری نے احساس باطل کر دیا تھا، آثار اسلامی مٹ رہے تھے، نام نہاد اسلامی حکومت تھی۔"

"اجودھیا میں ایک ٹیلہ تھا، مہاراج رام چندر جی نے اس مقام پر ہنومان کو بٹھایا تھا اس وجہ سے وہ ہنومان بیٹھک کہلاتا تھا، یہ ٹیلہ بیکار سا پڑا ہوا تھا تو اپنے عہد میں شہنشاہ عالمگیر نے اس جگہ مسجد بنوا دی، برہان الملک کے زمانہ میں بیراگیوں نے اس مسجد کو شہید کر دیا، مگر حکومت نے عوام کی شورش پر مسجد کو از سر نو تعمیر کرا دیا اور نگراں قاضی محمد عاقل فیض آبادی مقرر کئے گئے۔"

"واجد علی شاہ جب تخت پر بیٹھے تو راجہ درشن سنگھ نے ہاتھ پیر نکالے اور حکومت سے بے پروا ہو کر اس مسجد کو پھر گروا دیا، اور بیراگیوں نے ہنومان گڈھی نئے سرے سے تعمیر کرائی اور ایک قدم آگے یہ اور بڑھایا کہ مسجد بابری کے آگے جو جگہ سیتا جی کی رسوئی کہی جاتی تھی اس جگہ پر ایک صنم کدہ بنایا، ان واقعات نے ہندوؤں میں عام خود سری پیدا کر دی اور اس قدر رنڈر ہو گئے کہ رام گھاٹ کی مسجد کی بھی بے حرمتی کر ڈالی، راجہ درشن سنگھ اور مہنتوں نے سلطان پور کے ناظم اعلیٰ علی نامی کو معقول رقم چٹا دی جس کا بڑا حصہ وزیر کی معرفت واجد علی شاہ تک پہنچ گیا۔"

"۱۲۷۱ھ" میں اس مسجد ہنومان گڈھی کے سلسلہ میں، شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح فیض آبادی نے جو اس مسجد کے درست کرانے میں شریک رہ چکے تھے ایک جلسہ بہ طور احتجاج کیا، حسن علی خاں اور احسان علی رسالدار رستم علی خاں بہادر علی خاں، شاہ غلام حسین کے شریک

خیال) تھے، آغا علی خاں معروف آغائی ناظم سلطانپور ہنو د کا مدد گار بنا ہوا تھا ۱۱ رذی قعدہ ۱۲۷۱ھ کو یہ سب حضرات اور دوسرے مسلمانوں کو لے کر بابری مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے، راجہ کے اشارے پر اِن مسلمانوں پر ہزاروں بیراگی ٹوٹ پڑے، شیعہ حکام مسلمانوں کا قتل دیکھتے رہے، ۱۴۰ نے جام شہادت نوش کیا، غلام حسین بھی شہید ہو گئے"

"یہ خبر لکھنؤ پہنچی، مضافات لکھنؤ میں اس واقعہ نے آگ لگا دی، مولوی امیر علی شاہ نے اس واقعہ سے بڑا اثر لیا اور لکھنؤ چلے آئے اور حکومت کو آگاہ کیا کہ وہ بیراگیوں سے انتقام لے، اگر نہیں لیتی ہے تو مسلمانوں کو میں خود جہاد کے لئے تیار کرتا ہوں، چنانچہ کچھ عرصہ انتظار کر کے فتوی جہاد جاری کیا اس پر مولوی عبد الرزاق فرنگی محلی نے بھی دستخط کر دئے تھے فتوے شائع ہوتے ہی تمام شہر میں کھلبلی مچ گئی — واجد علی شاہ کو بھی خبر پہنچی، گھبرا سا گیا، مگر حکام اس کو دلاسا دیتے رہے، اس نے کچھ سوچ کر مولوی صاحب کے پاس اپنے نمائندے روانہ کئے کہ ان کو سمجھا دیں ابھی قدم آگے نہ بڑھائیں، نواب احمد علی خاں مولوی غلام جیلانی، مولانا غلام امام شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی صدر الصدور لکھنؤ پنچ مقرر کر دئے اور مہنتوں کو طلب کیا، مگر مہنتوں نے شاہی حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ کوئی متنفس ہنومان گڑھی کا آیا پھر دوسری چال واجد علی شاہ نے یہ چلی کہ راجہ نصرت جنگ، راجہ مان سنگھ، قاسم جنگ، تہور علی خاں رسالدار فیض آباد ہنومان گڑھی کی تحقیقات کے لئے مقرر کئے اور مولوی صاحب کو الجھائے رکھا؛ اِن لوگوں نے معائنہ کر کے رپورٹ یہ دی کہ وہاں کبھی مسجد بنی ہی نہ تھی، بادشاہ نے اس کا اعلانِ عام کرا دیا"

"اِس خبر سے مولوی امیر علی شاہ برافروختہ ہو گئے اور حجت تمام کرنے کے لئے بادشاہ کے نام ذیل کی منظوم درخواست لکھی —

سپاس و حمد بہ درگاہِ خالقِ کونین　　سلام حضرت باری بہ سید الثقلین
درودِ حضرتِ حق بر رسول عالی جاہ　　بر آل اطہر اصحاب آل رسول اللہ
یہ اشتہار جہاد آج کر دیا ارقام　　بہ اطلاع تمام امم رسول کرام
امید ہے کہ شہنشاہ قبلۂ عالم　　ابو المظفر و منصور و خسرو اعظم
زبانِ فیضِ مبارک سے یوں کریں ارشاد　　کہ کافرانِ اودھ پر شتاب ہوے جہاد

"واجد علی شاہ نے شاہ صاحب کے خط کا کوئی جواب نہ دیا ۲۶ ر صفر ۱۲۷۲ھ کو شاہ صاحب اپنے مریدین کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے ان کے عقب میں چار کمپنیاں فوج کی مسٹر بارلو کی سرکردگی میں روانہ ہوئیں، شاہ صاحب محمد پور پہنچے اور ان کو ٹکیری سے نیچے حاجی مرزا حسین علی نے مقیم کرایا اور کہا کہ معاملہ ختم ہوا جاتا ہے، ٹکیری کے مورچہ پر بارلو مع گلابی پلٹنوں کے ٹھہرے، ادھر مفتی سعد اللہ نے

امیر علی شاہ کے خلاف قتل کا فتویٰ دیا اور مفتی محمد یوسف لکھنوی اس کی اشاعت کر رہے تھے کہ جو امیر علی کے ساتھ مل کر لڑے گا وہ جہنمی ہے"۔

"مجاہدین نماز پڑھنے میں مصروف ہوئے ٹیکری پر سے بارلو انگریز نے توپوں کے دہانے پر ان سب کو رکھ لیا ۶۲۵ نفوس گھنٹہ بھر میں شہید ہوئے شاہ صاحب بھی کام آئے ان کا سر اُتار کر علی نقی کے پاس بھیجا گیا"۔

"واجد علی شاہ نے کہا اس کو جلد قصبہ جنہٹ کے تالاب میں دفن کرادو، شہداء کی لاشیں قریب جوار کے مسلمانوں نے دفن کیں، یہاں یہ ہو رہا تھا، لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کی ضبطی کا حکم دے دیا، نواب صاحب تخت سے اُتار دئے گئے اور کلکتہ بھیج دئے گئے"[۵۱]

یہ منظوم درخواست ۵۶ اشعار پر مشتمل ہے اس کی سُرخی اس طرح قائم کی گئی ہے "اطلاع نامہ من جانب سید امیر علی شہید اکبر بروئے خدا بہ خدمت شاہ اودھ بدستخط خاص" اس کے ابتدائی اشعار تو وہی ہیں جو اوپر نقل کر دئے گئے البتہ خاتمہ حسبِ ذیل اشعار پر ہوا ہے۔

اہالیانِ خلافت پناہ قیصر جاہ　　کریں گے منصفی معذرت سے اس پہ نگاہ
بہ پاسِ دینِ رسالت پناہ صلِّ علی　　کہ فرضِ عین ہے مقہور کردنِ اعدا
روانہ ہووے گا شنبہ کو لشکر اسلام　　برائے غارت و تاراجِ شہرِ چھمن و رام

اِس منظوم درخواست کے آخر میں دو مخمّس ہیں ایک واجد علی شاہ آختر کا اور دوسرا مجتہد لکھنوی کا، پہلا مخمس آختر نے اپنی معزولی کے وقت لکھا ہے، اور دوسرا اس پہلے کا جواب ہے جو نہایت ہی طنز آمیز ہے، اس میں طعنہ دیا گیا ہے کہ جب مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا، تو تمھاری غیرت اور تمھارے انصاف کو ذرہ بھر ٹھیس نہ لگی، لیکن اب جبکہ تمھاری کشتی ڈوب رہی ہے تو چلّا رہے ہو "یاحسین آیئے دہائی ہے"
پہلے خمسہ کی سرخی یہ ہے "مناقب تصنیف شاہ لکھنؤ بعد معزولی خود"

(۱) خمسۂ اوّل از آختر

پہلا بند:- شہر پر اک اداسی چھائی ہے　　یہ خدا رنج میں خدائی ہے
آفت اک آسماں سے آئی ہے　　رزق عالم کی اب صفائی ہے
یاحسین آیئے دہائی ہے

آخری بند:-
شہ واجد علی محب انام　　آختر ہند پنجتن کا غلام

---

۵۱ علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں صـ۶۲

مفت ہوتا ہے موردِ الزام   اس کو امداد غیر سے کیا کام

یا حسین آیئے دہائی ہے

(۲) خمسۂ ثانی از مجتہد

پہلا بند:-

یہ مناقب سنا جو بندے نے   دل میں آیا جواب اس کا لکھے

ییک اس خمسہ کے نشاں کے لئے   ٹیپ اس کی یہ مصرعہ اس کا ہے

یا حسین آیئے دہائی ہے

آخری بند:-

مجتہد نے یہ خواب میں دیکھا   شہدائے اودھ بہ آہ و بکا

غل مچاتے ہیں زیرِ عرش علیٰ   اور کہتے ہیں اپنے ہاتھ اٹھا

یا حسین آیئے دہائی ہے

روضۃ الشہداء مختصر

مصنف: حسینی، سنہ تصنیف ۱۱۳۶ھ صفحات ۲۰۵، شعر فی صفحہ ۱۳، خط نستعلیق، عنوانات سرخ روشنائی میں، سائز ۶" × ۸"۔

یہ مثنوی کسی شاعر حسینی کی مفصل مثنوی کا اختصار ہے حسینی نے روضۃ الشہداء کا مفصل ترجمہ ۱۱۳۶ھ میں نظم میں کیا تھا اس کے ۱۴ سال بعد اس نے اپنے ایک شاگرد سے اس کے اختصار کی فرمائش کی، دوستوں نے بھی اسے مجبور کیا اور اس کا نتیجہ یہ مختصر نظم ہے، چنانچہ وہ خود لکھتا ہے:-

نپٹ شیریں او دکھنی زباں سوں   کیا تھا طول اِس غم کے بیاں کو

نظر سوں اس کے منظور نظر کر   اٹھا یو بینوا شاگرد کمتر

کہا ایک شب نوازش کی نظر سوں   بیانِ طول کوں کر مختصر توں

یو حصہ تھا مرا سو میں سمجھ کر   رکھا تھا کرنے شکر حق سوں اب سر

کئے پھر دوستاں سب اس پہ تکلیف   کہ توں کر مختصر یو نظم تالیف

مرتب ہیو اں اس منتخب کوں   کیا کہ شاد شاہِ تشنہ لب کوں

کیا جس سال میں یو مختصر گنج

ہزار و یک صد و پنجاہ تھا پنج   ۱۱۵۵ھ

حسینی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، اس کے شاگرد نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔

حسینی راز دانِ سرِّ شہداء　　　نہیں پوشیدہ ہے سب پر ہویدا
عزیز مصر عزّت کا پسر تھا　　　وفا خانی لقب اس کا نشر تھا
سخن کے درج کا تھا درفشاں او　　　اتھا شہزادۂ ما ثر دراں او
خدایا گور کوں کر اس کے پُر نور　　　اسے ہم نام سوں کر اس کے محشور

نصیر الدّین ہاشمی نے اپنی کتاب دکن میں اُردو میں ایک حسینی کا تذکرہ کیا ہے جو شاہ مین الدین اعلی کا مرید اور خلیفہ تھا[1]، ممکن ہے یہ حسینی وہی ہو۔

اصل روضۃ الشہداء حسینی ہی نے لکھی ہے، چنانچہ خاتمہ میں اس نے اپنے تخلّص اور سنہ تصنیف کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

ہوا جب راز حق مجھ پر ہویدا　　　کیا تب نظم اِس نامہ کا پیدا
خدا کے فضل ہور اس کے کرم سوں　　　مرتب روضۃ الشہداء کیا ہوں
سنہ ہجری اتھی اس وقت اوپر　　　اگیارہ سو پہ چھتیس سال اطہر
حسینی اول و آخر ہے اللہ　　　حسینی باطن و ظاہر ہے اللہ

مثنوی رسول اللہؐ سے لے کر حضرت حسین تک تمام شہداء اور اہل بیت کے احوال پر مشتمل ہے شہیدوں اور بزرگوں کے حالات الگ الگ بیان کئے ہیں، جہاں جس شہید کا ذکر ختم ہوا ہے وہاں حسب ذیل شعر اس کے نام کے ساتھ دہرایا ہے:-

اچھو مولیٰ خدا کے پاس محبوب　　　اچھو قاتل دونوں عالم میں معتوب

اور جہاں مضمون کسی کی شہادت پر ختم نہیں ہوتا وہاں اس شعر کی تکرار کی گئی ہے:-

گل صلوات کی چادر معطر　　　اچھو ہر آن بر روح پیمبر

مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے اور خاتمہ میں سنہ تصنیف وغیرہ کے حوالے دئے ہیں،

ابتدا:-

زباں کر نور بسم اللہ سوں پاک　　　کہوں یک شرح با اعجاز و ادراک
ثنا کر اس کروں طاقت ہو سب طاق　　　کیا یک صوت میں روشن دو آفاق

ملا از آب آتش خاک از باد
کیا ہے جسم و جانِ بو البشر ساد

---

[1] دکن میں اردو چوتھی طباعت صہ۲

خاتمہ:۔

کئے پھر دوستاں سب اس پر تکلیف — کہ توں کر مختصر یو نظم تالیف
مرتب بیسواں اس منتخب کوں — کیا کر شاد شاہِ تشنہ لب کوں
کیا جس سال میں یو مختصر گنج — ہزار و یک صد و پنجاہ تھا پنج

روضۃ الشہداء کے نام سے ۱۱۱۹ھ میں ولی ویلوری نے بھی ایک مثنوی لکھی تھی جس کا ایک مطبوعہ نسخہ کربی لائبریری میں موجود ہے، لیکن مذکورۂ بالا روضۃ الشہداء اور اس کے اختصار کو ولی کی روضۃ الشہداء سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ اس کے تقریباً سترہ سال بعد لکھی گئی ہے، اور اس کا اختصار ۱۱۵۵ھ میں ہوا ہے۔

فتح نامہ

مصنف: محمود، سنہ تصنیف ۱۲۰۴ھ، صفحات ۳۹۶، شعر فی صفحہ ۱۳،
خط نسخ۔ سائز ۷" x ۹"۔

محمود کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے، مثنوی میں مختلف مقامات پر صرف محمود کا لفظ بہ طور تخلص بھی استعمال کیا گیا ہے، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دکن میں اُردو میں اس کے کچھ حالات بیان کئے ہیں جو مشتبہ ہیں[۵] کیوں کہ اس بلوم ہارٹ کے بیان کئے ہوئے حالات پر اعتماد کر کے عاجز اور محمود کو ایک ہی فرض کر لیا گیا ہے۔ وجہ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے تصریح کی ہے کہ ایک عاشورا کی شب جب میں اور میرے بعض دوست تماشا دیکھنے کی غرض سے نکلے تو راستہ میں دیکھا، ایک مجلس جمی ہوئی ہے اور اس میں قاسم بن علی کا لکھا ہوا جنگ نامہ پڑھا جا رہا ہے اور اس کے سننے میں لوگ ہمہ تن مصروف ہیں اس سے متاثر ہو کر میرے ایک دوست نے فرمائش کی کہ تم بھی روضۃ الشہداء کے طرز پر ایک فتح نامہ مرتب کر دو، گو میں اس کے لائق نہ تھا، پھر بھی ایک دوست کی دل شکنی اچھی معلوم نہ ہوئی، لہذا یہ مثنوی لکھی، اشعار ملاحظہ ہوں:۔

شب عاشورہ میں تھے سیر کرتے — تماشہ دیکھتے ہر ٹھار پھرتے
یکایک ہم نے دیکھا یک مکان پر — بھری تھی ایک مجلس لئے منور
وہاں یک یار پڑھتا جنگ نامہ — شہنشاہ دین کا فتح نامہ
جو قاسم بن علی نے درِ نادر — پرووئے ہیں ظفر کی لڑیوں میں ظاہر
بنایا فتح نامہ ان نے نامی — ولیکن وزن میں او ہے گرامی

---

۵ دکن میں اُردو چوتھی طباعت ص۲۴۲

سبب اس کے مرا ایک یارِ جانی ۔ محب دلربا دلدار گیانی
محبت کے گگن کا او قمر ہے ۔ وفائی کے شجر کا او ثمر ہے
سنو دلبر غلام محی الدین ہے ۔ سمن بر، سیم تن اور مہ جبیں ہے
کہا مجھ کو کہ اے دلدار دلبر ۔ مرا ایک عرض سن اے نیک محضر
پکڑ اب جلد توں لے ہاتھ خامہ ۔ شروع کر شاہ کا اب فتح نامہ
تلازم روضۃ الشہدا کا لے کر ۔ بنا تا فتح نامہ اس وزن پر
یو سن کر دل ہوا مائل شتابی ۔ ہوئی دل کوں مرے بے اضطرابی
ولی اور روضۃ الشہداء کا مالی ۔ فراست کے کیا گلشن کوں خالی
مجھے کاں ہے سکت اس کے برابر ۔ جو بولوں شعر تازہ اے برادر
ولے تجھ حکم سوں میں ہو کے لاچار ۔ لکھتا ہوں اے مرے دل بند دلدار

مثنوی بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے، ابتدائی تین مجلسیں تاریخ شہادت سے زیادہ طلسم ہوش ربا سے تعلق رکھتی ہیں، مجلس چہارم سے اصل واقعہ شروع ہوتا ہے اور حضرت علی کی تخت نشینی سے لے کر شاہ حنیف اور ابراہیم اشتر کے مدینہ میں فاتحانہ داخلہ تک تمام واقعات مفصل لکھے گئے ہیں۔

ابتدا حمد و نعت سے کی گئی ہے اور خاتمہ میں سنہ تصنیف وغیرہ کا بھی ذکر ہے، یہ مثنوی ۱۲۰۴ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

ابتدا:-

کروں نامہ کوں حمد رب سے آغاز ۔ فصاحت میں رہوں دائم سرافراز
خدا کے نام سے نامہ کوں ارقام ۔ کروں میں تا ہوے جلدی سے اتمام
حکیم ایسا وہ ہے حکمت میں نادر ۔ کرے نطفہ ستیں انسان ظاہر

خاتمہ:-

اے محمود رکھ اب جلد خامہ ۔ توں کر اتمام زودی فتح نامہ
کیا اتمام جب یو شہ کا انجم ۔ تو بارہ سو پہ تھا سال چہارم
پڑھو یاراں سگل صلوٰت اطہر ۔ یہ روح پاک او ساقی کوثر
کیا مرقوم اس نامہ کوں اتمام ۔ پڑھو سب فاتحہ اے اہل اسلام

ترقیمہ:-

"کاتب الحروف فقیر الحقیر المحتاج الی اللہ الحمید عبد اللہ شاہ ولد الہداد شاہ"

اس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو میں موجود ہے[۹] اس میں بھی فہرست اردو مخطوطات اور دکن میں اُردو کی باتیں نقل کر دی گئی ہیں۔

فتح نامہ

یہ فتح نامہ کا دوسرا نسخہ ہے جو ۷ × ۱۲ کے تقریباً ۳۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے، پہلا نسبتاً قدیم ہے، اور دوسرا اسی کی نقل ہے، اس میں ناقل نے خوب دست درازی کی ہے اور تقریباً تمام دکنی خصوصیات کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے، اس میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔

زادالآخرۃ

مصنف صفا، ۱۲۱۷ھ، صفحات ۳۷۳، شعر فی صفحہ ۱۱

خط نستعلیق، عنوانات سُرخ روشنائی میں، سائز ۷ × ۸ ۔

مصنف کا تخلص صفا ہے اور علی ذوالفقار نام، اس کے تفصیلی حالات محبوب الزمن جلد دوم میں ملتے ہیں۔ صاحب محبوب الزمن کا بیان ہے :-

"میر ذوالفقار علی خاں نام، مشاہیر شرفاء لکھنؤ سے تھا، فن شاعری میں یگانۂ روزگار میر تقی میر کا شاگرد تھا، لکھنؤ سے بنگالہ گیا، وہاں چند مدت رہا، امرا و رؤسا کی مدح میں قصائد لکھے، بہت صلے وجائزے پائے، آزادانہ زندگی بسر کرتا تھا، بنگالہ سے چینا پٹن میں گیا وہاں عزت و آبرو سے اوقات عزیز گذارتا رہا، پھر وہاں سے میر ابوالقاسم المخاطب میر عالم مدارالمہام کے عہد میں حیدرآباد دکن میں آیا، چند روز وزیر عالم کی سرکار میں ملازم رہا۔ چند روز کے بعد آپ کے جواہر چمکنے لگے ،..... رفتہ رفتہ راجہ چندو لعل مہاراجہ بہادر کے دربار میں باریاب ہوئے چونکہ مہاراج شعر و سخن کے شیفتہ اور اہل سخن کے فریفتہ تھے۔ صاحب مذاق و قدردان تھے، آپ کے پانچ سو روپئے ماہوار تنخواہ کردی...... آپ تا بہ مرگ مہاراج کے جلیس و انیس رہے......"

"صاحب دیوان ہیں آپ کا دیوان قصائد و غزلیات و رباعیات کا ذخیرہ ہے، اور آپ نے چند مثنویات بھی لکھی ہیں، مثلاً مثنوی چھومنتر وغیرہ...... آپ ہندی و فارسی دونوں زبانوں میں خوب کہتے تھے آپ کا انتقال ۱۲۶۰ھ میں ہوا۔"

علاوہ ازیں خود مثنوی میں مصنف نے اپنے بعض حالات کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ تمہید میں

---

[۹] تذکرۂ اُردو مخطوطات صـ۹۱

لکھا ہے :-

فقیر از دودۂ پیغمبری ہے	حسینی ہاشمی و جعفری ہے
بہ صادق مثل خطا راہ انگشت	مجھے پہنچی اہے اٹھائیسویں پشت
غم آل نبی ہے کام میرا	علی و ذوالفقار ہے نام میرا
اثر جو بیتی سو میرا بیاں ہے	جو میرا نام سو میری زباں ہے
رکھی ہے یہ میری تیغ زبانی	بہ کفر و دین حکم برق و پانی
تخلص مشتہر میرا صفا ہے	مرا دل حبّ حیدر سے بھرا ہے
دکن میں جو رگردوں سے قضارا	ہے سال چند سے میرا گذارا
مسافر وضع در چیناپٹن ہوں	غریب شخص آوارہ وطن ہوں

مصنف کی ایک دوسری مثنوی "حملہ حیدری" کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو[لہ] میں موجود ہے یہ زادالآخرۃ سے کئی سال بعد لکھی گئی ہے،

زادالآخرۃ دس مجلسوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو مجلسیں رسول اللہ کی ولادت و وفات سے متعلق ہیں مجلس سوم سے نہم تک حضرت حسن و حسین کے حالات کو تاریخ کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے، آخری مجلس میں شہدائے کرام کے پس ماندوں کی اسیری، پیشی اور ان کی مدینہ کی طرف روانگی پر روشنی ڈالی ہے، اور ہر مجلس کے خاتمہ پر اُن شہداء پر جن کا اس مجلس میں ذکر کیا گیا درود و سلام بھیجا ہے۔ مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔

تمہید میں مصنف نے اپنی تصنیف کی غرض و غایت کو اس طرح ظاہر کیا ہے :

اگرچہ کر چکے ہیں اس کو تحریر	یہ افسانہ نہیں محتاج تقریر
نہ کہتا میں اسے خاموش رہتا	کبھی افسانہ کو ہرگز نہ کہتا
مگر افسانہ نئیں اعجاز ہے یہ	خدا کے لاڈلوں کا راز ہے یہ
عجب ہی زور ہے اس میں اثر ہے	کہ جیوں جیوں کہیئے تیوں تیوں تازہ تر ہے
نہیں دقت کا رکھا اس میں دستور	تکلف کا نہیں زنہار مذکور
کہ ہے مطلب رلانا اور رونا	غرض ہے نامۂ اعمال دھونا
ہوا جس وقت اس کا حسن انجام	کیا تجویز زادالآخرۃ نام
مجھے معلوم نئیں انجام میرا	رہے گا اس بہانے نام میرا

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ اردو مخطوطات ص ۱۸۶

اس مختصر سی تمہید کے بعد مناجات ہے جس میں مصنف نے اپنی تصنیف کی مقبولیت کے لئے خدا سے دعا مانگی ہے اور پڑھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اس سے درگذر کر کے اس کی مغفرت کی دعا کریں۔

ابتدا:۔

وہی عالم ہے میرے طرح غم کا		جو طرح انگیز ہے لوح و قلم کا
ظہور اس کا زمشت آب و گل ہے		مکاں اس لامکاں کا گنج دل ہے
صنائع اس کی خلق انس و جاں ہے		بدائع اس کی یہ روح رواں ہے

خاتمہ:۔

کیا ہے خون دل سے میں نے تحریر		کلام من بکا کی ایسی تفسیر
نہیں غم روز زشت و خیر مجھ کو		کفایت ہے یہ دستاویز مجھ کو
ہوا مرقوم جب یہ غم کا احوال		تھے بارہ سو کے اوپر سترہ سال

یہ مثنوی متعدد بار چھپ چکی ہے، چنانچہ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کریمی لائبریری میں موجود ہے، جس کو ۱۳۰۷ھ میں مطبع فتح الکریم بمبئی نے شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ خط نسخ میں چھپا ہوا ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ اس مطبوعہ نسخہ کے خاتمہ میں حسب ذیل ایک شعر زیادہ ہے۔

نبی پر اور ان کی آل امجد		پہ بھیجو تم درود از حد و بے حد

لیلیٰ مجنوں

مصنف: ہاشم، سنہ تصنیف ۱۰۴۶ھ، صفحات ۸۵، شعر فی صفحہ ۱۵
خط نستعلیق، سائز ۶" × ۱۰"۔

مصنف کے حالات معلوم نہ ہو سکے، دکن میں اردو اور اُردو شہ پارے میں ہاشمی[۵۱] اور ہاشم علی[۵۲] نامی دو شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے، جو بالترتیب نصرتی اور ولی کے معاصرین بتلائے گئے ہیں۔ ان میں ہاشمی کے متعلق تصریح کی گئی ہے کہ اس نے "یوسف زلیخا" نامی ایک مثنوی بھی لکھی، ممکن ہے اس "لیلیٰ مجنوں" کا مصنف بھی وہی ہو، لیکن یہاں مصنف نے اپنا تخلص ہاشمی نہیں بلکہ صرف ہاشم استعمال کیا ہے، علاوہ ازیں اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۰۴۶ھ ہے اور یوسف زلیخا کا ۱۰۹۹ھ، اس طرح دونوں مثنویوں میں تقریباً ۵۳ سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔ جو مشتبہ ہے۔

---

۵۱ دکن میں اُردو ص۱۹۳، ۵۲ اُردو شہ پارے ص۱۵۵

مولفہ اُردوئے قدیم نے ہاشمی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ " شاہ ہاشم علی علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے، شاہ ہاشم بیجاپور کے مشاہیر اولیا سے ہیں، شاہ وجیہ الدین گجراتی کے بھتیجے تھے ۱۰۵۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے"[۵۱] جس سے یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ لیلیٰ مجنوں بجائے ہاشمی کے خود شاہ ہاشم کی نہ ہو۔

مثنوی کا موضوع نام سے ظاہر ہے، ابتدا حمد و نعت اور معراج سے کی ہے، اور خاتمہ میں بعض ضروری معلومات پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ ایک جگہ مصنف نے اس قصہ کو فارسی سے دکھنی میں منتقل کرنے کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

رکھے ہاتھ میں فارسی نظم سوں — کہے ہیں یو قصہ دکھنی رزم سوں

علاوہ ازیں سنہ تصنیف، تعداد ابیات اور اپنے نام وغیرہ پر بھی اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

ربیع الاوّل مہ مبارک نظام — ہوا دن دو شنبہ یہ قصہ تمام
مدد یار بارہ ہیں پنجتن امام — مدد پیر میراں ہیں محی الدین نام
کہا سب قصہ میں سو تقدیر کلام — چھ سو بیت و یکتا لیس ہوے ہیں تمام
ہزار ہور چہل شش تھے ہجری تھے سال — ہوے پر کہا مجنوں لیلیٰ کا حال
لکھن والا بندہ ہے ہاشم سہی — اصل سے سمجھ میں لکھے اُن کہی

ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ قصۂ لیلیٰ مجنوں محض بہانہ ہے، ورنہ اصل مقصود عشق حقیقی ہے:۔

او معشوق عاشق میں معنی اہے — لیلیٰ ہور مجنوں بہانا اہے

ابتدا:۔

کیا ابتدا میں بنام خدا — ہریک رسم اوپر کروں جیو فدا
خدایا تو ہیں پاک بے عیب رب — بنایا جگت خاص ہور عام سب
تو حاکم ہے حکمت میں پورا حکیم — تو دانندہ ہر عیب کا ہے علیم

خاتمہ:۔

یہ کیا بات ہے ہور کیا ہے رمز — اسے سن کو عاشق جو پکڑے طرز
جوانی بڑھاپا نتا دان توں — عشق کے کنہ کوں بقا جان توں
عشق کا بڑا بیشہ یو ہے صحی
دونوں پیٹھ ہو جا مرد ہے وہی

---

[۵۱] اردوے قدیم ص۹۰

ترقیمہ :-

"تمام شد این قصۂ لیلی مجنوں در شہر رجب المرجب سنہ ۵ جلوس بہ تاریخ ۲۸ شہر مذکور در مقام بلدۂ لاہور کہ عساکر ظفر پناہ شاہ بہادر شاہ غازی، دائرہ ہمانجا ساختہ بود، نوشتہ بہ قلم شکستہ رقم، بجہاں صاحب برائے خاطر داشت میاں محمد شاکر جیو......"

یوسف زلیخا

مصنف: امین، سنہ تصنیف ۱۱۰۹ھ، صفحات ۲۸۱، شعر فی صفحہ ۱۵

خط نسخ، عنوانات سُرخ روشنائی میں سائز ۶ × ۱۰۔

مصنّف کا پورا نام "محمد امین ہے، گجرات کا باشندہ ہے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں اُس کا انتقال ہوا ہے، اس نے یوسف زلیخا کی داستان گوجری زبان میں منظوم کی ہے،..... اس کے علاوہ ایک نعتیہ قصیدہ بھی لکھا ہے جو ۲۲ر جمادی الثانی ۱۰۹۹ھ کو تمام ہوا ہے"[1]

سنو مطلب اہے اب یوں امیں کا   لکھے گجری منے یوسف زلیخا
ہر یک جا گہ قصہ ہے فارسی میں   امیں اس کوں اتارا گوجری میں

علاوہ ازیں خاتمہ میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

الٰہی تیں مجھے توفیق جو دی   تو میں نے فارسی سوں گوجری کی

خاتمہ میں مصنّف نے سنہ تصنیف، تعداد ابیات اور اورنگ زیب کے عدل وانصاف کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے :-

زمانہ شاہ اورنگ زیب کے میں   کہی یوسف زلیخا کوں امیں نے
الٰہی توں ایسا عادل شہنشاہ   رکھیں قائم جدھاں لگ مہر ہو ماہ

... ...

اگیارہ سو کے اوپر نو جو گذرے   برس ہجرت محمد مصطفےٰ کے
بتیاں چھتیس سو ہور تیس اوپر   لکھا ہوں گوجری کے بیچ خوشتر

ابتدا :-

اول تعریف سن خالق کی اے یار   کہ وو دونوں جگت کا ہے کرنہار
وہی نابود سے سب کوں کرے بود   کرے سب کوں حیاتی دے کے مشکور

---

[1] اردوئے قدیم ص۱۵

وہی اس خاک کی عزت بڑھاوے کرے کر خاک کوں آدم بناوے

خاتمہ:۔

صبح کے وقت لکھانے گا ایں یہ الٰہی توں محبت سب کے تئیں دے

کہ سب کوئی کرے اس کے اوپر پیار پڑھے دل جان سیتے ہو کے ہشیار

ایں بس کر سخن اس ہی جگہ ہاں ہمیشہ پڑھ محمد پر دروداں

ترقیمہ:۔

"تمام شد در ماہ ذی قعدہ تاریخ دواز دہم ۱۲۵۹ھ"

مولفہ اردوئے قدیم کی تصریح کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ میں موجود ہے، علاوہ ازیں ۱۲۷۰ھ میں بمبئی سے شائع بھی ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ ایچ فاروقی نے اس کو ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ اڈٹ کیا ہے اور یہی کتاب ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے مقالہ کا موضوع تھی۔

چندر بدن مہیار

مصنف مقیمی، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۵۹، سطر فی صفحہ ۱۵،

خط نستعلیق، عنوانات سرخ روشنائی میں، سائز ۹ × ۶۔

ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب اُردو شہ پارے میں نہایت تفصیل کے ساتھ مقیمی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، ان کے بیان کے مطابق "مرزا محمد مقیم مقیمی بہت بڑا فارسی شاعر تھا، استر آباد کے ایک سید خاندان کا رکن تھا، بچپن ہی میں اس کا باپ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے اسے اپنے ساتھ عربستان لے گیا تھا زیارت کرنے کے بعد وہ شیراز پہنچے جو اس وقت فارسی علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا، بدقسمتی سے یہاں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور مقیم کو کسی سرپرست کی ضرورت لاحق ہوئی، اس نے فوراً ہندوستان کا رُخ کیا اور یہاں پہنچ کر بیجاپور کے فیاض دربار میں پرورش پائی جس وقت فزونی نے اپنی تاریخ ختم کی ہے یہ تقریباً نوجوان تھا لیکن اس پر بھی تاریخ میں اس کا ذکر ہے اور اس میں مقیمی کو عالم تو نہیں البتہ اچھا شاعر ضرور بتلایا گیا ہے۔[۱]

لیکن ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مقالہ "اردو شہ پارے پر ایک نظر میں" یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا مقیم استر آبادی اور چندر بدن مہیار کا مصنف مقیمی دونوں ایک نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اختلاف کرتے ہوئے حسب ذیل پانچ وجوہ بیان کئے ہیں۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اردو شہ پارے صـ۳۷

(۱) مرزا مقیم فارسی زبان کا اچھا شاعر تھا۔ اس کے اشعار میں اس کا تخلص مقیم آیا ہے، مقیمی کہیں نہیں ہے۔

(۲) سوائے اس کے کہ چندر بدن کی تکمیل ۱۰۴۵ھ کے قبل ہوئی ہے اور ان ہی ایام میں مرزا مقیم بھی یہیں موجود تھا اور کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے مقیم کو چندر بدن کا مصنف سمجھا جاسکے۔

(۳) قصہ چندر بدن و مہیار کا تعلق بیجاپور سے تھا مگر کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے مقیمی کو بیجاپوری قرار دیا جائے۔

(۴) ایسے دور میں جبکہ خود ہندوستان کے رہنے والے دکھنی زبان میں تصنیف و تالیف کرنا عار سمجھتے تھے تو ایک ایرانی اس کی طرف کیونکر مائل ہوا ہوگا۔

(۵) مرزا مقیم بالکل نو وارد ایرانی شاعر تھا دکھنی زبان میں اس کو اتنی مہارت حاصل نہیں ہوسکتی کہ اس میں تصنیف کرسکے۔ مولف "بہرام و بانوے حسن" نے مقیمی کی دکھنی نظموں کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہے۔[۵]

ڈاکٹر صاحب کے یہ اعتراضات بجائے خود صحیح ہیں لیکن جب تک اصل مقیمی کا پتہ نہ چلے گا اس وقت تک یہ انتساب درست ہی سمجھا جائے گا۔

مثنوی کا موضوع محبت کا ایک نیم تاریخی واقعہ ہے، جس میں ایک ہندو لڑکی چندر بدن اور مسلمان لڑکا مہیار کو ایک دوسرے سے محبت کرتے اور اس راہ میں جان دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ابتدا حمد و نعت سے کی ہے اور پھر عشق و محبت کو عالم گیر قرار دے کر بتلایا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ پریت ہی کی ریت میں ڈوبا ہوا ہے، موت اور زندگی کا فرق، دانا اور دیوانہ کا امتیاز، دنیا و دین کی اہمیت اسی طرح دوسری بہت ساری خصوصیتیں محض اسی کی بدولت زندہ ہیں، یہ نہ ہو تو دنیا نہو، آخر میں اپنے آپ کو بھی اس کا شکار قرار دیا ہے:۔

پرت کے دریا کا شناور ہوں میں — پرت کیچ غوطہ میں باور ہوں میں
کہیں پرت بیچ سپڑیا ہوں میں — مقیمی پرت سوںچ نہ مریا ہوں میں

علاوہ ازیں اس تمہید میں اس نے اپنی سخن طرازی کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں غواصی کا تابع ہوں، چنانچہ لکھا ہے :۔

زباں کا اپتا ہوں سچا جوہری — کروں نت سخن سوں گہر گستری
زباں درج گو ہر سو مجھ پاس ہے — ہر یک صرف گویا رتن خاص ہے
سینا کھیں رتن کا بٹوا کھول کر — نکالوں حرف سیں رتن رول کر

---

[۵] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تحقیقی مطالعے" ص ۱۳۸

ضمیمۂ

مقالہ نُما

مرتبین

عالی جعفری ، فضل اللہ فاروقی ، عصمت جاوید
سید جمیل الدین

ضروری نوٹ :- مقالہ نما میں شامل شدہ مضامین کی نقل حسب طلب (خطِ شکست میں) دو آنے فی صفحہ کی اجرت پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱۔ ادارہ:

قدیم صوفیہ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ء جولائی ۲۱-۲۶)

امام عبدالوہاب شعرانی مصری کی کتاب "طبقات الکبریٰ" سے متعدد اکابر اسلام و صوفیا کے اقوال مترجم نے مصنف کے بعض بیانو سے اختلاف کیا ہے۔

۲۔ ادارہ:

ہدائت و نور

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ء دسمبر ۲۱-۲۹)

امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب طبقات الکبریٰ سے مذہب اخلاق علم و عمل، ولایت و زہد، علماء فقراء امراء، اوران کے علاوہ مختلف مذہبی اور معاشرتی زندگی سے متعلق عنوانات پر پند و نصائح پیش کئے ہیں۔

۳۔ اطہر قاضی مبارک پوری:

فقہ اہل سنت کی ترویج و اشاعت

(البلاغ بمبئی ۵۴ء ستمبر، ۲۶-۳۰)

چار فقہوں (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کا حال کہ عالم اسلام میں ان کی ترویج و اشاعت کن حالات کے تحت ہوئی اور کس ملک میں کون سا فقہی مذہب کب پھیلا اور موجودہ زمانے میں یہ مذاہب کس ملک میں کہاں تک موجود ہیں۔

۴۔ جعفر شاہ محمد:

فرمان رسولؐ

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۵۴ء جولائی ۱۱-۱۲)

امیر و مامور سے متعلق مختلف احادیث ان کے ترجمے اور تشریح اور آخر میں موجودہ دور کے ناقص حالات کو پیش کر کے متنبہ کیا ہے۔
ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کے بجائے اپنی اصلاح کی جائے۔

۵۔ جعفر شاہ محمد:

فرمان رسولؐ

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۵۴ء ستمبر ۱۱-۱۲)

صدقہ کی ہمہ گیری اور اسکی وسعت سے متعلق احادیث ان کے ترجمے و تشریح۔

۶۔ حامد الانصاری غازی:

اسلام کے حقیقی ہیرو

(البلاغ بمبئی ۵۴ء ستمبر ۱۲-۱۷)

ہندوستان اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ایشیائی ملکوں میں اسلام کے پھیلانے والے فوجی کمانڈر نہیں ہیں بلکہ وہ بزرگان دین اور اولیاء کرام ہیں جنھوں نے اسلام کے انسانیت نواز اصولوں سے اللہ کا پیغام پہنچایا۔

۷۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی:

حدیث دین میں حجت ہے

(فاران کراچی ۵۴ء اگست ۹-۲۹)

قرآن پاک دین و شریعت کی اصل و اساس ہے اور ادلہ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے مگر اس کا کام اصول بتانا ہے۔ تفریع و تفصیل اور توضیح و تشریح حدیث و سنت کا وظیفہ ہے۔

۸۔ خورشید احمد فارق:

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں
(ایک سیاح کے مشاہدات)
شام
(۳)

(برہان دہلی ۵۴ء جولائی ۳۵-۵۲)

اس قسط میں شام اور مصر کے اہم شہروں اور قصبوں کے جغرافیائی، تجارتی، تمدنی اور مذہبی حالات بیان کئے ہیں۔

۹۔ خورشید احمد فارق:

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(برہان دہلی ۵۴ء ستمبر ۱۷۹)

(مسلسل) مقدسی کو ماخذ قرار دے کر چوتھی صدی ہجری کے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ اس قسط میں ملک مغرب یعنی شمالی مغربی افریقہ کے مخصوص حالات ملتے ہیں۔

۱۰۔ سعید احمد:

نظرات
مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

(۳)

(برہان دہلی ۵۴ء، اگست ۲ـــ۱۰)

عربی مدارس میں جو نصاب رائج ہے وہ فرسودہ و قدیم ہو چکا ہے۔ زمانہ حاضرہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا نصاب کی خامیاں اور کمزوریاں ظاہر کرتے ہوئے موجودہ حالات و مسائل کی روشنی میں جدید نصاب مرتب کرنے کا مشورہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ سعید احمد:

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

(۴)

(برہان ۵۴ء ستمبر ۵ـــ۱۴)

تفسیر کی وجہ تسمیہ اور اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ علم تفسیر کے طالب علم کو کون سی باتیں ملحوظِ خاطر رکھنی چاہئیں۔ (باقی آئندہ)

۱۲۔ عباس طالب صفوی:

دینِ الٰہی کے عناصر اربعہ
(مسلسل)

(نگار لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۵ـــ۱۲)

اس قسط میں دینِ الٰہی کے عنصر تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۳۔ عبد الرحمٰن عتیق فکری:

اخلاق، تمدّن اور معاشرت کو مذہب نے سنوارا

(فاران کراچی ۵۴ء ستمبر ۳۰ـــ۳۴)

قدیم تاریخ انسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقوام عالم میں مذہبی رجحان اور مذہب کی طرف انسانوں کا جھکاؤ ثابت کیا ہے اور دنیا کی ترقی میں مذہب ہی کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ یورپ کے متعدد فلسفیوں کے خیالات سے اقتباس بھی پیش کیا ہے۔

۱۴۔ عرشی:

تیسری صدی ہجری کا ملحد اعظم

(نگار لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۲۴ـــ۲۸)

ابو الحسین احمد بن یحیٰی اسحٰق الراوندی تیسری صدی ہجری کا زبردست عالم و متکلم اور مصنف تھا۔ یہ اگرچہ کسی مذہب کا پابند نہ تھا مگر اس کے مختلف مذہبوں پر متنازع فیہ کتابیں لکھی ہیں۔

۱۵۔ علی۔ سید ابو الحسن:

سراغ زندگی

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ء، اگست)

مولانا سید ابو الحسن ندوی کی ایک تقریر کا اقتباس جو ان کے تازہ مجموعہ پیام انسانیت سے ماخوذ ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ انسانیت اس وقت۔ ایک کشمکش اور بے چینی میں مبتلا ہے اور نتیجہ ہے صحیح راستہ سے بھٹک جانے کا۔ انسان کا دماغ ایجادات و اختراعات سے دنیا میں اضافے کر رہا ہے لیکن دل کی طرف سے آنکھیں بند ہیں، دل میں خدا کا تقدر نہیں اس کے سامنے جواب دہ نہیں جانتا اسی لئے ـــ ساری دنیا میں اضطراب و بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

۱۶۔ علی ابو الحسن ندوی سید:
عتیق الرحمٰن سنبھلی مترجم

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۳۰ـــ۴۴)

سید ابو الحسن علی ندوی نے ازہر اور فواد یونی ورسٹی کے

طلبہ کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف مغربی تہذیب اور اس کا فلسفۂ حیات ہے اور دوسری طرف دین اسلام اور اس جنگ کے جیتنے کی ذمہ داری امت کے نوجوانوں پر ہے۔ اس کے علاوہ سید احمد شہید کے ساتھیوں کے حالات بھی بیان کیے، دینی اور اخلاقی تیاری اور تربیت پر بھی زور دیا۔

۱۷۔ غوث محمد ڈاکٹر:

جنایات بوجہ غفلت

(معارف اعظم گڑھ ج ۷۵، اگست ۳۹-۴۸)

پہلے نویں باب متعلق بہ "امور متعلق بہ ثبوت" کی چوتھی فصل: علم اور رضامندی میں فرق کو اور اس کے بعد دسواں باب مشتمل بر "مدعی کن وجوہ کی بناء پر ہرجانہ وصول کرنے سے محروم ہو جاتا ہے" درج کیا ہے۔

۱۸۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ج ۸ ش جولائی ۸-۱۰)

صبر و استقامت، مصائب پر ثابت قدمی، وغیرہ کے سلسلے میں آیتیں احادیث اور ان کی تفسیر پیش کی ہے۔

۱۹۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر

(فیض الاسلام راولپنڈی ج ۸ ش ستمبر ۸-۱۰)

ذکر درد اور امن و راحت میں عام انسانی فطرت سے متعلق قرآنی آیات، ترجمے، تشریح۔

۲۰۔ فضل اللہ سید:

وقف اور امام ابو حنیفہ

(معارف اعظم گڑھ ج ۷۵، اگست ۹۵-۱۱۵)

اسلامی وقف سے متعلق امام ابو حنیفہ کے خیال اور طریقہ کو بیان کیا ہے۔

۲۱۔ قطب الدین احمد:

حقیقت تصوف
فقر و احسان یا رہبانیت و خانقاہیت

(برہان دہلی ج ۳۵ جولائی ۸-۳۱)

مقالے کے اس حصے میں لفظ "صوفی" کے مادۂ اشتقاق تصوف کے ماخذ عشق و محبت، اتباع کتاب و سنت اور ارادت و ارشاد سے بحث کی ہے۔

۲۲۔ قطب الدین احمد:

حقیقت تصوف
فقر و احسان یا رہبانیت و خانقاہیت
(۲)

(برہان دہلی ج ۳۵، اگست ۱۱-۲۷)

تصوف پر ایک اتہام رہبانیت کا ہے۔ مختلف بزرگان دین کے دولت و ثروت کے واقعات پیش کر کے اسے غلط ثابت کیا ہے۔ اسی طرح دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ صوفیاء کا طریق عمل کیا تھا، فقر قرآن، مثال وحدت وجود، تصوف کے دور تنزل و انحطاط کے اسباب، آخر میں بیان کیا ہے کہ تصوف سراپا عمل کی تعلیم دیتا ہے اور تصوف اسلام ہی کا شجر طیبہ ہے۔

۲۳۔ قطب الدین احمد:

قرآن کا معیار فکر و نظر

(برہان دہلی ج ۳۵ ش ستمبر ۱۴-۳۱)

قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ قرآن نے جوہر عقل و تمیز کو کام میں لانے کی ہدایت کرنے کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیاتی مسائل میں اس کی بے بسی تسلیم کی ہے۔ قرآن کا مرکزی اور محوری نقطہ توحید الوہیت ہے۔

۲۴۔ م۔ ق:

ارشادات عالیہ

(فاران کراچی ج ۸ ش ستمبر ۹-۱۸)

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مواعظ کا اقتباس

جن میں آپ نے توحید، کتاب و سنت اور توکل و تقدیر سے متعلق اشارے کئے ہیں۔

۲۵۔ منظور نعمانی:

معارف الحدیث

(الفرقان لکھنؤ ۴۵ جولائی ۱۰۔۔ ۱۶)

(مسلسل)

احادیث رقاق۔ ترجمہ و تشریح۔

۲۶۔ منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(۱۰)

(الفرقان لکھنؤ ۴۵ جولائی ۵۔۔ ۹)

بعث بعد الموت سے متعلق قرآن کریم کی چند آیتیں ترجمہ کے ساتھ درج کی گئی ہیں اور کہیں کہیں تشریح بھی کی گئی ہے۔

۲۷۔ منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(۱۱)

(الفرقان لکھنؤ ۴۵۔ اگست ۴۔۔ ۱۱)

اس قسط میں آخرت میں پیش آنیوالے واقعات کو متعدد آیتیں پیش کرکے ان کا ترجمہ اور تفسیر بیان کی ہے۔

۲۸۔ منظور نعمانی:

معارف الحدیث

(مسلسل)

(الفرقان لکھنؤ ۴۵ ستمبر۔ ۴۔۔ ۱۹)

دولت مندی سے متعلق حدیثیں مع ترجمہ و تشریح۔

۲۹۔ منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(۱۲)

(الفرقان لکھنؤ ۴۵ ستمبر ۵۔۔ ۱۲)

جس میں لکھا ہے کہ جنت اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا انتہائی مظہر ہے اور دوزخ صفت غضب کا پھر جنت و دوزخ کے متعلق قرآن کریم کی آیتیں اردو ترجمہ کیساتھ درج کی گئی ہیں۔

❖　❖　❖

تذکرہ و سیرت نگاری

۳۰۔ ادارہ:

بزرگان دین

(فیض الاسلام راولپنڈی ۴۵ جولائی ۱۳۔۔ ۱۵)

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے حالات زندگی، تبلیغ و اشاعت دین، مرض الموت اور ان کے خلفاء کے نام۔

۳۱۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(فیض الاسلام راولپنڈی ۴۵ جولائی ...)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے حالات و اسلامی خدمات، ان کے فاتحانہ کارنامے۔

۳۲۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(۳)

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۴۵ ستمبر ۱۷۔ ۱۹)

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کے جنگ یرموک میں آپ کے کارناموں کا ذکر۔

۳۳۔ پیام شاہجہانپوری:

تاجور نجیب آبادی

(روح ادب کراچی ۶ سال ۷۔ ۸ نمبر ۱۲۵۔ ۱۳۲)

قادر الکلام شاعر، بلند پایہ نثر نگار، صاحب طرز صحافی، مسلم الثبوت استاد، جید عالم، انتہائی سنجیدہ اور قیامت کا شوخ، جس انسان میں یہ ساری خصوصیات جمع ہوگئی تھیں اسے تاجور نجیب آبادی کہتے ہیں۔ انھوں نے لاہور کی علمی وادبی اور صحافتی فضا کے علاوہ بحیثیت مجموعی اردو ادب پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مولانا کی صحافتی خدمات ان کی نثر نگاری اور ان کی شاعری بہت اہم ہیں ان کی تفصیل اس مقالہ میں مل جاتی ہے۔

❖　❖　❖

۳۴۔ دیسائی مگن بھائی:

راجہ رام موہن رائے کا یگ

(نیا ہند الہ آباد ۵۴ اگست ۱۷-۲۴)

راجہ رام موہن رائے کا عہد ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمانے کا عہد تھا ملکی بدنظمیوں اور بدانیوں کے مقابلے میں عوام نے انگریزی راج کو زیادہ سکون پرور پایا اور ایک ایسا متوسط طبقہ پیدا ہوا جس نے اس راج کی جڑیں استوار کرنے میں مدد دی۔ راجہ رام موہن رائے نے بھی اس نئے راج کا خیر مقدم کیا اور اس راج کی لائی ہوئی خوبیوں کو اپنانے کی تلقین کی۔

۳۵۔ شیر جنگ:

نشاط مطالعہ ۔ داستوئفسکی

(آج کل دہلی ۵۴ اگست ۴۴-۵۱)

روس کے مشہور ناول نگار داستوئفسکی (۱۸۲۱-۱۸۸۱) کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا ہے اور اس کے فن پر تبصرہ کیا ہے۔ داستوئفسکی بہت بڑا آرٹسٹ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بہت بڑا ماہر نفسیات، ایک جید مفکر اور صاحب پیغام و الہام بزرگ۔

۳۶۔ عرشی:

رنگا رنگ یادیں

(فیض الاسلام ۔ راولپنڈی ۵۴ ستمبر ۴۲-۴۹)

مضمون نگار نے اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں۔

۳۷۔ قاضی محمد ابراہیم:

تاریخ بدایونی پر ایک اجمالی نگاہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ اگست ۲۳-۳۸)

تاریخ بدایونی پر ایک اجمالی نظر کی چوتھی قسط درج ہے۔

۳۸۔ قاضی محمد ابراہیم:

تاریخ بدایونی پر ایک نگاہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ ستمبر ۱۰۸-۱۱۹)

اس مضمون کی پانچویں قسط ہے۔

۳۹۔ م:

بزرگان دین

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ ستمبر ۱۳-۱۵)

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رح تعلیمات، نماز، لذت نماز، جہاد، روزہ، توکل، تسلیم و رضا سے متعلق انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ۔

۴۰۔ محبوب رضوی:

سلطان محمود غزنوی کی تصویر کا حقیقی رخ

(برہان دہلی ۵۴ اگست)

سلطان محمود کے عدل و انصاف خشیت الٰہی فقرا و صوفیا سے شیفتگی اور ان کے احترام کے چند واقعات بیان کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ سلطان محمود کی حقیقی تصویر یہ ہے نہ کہ انگریز مورخین خاص طور سے انگریز ادیب اڈیسن کے اُدوں والے ذہنی افسانے جنھیں انگریز مورخین بڑے آب و رنگ سے پیش کرتے ہیں۔

۴۱۔ مخمور اکبر آبادی:

خواجہ سر احسن اللہ بہادر نواب ڈھاکہ

(العلم کراچی ۔ جولائی تا ستمبر ۵۴، ۴۹-۶۳)

نواب سر احسن اللہ کے حالات زندگی اور ان کی ہمدردی و شرافت، خدمت خلق، اور دوسرے واقعات جن سے ان کے بلند کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

۴۲۔ ندوی ۔ ابوالحسن:

دوست کی یاد میں

(چراغ راہ کراچی ۵۴ ستمبر ۵-۱۶)

دوسری قسط ۔ مسعود عالم ندوی کے حالات اور ان کے افکار ان کے چند خطوط کے اقتباسات کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

۴۳۔ نسیم احمد فریدی:

شیخ الہ داد دہلوی

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ ستمبر ۲۰-۲۹)

ان ذکر کے بعد کہ شیخ الہ داد خواجہ باقی باللہ کے اکابر

اصحاب میں سے تھے اور تہذیب اخلاق و تصفیہ باطن کی وجہ سے درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور شیخ الہ داد کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۴۔ وحید انور:

چارلس اسپنسر چیپلین

(روح ادب کراچی ۶ سال ۷۔ ۸ نمبر، ۱۴۰۔۱۴۴)

چارلی چیپلین کا اصل اور پورا نام چارلس اسپنسر چیپلین ہے۔ بلاشبہ وہ اس وقت کا سب سے بڑا آرٹسٹ ہے جس کو فلم انڈسٹری نے جنم دیا ہے۔ اپنے دکھ بھرے ماضی سے مواد لے کر اس نے دکھی انسانوں کے مسائل زندگی کو اپنی طنز و مزاح سے بھرپور فلموں میں پیش کیا ہے۔ چارلی ۱۶ اپریل ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔

۴۵۔ ولادیمیر پرزیلوف:

انتون چیخوف

(ہندوستانی ادب حیدر آباد (دکن)، ۵۴، اگست ۲۳۔۲۸)

روس کے اس عظیم مصنف نے "انتوشا چیخونتے" کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ چیخوف کے ابتدائی دور کی تحریر کا جمہوریت پسند رجحان انکے طنزیہ افسانوں میں خاص طور پر نمایاں ہے اس نے روس کے "نچلے" اور ستائے ہوئے طبقہ کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور بہت ہی خوبصورت کہانیاں دیں۔

تاریخ و سیاسیات

۴۶۔ ادارہ:

علوم اسلامی پر ایک مورخانہ نظر

(نگار لکھنؤ ۵۴ جولائی، ۵ — ۱۲)

علوم عرب قبل اسلام، عہد رسالت و خلفائے راشدین عہد بنی امیہ، عہد بنی عباس، حکومت مصر، حکومت اسپین ان عنوانات کے تحت علوم اسلامی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۴۷۔ ادارہ:

اسلامی قافلے

(البلاغ بمبئی ۵۴، ستمبر ۳۳۔۳۴)

قبل مسیح بھی عرب تاجر دور دراز ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے۔ مورخوں نے اپنی تاریخوں میں عربوں کے طویل سفروں کا ذکر کیا ہے۔ مشرق اقصیٰ کو جانے والے عربی قافلے اکثر ہندوستان کے ساحلوں سے ہو کر گذرتے تھے۔

۴۸۔ بیگم شاہ نواز:

قائد اعظم —— چند تاثرات

(ماہ نو، کراچی ۵۴ ستمبر)

مسٹر محمد علی جناح کے ساتھ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک اپنی بعض ملاقاتوں کا ذکر، ان کی سیاست دانی کا اعتراف اور اپنے ارادت مندانہ تاثرات کا اظہار۔ ضمناً کئی دوسرے سیاسی لیڈروں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۴۹۔ پینت ڈی "ص، ع":

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

(معارف اعظم گڑھ ۵۴، اگست ۱۳۵۔۱۴۵)

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی پینت نے "مغلوں کی تجارتی پالیسی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ہندوستان میں اکبر سے لے کر اورنگ زیب کے عہد کی تجارت پر محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ اس مقالہ میں اسی کی تلخیص درج ہے۔

۵۰۔ ڈیسائی مگن بھائی

بٹیل، کانو بھائی نانالال۔ مترجم

راجا رام موہن رائے سے گاندھی جی تک

(دنیا ہند، الہ آباد ۵۴ جولائی ۴۲۴۔۴۲۸)

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کے ابتدائی دور کی کوششوں اور انگریزوں کے اقتدار کے خاتمہ تک موہن رائے کے سیاسی حالات پیش کئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۵۱۔ زین العابدین شمس:

علم و فن، تہذیب و تمدن اور ایجاد و اختراع میں مسلمانوں کا حصہ

(فاران کراچی ۵۴ء ستمبر، ۱۹۔۔۲۱)

مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم عالیہ سے متعلق مختلف انکشافات و ایجادات یورپین ماہرین سائنس و تاریخ کے حوالوں سے پیش کی گئی ہیں۔

۵۲۔ سروج اگروال:

سرودے، بھودان اور ہردے پریورتن

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ء، اگست ۷۵۔۸۴)

سرودے (ہمہ خوش حالی) بھودان اور ہردے پریورتن (تالیف قلوب) کی بنیادی خامیوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے سرودے اور بھودان کا مقصد عوامی جدوجہد کو غلط راستے پر ڈالنا ہے۔

۵۳۔ سریش رام بھائی:

ہردے پریورتن اور بھودان

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ء، اگست ۶۶۔۷۱)

بھودان تحریک کی موجودہ نامقبولیت اور اس کی افادیت کا جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح گاندھی جی سیاسی آزادی کیلئے پیدا ہوئے تھے اسی طرح ملک کی اقتصادی آزادی کے لئے اچاریہ ونوبا بھاوے پیدا ہوئے ہیں اور سیاسی آزادی کی طرح ملک میں اقتصادی آزادی آکر رہے گی۔

۵۴۔ سلیم جعفر:

ہندوکُش یا ہندوکش

(ساقی کراچی ۵۴ء ستمبر ۷۵۔۸۰)

پنجاب کے علاقہ کو قدیم زمانہ میں ہند کہتے تھے۔ "کش" سنسکرت کا لاحقہ ہے جس سے اسم صفت و اسم ذات بنائے جاتے ہیں۔ کش کے معنی کنارہ و ساحل کے ہیں۔ چنانچہ اصل لفظ ہندوکش ہے ہندوکُش نہیں۔ "ہندو" اور "کُش" کے سلسلے میں لوگوں نے خواہ مخواہ غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں

۵۵۔ صباح الدین عبدالرحمٰن،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بعض آلاتِ حرب

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء ستمبر، ۱۷۱۔۱۸۷)

مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تیغ، سپر، کمان، تبر، نیزہ، پاستاں، گرز، ناچخ، پیازی، فلاخن، کمند، کٹار، دشنہ، جمدھر، خنجر، کارد وغیرہ آلاتِ حرب مستعمل تھے مضمون میں ان پر آئین اکبری اور آداب الحرب والشجاعت کے حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵۶۔ ضمیر حسن کاظمی:

سوڈان

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ء ستمبر، اکتوبر ۱۶۵۔۔۱۷۰)

سوڈان کے جغرافیائی محل وقوع، مصر کیلئے اس کی اہمیت، یہاں کی سیاسی پارٹیوں انتخاب اور برطانوی اقتدار کے زوال پر روشنی ڈالی ہے۔

۵۷۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر

عبدالحمید نعمانی مترجم:

عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

(۲)

(برہان دہلی ۵۴ء، جولائی ۲۲۔۳۴)

مضمون کے اس حصے میں زیادہ تر شیخین خصوصاً حضرت عمرؓ کے طریق کار سے بحث کی ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ ان کی خصوصیات میں سے تھا کہ انصاف کی راہ میں کسی سنگ گراں کو خاطر میں نہ لانا، حق کے اظہار میں کسی ملامت کرنے والے کا اثر قبول نہ کرنا اور دن ہو یا رات، ظاہر ہو یا پوشیدہ یہ محسوس کرنا کہ خدا دیکھ رہا ہے، نگرانی کر رہا ہے اور وہ باز پرس کرے گا۔

۵۸۔ طٰہٰ حسین۔ ڈاکٹر

عبدالحمید نعمانی مترجم:

عثمانؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

(۳)

(برہان دہلی۔ ۷۵ء اگست ۲۹-۷۵)

اسلام کے حاکمانہ نظام پر مفصل اور تشریحی بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ قرآن نے کوئی اسلامی نظام حکومت کا ڈھانچہ پیش نہیں کیا اور عہد نبوی میں جو نظام حکومت تھا وہ کوئی الٰہی نظام نہ تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت انسانی معاملات کی سی تھی جس میں صحت و غلطی دونوں کا امکان تھا۔ جمہوریت کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یونانی عہد قدیم اور موجودہ دور تک کی جمہوریت کے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ابتدائی دور میں حکومت کا نظام جمہوری نہ تھا اس لیے کہ حکام کا انتخاب جمہور نے نہیں کیا تھا۔ بحث کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ نبی و نبی کے دونوں خلفاء کیلئے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ ان کو بادشاہ کہا جائے اور جمہوری نظام بھی نہیں تھا کہ زندگی بھر کیلئے صدر کا انتخاب کرلیا جائے، نہ رومی نقطۂ نظر کا قیصری نظام تھا۔ بلکہ خالص عربی نظام تھا جس کی نظیر عربوں کے پاس نہ تھی پھر وہ اس کی تقلید بھی نہ کرسکے۔

۵۹۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر:

عبدالحمید نعمانی مترجم:

عثمانؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

(برہان دہلی ۷۵ء ستمبر ۱۶۱-۱۷۷)

حضرت عثمان غنیؓ کے طریقۂ کار پر تاریخی تبصرہ پیش کیا ہے۔

۶۰۔ عتیق الرحمٰن:

واقعۂ کربلا

(الفرقان۔ لکھنؤ۔ ۷۵ء اگست ۱۷-۲۲)

صحیح تاریخ کی روشنی میں واقعات کربلا کو پیش کیا گیا ہے بہت سی من گھڑت روایات۔ اور واقعات کو غلط ثابت کیا گیا ہے۔

۶۱۔ عتیق الرحمٰن سنبھلی:

واقعۂ کربلا — چند غلط فہمیوں کا ازالہ

(الفرقان لکھنؤ ۷۵ء ستمبر ۳۹-۵۳)

خلافت یزید اور بیعت حسینؓ کی غیر شیعی نقطۂ نظر سے وضاحت کی گئی ہے۔

۶۲۔ لالۂ صحرائی:

اسلامی مشرق کے جدید محرکات

(چراغ راہ کراچی ۷۵ء ستمبر ۲۱-۳۰)

الفریڈ کارلٹن اور ڈبلیو منٹگمری کے مقالہ کا اردو ترجمہ جو امریکی جریدہ دی مسلم ورلڈ میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت دنیائے اسلام کے جدید محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے (۱) مشرق و مغرب کی آویزش کا تاریخی پس منظر، (۲) اسلامی مشرق کے جدید مسائل (۳) مغرب کے افکار و نظریات (الف) نظریہ قومیت (ب) نظریۂ جمہوریت (ج) مارکسزم (د) فلسفہ و سائنس کے نظریات (۴) دین اسلام کی قوت (۵) مذہب عیسائیت کی طاقت، اور (۶) مستقبل کے امکانات۔

۶۳۔ محبوب رضوی:

دہلی آٹھویں صدی ہجری میں

(البلاغ بمبئی ۷۵ء ستمبر ۱۸-۱۹)

علامہ تقی الدین مقریزی نے کتاب الخطط میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں رفاہ عامہ کے لئے دہلی میں ستر شفا خانے اور دو ہزار مسافر خانے اور کاروان سرائیں تھیں۔ بادشاہ خود صاحب علم اور عالموں کا قدردان تھا۔

۶۴۔ مہدی علی:

تاریخ زندگی پر ایک نظر

(سب رس حیدرآباد ۷۵ء ستمبر ۱۷-۲۰)

دنیا میں حیات کے ارتقاء کی تاریخ اختصار کے ساتھ پیش کی ہے۔

تنقید، ادب، لسانیات

۶۵۔ آرزو۔ مختارالدین احمد:

کتب خانہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ شعبۂ مخطوطات

(آج کل دہلی ۵۴ ستمبر، ۲۳۔۲۴)

شعبۂ مخطوطات یونی ورسٹی لائبریری کی تاریخ اور ترتیب جدید، ملکی اور غیر ملکی مقتدر ہستیوں کے معائنے سے متعلق معلومات۔ آخر میں بانیٔ علی گڑھ اور ان کے ساتھیوں کے فوٹو، پھر موجودہ حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر، سید بشیرالدین صاحب لائبریرین اور شعبۂ مخطوطات کے انچارج آرزو صاحب کی تصویریں ہیں۔ بعض نادر قلمی کتابوں کے صفحات کے عکس بھی دئے گئے ہیں۔

۶۶۔ ابواللیث صدیقی:

اقبال اور بیدل

(ماہ نو کراچی ۵۴، اگست ۱۹۔۲۴)

بیدل کے کلام کا جائزہ لیتے اور اقبال و بیدل کے کلام کا تقابل و تطابق کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ بیدل کے یہاں جو انسان کی عظمت، رہبانیت کے خلاف ردعمل، علم کی حقیقت، اصل معرفت، عقل اور جنون، خودداری، خودنگری اور خودشناسی اور سب سے بڑھ کر جدوجہد اور تب و تاب کے جوہر پائے نایاب ہیں، اقبال انھیں کے خریدار ہوئے ہیں اور اسی متاع بے بہا سے انھوں نے اپنی دوکان سجائی ہے۔ ورنہ کچھ ایسے مقامات ہیں جہاں اقبال، بیدل سے الگ راستہ معین کرتے ہیں۔

۶۷۔ اجمل خاں۔ محمد:

ایران کا قومی ترانہ

(آج کل دہلی ۵۴ ستمبر ۵۔۱۲)

ایران کا قومی ترانہ مع اردو ترجمہ اہل ایران اور فارسی زبان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ، عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۶۸۔ ادارہ:

ہندوستان میں بولی جانے والی زبانیں اور بولیاں

(ہندستانی ادب، حیدرآباد (دکن)، ۵۴ جولائی ۱۔۲)

ہندوستان کے رجسٹرار جنرل کے دفتر سے ملک کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی زبانوں کے لحاظ سے آبادی سے متعلق اعداد و شمار کا جو مقالہ شائع ہوا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۶۹۔ ادارہ:

کہاوتیں

(نگار لکھنؤ ۵۴، جولائی ۴۱۔۴۴)

کہاوتوں کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد اردو کی ایک دو کہاوتوں کی پشت پر جو کہانیاں ہیں وہ مختصراً بیان کی گئی ہیں اور چند اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں شعراء نے کہاوتیں باندھی ہیں۔

۷۰۔ ارشد کاکوی:

کچھ وحشت کے بارے میں

(نگار لکھنؤ ۵۴ جولائی ۱۳۔۱۹)

وحشت کلکتوی کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

۷۱۔ اسرار احمد:

اسلامی ادب

(فاران کراچی، ۵۴ جولائی ۱۷۔۲۰)

انسانی کردار کا جو نقشہ قرآن مجید نے پیش کیا ہے اور جو احکام بتائے ہیں، ان کے دائرے میں رہتا اور مطابقت رکھتا ہوا ادب اسلامی ادب ہے۔

۷۲۔ اسرار احمد:

ادب اسلامی کی جمالیاتی قدریں

(چراغ راہ کراچی ۵۴ ستمبر ۳۱۔۳۵)

مضمون میں اس خیال کی تردید پیش کرنے کی کوشش کی

گئی ہے کہ اسلامی ادب میں جمالیاتی تاثرات کیلئے گنجائش نہیں اور یہ بتایا ہے کہ طرز ادا میں حسن پیدا کرکے اسلامی ادب کے جمالیاتی تقاضے پورے کئے جاسکتے ہیں اور اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۳۔ اسلوب احمد انصاری:

فراق گورکھپوری

(ادب لطیف لاہور ۵۴ء، اگست ۲۱-۳۶)

فراق ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کے ایک ممتاز نمائندہ ہیں۔ ان کی پرگوئی اور ان کا وفور ان کی خلاقی کی دلیل ہیں۔ ان کے تخیل میں جو نزاکت اور شادابی، ان کے فکر میں جو گہرائی اور ہمہ گیری، اور ان کی جذباتی کائنات میں جو پختگی اور فراوانی ہے، وہ ان کے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ان کی فنی خامیاں، ان کی قوت اور کمزوری دونوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو جو قدریں دی ہیں، وہ نئی اور اہم ہیں۔ اور ایک طرح سے انھوں نے اردو غزل کا رخ موڑ دیا ہے۔ اس بنیاد پر اگر انھیں جدید اردو غزل میں ایک بڑی اور موثر طاقت مان لیا جائے، تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔

۷۴۔ اقبال محمد:

ایک غیر مطبوعہ خط

(ماہ نو کراچی ۵۴ء، اگست ۲۰ و ۲۱ کے درمیان)

علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۳۰ء کسی خاتون کے نام درج ہے۔ اس میں اقبال نے لکھا ہے کہ اگر ملک کے ایک حصہ میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہو جائے تو (مسلمانوں کی) معاشرتی زندگی بہت جلد سنور سکتی ہے۔

۷۵۔ اقبال سر محمد:

مکاتیب اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء جولائی ۶۹-۷۷)

مولانا سلیمان ندوی کے نام سر محمد اقبال نے جو خطوط لکھے تھے ان میں سے چند ایک (۲۵ تا ۳۴ یعنی دس خطوں) کو یہاں درج کیا ہے۔ موقع موقع سے ضروری نوٹ حاشیہ میں ادارہ نے دیئے ہیں۔ ان خطوط میں روسی عالم مفتی جان عالم نظم خضر راہ و پیام مشرق پر مولانا کے نوٹ، محمد دارالملک کی لطیفہ غیبیہ، انجمن حمایت اسلام، رسالہ ذخیرۃ الدینیہ جادوا گرامی کے شعر پر۔

۷۶۔ اقبال سر محمد:

مکاتیب اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی رح

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء، اگست ۱۳۶-۱۵۴)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اقبال نے جو خطوط لکھے تھے، انھیں اس عنوان کے تحت مسلسل چھاپا جارہا ہے۔ اس قسط میں ایسے پانچ خط ہیں (مثلاً ۳۵ سے لے کر ۳۹ تک)۔ ان میں انجمن حمایت اسلام، علامہ مشرقی تذکرہ وحی و حدیث فقہ اسلامی کی ایک جامع کتاب کی خواہش، آیۂ توریت کی تشریح کے ساتھ اقبال نے اپنے رسالہ اجتہاد کا ذکر کیا ہے بعض بعض جگہ حاشیہ میں ادارہ نے ضروری نوٹ اضافہ کردئے ہیں۔

۷۷۔ اقبال سر محمد:

مکاتیب اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڈھ، ۵۴ء ستمبر ۲۱۳-۲۱۷)

(مسلسل) اس قسط میں ایسے دو خط ہیں (نمبر ۴۰ و ۴۱) ان میں پیغمبر اکرم کی نبوت و امامت (الگ الگ)، امام ابو حنیفہ کے مسئلہ ولادت بعد از دو سال طلاق و وفات شوہر، لا تسبو الدھر الخ و حکیم موسیٰ بن میمون وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ ذیلی حاشیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم کے ضروری اور مفید نوٹس بھی ہیں۔

۷۸۔ اکبر علی ترمذی:

جلالی احمد آبادی

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ جولائی ۵۶-۶۲)

۳۔ اس قسط میں جمعات شاہیہ اور اس کے ماخذ سے بحث کی ہے۔

۷۹۔ امرناتھ جھا ڈاکٹر:
اختر اورینوی۔

اکبر الہ آبادی

(آج کل دہلی ۵۴ء، اگست ۳۹-۴۳)

اُردو شاعری اکبر سے قبل ترقی کی منزلیں طے کر چکی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنے زمانہ میں حالی اور اکبر نے جسد اُردو میں نیا خون داخل کیا۔ اکبر نے اردو شاعری کے مواد اور مزاج میں ایسی بنیادی تبدیلی پیدا کی جو گویا انقلابی تھی۔ اکبر کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی دلچسپ حیثیت رکھتی ہیں۔ یوں تو روایتی انداز کی شاعری اکبر کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اکبر کی شاعری کا بہترین نمایندہ طنز و ظرافت ہے۔ لیکن یہ طنز و ظرافت کسی کو ایذا نہیں پہنچاتے۔ ان کا کام تہذیب و تربیت ہے۔ اکبر رجعت پسند نہیں تھے۔ مادیت کے خلاف روحانیت کے قائل تھے۔ سرسیّد کے مخالف اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔

۸۰۔ انتظار حسین، ناصر کاظمی:

دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
(چاء کی میز پر ایک گفتگو)

(ماہ نو کراچی ۵۴ء ستمبر، ۱۹-۲۸)

انتظار حسین اور ناصر کاظمی کا ایک مذاکرہ، میر کے مندرجہ بالا مصرعہ کو سامنے رکھتے ہوئے موضوع گفتگو، میر سے اپنے دور کے تصورات و شعور انفرادیت اور اجتماعیت، سماج، ساتھ ہی گفتگو میں، موجودہ ادیبوں کے رجحانات پر تنقید۔ پھر اس رائے پر بحث کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ غالب کی شاعری فکر کی شاعری اور میر کی شاعری محض احساس کی شاعری ہے۔ یہ مذاکرہ، اور اظہار رائے مذاکرہ میں موضوع میر اور ان کی شاعری بنیادی چیز ہے۔

۸۱۔ اہرن برگ۔ ایلیا۔ مجیب رضوی مترجم:

لیکھک اور اس کی کلا

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ء جولائی ۴۴)

(مسلسل) مختلف اہم موضوع مثلاً پرگتی شیل ساہتیہ اور اس کا مقصد، کلا بغیر بھاونا کے نہیں ہوتی، اور معین رچنا کی سیڑھی ہے۔ ایک حیرت میں بہت سے دیکھتی چھپے ہوتے ہیں پھر ان پر مفصل بحث اور تشریح کی ہے۔

۸۲۔ ایچ۔ ایس۔ پاٹل:
مترجم۔ مہدی عباس حسینی۔

کنڑا ایک ایکٹ کے ڈرامے

(آج کل دہلی ۵۴ء، اگست ۵۲-۵۵)

ایچ۔ ایس۔ پاٹل کے مضمون کا مہدی عباس حسینی نے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں کنڑا دیس کے ایک ایکٹ کے ڈراموں پر ادبی اور تاریخی حیثیت سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

۸۳۔ برجموہن دتاتریہ کیفی:

داغ ۔ خطوط کی روشنی میں

(آج کل دہلی ۵۴ء، اگست ۵-۱۱)

ضروری سوانحی تعارف کے بعد خطوط کی روشنی میں داغ کی شخصیت پیش کی ہے۔ ان کے اکثر خطوط حیدر آباد سے لکھے گئے تھے۔ رام پور اور دلی کے خطوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ داغ خوددار تھے مگر غالب کی طرح خودبیں ہونے کی حد تک نہیں عیاش طبع ہونے کے باوجود اپنی بیوی اور دوسرے متعلقین کا بہت خیال کرتے تھے۔ شاگردوں کے ساتھ پیار اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ خیابان فارس (ظفر علی خاں) کا مقدمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ داغ کی یہ تنہا طویل نثر ہے۔ نو شاگردوں کے لئے ایک ہدایت نامہ (منظوم) لکھا تھا جو بڑے کام کی چیز ہے احسن مرحوم کے کہنے پر فصیح اللغات کی ترتیب شروع کی تھی۔ یہ کام عجیب تھا کہ احسن محاورے مرتب کرتے اور وہ انھیں نظم کردیتے۔ اچھا ہوا کہ یہ لغت پورا نہ ہوا۔ اسے صحیح طور پر صاحبزادہ ولی احمد خاں نے ترتیب دیا۔ یعنی انھوں نے کلام داغ سے محاورے مرتب کئے اور انھیں "محاورات داغ" کے نام سے شائع کیا۔

۸۴۔ بیتاب بریلوی جگیشور ناتھ:

تبلیغی ادب

(شاعر بمبئی ۵۴ء جولائی ۲۸-۳۲)

اگرچہ ادب کا مفہوم اور اس کی حدوں کا تعین ہو چکا ہے،

مگر بعض ادیب ہنوز اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ ادب بلا تخصیص ایک قسم کا پروپگنڈا ہی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ادب اور تبلیغ کے مابین ایک واضح اور روشن حد فاصل موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پروپگنڈے کا حقائق پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اگر ادب شاہراہِ حقیقت و صداقت سے منحرف ہو جائے تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

۸۵۔ تحسین سروری:

اُردو کی قلمی کتابیں کتب خانہ آصفیہ میں

(سب رس حیدر آباد دکن ۵۴ء ستمبر ۱۴—۱۶)

ڈاکٹر راحت اللہ خاں نے اپنے مضمون "کتب خانہ آصفیہ کی اردو کی قلمی کتابیں" مطبوعہ سب رس ۵۴ء اپریل میں کچھ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ محض کتب خانۂ آصفیہ میں ملتی ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ دیوان چندا، مثنوی گلزار اعظم، عروس مضمون اور دیوان قیس کے بارے میں غلط ہے کہ ان میں کی کئی ایک چھپ چکی ہیں اور باقیوں کے نسخے دوسری لائبریریوں میں ملتے ہیں۔

۸۶۔ تمکین کاظمی:

صفی اورنگ آبادی

(سب رس، حیدر آباد (دکن)، ۵۴ء ستمبر ۶—۱۳)

صفی حیدر آباد کے مشہور شاعر تھے۔ البتہ ان کی قدر ان کی زندگی میں نہیں ہوئی۔ ان کے والد کا نام منیر الدین تھا۔ یہ اورنگ آباد میں مطب کیا کرتے تھے۔ نویں سال صفی اورنگ آباد سے حیدر آباد گئے اور مدرسۂ نظامیہ میں شریک ہوئے۔ اس کے ماحول نے ان میں تاریک خیالی اور پست ہمتی پیدا کی مگر صفی نے بعد میں اپنے آپ کو اس سے بچا لیا۔ ان کے مزاج میں عجلت بے حد تھی جو زندگی و شاعری میں ان کی ترقی کے آڑے آئی۔ شاعری میں صفی، ضیاء دہلوی ظہور دہلوی، فروغ شاگرد داغ اور کیفی کے شاگرد ہوئے کچھ عرصہ مطب بھی کیا۔ خطاط بہت عمدہ تھے۔ ان کی شاعری میں تفکر و تخیل کی کمی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں انتقال کیا۔

۸۷۔ تہور حسین:

ظفر کی شاعری پر مقامی اثرات

(العلم کراچی ۵۴ء جولائی تا ستمبر ۸۹—۹۶)

ظفر کے ان بعض اشعار کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ جن میں ظفر نے خالص ہندوستانی ماحول کی عکاسی کی ہے۔

۸۸۔ جہاں بانو نقوی:

"صلائے عام" کے ناصر علی

(ساقی کراچی۔ ۵۴ء، اگست ۱۱—۱۸)

ساقی ناصر علی نمبر ۳۳ء کے مضمون سے اقتباس کر کے میر ناصر علی کے حالات زندگی۔ خاندان، تعلیم و تربیت ۱۹۰۸ء سے صلائے عام کی ابتدا، اور انتقال سے ایک سال قبل ۳۲ء تک برابر رسالہ کا جاری رہنا اور ان کے اخلاق و کردار زباندانی وغیرہ سے متعلق مختلف گوشوں کو واضح کیا ہے۔

۸۹۔ خصلت حسین صابری:

منشی امیر احمد مینائی لکھنوی کے چند مکتوبات

(العلم کراچی ۵۴ء جولائی تا ستمبر ۷۱—۷۵)

منشی ولایت علی عزیز صفی پوری کے نام امیر احمد مینائی کے چھ خط۔ آخر میں منشی ولایت علی عزیز صفی پوری نے امیر مینائی کے مختصر حالات لکھے ہیں اور اپنی کہی ہوئی مختلف پانچ تاریخ وفات لکھی ہیں۔

۹۰۔ سالک عبد المجید:

لسان العصر

(ساقی کراچی ۵۴ء اگست ۵—۷)

ریڈیو پاکستان کراچی کی ایک تقریر جس میں لسان العصر اکبر الہ آبادی کے وہ اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں مغربیت کی بڑھتی ہوئی رفتار سے مذہب اور مشرقی اخلاقی قدریں ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔

پردہ کے سلسلے میں بھی اکبر کے متعدد اشعار پیش کئے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

۹۱۔ سید حسن:

محمود میاں رونق

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ء جولائی ۴۳-۵۵)

اردو ڈراما سے متعلق کتابوں اور مضامین میں رونق کا ذکر ضرور آتا ہے لیکن ان کے نام اور وطن کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں ملتی۔ ان کا نام محمود میاں اور تخلص رونق ہے۔ وطن احمد آباد ہے۔ کون سا احمد آباد یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا رونق نے ۱۸۸۶ء میں انتقال کیا۔ کوئی ۲۳ ڈرامے ان کی تصنیفات سے ہیں۔ مضمون نگار کے مملوکہ ڈراموں میں خون عاشق، بہرجہت اچھا ڈراما ہے۔ ویسے یہ ڈرامے زمانے کے مذاق کے مطابق ہیں۔ اپنے ڈراموں میں رونق نے ہندستانی اور مغربی موسیقی دونوں ہی سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ ان کے ڈراموں میں مختلف اصناف نظم کے ساتھ ہندی چھند کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ رونق کے کلام میں فنی اسقام پائے جاتے ہیں۔ لمبی بحروں اور ردیفوں میں کہنے کا شوق ہے۔ ناٹکوں میں اساتذہ کی بھی غزلیں شامل کی ہیں۔

ان کے ڈراموں میں بیدل کی ایک غزل بھی ہے کہیں کہیں نثر بھی استعمال کی ہے۔ اور یہ بہت سادہ ہیں۔ ڈراموں میں مزاحیہ عنصر بھی ہے جو اصل پلاٹ سے جدا نہیں ہے۔ رونق اور ان کے ہم عصروں کی زبان پر اعتراض درست نہیں۔ حالات کے علاوہ اپنے ماحول اور ضروریات سے وہ مجبور تھے۔ رونق کی زبان دکنی و گجراتی دونوں کے نمونے اور اثرات رکھتی ہے۔ رونق ذہین اور طباع، ڈراما نگار اور شاعر تھے۔

۹۲۔ شوکت سبزواری:

نئی تنقید کی دقتیں

(ادب لطیف لاہور، ۵۴ء، اگست ۴-۷)

نئے نقادوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کریں۔ اس سے ذاتی صلاحیت کا نمو، ذہن و فکر کی تربیت اور ادراک کی قوتوں کی جلا ہوتی ہے۔ انگریزی ادب و تنقید کو پڑھیں مگر پڑھ کر ہضم کریں اور تب ان کی روشنی میں اپنے ادب کی بات کریں۔ ان کی ایک دقت یہ ہے کہ وہ ادب و زندگی کے رشتے پر زور دیتے ہیں اور کبھی کبھی زندگی کے نمو، حرکت و ارتقا کا نام بھی لیتے ہیں لیکن حرکت و ارتقا سے زندگی میں جو تاریخی تسلسل رونما ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں ان کی سب سے بڑی دقت یہ بھی ہے کہ وہ قدیم عناصر سے بے خبر ہیں۔ وہ قدیم وزن اور اصنافِ سخن کی فنی خصوصیات اور تہذیبی اہمیت سے بھی ناواقف ہیں۔ یہ قدیم ادب کو اس کے اپنے پس منظر میں نہیں جانچتے۔

۹۳۔ شہید اللہ محمد۔ عبدالرحمن بیخود:

بنگلا زبان

(ماہ نو، کراچی ۵۴ء، اگست ۳۹-۴۲)

بنگلا زبان نے اور زبانوں کی طرح سنسکرت سے بھی الفاظ لئے ہیں۔ لیکن لسانی تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق سنسکرت سے نہیں بلکہ اس کی ہم ذات ایک قدیم ہند آریہ بول چال سے ماخوذ ہے۔

۹۴۔ ضیاء الحسن موسوی:

اقبال کا نظریۂ قوت اور فلسفۂ شہادت

(ماہ نو کراچی ۵۴ء ستمبر ۲۹-۳۱)

اقبال کی فکر و نظر کا اہم محور قوت ہے اور اسی پیمانہ سے انھوں نے کائنات کے مشاہدہ اور نقد میں کام لیا ہے۔ ان کو حسن کا اعلیٰ مظہر بھی قوت میں نظر آتا ہے یعنی قوت اظہار حسن ہی سے عبارت ہے اور حق بھی قوت ہی سے زندہ رہتا ہے۔ مثال میں اقبال کے کلام سے ان کے متعدد اشعار پیش کئے ہیں اور آخر میں شہادت حسینؓ سے متعلق اقبال کے کلام سے مختلف اشعار پیش کئے ہیں۔

۹۵۔ ظ انصاری:

نیا سال نئے سوال

(روح ادب کراچی، سال ۷-۸ نمبر ۱۱۲-۱۲۴)

پچھلے کچھ سالوں سے اردو ادب میں جو اکتاہٹ اور جمود کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اس کا تجزیہ کیا اور اسے دور کرنے

کے طریقے بتائے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں ہر اس شاعر و ادیب کو شمار کرنا چاہیئے جو زندگی کے مثبت پہلو کو سامنے رکھتا ہو۔ لام بندی سے بچنا چاہیئے۔ اردو ادب میں جمود کسی کے نہ لکھنے یا کم لکھنے سے نہیں پیدا ہوا ہے۔ یہ جمود دراصل چند خارجی اور داخلی اسباب کی پیداوار ہے معاشی واقتصادی اور سیاسی حالات نے زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ لوگوں کی قوت خرید تقریباً ختم ہوگئی۔ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی مفقود ہوگئی۔ لوگوں نے مطالعہ او رمشاہدہ پر بہت کم توجہ دی۔ اس جمود کو دور کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ادیب و شاعر زندگی کو قریب سے دیکھیں، اس کی جزئیات کو نظر میں رکھیں اور اس کی پیش کش کے لئے بہتر اور موزوں اسلوب او رہیئت وصنف کا انتخاب کریں۔ اپنے اور دوسرے ادبوں کے مطالعے کے ساتھ ساتھ دوسرے فنون کو بھی دیکھیں اور استفادہ کی کوشش کریں۔

۹۶۔ "ع"

امن! امن!! امن!!!
ایرانی شاعری میں

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ ستمبر، ۳۱۔۳۲)

ایران کی جدید شاعری میں امن سے متعلق جن جدید شعراء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ شعراء میں عطا گیلانی، پور داؤد، وحید دست گردی پروین اعتصامی، ہمایوں کرمانی، ملک الشعراء بہار، خانم شہناز وغیرہ ہیں۔

۹۷۔ عابد علی عابد:

بیسویں صدی میں ادبی محفلیں

(ماہ نو کراچی ۵۴، اگست ۱۴۔۱۸، ۱۳۷)

اپنے والد کی زبانی جن ادبی محفلوں کا ذکر سنا ہے ان میں ناظم اقبال، احمد حسین مدیر "شباب اردو"، منشی محمد دین فوق اور حکیم الہ یار خاں جوگی نمایاں تھے۔ ۱۹۲۰ء سے بذات خود ادبی محفلوں میں شرکت کی۔ ان میں کچھ مجالس عزا تھیں۔ بعد میں مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان مشاعروں میں مقالہ نگار کے علاوہ تاجور نجیب آبادی مع اپنے شاگردوں کے، تاثیر تاج، اثر صہبائی، ہری چند اختر، اختر شیرانی، نظیر لدھیانوی فاخر ہریانوی اور سیلا رام وفا وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ آغا شاعر کے کلام کے اثرات، رسالہ کہکشاں، اردو مرکز وغیرہ کی کیفیات دکھائی ہیں۔

۹۸۔ عبادت بریلوی:

جدید اسالیب تنقید

(ماہ نو کراچی ۵۴، اگست، ۳۰۔۳۸)

اردو میں جدید تنقیدی اسالیب انھیں رجحانات کے پس منظر میں پیدا ہوئے ہیں جو دور اول کے ناقدین اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے اہل قلم کی بدولت بروئے کار آئے تھے۔ یوں جدید دور میں تنقیدی اسالیب کے تجربے بھی کئے گئے ہیں لیکن کوئی ایسا انقلابی تجربہ نہیں ہو سکا ہے جس کی ہمہ گیری کسی نئے اسلوب تنقید کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتی۔ اسی لئے جدید اسالیب تنقید کو حالی، شبلی، آزاد، عبد الحق عبد الماجد اور مہدی وغیرہ کی قائم کی ہوئی روایات کا تسلسل کہنا بے جا نہیں۔ جدید اسالیب تنقید کے میلانات فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، وقار عظیم، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، مجنوں گورکھپوری، اور سید احتشام حسین میں زیادہ نمایاں ہیں۔

۹۹۔ عبد الاحد خاں خلیل:

لکھنویت کا صحیح مفہوم

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ ستمبر ۱۳۔۱۶)

لکھنویت کی بنیاد ہمارے سماجی حالات کے علاوہ لکھنؤ کی آب وہوا اور مقابلتہً پرسکون زندگی پر رکھی جا سکتی ہے۔ اور یہ آج بھی ہمارے ادب میں اجاگر ہے۔ تصنع و تکلف ایہام و رعایت لفظی، نسائیت و فحش گوئی، معاملہ بندی، قافیہ پیمائی و مرثیت لکھنویت نہیں اس لئے کہ لکھنؤ کی شاعری میں یہ باتیں کچھ ہی عرصہ تک تھیں۔ لکھنویت دراصل اس

مخصوص انداز بیان کا کہ جس میں "زباندانی" کی بدولت "الفاظ" اور ان کے "محل صرف" پر خاص توجہ دی گئی زباندانوں کی یہ صناعی بشرطیکہ اس پر روح کلام قربان نہ کردی گئی ہو شعر و سخن کے قدرتی محاسن کا عالم دوبالا کر دیتی ہے۔

۱۰۰۔ عبد القوی دریابادی:

حسرت اور جوہر کی جیل کی شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۲۴-۲۹)

(مسلسل) حسرت اور جوہر بیباک و جری قومی لیڈر تھے۔ ان کی جیلیہ شاعری میں بھی ان کی جرأت و بیباکی نمایاں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قید و بند نے ان کی شاعری کی جلا کر دی ہے۔

۱۰۱۔ عبد اللہ۔ سید:

مرزا غالب کا حاسۂ انتقاد

(ماہ نو کراچی ۵۴ء ستمبر ۱۳-۱۸)

غالب نے تنقید میں انتقادی شعور سے کام لیا ہے جو علم سے زیادہ وجدان سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے وجدان کے صحت مند ہونے سے انکار نہیں لیکن کبھی کبھی، اشتعال میں دلیل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

۱۰۲۔ عسکری، محمد حسن:

اردو میں طنز کے اسالیب

(ماہ نو کراچی، ۵۴ء ستمبر ۱۰-۱۳)

مضمون نگار نے کچھ دن قبل اپنے ایک مضمون میں اردو زبان میں ترجموں کی دشواریوں پر بحث کی تھی جس سے متاثر ہو کر بعض لوگوں نے مضمون نگار سے شکایت کی کہ اردو میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا ترجمہ مغربی زبانوں میں ممکن نہیں، اعتراض کو قبول کرتے ہوئے اردو کے متعدد اشعار پیش کر کے بتاتے ہیں کہ واقعی ان کا ترجمہ ممکن نہیں لیکن ساتھ ہی اپنی اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زبان کی انفرادیت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ الفاظ و اسالیب میں کوئی تبدیلی ہی نہ ہو۔ ہمارے اردو ادیبوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے شعور کی تبدیلی کے ساتھ اسالیب بیان وغیرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اور حال یہ ہے کہ ہمارے ادب میں جو نثر استعمال ہو رہی ہے وہ ساخت کے اعتبار سے اردو کی پہلی کتاب کی نثر ہے۔ طنز پر بحث کرتے ہوئے اردو طنز و ظرافت کے جتنے طریقے پائے جاتے ہیں ان کا شمار کرایا ہے اور پھر ان پر بحث کی ہے۔

۱۰۳۔ عسکری محمد حسن:

ہمارے یہاں ڈراما کیوں نہیں؟

(ماہ نو کراچی ۵۴ء اگست ۱۱-۱۳ و ۱۳۶)

اگر ہمارے ادب میں ڈراما نظر نہیں آتا تو اس میں تخلیقی صلاحیت کی کمی یا زیادتی کا سوال نہیں، یہ ہمارے ادیبوں کی شخصیت کی کمزوری ہے۔ اگر یہ صنف ہمارے ادب میں نہ ہوتی تو بھی کوئی بات نہ تھی، ہمارے یہاں تو ڈرامائی احساس ہی نہیں ملتا۔ ڈراما کو اسٹیج کی غیر موجودگی نے نہیں مارا، ہم خود اپنی ہستی کو ایک اسٹیج سمجھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ انسان کی شخصیت کی تبدیلی میں ڈراما پوشیدہ ہے اور ہمارے ادب میں آدمی کی قلب ماہیئت کا تو ذکر ہی کیا تبدیلی کا احساس بھی عام طور سے نہیں ملتا۔

۱۰۴۔ عشرت حسن انور:

اقبال، رومی اور شنکراچاریہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء، اگست ۹۸-۱۰۷)

ذ۔ حق اور کائنات کے وجود کے سلسلے میں مولانا رومی اور شنکراچاریہ ہم خیال ہیں۔ (مسلسل)

۱۰۵۔ عشرت حسن انور ڈاکٹر:

اقبال، رومی اور شنکراچاریہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء ستمبر ۱۶۵-۱۷۶)

جیو یا وجود شخصی کے بارے میں رومی اور شنکراچاریہ کے خیالات یکساں ہیں البتہ الفاظ و بیان کا فرق ہے۔ ان میں اتفاق طریقۂ نفی میں بھی ہے۔ لیکن طریقہ اثبات میں اختلاف ہے۔

۱۰۶۔ علی ابوالحسن ندوی۔
مترجم۔ طیب عثمانی ندوی:

انسانِ کامل

(فاران کراچی ۷۴ء جولائی ۹۔۱۶)

فواد یونی ورسٹی قاہرہ میں "یوم اقبال" کے موقع پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے جو مقالہ پڑھا تھا، طیب عثمانی نے اس کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس مقالہ میں دکھایا ہے کہ اقبال کا انسان کامل یا مرد مومن دراصل قرآنی نظریہ کا "انسان کامل" ہی ہے جو موجودہ دور کے مادی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے انسانیت کی صحیح راہ متعین کرتا ہے۔

۱۰۷۔ عندلیب شادانی:

ڈھاکہ کی ادبی محفلیں

(روح ادب کراچی ۶ سال ۷۔ ۸ نمبر ۱۸۵۔۱۸۶)

۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء و ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۷ء کے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت کے مشاعروں بلکہ ادبی محفلوں کی رونق حکیم حبیب الرحمٰن خاں مرحوم، خواجہ بیدار بخت بیدار اور شرف کی وجہ سے تھی۔ مشاعرے بالعموم طرحی ہوتے تھے۔ اب اگرچہ کافی تعداد میں ڈھاکہ میں شاعر موجود ہیں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں مگر وہ ہی غیر طرحی۔

۱۰۸۔ غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر:

ادب اور دین

(فاران۔ کراچی ۷۵ء ستمبر، ۲۵۔۲۹)

شروع میں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" دونوں نظریوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں عربی شاعری اور فارسی ادیبوں کے نظریات شاعری پیش کئے ہیں آخر میں متعدد موضوع کی نشان دہی کی ہے کہ ایسے موضوع پر لکھا جائے تو وہ اسلامی ادب کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس میں انفرادی شان نہیں تو پھر بقول اقبال

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

۱۰۹۔ فاروقی اظہر علی:

ایڈیٹر اودھ پنچ کے خطوط

(آج کل دہلی ۷۴ء ستمبر ۱۹۔۲۲)

اردو کے ابتدائی اخبارات اور اردو صحافت کی تاریخ پیش کرنے کے بعد اردو خطوط نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی سجاد حسین کے ان خطوط کی فہرست جو انھوں نے وائسرائوں اور نوابوں وغیرہ کو ملکی اور سیاسی حالت ظاہر کرتے ہوئے لکھے ہیں طنز و مزاح جو سجاد حسین کا خاص طرز تھا اس میں ملکی اور سماجی کیفیت مزاح ہی مزاح میں پیش کی ہے۔ اسی انداز نگارش کی وضاحت کی گئی ہے۔

۱۱۰۔ فراق گورکھپوری:

نظم اور غزل

(روح ادب کراچی ۶ سال ۷۔ ۸ نمبر ۹۹۔۱۰۴)

نظم یا تو بیانیہ ہوگی یا منظریہ یا مفکرانہ اور جذباتی۔ بیانیہ اور منظریہ نظم کے سانچے میں خارجی پہلو نمایاں اور غالب ہوگا۔ مفکرانہ اور جذباتی نظم غزل کے بہت قریب آجاتی ہے۔ یہاں نظم اور غزل کی سرحدیں ملنے لگتی ہیں۔ نظم اور غزل کے درمیان رباعی اور قطعہ گمشدہ کڑی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ویسے غزل ہر لحاظ سے نظم سے بلند ہوتی ہے۔ اعلیٰ نظم گوئی کے مقابلے میں اعلیٰ غزل گوئی میں بہت خطرات ہیں۔ زبان، بیان، اسلوب و فلسفے وغیرہ کے پیش نظر نظم غزل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی مطلع سے لیکر مقطع تک غزل میں ہر شعر ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ردیف اور قافیے نظم میں نہیں غزل میں جان ڈال دیتے ہیں غزل میں انتشار دکھانا، اس کے عشق کو کم سمجھنا اور نظم کو اس پر ترجیح دینا غلطی ہے۔

۱۱۱۔ فوق۔ حنیف پروفیسر:

قدیم یا جدید

(ادب لطیف لاہور، ۷۵ء ستمبر ۸۔۱۵)

قدیم اور جدید تنقید ادب پر بحث کرتے ہوئے حالی، سرسید آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، طباطبائی کے اردو ادب کی جامد

روائتوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا کے اور جدید علوم سے
استفادہ کر کے ادب میں نئی روح پھونکنے کا فخر حاصل ہے۔
بحث کے اختتام پر فیصلہ کیا ہے کہ نئی تنقید نے مستقبل پر تعلق
رکھنا سکھایا ہے۔ اس مستقبل کی تعمیر حال و ماضی کی بنیادوں پر
کی گئی ہے۔ ماضی کا ادب العالیہ ہماری تہذیبی میراث ہے
اس کی قدر کرنا نئی تنقید کا اہم کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے
کہ ماضی کو جتنے بہتر طور پر نئی نسل کے ادیبوں اور نقادوں
نے سمجھا ہے وہ پرانے لوگوں (فکر و خیال کے اعتبار سے)
کے بس کی بات نہیں۔

۱۱۲۔ فرمان فتح پوری:

آسی کی شرح دیوانِ غالب

(نگار لکھنؤ ۵۴ء جولائی ۳۰ — ۳۵)

مضمون میں غالب کے چند اشعار کی اس تشریح سے
اختلاف ظاہر کیا گیا ہے جو مولانا آسی لکھنوی نے اپنی شرح
دیوان غالب میں کی ہے۔

۱۱۳۔ کشن پرشاد کول:

خطبۂ صدارت — بہار ریاستی اردو کنونشن

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۴۹ — ۵۲)

اس خطبہ کا ابتدائی حصہ یہاں درج ہے جس میں اردو
دشمنی کی فضا کا ذکر کرتے ہوئے تاریخی و لسانی حیثیت سے
اردو کا ہندی نژاد ہونا دکھایا ہے۔ اگلی قسط میں بھی خواہانِ
اردو کو چند مشورے دئے جائیں گے۔ (مسلسل)

۱۱۴۔ کلب علی خاں فائق:

شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء ستمبر ۱۸۸ — ۲۱۲)

شیفتہ، نواب مرتضیٰ خاں کے بیٹے ۱۸۰۳ء میں بمقام
دہلی پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد ۱۶ سال کی عمر میں شاعری
شروع کی اور مومن کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں غالب سے
اصلاح لی۔ چھ سات سال بعد (۱۸۱۹ء) میں طبیعت اچاٹ
ہوئی اور دیوان کی ترتیب وغیرہ کا خیال نہ رہا۔ لیکن ۱۸۳۱ء
میں نواب فخرالدین خرد نے دیوان کا انتخاب مرتب کیا
۱۸۳۹ء — ۴۱ میں فریضۂ حج ادا کیا اور تقویٰ و پرہیزگاری
کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۹۱۶ء میں شیفتہ کا مجموعۂ کلام
کلیات شیفتہ و حسرتی کے نام سے شائع ہوا۔ پہلے انتخاب کی
طرح مطبوعہ کلیات میں بھی کچھ کلام کو چھوڑ دیا گیا۔ مقالہ نگار
نے اس کلام کو یہاں اپنے فرمودات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس
میں ارباب نشاط میں سے زگجو المتخلص بہ نزاکت اور شیفتہ
کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۱۵۔ کلیم صدیق:

ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری

(ساقی کراچی، ۵۴ء، اگست ۲۶ — ۳۴)

ابتدا میں مختصر طور سے طنز و مزاح کی تعریف بیان کرنے
کے بعد ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری، اس کا انداز فکر، اس کے
موضوعات طنز و مزاح اور اس کے اسٹائل وغیرہ کے سلسلہ
میں متعدد اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔

۱۱۶۔ کوثر چاند پوری:

انجم فوقی بدایونی کا تغزل

(نگار لکھنؤ ۵۴ء ستمبر ۳۹ — ۴۲)

انجم کا پورا نام ظہور محمد اور سن ولادت ۱۹۱۴ء ہے
ماضی قریب میں "اجالے" کے نام سے نظامی پریس بدایوں
نے ان کا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے۔ انجم کے کلام میں قادر الکلامی
اور برجستگی کے ساتھ پختگی، گہرائی اور گیرائی ملتی ہے۔ انجم قنوطی
نہیں رجائی ہیں۔ ان کا تصوف بھی بلند ہے۔ ان محاسن
کے علاوہ زبان و بیان کی خامیاں بھی ان کے ہاں ہیں لیکن
مقالہ میں ان پر تبصرہ نہیں کیا ہے۔

۱۱۷۔ کومارو ف:

رابندر ناتھ ٹیگور اور سوویت یونین

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۴ء جولائی ۳۲ — ۳۴)

غیر ملکوں سے تہذیبی تعلقات قائم کرنے والی سوسائٹی
کی دعوت پر ٹیگور ۱۹۳۰ء میں سوویت یونین گئے تھے

اور انھوں نے مکتوبات روس کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سوویت یونین کی خدمات کو سراہا ہے۔

۱۱۸۔ محمد اسحٰق صدیقی:

فن تحریر کی تاریخ

(نگار لکھنؤ ۵۴ جولائی ۲۰-۲۷)

مندرجہ بالا عنوان پر اس مقالے کا بقیہ جس کی آخری قسط نگار لکھنؤ کے شمارہ بابت نومبر ۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں سامی رسوم خط کی تاریخ پیش کی گئی ہے (باقی آئندہ)

۱۱۹۔ محمد اسحاق صدیقی:

فن تحریر کی تاریخ

(نگار لکھنؤ ۵۴ ستمبر ۲۹-۳۳ تا ۳۸)

(مسلسل) اس مقالہ میں عربی رسم خط کی تاریخ پیش کرتے ہوئے خط کوفی، خط نسخ، اعراب و نقاط، ترتیب حروف، اظہار امداد، تاریخ گوئی، قلم مشجر، حروف کے نام اور معنی پر مفید نوٹ لکھے ہیں۔ مقالہ اگرچہ صفحہ ۳۳ پر ختم ہوجاتا ہے لیکن صفحات ۳۴ تا ۳۸ پر متعلقہ تشریحی امثال اور نمونے ملتے ہیں۔

۱۲۰۔ محمد عزیز:

اقبال
اسلامی نظریۂ ادب کی روشنی میں

(چراغ راہ کراچی ۵۴ ستمبر ۳۶-۳۸)

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کی عظمت انسان اور خودی کے تصور کی بنیاد اسلامی فلسفے پر ہے۔

۱۲۱۔ مدن گوپال:

بولی ـــ ایک اتہاس

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ ستمبر، اکتوبر ۱۷-۱۷)

ہر ملک کی بولی اس ملک کی قدیم معاشرتی زندگی کی حقیقی تاریخ ہوتی ہے۔ اس کلیہ کی روشنی میں بولی کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۲۲۔ مدنی ظہیر الدین:

گجرات کی مثنویاں

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ جولائی ۵-۳۲)

اس مضمون میں گیارھویں، بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی کی چند تازہ دریافت شدہ مثنویوں کی صراحت کی اور ان کا تعارف پیش کیا ہے۔ عبدالملک بہروچی کی تین مثنویاں (۱) مولودنامہ (۲) وفات نامۂ رسول (۳) مدح محبوب سبحانی۔ محمد شفیع کی قصۂ بی بی ارواح۔ رحمت احمد آبادی جو کئی مثنویوں کا مصنف ہے، اس کی (۱) مولودنامہ (۲) لیلیٰ مجنوں (۳) جان کی بینا۔ پربین یا پروین کی قصۂ ہیرالال عبادالله (۱) حضرت اسماعیل (۲) جبرئیل و میکائیل اور (۳) زن بے وفا۔ صالح کی معجزۂ حجر۔ جمال الدین کی چار مطبوعہ مثنویوں (۱) سکندر ذوالقرنین۔ (۲) شاہجہاں و روشن آرا (۳) روشن میاں سوداگر و شمس وددا۔ (۴) عیلی گوہر و اچھو گلا۔ غلام رسول آدا کی (۱) قصۂ بدیع الزماں (۲) قصۂ ٹھگ و سپاہی۔ سمجھو سورتی کی نیونی نامہ اور ان کے شاگرد منظور کی دوسری مثنویوں کے نام گنائے اور دریائے موج و افیونی نامہ کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ بزمیہ مثنویوں کا تذکرہ آئندہ کے مضمون کے لئے اٹھا رکھا ہے۔

۱۲۳۔ مسعود حسین ڈاکٹر:

غزل کا فن

(ادب لطیف لاہور ۵۴ جولائی ۳-۷)

ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی مطلع، ردیف، قافیہ، مقطع اور بحر ہے۔ انھیں سے اس کا اختصار، کیفیاتی وحدت اور موسیقیت متعین ہوتی ہے جس سے بعد کو غزل کا مخصوص ایمائی اور رمزیہ بنتا ہے۔

۱۲۴۔ مسعود حسین۔ ڈاکٹر:

نئے چراغ
فیض احمد فیض

(ادب لطیف لاہور ۵۴ ستمبر ۳۱-۳۸)

فیض کے پہلے مجموعہ نقش فریادی اور آخری دست صبا

کو سامنے رکھتے ہوئے فیض کی شاعری پر تنقید، ان کے تدریجی، ذہنی ارتقا، اور فنی جدت طرازیوں پر بحث کی ہے آخر میں اشارہ کیا ہے کہ جدید تنقید نے ابتدا سے فیض کی نئی آواز کو پہچانا ہے اور تنقیدی عمل کے رد و قبول میں صرف فیض کا نام ہے جو پچھلے دس سال کی تنقیدات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ فیض کی شاعرانہ انفرادیت کیلئے کافی ضمانت ہے اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ ہم ان کی شاعری پر نظر جمائے رکھیں۔

۱۲۵۔ مسعود حسین ڈاکٹر:

ہے عجب مجموعۂ اضداد ای اقبال تو!

(آج کل دہلی ۵۴ ستمبر ۱۴ ـ ۱۸)

یہ بیان کیا ہے کہ اقبال کے افکار میں تضاد پایا جاتا ہے۔ تضاد کی مثالیں بھی پیش کی ہیں اور اسباب پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

۱۲۶۔ مظفر علی سید:

مقامی رنگ

(ادب لطیف لاہور ۵۴ جولائی ۸ ـ ۱۳)

مقامی رنگ کا چرچا انگریزی ادب میں خاصا ہے۔ ہمارے ہاں دکنی شاعروں اور نظیر اکبر آبادی سے ہٹ کر بہت کم ہے۔ اور اگر آیا ہے تو تمسخر کی غرض سے۔ تاہم موجودہ دور کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ہاں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش پائی جاتی ہے مگر یہ کوشش اتنی شاندار نہیں جتنی مصوروں کے ہاں ملتی ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے فنون کے ساتھ ادب میں بھی مقامی رنگ کو نمایاں حیثیت دی جائے ورنہ اس میں جان نہیں آ سکے گی۔

۱۲۷۔ منٹو۔ عابد حسین:

ادبی تنقید

(ادب لطیف لاہور ۵۴ ستمبر ۱۶ ـ ۲۳)

"ن" خاتون کا مقالہ "ادبی تنقید" مطبوعہ ادب لطیف لاہور اگست پر محاکمہ، نئے تنقید نگاروں پر ان کے اعتراضات کا خلاصہ دے کر "ن" صاحبہ کو سلجھے ہوئے انداز اور مدلل طور سے منہ توڑ جواب دیا ہے۔

۱۲۸۔ منیر حسین:

ادب اور زندگی

(فیض الاسلام، راولپنڈی، ۵۴ جولائی ۲۷ ـ ۲۸)

ادب اور زندگی پر مختصر طور سے لکھتے ہوئے آخر میں لکھا ہے، ادیب جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کا ایک حصہ ہوتا ہے، چنانچہ لکھنے والا غیر ارادی طور پر اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے خواہ اس میں زندگی کی نقشہ کشی ہو یا زندگی پر تنقید۔

۱۲۹۔ میاں بشیر احمد:

اقبال کا ایک شعر

(ماہ نو کراچی ۵۴، اگست ۲۷ ـ ۲۹)

اقبال کے سارے کلام میں سے ایک شعر منتخب کرنے کے سلسلے میں دکھایا ہے کہ کن کن شعروں اور اقبال کی مختلف نظموں کے کن حصوں نے مقالہ نگار کو کتنا متاثر کیا ہے اور آخر میں اس شعر کو حاصل انتخاب کے طور پر پیش کیا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب!

۱۳۰۔ ن، خاتون:

ادبی تنقید

(ادب لطیف لاہور ۵۴، اگست ۸ ـ ۱۴)

اردو کے پروفیسر تنقید نگاروں کی خوش اخلاقی کہہ لیجئے یا نیاز مندی کہ ہمارا تنقیدی ادب "مقدمہ شعر و شاعری" اور "شعر العجم" سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یوں تو زیب داستان کی خاطر کچھ اصطلاحی حد بندیاں ضرور ہوئی ہیں جن کی وجہ سے سائنسی، فلسفیانہ، مابعد الطبیعیاتی، عملی، جمالیاتی تاثراتی، نفسیاتی، تشریحی، تخلیقی اور تحقیقی تنقید کے ناموں سے ہمارے کان کسی حد تک آشنا ہو گئے ہیں لیکن ان تمام تنقیدی نظریات کے فیوض و برکات سے اردو کا تنقیدی

ادب اب تک محروم ہے۔ اس بیچارگی اور محرومی کی داستان بڑی عبرت ناک ہے۔

۱۳۱۔ نجم الحسن صدیقی:

جگن ناتھ آزاد کی شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۷ ستمبر ۳۶)

جگن ناتھ آزاد کے پہلے مجموعہ "بیکراں" کے پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ شاعر ابھی راستہ کی تلاش میں ہے۔ دوسرے مجموعے "ستاروں سے ذرّوں تک" کا شاعر زندگی، طاقت اور تاریخ کو جامد نہیں متحرک سمجھتا ہے۔ (باقی)

۱۳۲۔ نذیر احمد ڈاکٹر:

مینا بازار کا مصنّف

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۵ - ۲۲)

ڈاکٹر نذیر احمد، لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنی کتاب "ظہوری" میں یہ تامل ظاہر کیا تھا کہ مینا بازار ظہوری کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی۔ اس پر ڈاکٹر محمد احمد، الہ آباد یونیورسٹی نے معارف کی اشاعت مئی میں مضمون لکھا اور بتایا کہ مینا بازار کا مصنّف ظہوری ہے۔ ان کے مضمون کے جواب میں ڈاکٹر نذیر احمد نے جو مضمون لکھا اس کی پہلی قسط یہاں درج ہے۔

۱۳۳۔ نذیر احمد ڈاکٹر:

مینا بازار کا مصنّف

(معارف اعظم گڈھ ۵۷، اگست ۸۵-۹۷)

ڈاکٹر نذیر احمد نے یہ لکھا تھا کہ ظہوری کا مینا بازار کا مصنّف ہونا مشکوک ہے بلکہ اس کا مصنّف واضح ہے اس کے خلاف ڈاکٹر محمد احمد نے معارف کی ایک گذشتہ اشاعت میں مضمون لکھا۔ جواباً ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے خیال کی صراحت کی۔ اس شمارہ میں اس کی تیسری قسط درج ہے۔

۱۳۴۔ نذیر احمد ڈاکٹر:

مقدمۂ مینا بازار نوشتہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی پر ایک نظر

(معارف اعظم گڈھ ۵۷ ستمبر ۲۲۰-۲۳۶)

مینا بازار از ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کے مقدمہ پر تبصرہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اس مقدمہ میں طرح طرح کے تاریخی و تنقیدی و تحقیقی اسقام ہیں۔

۱۳۵۔ نور الحسن ہاشمی:

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۷ ستمبر ۱۷-۲۷)

موجودہ لکھنوی ادب کے تحت اثر لکھنوی کی زندگی اور شاعری کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے۔

۱۳۶۔ نور الحسن ہاشمی:

اقبال کا نظریۂ شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۷ ستمبر ۶-۱۲)

روایتی انداز کی شاعری اقبال کے ہاں ضرور ملتی ہے لیکن اقبال اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے ہاں خلوص اور سوز و درد ہے اور اقبال اسی کے قائل ہیں۔ اقبال شاعر کا بہترین انسان اور مصلح ہونا چاہتے ہیں۔

۱۳۷۔ وارث حسین علوی:

سوداؔ کا طنزیہ کلام

(شاعر بمبئی ۵۷ جولائی ۱۶-۲۷)

سوداؔ نے ہجو گوئی ایک دلچسپ مشغلہ کے طور پر شروع کی لیکن اس میدان میں اپنی ذہانت اور طباعی کے وہ جوہر دکھائے اور اس کا دامن اسالیب بیان کی خوبیوں اور شعری محاسن کے انمول موتیوں سے بھر دیا کہ ایک ناقابل اعتنا اور نظروں سے گری ہوئی صنفِ سخن بامِ عروج پر پہنچ گئی۔

۱۳۸۔ وحید الدین فقیر سید:

اقبالیات

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۷ جولائی ۲۹-۳۴)

ناقل مضمون "م" فرماتے ہیں کہ فقیر سید وحید الدین نے روزگار فقیر کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں علامہ اقبال نے اپنے والد مرحوم کی اور اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے جن میں روضۂ اطہر پر حاضر ہونے کا سبب، قرآنی وحی، قرآن اور گوئٹے، غائبانہ عقیدت، نشان مزار تک ، خاکساری

اور ان کے علاوہ متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۹۔ وزیر آغا:

نئے چراغ ۔ مسعود شاہد

(ادب لطیف لاہور ۵۴ء جولائی ۲۹-۳۴)

شمس آغا کی طرح نقادان فن نے مسعود شاہد کی بھی تخلیقات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ مسعود شاہد اپنے فن کی ممتاز خصوصیت ۔ نظر عمیق، مضبوط فن کارانہ گرفت، ایک نئے زاویے کی تلاش اور دل کش اسٹائل کے باعث ہمارے جدید افسانوی ادب میں یقیناً ایک نئی آواز تھا۔ افسوس! ناگہاں موت نے اسے موقع نہیں دیا کہ وہ اپنے فن کو وسعت دے سکتا۔

+ + +

آرٹ

۱۴۰۔ ایم مکند راج:

کتھا کلی

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۴ء ستمبر ۱۶-۱۷)

کتھا کلی، اداکاری رقص اور موسیقی کا مجموعہ ہے اس میں اداکار نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ گاتے ہیں بلکہ ہاتھوں اور چہروں کے اشاروں سے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

۱۴۱۔ جلیب احمد:

سرزمین عشق

(آج کل دہلی ۵۴ء ستمبر ۳۴-۳۹)

ٹونک (راجستھان) کی بعض سڑکوں بازاروں مندروں مسجدوں اور بعض دوسری عمارتوں کا سرسری ذکر۔

۱۴۲۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

داستان امیر حمزہ

(ماہ نو کراچی، ۵۴ء اگست ۱۷۱-۱۷۸، ۱۷۶)

ہر ملک و قوم کے آرٹ کی اپنی نوعیتیں اور خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ عرب کا آرٹ ایران کے آرٹ سے الگ ہے اور ایرانی مصوری سے مغل مصوری جدا ہے۔

داستان امیر حمزہ میں اسی مغل مصوری کے شاہکار نمونے ہیں اور اس وقت کی زندگی اور اس کے تیور کے آئینہ دار ہیں۔

۱۴۳۔ چغتائی عبدالرحمٰن:

"داستان امیر حمزہ"

(۲)

(ماہ نو کراچی ۵۴ء ستمبر، ۳۲-۳۵)

اس عنوان کی یہ دوسری قسط ہے جس میں داستان امیر حمزہ کی تصویروں کا تاریخی و فنی جائزہ لیتے ہوئے مغلوں کے فن مصوری، اور ایرانی مصوروں کی ماہرانہ اور فنکارانہ صلاحیت و قابلیت، اور ان کی انفرادیت و عظمت پر ماہرانہ نظر ڈالتے ہوئے آرٹ کی تشریح کی ہے۔ یہ بھی غلط ثابت کیا ہے کہ داستان امیر حمزہ کی تصویرکشی میں (بحوالہ ابوالفضل) دربار میں کوئی ایسا ہندو موجود تھا یا کابل سے فنکاروں کے ساتھ لایا گیا یا دربار میں پیش کیا گیا تھا۔ جو ایرانی فنکاروں کے آنے سے پہلے تصویرکشی میں دسترس رکھتا تھا۔

"تیمور کا گھرانہ" ایک تصویر جو برٹش میوزیم میں موجود ہے وہ مغل مصوری کی امتیازی خصوصیات کے باعث ایک زندہ شاہکار ہے۔

۱۴۴۔ درانی سعید اختر:

لندن کے عجائب خانے

(روح ادب کراچی ۶ سال ۷-۸ نمبر ۱۳۳-۱۳۹)

لندن کے مشہور عجائب خانوں مثلاً البرٹ وکٹوریہ آرٹ میوزیم، "مادام تسو" کا عجائب خانہ (موم کے پتلے وغیرہ برج لندن)، اور طبقات الارض کے عجائب خانہ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

۱۴۵۔ براشد، سید محمد مطیع اللہ:

خان خاناں عبدالرحیم خاں کی ایک نادرۂ روزگار یادگار

(معارف اعظم گڑھ ۵۴، اگست، ۱۲۰۔۱۳۴)

اپنے زمانۂ امارت میں خان خاناں نے برہان پوریوں کی آبی دقت کو دور کرنے کے لئے سست پڑا پہاڑ کے اندرونی حصہ کا پانی ایک زمین دوز نہر کے ذریعہ شہر میں پہنچایا تھا۔ یہ مضمون اس نہر اور بعد کے نہری کارناموں سے متعلق ہے۔

معاشرتی حالات

۱۴۶۔ حامد الانصاری غازی:

قدیم ہند میں پیداوار کی قدریں

(آج کل دہلی ۵۴، اگست ۵۶۔۵۹)

ہندوستان کھیتوں کا ملک ہے اور رہے گا۔ اسی لئے کسان ہندوستانی زندگی میں ایک خاص اور اونچے مقام کا مالک ہے۔ ہندوستان اور کسان کا تعلق زمانۂ ماقبل تاریخ سے ہے۔ زمین اور آسمان پر دیوتا اس کی مدد کرتے رہے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا کام صرف پیداوار اگانا ہی نہیں تھا بلکہ پیداوار بڑھانا بھی تھا۔ وہ کسانوں کے ناخدا تھے اور خود کسان انسانوں کے درمیان دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔

۱۴۷۔ سلیم اللہ فہمی:

مشرقی پاکستان کی سماجی زندگی

(ساقی، کراچی، ۵۴ ستمبر، ۲۱۔۲۳)

فرید پور، بولائی، رنگ پور، چاٹ گام، ڈھاکہ اور سلہٹ کی ادبی اور سماجی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔

۱۴۸۔ کمار پیا، جے، سی، ڈاکٹر:

انتر راشٹریہ بدامنی
اس کے کارن اور علاج

(نیا ہند۔ الہ آباد، ۵۴ جولائی ۴۲۔۴۸)

مئی ۱۹۵۴ء میں وشو شانتی کونسل کی میٹنگ برلن میں ہوئی تھی ہندوستان سے بھی ایک وفد گیا تھا جس کے صدر پنڈت سندر لال تھے اسی میٹنگ میں ڈاکٹر کمار پیا نے موجودہ عالمی بےچینی کے اسباب اور اس کے علاج پر ایک تقریر کی تھی۔ اس میں عالمی بےچینی کے مختلف اسباب پیش کرتے ہوئے ان کا علاج پیش کیا ہے۔

۱۴۹۔ کمار پیا۔ بھارتن ڈاکٹر:

بھارت میں شانتی کیلئے اندولن

(نیا ہند۔ الہ آباد ۵۴ جولائی، ۱۹۔۲۳)

اس سال اپریل میں دنیا بھر کے پیسیفسٹ جاپان میں جمع ہوئے تھے ڈاکٹر کمار پیا ہندوستان کی طرف سے نمایندہ تھے، انھوں نے جلسہ میں تقریر کی اور بتایا کہ ویسے تو ہندوستان میں شانتی اور اہنسا کی سعی و کوشش لگ بھگ دو ہزار برس سے شروع ہوئی تھی، اس مضمون میں مہاتما گاندھی نے شانتی اور امن کے لئے جو طریقے اور اصول اختیار کئے تھے انھیں کا بیان مقصود ہے۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی نے جو ذرائع اختیار کئے انھیں مختصر طور سے بیان کیا ہے (۱) مانو بھاونا کی کٹھورتا (۲) راج کاجی جیون میں۔ ارتھک جیون میں۔ کھیتی میں۔ ان سب موضوع کی تشریح و تفصیل بیان کی ہے۔

۱۵۰۔ مختار احمد:

پیکنگ میں میری پہلی عید

(نیا ہند۔ الہ آباد ۵۴ جولائی، ۳۷۔۴۲)

مختار احمد صاحب پیکنگ یونیورسٹی میں اُردو

پروفیسر ہیں۔ انھوں نے پیکنگ کی عید، مسجد اور مسلمانوں کے رسم و رواج پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۱۔ ہنس راج رہبر:

ہندستانی کلچر

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ء ستمبر، اکتوبر ۱۴۴-۱۴۰)

مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ویدک کلچر عوامی تھا اور آنے والی تہذیب اور کلچر بھی عوامی ہی ہوں گے اور ان کی بنیاد زیادہ استوار ہوگی کیونکہ بقول مقالہ نگار ذرائع پیداوار بڑھ گئے ہیں اور یہ کہ بورژوا کلچر کو عوامی کلچر کے لئے جگہ خالی کرنی ہوگی۔

۱۵۲۔ یوسیس:

امریکہ کے اصلی باشندے

(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۴ء جولائی ۵-۱۶)

امریکہ کے اصلی باشندے حبشی نہیں بلکہ سرخ فام انڈین ہیں۔ مضمون میں ان کے کچھ حالات پیش کئے گئے ہیں۔

تعلیمات

۱۵۳۔ اختر حسین رائے پوری:

تعلیم کے سو سال

(ساقی کراچی ۵۴ء ستمبر، ۱۱-۱۲)

سو سال پہلے ہندوؤں اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی حالت اتنی ابتر نہ تھی، جتنی بتلائی اور سمجھی جاتی ہے۔ البتہ نظام حکومت کی تبدیلی نے قدیم و مروجہ نظام تعلیم کی کایا پلٹ دی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور دلی کالج جاری کیا۔ علی گڑھ کی مسلم یونی ورسٹی جامعہ ملیہ، اور ندوۃ العلماء نے مسلمانوں کی تعلیم میں خصوصی حصہ لیا۔ تاہم بدلے ہوئے حالات میں تعلیم کا دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور وہ ہو رہا ہے۔

۱۵۴۔ ادارہ:

حضرت عمرؓ کا نظام تعلیم

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ء جولائی ۲۷-۲۸)

حضرت عمرؓ نے ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ہمہ گیر نظام تعلیم مرتب کیا تھا۔ بچوں کے علاوہ بالغوں اور فوجیوں کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ قرآن کے علاوہ عربی زبان و ادب کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ آپ نے سب سے پہلے مدرسین کی تنخواہیں مقرر کیں۔ فوجیوں کو وظائف دئے۔ فوجوں کے محکمۂ تعلیم کے رجسٹر دربار خلافت میں آتے تھے۔ اساتذہ کے انتخاب پر بھی خاص توجہ تھی۔

۱۵۵۔ انتظام اللہ شہابی:

اسلامی نظام تعلیم کا احیاء

(العلم کراچی ۵۴ء جولائی تا ستمبر، ۱۰۳-۱۰۷)

ابتدا میں رسول کریمؐ اور آپ کے خلفاء و صحابہ کے دور میں جس طرح تعلیم دی جاتی تھی اس کی مثال پیش کی ہے۔ بعد میں مسلمانوں کی حکومت کی وسعت کے ساتھ ساتھ طریقۂ تعلیم اور مدارس کا ذکر ہے۔ آخر میں کہا ہے کہ پاکستان میں دوبارہ قرن اول کا نظام تعلیم جاری کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ علوم جدیدہ بھی پڑھائے جائیں۔

۱۵۶۔ انیس فاطمہ بریلوی:

تعلیم بالغان کی اہمیت و ضرورت

(العلم کراچی ۵۴ء، جولائی تا ستمبر ۶۸-۷۰)

تعلیم بالغان کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد عورتوں کو تعلیم دینے اور انھیں سہولتیں پہنچانے کیلئے حکومت اور عوام کو توجہ دلائی ہے۔

۱۵۷۔ بلوچ، این۔ بی۔ ڈاکٹر:

ثانوی تعلیم میں پیشہ ورانہ رہنمائی کی ضرورت

(العلم کراچی ۵۴ء جولائی تا ستمبر ۹۷-۱۰۲)

ہر طالب علم کی انفرادی اور صحیح ترقی کیلئے ضروری ہے کہ

اس کی زندگی کے جسمانی، ذہنی ذاتی سماجی اخلاقی مذہبی اور پیشہ ورانہ پہلوؤں میں اس طرح رہنمائی کی جائے کہ وہ انھیں ترقی دے سکے، پاکستان میں نظام اسکول میں رہنمائی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے طالب علم تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی قوم پر بار بن جاتا ہے، آخر میں پیشہ ورانہ رہنمائی کے لئے مختلف اصول بیان کئے ہیں اور حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ تعلیمی نظام میں تبدیلی کی جائے۔

۱۵۸۔ ج۔ا:

چین میں تعلیمی ترقی

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۴، اگست ۱۶)

نئے چین میں تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس کا ہلکا سا خاکہ دیا گیا ہے۔

۱۵۹۔ چیٹر جی۔ سی۔ جی:

ہندوستان میں تعلیم کا مستقبل

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۴ جولائی ۵-۷)

سرکاری ملازمتوں کے لئے موزوں عملہ مہیا کرنے میں یونی ورسٹی کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

۱۶۰۔ عابد حسین بلگرامی۔ ڈاکٹر:

تعلیم و تربیت قیادت

(العلم کراچی ۵۴، جولائی تا ستمبر

لیڈر شپ کے لئے کن کن اصولوں پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے مثلاً تربیت عام، ضبط و نظم کی تربیت جسمانی صحت، مشاغل کی تیاری۔ ان سب پر پوری توجہ کی ضرورت اسکول کے بچوں میں ابتدا ہی سے لازمی ہے۔ آخر میں کہا ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں میں بچوں کی تربیت کا بندوبست نہ ہوگا تو اچھے لیڈر نہ پیدا ہو سکیں گے لیڈر شپ کا معیار ذاتی کردار ہی اور ذاتی کردار کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔

۱۶۱۔ ڈر یسیڈرج کیتھرین۔ ڈاکٹر:

تعلیم ایک جمہوری ملک میں

(العلم کراچی ۵۴، جولائی تا ستمبر ۱۴-۴۲)

امریکی طریقۂ تعلیم ایک کلاس روم کی مثال دے کر پیش کیا ہے کہ بچوں میں کس طرح کسی ایک ملک کے بارے میں اس روز کی اہم خبر کو موضوع بنا کر پھر طلباء کی مختلف ٹولیاں بنا دی جاتی ہیں اور ایک ایک کام ایک ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور دن بھر میں یہ کمیٹیاں اپنے اپنے کام پورا کر کے پھر پورے درجہ کے سامنے پیش کرتی ہیں کلاس روم کی پہلی خصوصیت حقیقت و صداقت کی جستجو (۲) طریق کار حکومت کی طرح (۳) درجہ میں فرد کے احترام کے اصول پر عمل۔ یہ تمام لائحہ عمل عقلی

۱۶۲۔ سنجیوا راؤ:

ہندوستان میں تعلیم کا مستقبل

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۴ ستمبر ۹-۱۰)

ایک تعلیم یافتہ انسان کو یہ جاننا چاہیئے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور سماجی زندگی میں اسے کون کون سے فرائض ادا کرنے ہیں۔

۱۶۳۔ سعید احمد رفیق۔ پروفیسر:

برصغیر ہند و پاکستان میں یورپین اقوام کی ابتدائی تعلیمی کوششیں

سولھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی کے آخر تک پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں جو تعلیمی ادارے اپنے مقاصد و مفاد کے لئے قائم کئے تھے ان کی مختصر تاریخ۔

۱۶۴۔ عبد الصمد خواجہ:

قومی تعلیم و تربیت میں اصلاح کی چند تجاویز

(العلم کراچی ۵۴ جولائی تا ستمبر ۸۲-۸۸)

ابتدا میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی وہ تصویر پیش کی ہے جو قرون اول میں تھی اس کے بعد پاکستان کے موجودہ طریقۂ تعلیم کے نقائص اور کمزوریوں پر اشارہ کرتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ امداد باہمی۔ اور عملی تعلیم کی ضرورت ہے۔ موجودہ نظام تعلیم بچوں کو خود غرضی مادہ پرستی اور

الحاد کی طرف بہا کر لے جا رہا ہے اسکولوں میں درس قرآن کی شدید ضرورت ہے جس سے ان میں اخوت و ہمدردی کے جذبات اجاگر ہوں گے۔

۱۶۵- قادری۔ ڈاکٹر محمد افضال حسین:

تعلیم میں اسلامی رنگ

(فاران کراچی۔ ۵۴ء ستمبر ۲۲-۲۴)

تعلیم میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تعلیم کا مقصد تعلیم کا مواد اور تعلیم کا طریق کار سب کے سب اس کے لئے مناسب اور موزوں ہوں بیضون میں انھیں کی تشریح کی گئی ہے آخر میں کہا ہے کہ دنیا بھر کے لئے یہ بات ناگزیر ہو گئی ہے کہ علم کی بنیاد روحانی قدروں پر رکھی جائے، ورنہ علم کا رخ مردم کشی کی جانب پھر جانا ناگزیر ہے۔

۱۶۶- گارڈنر۔ آر۔ ایس ڈاکٹر:

تعلیم کا جدید رجحان

(العلم، کراچی ۵۴ء جولائی تا ستمبر ۱۸-۲۰)

ڈاکٹر گارڈنر آر۔ ایس نے پاکستان کے نظام تعلیم پر چند ماہ کے غور و خوض کے بعد رائے ظاہر کی ہے کہ دوسرے ممالک میں تعلیم کے سلسلہ میں جو تجربات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان کی روشنی میں، پاکستان میں تعلیمی ادارے اور کلاس روم ٹیچر سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں (۲) ٹیچروں کی مقامی انجمنیں بہت کم ہیں (۳) سکنڈری اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیمی طریقوں کے مقابلہ میں فرسودہ و پسماندہ ہیں (۴) پاکستانی ٹیچر کا معیار بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ پورے نظام تعلیم میں تجربہ، طبع زاد اور اشاعتی کام کی ضرورت ہے ۱۹۵۰ء میں امریکہ میں ایک گروپ یونٹ کی تشکیل ہوئی۔ اس سے اساتذہ نے بہت فائدہ اٹھایا اگر ایسا ہی ادارہ پاکستان میں قائم کیا جائے تو اساتذہ کو منظم و مستعد اور تعلیمی مسائل پر غور و بحث سے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ کونسل کے قیام کے لئے صرف ایک آدمی کی ضرورت ہے روپیہ پیسے کی ضرورت نہیں۔

۱۶۷- گریفن۔ گلائیڈ سی۔ پروفیسر:

کالج کی تعلیم کا ایک نیا طریقہ

(العلم کراچی ۵۴ء، جولائی تا ستمبر ۲۴-۲۵)

ابتدا میں امریکہ کی کالج تعلیم کی نمایاں خصوصیات اور ان کی افادیت کو بیان کرنے کے بعد آخر میں کہا ہے کہ اول طالب علم کو انسان کے شاندار ورثہ کے اہم ترین پہلوؤں سے روشناس کرانا اور متعلقہ شعبوں اور ضابطوں کے اہم نکتوں سے آگاہ کرنا تاکہ وسیع مسائل پر متوازن فیصلہ کر سکے۔

دوم تنقیدی طریقہ پر سوچنے اور آزادانہ طور سے تجربہ کے بہترین لوازم سے کام لینے کی تربیت دینا۔

سائنس

۱۶۸- سید محمد۔ ایم۔ اے:

ہائیڈرازائن

(ہندوستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۴ء جولائی ۸-۹)

ہائیڈرازائین کی خصوصیات اور استعمال پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ہائیڈرازائین سے بنتی ہیں۔

وفیات

۱۶۹- سعید احمد:

شمس العلماء عبدالرحمٰن کی وفات

(برہان دہلی ۵۴ء ستمبر ۱۳۰-۱۳۲)

شمس العلماء دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے سابق صدر تھے۔ زمانہ ملازمت میں عربی و فارسی کے علاوہ مغلیہ سلطنت سے متعلق تاریخی لکچر بھی دیا کرتے تھے۔ مختلف اداروں اور کانفرنسوں میں آپ کے مقالوں سے دھوم

بیچ جایا کرتی تھی۔ طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے۔ فارغ التحصیل ہوکر "مہیبہ اخبار" میں ملازم ہوئے اور "ابن خلدون" کا ترجمہ کیا۔ اسی کی بناء پر ڈاکٹر نذیر احمد نے دہلی کالج کی پروفیسری کیلئے انھیں منتخب کیا تھا عربی شعر و ادب اور اسلامی تاریخ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ اُردو زبان کے صاحب طرز ادیب تھے آپ کی کتاب "مرأۃ الشعراء" بہت کامیاب کتاب ہے کراچی میں انتقال کیا۔

متفرقات

۱۷۰۔ احمد اللہ ندوی:

کتاب الجواہر کا تعارف

(العلم کراچی ۵۸ جولائی تا ستمبر ۶۴-۶۷)

کتاب الجواہر جس کا پورا نام کتاب الجماہر فی سرفتہ الجواہر ہے اس کے مصنف ابوریحان البیرونی ہیں، جرمن مستشرق ڈاکٹر کرنکو نے اسے ترکی کے تین قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے ایڈٹ کیا ہے اور دارالترجمہ حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا موضوع جواہرات کی قیمتیں ان کے واقعات، اوزان اور قیمتیں وغیرہ ہیں۔

۱۷۱۔ بلراج ساہنی، مترجم۔ احمد مکی:

فلموں میں نئے رجحانات

(سب رس، حیدرآباد (دکن) ۵۸ ستمبر ۵-۶۰)

یہ سوچنا کہ عوام اچھی اور بلند تصویروں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، غلط ہے۔ ان میں اچھے اور بُرے کی تمیز موجود ہے۔ اور آج کل وہ فلموں میں صداقت اور حقیقت کے طالب ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ ان حقیقتوں کو اچھی طرح سے پیش نہیں کیا جاتا۔ ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں ہی اپنی اپنی دھن میں غلط حقیقتوں کو پیش کرنے پر مصر ہیں اور یہ غلط ہے۔

۱۷۲۔ تاراچند ڈاکٹر:

میرا ایران کا سفر

(نگار لکھنؤ ۵۸ جولائی ۳۶-۴۰)

سفر ایران کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔

۱۷۳۔ رٹنر ما۔ بی۔ ایل:

وکٹوریہ ٹاور

(ہندوستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۸ جولائی ۲۲-۲۳)

ولیسٹ منسٹر کے وکٹوریہ ٹاور کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جہاں پارلیمنٹری حکومت سے متعلق چار سو سال پُرانی ۵ لاکھ تاریخی دستاویزیں پڑی ہوئی ہیں جن میں ممتاز و عظیم شخصیتوں اور ظالموں اور مظلوموں کی تحریریں بھی شامل ہیں۔

۱۷۴۔ علی ابوالحسن ندوی۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی مترجم:

سفر مصر

(الفرقان لکھنؤ ۵۸ جولائی ۳۳-۴۰)

سید ابوالحسن علی ندوی کی ڈائری کے چند اوراق کے اس ترجمہ میں بعض شخصیتوں اور جماعتوں کا ذکر ہے اور ان سے متعلق تاثرات کا اظہار ہے اور ایک تقریر کا خلاصہ ہے جو سید صاحب موصوف نے "دعوت الی اللہ کی عظمت و رفعت، اس کی غیر معمولی ذمہ داریاں اور اسکی اہلیت کے شرائط کے بارے میں" مرکز انصار السنہ میں کی۔

تبصرے

۱۷۵۔ رشید حسن خاں:

سموم و صبا پر ایک نظر

(نگار لکھنؤ ۵۸ ستمبر ۱۴-۲۳)

جوش ملیح آبادی کے مجموعۂ کلام "سموم و صبا" پر یہ کہہ کر کہ اس میں انکی شاعری کے مشہور عناصر مثلاً زور بیان، طرفگئ استعارات منظر نگاری وغیرہ ملتے ہیں، تبصرہ کیا ہے اور زبان و بیان کی خامیوں اور محاورات کا غلط صرف دکھایا ہے۔

۱۷۶۔ مصطفٰے علی بریلوی:

نقد و نظر ـــ نقد اقبال

(العلم کراچی، ۵۸ جولائی تا ستمبر ۱۱-۱۱۹)

مصنفہ سیکش اکبرآبادی، حجم ۲۱۶ صفحات۔ قیمت تین روپیئے۔ ملنے کا پتہ پاکستان میں :۔ حکیم مرزا احسان علی بیگ، نرنکاری بازار ۱۴/۱۷ راولپنڈی۔

ہندوستان میں :۔ شاہ اینڈ کمپنی۔ وصی روڈ۔ آگرہ۔

ناشر :۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی ـــ اجمل پریس بمبئی نمبر ۳

فہرست مضامین نوائے ادب بمبئی

جنوری تا اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء

جلد پنجم

اُردو کا بے مثال ادبی مجلّہ

نقوش

بیسویں صدی کے تمام نامور اہلِ قلم کے شخصی تذکرے

شخصیات نمبر

کی صورت میں پیش کرتا ہے

جو من گھڑت افسانوں سے زیادہ دلچسپ اور روایتی سوانح نگاری سے مختلف ہیں

اِس میں آپ کا ہر محبوب ادیب ایک انسان کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اِن غیر فانی اور جیتی جاگتی شخصیتوں کے تمام تر خدوخال اہلِ قلم حضرات ہی کے جگری دوستوں اور عزیزوں نے سپردِ قلم کیے ہیں کہ وہ کس طرح سوچتے ہیں۔ اُن کے رہن سہن، عادات و اطوار کے علاوہ ان کی زندگی میں کون کونسے اہم واقعات و حادثات گذرے ہیں۔ اور ان میں کون کونسی اِنسانی خوبیاں اور کمزوریاں ہیں۔

—— اس نمبر میں ——

حالی	شبلی	سلیمان ندوی	شرر	محمد حسین آزاد	راشد الخیری	وحید الدین سلیم	مہدی افادی
میر ناصر علی	مولوی عنایت اللہ	محمود شیرانی	یلدرم	گرامی	مرزا رُسوا	آغا حشر	بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق
ابوالکلام	ظفر علی خاں	اقبال	خواجہ حسن نظامی	پطرس	فرحت اللہ بیگ	حسرت موہانی	عظیم بیگ چغتائی
دتاتریہ کیفی	ذاکر حسین	عبدالماجد دریا آبادی	رشید احمد صدیقی	فانی	حفیظ جالندھری	جگر	فراق
فیض	عصمت	منٹو	کرشن چندر	قرۃ العین	ہاجرہ	احمد ندیم قاسمی	عبدالقادر
چراغ حسن حسرت	عبدالمجید سالک	مجنوں	احتشام حسین	آل احمد سرور	کلیم الدین احمد	جذبی	عابد علی عابد
غلام عباس	بیدی	مفتی	شفیق الرحمٰن	جذبی	مجاز	راشد	تاثیر

ایسے ایسے قریباً ایک سو تابندہ اور زندہ جاوید ادبا و شعرا کا تذکرہ ہے۔

ادارۂ نقوش اِس نمبر کو بڑے فخر اور اس احساس کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ نمبر اردو ادب کی تاریخ میں بڑا اہم درامٹ کارنامہ ہے

بے شمار تصویریں — قریباً سات سو صفحات — قیمت چھ روپے

مینجر ماہنامہ "نقوش" ۱۱۔ مال روڈ —— لاہور

برانچ آفس، ایبک روڈ۔ انارکلی

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی، ایچ، ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور انھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔ جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

نمائندہ خصوصی

و

ترسیل زر کا پتہ

رائیٹرس امپوریم لمیٹیڈ

POST BOX NO. 1411, BOMBAY 1.

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

اپریل ۱۹۵۵ء

جلد (۶) نمبر (۲)

چندہ سالانہ .... تین رُوپے
" ششماہی .... دو رُوپے
(علاوہ محصول ڈاک)
قیمت فی پرچہ .... ایک روپیہ

فہرست مضامین

شذرات

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور "نوائے ادب" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ خبر یقیناً مسرت بخش اور اُردو دوست اصحاب کے لئے ہمت افزا ہوگی کہ بمبئی یونی ورسٹی نے اس ادارہ کو اُردو پی، ایچ، ڈی کی سند کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لئے ایک مرکز کی حیثیت سے باقاعدہ تسلیم کرلیا ہے اور اب یونی ورسٹی کے طلبا اس سند کے لئے ہمارے یہاں داخلہ لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادارہ کو زیادہ مفید بنانے کے لئے ہم دو رفقاء کا اضافہ کررہے ہیں جو مستقل طور سے اُردو سے متعلق کام کریں گے۔ اسی سلسلہ میں ہم اپنے کتب خانہ کو بھی وسیع کررہے ہیں۔ "نوائے ادب" کو زیادہ ضخیم اور دلچسپ بنانے کا بھی ارادہ ہے، خدا کرے ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔

یہ سہ ماہی ہمارے ہی لئے مبارک ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اسی میں حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اُردو نے اپنی ۲۵ سالہ نقرئی جبلی کا جشن ۵ دنوں تک بڑی شان اور ادبی اہمیت کے ساتھ منایا، واقعہ تو یہ ہے کہ ادارہ در اصل اس خواب کی تعبیر ہے جو اہلِ دکن نے عرصہ ہوا ایک مرتبہ پھر اُردو زبان وادب کو ہندوستان کے لئے مستند اور کارآمد بنانے کے لئے دیکھا تھا، اس ادارہ کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اگر ایک شخص بھی خلوص و ایثار سے عزم و استقلال کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہو جائے تو پھر نہ رفقاء کی کمی رہتی ہے اور نہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادارہ نے اپنی ربع صدی کی زندگی میں جتنی بھی کتابیں شائع کیں اور تعلیم بالغان و توسیع اردو کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ کسی بھی ادارہ کے لئے قابلِ صد فخر ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ادارہ نے حضرت امجد حیدرآبادی کی ڈائمنڈ جبلی بھی منائی، جو بہت کامیاب رہی۔

اس جشن کی دو ممتاز خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں، پہلی تو یہ کہ اس میں ہر قوم، اور ہر جماعت کے نمائندوں نے دل کھول کر حصہ لیا اور دوسری یہ کہ یہ تقریروں کا ہنگامہ نہ تھا بلکہ اس میں جو مقالات پڑھے گئے وہ بڑی حد تک اُردو کی تاریخ کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں؛ خدا کرے ادارہ روز بروز یوں ہی ترقی کرتا رہے۔

ادارہ کا جشن اگر حیدرآباد کے لئے باعث فخر تھا تو مدراس کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور

اُردو کے سلسلہ میں اس کی کارروائی لائق صد تحسین ہے۔ اس کانفرنس نے ایک مرتبہ پھر دکن میں اُردو ادب سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کردی ہے چنانچہ اس علاقہ میں کئی ناروں مشاعروں اور دوسری دلچسپیوں کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔

علاقہ مدراس میں جہاں ایک طرف علمی حیثیت سے اُردو کی یہ اشاعت ہو رہی ہے وہیں روحانی حیثیت سے بھی وہاں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، چنانچہ حال ہی میں وہاں ایک طریقت کانفرنس منعقد ہوئی ہے، اُردو کی اشاعت میں صوفیائے کرام کا جو درجہ اور حصہ ہے اس کی روشنی میں ہم امید رکھتے ہیں کہ ان اہل دل بزرگوں کے ذریعہ اہل زبان بھی اپنی صلاحیت بھر فائدہ اٹھائیں گے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذکر کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی کا خیال لازمی ہے اور اس سال یونی ورسٹی کا علی گڈھ میگزین اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں، علی گڈھ کی تعلیمی، مذہبی، علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں، ان کے بانیوں اور ان کے رفیقوں سے متعلق بلند پایہ مضمون نگاروں کے فکر زا مضامین ہیں، ہم اس کے مدیر اعزازی کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے عرصہ کے بعد ان گوشوں کو جن کو لوگوں نے بھلانا شروع کردیا تھا ایک مرتبہ پھر روشن کردیا۔

اردو کے لئے اس سال کی ابتدا انھیں خوش گوار واقعات پر ختم نہیں ہو جاتی جس طرح مرکزی حکومت نے اردو کی بہترین تصانیف کے سلسلہ میں انعامات دئے ہیں بالکل اسی طرح حکومت یو پی نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی تھی کہ مختلف زبانوں کی ۱۹۵۴ء کی بہترین کتابوں پر مصنفین کو انعامات دئے جائیں چنانچہ مندرجہ ذیل کتابیں مستحق انعام تسلیم کی گئیں ہیں۔

۱	اردو عربی ڈکشنری	عبدالحفیظ بلیاوی	۲	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور
۳	جوئے رواں	حامد اللہ افسر	۴	پیام ساوتری	جگر بریلوی
۵	تاریخ تنقید	مسیح الزماں	۶	تحقیقی مطالعے	ڈاکٹر نذیر احمد (لکھنؤ یونی ورسٹی)

دہ سالہ تجربہ کے بعد اتر پردیش کی حکومت کا یہ قدم ہمارے لئے امیدوں کی بڑی دنیا رکھتا ہے۔ کاش دوسرے صوبوں خصوصاً بہار، حیدرآباد، پنجاب، وغیرہ کی حکومتیں اس طرف متوجہ ہوں۔

مرکزی حکومت نے دار المصنفین کی شائع کردہ "مآل و مشیت" پچھلے سات برسوں میں اردو کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے اور اس کے مصنف ظفر حسین خاں مرادآبادی کو پانچ ہزار نقد انعام ملا ہے۔

۱۴ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اردو زبان و ادب کا ایک اور شیدائی دنیا سے رخصت ہوگیا۔ پنڈت کشن پرشاد کول یوں تو ایک زمانہ سے اُردو زبان کے عاشق و فدائی تھے لیکن ادھر چند برسوں سے اس کی حفاظت کے لئے وہ جس طرح سینہ سپر تھے اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا اور ان کی کوششیں یقیناً زبان کی تاریخ میں جگہ پائیں گی۔

پنڈت کشن پرشاد کول کا وطن آگرہ تھا لیکن ان کی زندگی کے آخری پچاس سال لکھنؤ میں گذرے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے تقریباً تمام لکھنوی اساتذہ اور ادیبوں کی آنکھیں دیکھی تھیں، چک بست سے تو اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے، چنانچہ "صبح امید" کے اجراء و اشاعت میں وہ شریک غالب کا درجہ رکھتے تھے۔ اردو فارسی کا ذوق انھوں نے اپنے نانا پنڈت بشمبھر ناتھ سے ورثہ میں پایا تھا۔

پنڈت کول اُس تہذیب کا جو صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کہلا سکتی ہے، ایک نہایت عمدہ نمونہ تھے، وہ بڑے سنجیدہ مگر زندہ دل انسان تھے۔ وہ کردار کے غازی تھے، چنانچہ ان کی ساری زندگی جدوجہد میں بسر ہوئی، انھوں نے ہندو سماج کی اصلاح و بہتری کے لئے بہت مفید کام کئے، ان کی ساری زندگی جدوجہد میں بسر ہوئی، انھوں نے ہندو سماج کی اصلاح و بہتری کے لئے بہت مفید کام کئے، ان کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کا ایثار ہے، تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہوگئے اور ساری عمر اس انجمن کی خدمت میں گزار دی ــــ پنڈت جی کو اردو سے بہت محبت تھی اور وہ اسے اپنی مادری زبان کہتے تھے اور اس کی بقا و حفاظت کے لئے انھوں نے عملی قدم اٹھایا۔ یوپی میں دستخطوں کی فراہمی کی مہم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں انھوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ وہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ اور انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے صدر تھے ــــ پنڈت جی نے تقریباً ایک درجن تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اُن کی تصانیف کا موضوع ادب، سیاست اور معاشرت تھا۔ انھوں نے بعض نہایت عمدہ اصلاحی ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔

بزم اردو کی ایک اور نہایت پرانی شمع بجھ گئی۔ سید مقبول احمد صمدنی، شبلی مرحوم، مہدی افادی اور سید سلیمان ندوی وغیرہ کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، بڑے سنجیدہ و متین اور با اخلاق انسان تھے۔ اردو فارسی اور عربی ادب کے عالم اور شیدائی تھے۔ زیادہ تر محققانہ مضامین لکھتے تھے۔ ان کی تاریخ الہ آباد اور حیات جلیل (عبدالجلیل بلگرامی) علمی حلقوں سے کافی تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ وہ نہایت شستہ اور نستعلیق انشا پرداز تھے، آخری عمر میں ضعف بصارت کی وجہ سے لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا تھا۔ تقریباً پچاسی برس کی عمر پائی تھی، افسوس ہے کہ یہ قدیم شمعیں ایک ایک کرکے بجھتی جارہی ہیں اور محفل کی رونق دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں　　　مرتب خود بخود انجام محفل ہوتا جاتا ہے

ابن گجراتی کی "یوسف زلیخا"

(بہ سلسلۂ ماسبق)

از ڈاکٹر محمد عبدالحمید صاحب فاروقی
صدر شعبہ فارسی و اُردو کرناٹک کالج دھارواڑ

مثنوی

مثنوی مثنیٰ سے منسوب ہے یعنی دو، چنانچہ دو دو مصرعوں کی مناسبت سے اس صنف کا نام مثنوی رکھا گیا، اکثر اصناف شاعری میں ہر شعر کو دوسرے شعر سے ردیف و قافیہ میں ایک ہونا ضروری سمجھا گیا ہے لیکن مثنوی میں یہ پابندی نہیں۔ عام طور پر خفیف مسدس، سریع مسدس، ہزج مسدس، رمل مسدس، متقارب مثمن وغیرہ بحروں میں مثنوی لکھی جاتی ہے۔

نظامی گنجوی سے پہلے مثنوی میں کوئی خاص ترتیب یا تکنیک نہیں تھی، شعرا براہ راست قصے یا موضوع کی ابتدا کرتے تھے۔ کبھی کبھار صرف حمد یا نعت پر اکتفا کیا جاتا لیکن نظامی نے مندرجہ ذیل باتوں کا اپنی مثنویوں میں اضافہ کرکے ان کو ایک خاص اصول کے ماتحت منضبط کیا:

(۱) حمد (۲) مناجات (۳) نعت و معراج (۴) منقبت اہل بیت و آئمہ در پادشاہ وقت (۵) شاعری یا شعرا کی تعریف (۶) اس قصہ یا موضوع (۷) سبب نظم کتاب (۸) خاتمہ۔

چنانچہ نظامی کے بعد فارسی اور اُردو کے شاعروں نے بھی اس کی تقلید کی ہے، البتہ بعض شاعروں نے ترتیب میں حسب ضرورت تغیر بھی کیا ہے۔

مثنوی کا موضوع

ہم کو اپنے خیالات کے اظہار میں دو صورتیں استعمال میں لانا پڑتی ہیں۔ کبھی ایک بڑی بات کو چند الفاظ میں بیان کرنا پڑتا ہے کہ اسی میں فصاحت و بلاغت پوشیدہ ہوتی ہے اور کبھی کسی واقعے کے ایک ایک جزو کو مفصل و مشرح بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ واقعہ اسی کا مقتضی ہوتا ہے اور بیان کا کمال اعجاز کی جگہ اطناب میں مضمر ہوتا ہے، خال اپنی جگہ پر حسن کا مرکز ہے لیکن درازی زلف کی ہمہ گیری سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ دوسرے اصناف کلام کے خلاف اس میں اشعار کی تعداد محدود نہیں، ہر شاعر اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق جس واقعہ اور اس

واقعے کے جن خاص پہلوؤں کو چاہے اور جس طرح چاہے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔
مثنوی میں، ہر قسم کے موضوع مثلاً رزمیہ تاریخی عشقیہ تصوف۔ فلسفہ، اخلاق وغیرہ پر نہایت آسانی اور آزادی کے ساتھ قلم اٹھایا جا سکتا ہے، جذبات نگاری، تخیل آفرینی مناظر قدرت وغیرہ کے لئے مثنوی سے بڑھ کر کوئی میدان نہیں، چونکہ مثنوی اکثر کسی تاریخی یا مذہبی واقعے یا قصے پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اس میں انسانی زندگی کے مذہبی اخلاقی معاشرتی یا عمرانی پہلو کو اجاگر کرنے کا بڑا اچھا موقعہ ملتا ہے۔

امین کی مثنوی

امین کی مثنوی بہ لحاظ تکنیک حسب ذیل حصوں پر مشتمل ہے:
(۱) حمد و مناجات (۲) نعت، و معراج (۳) صفت خلفائے اربعہ و حسنین و امام اعظم و پیر محی الدین جیلانی (۴) در بیان عشق حقیقی تعریف سخن (۵) اصل قصہ (۶) خاتمہ۔
اس مثنوی کی ایک بڑی خصوصیت جو اس دور کی مثنویوں میں بہت کم پائی جاتی ہے یہ ہے کہ آئین ہر عنوان کی ابتدا ساقی نامہ سے کرتا ہے، اس میں اکثر تصوف اخلاقیات، پند و نصائح، شکایت دوراں گردش زمانہ بغض و کینہ، فریب و دغا، حرص و آز اور راستی و دروغ گوئی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ زاہد واعظ یا ایدیٹک کی طرح پڑھنے والوں کے حلق میں کڑوی کسیلی نصیحتوں کے گھونٹ نہیں اُتارتا اور نہ فلسفیانہ انداز میں اخلاق و تصوف اور موت و حیات کے پیچیدہ مسائل پر منطقی دلائل کا جال بنتا ہے، بلکہ زندگی اور اس کے حقائق کا ایسا لطیف تجزیہ پیش کرتا ہے جس کے سامنے وعظ منطق اور فلسفے بے جان معلوم ہونے لگتے ہیں، یہ ساقی نامے آئین کے حقیقی جذبات و احساسات کا مرقع ہیں اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ان میں خود آئین کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے بعض اور ساقی نامے ملاحظہ فرمایئے بے رحمیٔ زمانہ کے متعلق کہتا ہے:

بھروسا نئیں، زمانے کا کچھو رے　　نہیں کچھ گنج ہے سانپ اور بچھو رے
غمی دے کر خوشی کوں بار کاڑے　　زمانہ یوں بہت عالم کوں پاڑے
کھرا دشمن زمانہ ہے نہیں یار　　کہ آخر خلق کوں کرتا ہے یہ خوار
زمانے کوں ترس آتا نہیں رے　　کسی کا یہ بھلا چاتا نہیں رے
شرم اِس کوں نہیں یہ بے شرم ہے　　نہ دل اس کا محبت سیں نرم ہے
نہیں اُوس کے دل اندر مہربانی　　کرے گا اوس کے تیں یکبار فانی
ہے جلتے کو جلاتا کرکے اسے باؤ　　اہے یوں کھیلتا۔ سگلوں ستیں داؤ

بے ثباتیٔ دنیا کے متعلق کہتا ہے

بھروسا کچھ نہیں یہ بے وفا کا　　نہیں معلوم کھیل اِس پر دغا کا
جِنے دنیاں سیتیں دل کوں لگایا　　اوس نے آخر نفع ذرّہ نہ پایا
جو آیا جگ میں اوس آخر ہے جانا　　عبث دنیا کے سیتیں دِل لگانا
ہزاراں سال جو جیوے جگت میں　　تو بھی آخر وہ ڈوبے اس رگت میں
دِکھو یہ ہے جگت دریا رگت کا　　بھروسا کچھُ نہ کرنا اِس جگت کا
لکھوں لکھ کون جگت یہ پالتا ہے　　آنے آخر رگت میں ڈالتا ہے
اب تو بیداد ہے اِس میں نہیں داد　　زمانے کی سنے اب کون فریاد
زمانے کوں نہیں یک ذرّہ انصاف　　اب تو ظالم اہے بے شین و بے کاف

جھوٹ اور سچ کا تقابل دیکھئے:

ارے یاراں تمیں جھوٹ نہ بولو　　بغیر از سانچ اپنے لب نہ کھولو
سچا دو جگ منیں پاوے خلاصی　　جھوٹا دونوں جگت کے بیچ عاصی
سچے کو حق تعالیٰ دے گا یاری　　اس نے جھوٹے کے تئیں دونی بے خواری
سچا رُتبہ جگت میں پائے عالی　　انے جھوٹے کے تئیں ہے گوشمالی
سچا آخر کو ہیں ناں پچھتاوے　　انے جھوٹا جو ہوے تو لجاوے
سچے کا بول سب جاگے سچا ہے　　انے جھوٹے کا بولا سب کچا ہے
سچا سب محاسوں بیچ مرد ہے رے　　انے جھوٹا سو خاک اور گرد ہوے

چونکہ "یوسف و زلیخا" ایک عشقیہ مثنوی ہے اِس لئے نفسِ مضمون کی رعایت سے آمین نے اکثر جگہ عشق و محبت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، مناجات کے چند اشعار سنیئے:

ملک حوراں انے غلماں و رضواں　　ہیں تیرے عشق اندر سارے حیراں
فلک سرگشتہ تیرے عشق میں ہے　　زمین سر بستہ تیرے عشق میں ہے
چندر اور سور تیرے عشق بھیتر　　ہمیشہ دوڑتے ہیں اس گگن پر
ستارے سگلے سرگرداں ہیں رے　　سو تیرے عشق میں حیران ہیں لے رے
پہاڑاں روے تیرے عشق بھیتر　　ہوے دریاؤ تب جاری زمین پر

جگت میں جھاڑ چھوٹے اور بڑے ہیں　　　سو تیرے عشق میں ثابت کھڑے ہیں
تیرا ایک لمعہ سورج پر پڑا جب　　　ہوا عاشق اُوس اُوپر گل کنول تب
چندر پر نور تیرا جھل جھلایا　　　چکاوک تب سین اوپر تلملایا
جدہاں مشعل نے تیرا نور پایا　　　پتنگا شمع پر تب سوں لبھایا
پڑا جب گل اوپر تیرا کرشماں　　　ہوئی تب بلبل عاشق از دل وجاں
وہی گل توں وہی بلبل وہی توں　　　تو نہیں طالب تو نہیں مطلب جگت موں

زلیخا کی سہیلیوں کو حضرت یوسف تلقین کرتے ہیں کہ "حسن مجازی" فنا ہونے والا ہے۔ اس لئے انھیں "حسن ازلی" سے رجوع کرنا چاہیئے:

سنو تم سب اہیں میری سو گفتار　　　یہ ہے آخر فنا سب حسن بازار
نہ میرا حسن رہے گا برقراری　　　نہ یہ خوبی رہے گی کچھ تمھاری
فنا پر جیو مجہ کوں نہیں لگانا　　　تموں کو بھی فنا پر کیا لبھانا
فنا کو چھوڑ کر پکڑو بقا کوں　　　بندوں کوں چھوڑ کر پکڑو خدا کوں
جنے تم کوں سے مجہ کوں کرکے پیدا　　　جگت بھیتر دیا ہے حسن ایسا
تم اس کاریگری پر مت لبھاؤ　　　تمھیں سب چھوڑ کاریگر کوں دھاؤ

امین نے زلیخا کے عشق مجازی کو اس کے آلام و مصائب کا باعث قرار دیا ہے:

جو عاشق ہوئی انساں پر زلیخا　　　پڑی تو اُس اوپر دکھو بہت کیا
اگر اللہ پر عاشق وہ ہوتی　　　اس نے انساں کے سامنے نہ جوتی
کبھو مشکل نہ پڑتی اس کے تئیں ہاں　ق　رتی ہو مست دایم عشق کے ماں
فنا پر جو ہوا عاشق جگت ماں　　　سو ڈوبا ہے خرابی کے رگت ماں

سخن کی تعریف میں کہتا ہے:

سخن ہے تو خدا کوں جانتے ہیں　　　سخن ہے تو نبی کو مانتے ہیں
سخن دنیاں منیں سب سوں بڑا ہے　　　سخن سیتیں سب انساں کا دھڑا ہے
سخن سیتیں ہیں پڑھتے علم جگ میں　　　سخن سیتیں ہیں کرتے علم جگ میں

سخن سیتیں ہر ایک کوئی راگ گادیں   سخن سوں گا کے عالم کوں رجھادیں
سخن سوں شعر سب شاعر کئے ہیں   سخن سوں صوفیاں سب مدتے ہیں
سخن سیتیں افسوں کرکے افسول   اِیں کرتے بند دیواں ہور پری کوں
سخن سوں واعظاں سب وعظ بولیں   سخن سیتیں گہر معنی کے تولیں
سخن روتے بشر کوں ہے ہنساتا   سخن ہنستے بشر کو تھے رُلاتا
سخن غم کوں نکال اور لیا ہے شادی   کرے خوش دور کر کرنا مرادی
سخن شادی کے تین پل میں کرے دور   سخن غم کوں کرے دل بیچ بھرپور
سخن سوں دوزخی سب جنتی ہولے   سخن سوں جنتی اور دوزخی ہوئے
سخن سوں جیو توں کے جیو جاوے   سخن سوں مردے سگلے جیو پاوے
سخن سوں یار سب ہووے بیگانے   سخن سوں سب یگانے ہوے بیگانے

سبب نظم کتاب کے سلسلے میں کہتا ہے کہ " یوسف زلیخا" کا قصہ فارسی میں عام ہے لیکن عوام کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے اُسے گوجری میں نقل کیا ہے:

ہر ایک جاگے قصا ہے فارسی میں   امین اُس کوں اتارے گوجری میں
کے بوجے ہر کدام اِس کی حقیقت   بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

خاتمہ میں کہتا ہے:-

الٰہی تیں مجھے توفیق جو دی   تو میں بی فارسی سین گوجری کی
میرا مطلب ہے یوں سب کوئی جانے   حقیقت اوس کی سب کوئی پچھانے
پڑا ہوے جو کوئی فارسی کوں   وہی جانے حقیقت اے سو دل ہوں
انے جو نا پڑھا ہوئے بچارا   سو کیا بوجے اُنوں کا عشق سارا
میں اوس کے واسطے کیتی اے گوجری   حقیقت سب عیاں ہووے اُنوں کی

نیز امین کو امید ہے کہ یہ مثنوی دنیا میں بطور یادگار قائم رہے گی:

امین نے گوجری کیتی سو یوں کر   کہ آپیں نئیں رہے دُنیا کے بھیتر
دیکھوا ہے ہو سو سب ہو جائے گا خاک   نہیں پادوے سو ڈھونڈا جیوا ہے پاک
نشانی تب رہے گی ہے سخن دے   جو کچھ بولا امین میٹھے بچن رے

چونکہ مثنوی کے اشعار اس کے دلی جذبات کا اظہار ہیں اس لئے دعا کرتا ہے کہ بجز سخن کے یہ موتی

مقبول خاص و عام ہوں:

الہی توں میرے دِل کا سر دریا | کرم کر معرفت کے تین سو بھریا
ابل کر جب ہوا دریا یہ جاری | جو اہر تب یہ نکلے ننگ بھاری
الہی جوت دے ان جوہروں کو | جگت میں چاہئے سب کوئی انوں کوں
سخن میرے توں کر میٹھے الہی | ایسے میٹھے کہ جوں میٹھی مٹھائی
شکر مصری کے مانند اسے سخن کر | بلک اون کے اگل شرمائے شکر
الہی خلق کے دِل دے محبت | کہ اوس کے تئیں پڑیں سب با شفقت
نہ چھوڑیں ہات ننوں اس کے سو دن رات | رکھیں سب لوگ اس کو اپنے سات

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مدح میں یہ اشعار کہے ہیں۔

زمانے شاہ اورنگ زیب کے ہیں | لکھی یوسف زلیخا کوں آئین نیں
الہی تو ایسا قادر شہنشاہ | رکھے قایم رہے جب تک مہر ماہ

یہ مثنوی ۱۱۵۹ھ میں جمادی الاول کی دوسری تاریخ کو لکھی گئی۔ اس میں کل چار ہزار ایک سو چودہ ابیات ہیں:

اگیار اسو کے اوپر نو جو گزرے | برس ہجرت محمد مصطفےٰ کے
بیتاں چالیس سو پر چودہ اور سو | ہیں لکھیاں گو دھرے کے بیچ سن لیو

یوسف زلیخا پر تبصرہ

کسی مثنوی پر تبصرہ یا اس کی خصوصیات کا ذکر کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مثنوی کے اصول و ضوابط کیا ہیں، مولانا شبلی اور مولانا حالی نے مثنوی کے جانچنے کے لئے بعض معیار قائم کئے ہیں جن میں سادگیٔ ادا، حسن ترتیب، کردار نگاری، واقعہ نگاری اور بلاغت قابل ذکر ہیں، مثنوی کے انہیں فنی لوازم کی روشنی میں ہم آئین کی یوسف زلیخا پر تبصرہ کریں گے۔

سادگیٔ ادا:

آئین نے اس قدر سلیس، سادہ، اور رواں زبان لکھی ہے کہ بلا تکلف پڑھنے والے کی سمجھ میں آجاتی ہے، دور از کار تشبیہوں، استعاروں یا غیر معروف تلمیحوں کا پتہ نہیں ملتا، اس سے قبل ہاشمی بیجاپوری نے بھی یوسف و زلیخا کے قصے کو نظم کیا ہے لیکن اس میں یہ بات نہیں، ہاشمی چونکہ آئین سے بہت پہلے

ہو گذرا ہے اس لئے لازمی طور پر اس کی زبان زیادہ گنجلک ہے، پڑھنے والے کو قدم قدم پر صنایع بدایع کے خارزار سے الجھنا پڑتا ہے اور زبان سے تصنع کا اظہار ہوتا ہے، لیکن سادگی و متانت امین کا جوہر ہے اور یہیں وہ اپنے پیشروں اور ہم عصروں سے بازی لے جاتا ہے، شعر پر شعر پڑھتے جایئے معلوم ہوتا ہے خیالات کا ایک چشمہ ہے جو اُبلا پڑتا ہے، ہاشمی کی زبان ملاحظہ کیجئے، شب کو زلیخا کے سونے کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

معلم نے لے سُک کی نیند کا کتاب　پڑھایا یوں عالم کو راحت کا خواب
ہر یک تن پچھانے کی تختی پہ ٹھار　دو جیب جیب کا ہر خواب کا حرف کاڑ
ہجے کروتاں کی یو کر بار بار　کیسے علم راحت کا تحصیل اپھار
سبق اپنے دھندے کا لے بے حساب　اخختہ پڑے یعنی پھر پھر کے خواب
ملانے زلیخا کی شب رین کی　پڑائی بیٹی سب سوسکھ چین کی
جایاں الف کا سپارا پڑا ئے　تو آرام کا علم سارا پڑائے
دبستاں منے سیجہ کیری شتاب　مرتب کیتی نیند کیرا کتاب
ہر یک لفظ ڈھلکا معانی سپن　دسیا نوجوان یعنی لاگیا لگن

امین کی سادگی کے باوجود بعض بزرگوں کو اس کے اسلوب بیان سے شکایت ہے، ڈاکٹر زور فرماتے ہیں:

"اسلوب بیان بہت ہی سادہ ہے لیکن جب شاعر اپنے کو ایک بہت بڑا صوفی بتلانے کی کوشش کرتا ہے تو انداز بیان پیچیدہ ہو جاتا ہے۔"[۵۱]

ہاشمی صاحب جو بڑی حد تک "اردو شہ پارے" کے خوشہ چین ہیں اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر زور کے ہم نوا ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"زبان صاف ہے مگر جہاں تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں وہاں اس کا اسلوب پیچیدہ ہو گیا ہے"[۵۲]

جہاں تک ڈاکٹر زور کے "اپنے آپ کو ایک بڑا صوفی بتلانے" اور "انداز بیان پیچیدہ" ہونے کا تعلق ہے، ہم نہایت ادب سے ڈاکٹر موصوف سے اختلاف کی اجازت چاہتے ہیں، یہ رائے ڈاکٹر زور کے عاجلانہ مطالعے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر وہ مثنوی کو بہ غور پڑھتے تو معلوم ہو جاتا کہ مثنوی کا انداز بیان کہیں بھی پیچیدہ نہیں اور نہ امین نے اپنے کو بڑا صوفی بتانے کی کوشش کی ہے، یہ ہماری منفرد رائے نہیں ہے

---

۵۱ شہ پارے ص ۱۳۹ ، ۵۲ دکن میں اُردو ص ۲۱۶ ،

بلکہ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں اُردو کے دو بڑے استاد بھی ہمارے ہم خیال ہیں، پروفیسر محمود شیرانی فرماتے ہیں:

"محمد آئین کے ہاں زبان بہت صاف ہوگئی ہے اور غالباً یہ پہلی مثنوی ہے جو اس قدر سہل اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے، ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے جنھیں موجودہ اُردو خواں نہیں سمجھ سکتے۔"[۵۱]

مولانا عبدالحق صاحب مثنوی کی زبان کے متعلق اپنے ایک گرامی نامے میں فرماتے ہیں:

"آئین کی مثنوی گجراتی زبان میں نہیں یہ گجراتی اُردو ہے، اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں آئے گی۔"[۵۲]

حُسنِ ترتیب

ہر چند آئین کے پیش نظر فارسی مثنویاں تھیں لیکن اس نے حالات کی ترتیب میں اپنے اجتہاد کا ثبوت دیا ہے اس نے حسب ضرورت اگرچہ ایسے بہت سے حالات جو فارسی مثنویوں میں نہیں ہیں بڑھا دیے ہیں، لیکن ان کو اپنی اپنی جگہ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ قصّے کے بنیادی پلاٹ میں سرِمو فرق نہیں آیا اور نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آئین نے انھیں خواہ مخواہ مثنوی میں گھسیٹا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اضافوں نے مثنوی کی خوبی کو دوچند بڑھا دیا ہے، اس نے اکثر جگہ اخلاقی اور مذہبی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اس سلسلے میں بعض فرضی روایتوں کو جگہ دی ہے پھر بھی انھیں اصل قصّے میں اس طرح سمو دیا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ آئین کا اضافہ ہے۔

کردار نگاری:

یوں تو آئین نے مثنوی کے ہر کردار کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے لیکن ہم یہاں زلیخا کی دایہ کے کردار کا بصورت خصوصی سے ذکر کریں گے، اس کے پڑھنے کے بعد دایہ کی تمام امتیازی خصوصیات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں، پھر خوبی یہ کہ اس کے کردار میں تناقض مطلق نہیں پایا جاتا جو اکثر مثنویوں کی کمزوری ہے، اس سلسلے میں ہم بعض ٹکڑے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں، زلیخا خواب دیکھتی ہے اور وحشت زدہ ہو کر کھانا پینا، ہنسنا بولنا سب ترک کر دیتی ہے، سہیلیاں ہر چند اس کے دل کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتیں، آخر دایہ اس کا راز معلوم کرنے کا تہیّہ کرتی ہے، ایسے نازک مقام پر وہ زلیخا سے براہ راست سوال نہیں کرتی، پہلے زلیخا کے ساتھ اپنے تعلقات کو واضح کرتی ہے اور وہ تمام خدمات گناتی ہے جو بچپن سے لے کر جوانی تک زلیخا کے حق میں کی ہیں، ملاحظہ ہو:

---

۵۱ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء ص ۳۲ ، ۵۲ مکتوب بنام مقالہ نگار۔

زلیخا کے اگل آکر وہ دائی — میٹھی اور پیار سوں باتاں چلائی
زلیخا تُو تو ہے بی بی میری رے — انے میں ہوں سوجوں لونڈی تیری رے
دنیا میں جب تو ماں کے پیٹ سوں آئی — تجھے لے کر میرے تب گود میں ڈالی / پائی
پلایا دود تجہ کوں پیار سوں میں — تجھے پالی ہوں ہے ہشیار سوں میں
ہیرا میں جیو تجہ سا تھیں لگایا — تیرے درسن کوں دیکھ آرام پایا
کدھیں تن پن میں توں ہٹ کر کے روتی — تو میں ہو گما بری سب عقل کھوتی
تھپک کر تجہ گنوارے میں سلاتی — دیتی جھولا انے لوری / لولی اسے گاتی
زلیخا کے تئیں توں بخشش الٰہی — زلیخا ہے تو مجہ ہے پادشاہی
تو جب اُٹھتی تو میں / ہوں لیتی کمر پر — بٹھاتی تجہ کوں میں اپنے صدر پر
نہ یک ساعت تجھے میں چھوڑتی کئیں — تیری صحبت سے کہہ نہ موڑتی کئیں
محبت سیں میں تجہ کھانا کھلاتی — انے دل پیار سوں پانی پلاتی
ہمیشہ تجہ کوں نئے کپڑے بدن پر — بنا کر زیب کرتی تیرے تن پر
میں تیرا مکھ ہزاروں بار دھوتی — تیرے درسن اوپر قربان ہوتی
جُدی میں نئیں رہی تجہ سیں گھڑی ایک — زلیخا سُن توں اب خدمت میری دیکھ
کدھیں جو بات مجہ سیں نئیں چھپائی — جو ہوئی سو تُرت مجہ کوں بتائی
نہیں تجہ دل کے بھیتر کچھ کپٹ کور — ہے تیرا دل محبت سیتیں معمور
توں سچ کہہ مجہ اگل اسے کیسا بلا ہے — ٹھکانے دل نہیں تیرا سو کیا ہے
میں بی ہوں گی شریک اس تیرے غم میں — توں کر واقف مجے درد و الم سیں

اس پر بھی جب زلیخا ٹس سے مس نہیں ہوتی تو دایہ شہ رگ پر انگلی رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے، تیرا یہ عشق مجہ سے زیادہ دنوں چھپ نہیں سکتا، اپنے مقصد کی تکمیل میں تجھے میری ہی مدد درکار ہوگی۔ ملاحظہ ہو:

کہا تب دائی نے سن اے زلیخا — یہ تیرا عشق آخر کیوں چھپے گا
چھپاتی کائے کوں یہ نیں چھپے ہے — جو کچھ ہوئے سو اب مجہ کوں توں کہہ دے
تیرا مکھ لال تھا سو زرد کیوں ہے — تیرا دم گرم تھا سو سرد کیوں ہے
یقیں مجہ کوں ہی یوں کے کوئی دلدار — تجھے اپنا دکھایا اُونے دیدار
توں کہہ میرے اگل کوشش کروں میں — لیا محبوب کوں آگل دھروں میں
اگر ہوئے فرشتہ آسماں پر — پڑھوں تسبیح دعایاں اس طرح پر

فرشتہ چل کے تیرے پاس آوے ۔ تجھے دیدار اپنا آ دکھاوے
انے ہووے بشر یا جن پری او ۔ ہووے محبوبوں سیتیں برتری او
کروں منتر کوں پڑھ اوس بیقراری ۔ کروں میرا عمل اوس پر سو جاری
وہ ہووے بےقرار آوے سو تب دوڑ ۔ گرے آپس کے آکر تجھ اگل ٹھور
اگر انسان ہووے تو اوسے میں ۔ لے آؤں دے فریب اور تیرے پاسیں

چنانچہ دایہ کی باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ زلیخا اپنا خواب اور محبت میں مبتلا ہونے کی ساری حقیقت اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے۔

اسی موقعے کا ذکر ہاشمی نے بھی کیا ہے لیکن وہ بات پیدا نہ ہوسکی، دایہ زلیخا کے سامنے براہ راست اپنی تعریف کرتی،

فرشتہ پہ گرچہ اچھے گی نظر ۔ گگن تی اوتاروں گی میں پڑ منتر
پری دیو بلکہ میرے ہات ہے ۔ بشر کوں ملانے کی کیا بات ہے
اگر کم اچھے گا وہ عنقا نمن ۔ تو میں اوس کا کاڑوں گی ڈھونڈ کر وطن
منت کہکے پڑتی ہوں میں تیرے پاؤں ۔ نکو راز مجھ تھیں تو ں ہرگز چھپاؤں

چنانچہ زلیخا اپنا راز بیان کرتی ہے لیکن دایہ کو راز معلوم کرنے کے لئے "ہاتھ پاؤں پڑنے" کی ضرورت ہوتی ہے، آئین ایک کامیاب فن کار کی طرح اپنے کردار کو اس حد تک گرنے سے بچا لیتا ہے، اس کے علاوہ آئین کے یہاں جب دایہ پہلی بار راز پوچھتی ہے تو زلیخا برافروختہ ہو کر کہتی ہے:

زلیخا نے سنی جب دائی کی بات ۔ غصا کھا کر سخن بولی اوسیں دھات
حقیقت میری کوں توں جانتی ہے ۔ مجے تن بن سوں توں پہچانتی ہے
نہ میری عمر کے بھیتر کسی نیں ۔ ہے دیکھا بھر نظر ان انکھیوں سیں
رہتی ہوں میں ہزاروں پردوں کے ماں ۔ کسی کوں دیکھ کر عاشق ہوئی کاں
یہ تیری بات مج کوں لاگے بھاری ۔ کلیجے کے بھیتر جیوں گھاؤ کاری

شرم و حیا اور عفت و عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی پردہ نشین دوشیزہ پر عشق و محبت کا الزام لگایا جائے، چاہے وہ حقیقت ہی پر مبنی ہو تو وہ ضرور چیں بہ جبیں ہو کر اپنے وقار و ناموس کی حفاظت و مدافعت کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ ہاشمی انسانی کردار کے اس نفسیاتی پہلو سے ناواقف معلوم ہوتا ہے ورنہ وہ اس غلطی کا شکار نہ ہوتا۔

واقعہ نگاری

آیین نے ہر موقعے اور حالات کی مناسبت سے واقعات کی تفصیل میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے؛ جس حالت یا کیفیت کو بیان کیا ہے اس کی تمام خصوصیات و جزئیات کو فن کارانہ طریقے پر پیش کیا ہے زلیخا کے سنگار کے سلسلے میں، اس کا جو سراپا آیین نے بیان کیا ہے اس میں ہر ہر عضو کی موزونیت اور حسن کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اس ٹکڑے کو ہم آئندہ پیش کریں گے۔ سردست واقعہ نگاری کی ایک مثال ہم لکھتے ہیں، حضرت یوسف کی وفات پر ماتم کی کیفیت کو آیین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

اٹھا تب شور سب دربار بھیتر   لگے رونے سو سب سنسار بھیتر
وزیراں بھی رویں اوس تھام سیل   ہوا گھائل سوا ین یا آیین کا دل
لگے سب لوگ رونے بار اور اندر باہیں   سنے جیوں شور تیوں تیو دوڑتے آئیں
جیسے قائم قیامت ہوئی اوس جاگ   نہ تھی لوگوں کے آگل یک زرا باگ
فرشتے آسماں پر روئے سارے   پکھیرو جانور کھادیں بچارے
جنگل کے چار پائے گھانس نا کھائیں   انے پینے کے تئیں پانی نہ کئیں جائیں
جنت میں ابرہن حوراں او تارے   لیا اون سوگ سب کسوت بچارے
گگن اوپر سورج لوہو میں نایا   چندر نے بیچ کلیجے گھاؤ کھایا
سو سب باگ بھیتر سوں گئے سوک   یوسف کے غم منیں توٹے ہو دو ٹوک
اوڈری سب باگ باڑی کے بھیتر خاک   کلیجے سب گلیں کے ہو گئے چاک
اتھے باڑی کے بھیتر بوت لالا   پڑا چھاتی کے اوپر داغ کالا
انے ہلگوں نے مکھ لوہو سوں دھوئے   یوسف کے درد بھیتر بوت روئے
گل صد برگ کا منھ ہو گیا زرد   یوسف کے واسطے پوچا اوسے ڈر
بنفشہ نے اپس کے بال توڑے   بھی نرگس نے اپس کے نین پھوڑے
زباں سوسن کی ہو گئی بند غم سوں   پچھے آنا یوسف کے الم سوں
چمپے اور موگرے اور کیورے سب   گئے باری بھیتر سوں سوک کر تب
چمیلی بیل کی سب بوئے اڑ گئی   گل داؤدی جڑ میں سوں اکھڑ گئی
گلاب اور سیوتی سب جل گئی تھی   کسی بیچ بوئے یک ذرہ نہ رئی تھی
سمن اور نسترن تھے بوت روتے   گڈہل نے لوہو بھیتر کھائے غوطے
کیا ریحان نے کالا سو مکھ کوٹ   پڑی تب گل نا فرمانوں اوپر لوٹ

ضمیران سب رگت میں ڈوب گئے تھے　　　گُلِ زنبق بھی سب بیہوش رہے تھے
گُل کوزہ بھیتر پانی نہ تھا رتِل　　　عباسی کا جلا تھا درد سوں دل
گُل مہندی گُل کچنار کملائے　　　گُل نورنگ لوہو بیچ سرمائے
ترنج بی غم سوں پیلے ہو پڑے تھے　　　زمیں پر سیب سگلے گر پڑے تھے
انے نارنگیوں کا رنگ گیا اور　　　رہی غم سوں ہو کمرخ سوک چرمر
کوئیل اس درد سوں ہو گئی تھی کالی　　　یوسف کارن اونے آپس کو جلائی
گلے بیچ قمریوں ڈالے تھے پھانسی　　　کبوتر درد سوں سب تھے اداسی
یوسف کے درد بھیتر پوپٹوں نیں　　　پہنے نیلے لباس اپنے تنوں میں
بھنورا کالا ہوا غم بیچ جل کر　　　دیوانا ہو گیا سُدھ بُدھ سوں ٹل کر

جامی نے حضرت یوسف کی وفات پر صرف چند شعر لکھے ہیں:

چون یوسف را بدست آن سیب بنہاد　　　روان آن سیب را بوئید و جان داد
دلش زان نکہتِ باغ بقا یافت　　　ازان نکہت بسوئی باغ بشتافت
چون یوسف را ازان بو جان برآمد　　　زجانِ حاضران افغان برآمد
زبس بالا گرفت آواز فریاد　　　صدا در گنبدِ فیروزہ افتاد

ہر چند کہ آئین کے پیشِ نظر جامی کی "یوسف زلیخا" بطورِ نمونہ رہی ہے لیکن مندرجۂ بالا موقعے پر جہاں جامی نے چار شعر پر اکتفا کیا ہے وہاں چھتیس شعریں ماتم کا نقشہ دردناک پیرایے میں پیش کرتا ہے اور اس کا اشہبِ قلم تھکنے کا نام نہیں لیتا۔

جذبات کی عکاسی

انسانی جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی مثنوی نگار کا سب سے بڑا کمال ہے عشق و محبت، عیش و عشرت، رنج و الم، ہجر و فراق اور رشک و حسد کی حالت میں جو جذبات انسانی دلوں پر مترتب ہوتے ہیں ان کا تجزیہ آئین نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے، ان میں تصنع یا بناوٹ کو مطلق دخل نہیں حضرت یوسف کو زنداں میں بھیجنے کے بعد زلیخا کفِ افسوس ملتی ہے اور زنداں سے مخاطب ہو کر جن جذبات کا اظہار کرتی ہے وہ ایک حقیقی عاشق کے دل کی صحیح عکاسی کرتے ہیں:

کبھی زنداں کے کیا بختاں بڑے ہیں　　　کہ جس کے بیچ یوسف بند پڑے ہیں

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

اُردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات

(۲)

(بہ سلسلہ ما سبق۔ نوائے ادب جلد ۵ نمبر۱)

(گوپی چند نارنگ ایم اے۔ ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی)

ایک دوسرے کے مذہبی اعتقادات سے روشناس کرانے میں مختلف تہواروں کو جو اہمیت حاصل ہے اُسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپس کے میل ملاپ اور ربط و ارتباط نے جس مشترک ہندوستانی تہذیب کو پیدا کر دیا تھا اس کے زیر اثر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہو کر اپنی محبت اور فراخ دلی کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ عید پر مبارک باد دینا، گلے ملنا اور معانقہ ہندوؤں مسلمانوں میں عام تھا۔ ایسے ہی ہندوؤں کی مذہبی تقاریب پر مسلمان بھی حق مروت ادا کرتے تھے اُردو ادب نے سینہ بہ سینہ اس روائت کو ہم تک پہنچایا ہے۔

ہندوؤں کے تہواروں میں سب سے اہم بسنت، ہولی، دیوالی، دسہرہ اور برسات ہیں۔ اُردو کے مسلمان شاعروں نے تقریباً ان سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس سلسلہ میں محمد قلی قطب شاہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ قطب شاہ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا چوتھا تاجدار تھا اور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک حکمراں رہا۔ اس کے کلیات میں بسنت کے موضوع پر نو (۹) نظمیں درج ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہیوں کے عہد حکومت میں بسنت کی تقریب پورے اہتمام اور شان و شوکت سے منائی جاتی تھی۔ محلوں کے صحن پھولوں کے انبار سے لد جاتے تھے، باغوں کے گوشوں میں بہار کی تمام رنگینیاں سمٹ آتی تھیں۔ قطب شاہ کی ان نظموں میں جو بسنت پر لکھی گئی ہیں، ہندوستان کی اتحاد پسند روح اس طرح رچی بسی ہوئی ہے کہ ان کو پڑھتے ہی محبت کے اس رشتہ کا احساس ہونے لگتا ہے جو نہ صرف ہندو کو مسلمان سے بلکہ انسان کو انسان سے ملاتا ہوا تعصب کی تاریکیوں میں سیلاب نور کی طرح پھیل جاتا ہے۔ بسنت کی یہ نظمیں ہندو مسلمان کی تفریق سے بالاتر ہیں۔ وہ پوری ہندوستانی فضا کا احاطہ کرتی ہیں۔ نشاط و رنگ و رنگ کی ہندوستانی دھنک ہر طرف چھائی ملتی ہے۔ بسنت کے پھول یا قوت رمانی کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ دعوت جہاں بسنت وصال یار کا پیغام لائی ہے۔ زعفران کی رت ہے اور سہیلیاں پھولوں کے ٹوکرے اٹھائے گاتی جاتی ہیں۔

نین پتلیاں کے چمن میں پھول پھل لیایا بسنت ۔ شاہ کے سند رسعادت کا خبر لیایا بسنت ۔

پیارے بسنت کا ہوا آیا سکھیاں تن مشک زعفران لائیا

بسنت کھیلیں ہمن ہور سجنا کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

بسنت کے پھول کھلے ہیں اب رنگے ہوا حیراں دیکھ اس تائیں مانی

بسنت کی آمد آمد میں "سارا ترلوک" رنگیلا ہو گیا ہے۔ اور کیسریں بہار آنے سے چمن شعلہ بدست نظر آتا ہے۔ پپیہے کی پیہو اور کوئل کی کوک نے گھن گرج کے ساتھ مل کر ایک سماں باندھ دیا ہے؛

پپیہا گاؤتا ہے میٹھے نیناں مدہر رس دے اُدھر پُھل کا پیالا (رہونٹ)

کنٹھی کوئل سرس ناداں سناوے تنن تن تن تنن تن تن تلا لا

گرج بادل تھے داد رگیت گاوے کوئل کو کے سو پُھل بن کے خیالا

مغل بادشاہوں کی طرح قلی قطب شاہ کا دل بھی ہندوستانی سوبھاؤ کی نرم آنچ میں گداز ہو گیا تھا۔ پھولی ہوئی سرسوں اس کے دل پر گہری چوٹ کرتی تھی۔ اور اسے رنگ کھیلنے کی دعوت دیتی تھی۔ چاند اور سورج کے حوض بھی رنگ سے چھلک اٹھتے ہیں۔ اپنے چھند بند سے لیس محبوب پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے "بازی رنگ" کی ترغیب دلاتے ہیں۔

پیاری کے مکھ حیا نے کھیلیا بسنت پھولاں حوض تھے چڑکے چھڑ کیا بسنت

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا تمیں ہو چاند میں ہوں جوں ستارا

پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا

نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

ہندوستان میں موسم بہار ایک نئی زندگی اور نئے دور کا پیامبر ہوتا ہے۔ برسات کے شروع ہوتے ہی جھولے ڈالے جاتے ہیں۔ گیتوں کے رسیلے بول فضا میں گونج اٹھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اظہار نشاط کیا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے ہندوستان کے اس روح پرور موسم پر چودہ[14]

نظمیں لکھی ہیں تو حق تو یہ ہے کہ اپنے ہندوستانی شاعر ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔

"برسات کا موسم آیا ہے اور کلیوں کا راج شروع ہوا ہے۔ ہری ہری ڈالیاں سر پر پھولوں کے تاج سجائے کھڑی ہیں۔ شوخ دوشیزاؤں نے اپنی چولیاں پانی کی بوندوں سے بھگوئی ہیں۔ اور جھولوں میں اتری جاتی ہیں۔ سُرخ پھُندنے ان کے بازوؤں پر بہار دے رہے ہیں۔ جنبلی کے پھولوں میں بھونرے ملہار گاتے پھرتے ہیں۔ بادل کی گرج کا شور ہے اور بجلی کی چمک میں نرل موہنیوں کے چہرے دمک جاتے ہیں۔ ان کے گھنگھرو بج اٹھتے ہیں —— مینھ برستا ہے۔ اور سکھی جو اپنے عہد کی پدمنی ہے، سردی کی وجہ سے لرز رہی ہے۔ اس کا جوبن کپکپا رہا ہے —— اور پیا کو دیکھتے ہی چولی خود بخود پھٹی جاتی ہے"

غرض یہ کہ ہندوستانی برسات کی نشاطگی اور رومان انگیزی کا شاید ایسا کوئی پہلو ہو جو قلی قطب شاہ سے چھوٹ گیا ہو۔ برسات سے وہ ایک ہندوستانی کی طرح سرور و انبساط حاصل کرتا تھا۔ اور اس کے بیان میں وہ ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ ہندوستان کے اس مبارک تہوار کی روح اس کے اشعار میں پوری طرح سے کھنچ آتی ہے۔

رت آیا کلیاں کا ہوا راج ہری ڈال سر پھولاں کے تاج

تن تھنڈٹ لرزت، جوبن گرجت پیا مکھ دیکھت، کنچلی کس ٹیکسے آج

چوندھر گرجت مور مہینوں برست عشق کے چمنے چمن موراں کا ہے راج

گواڈر اک برسانت اس ہوا میں سکیاں پیو کوں منا لیا ومیاسوں

شمالی ہندوستان میں مسلمان ہندوؤں کے تہواروں کو اسی آن بان سے مناتے تھے، کہا جاتا ہے کہ بسنت منانے کا رواج امیر خسرو کے زمانے سے شروع ہوا تھا گو امیر خسرو کا ہندی کلام مشتبہ ہے لیکن مروج کلام میں اس قسم کے اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔

سگل بن پھول رہی سرسوں، سگل بن پھول رہی سرسوں، امبوا مورے ٹیسو پھولے، کوئل کوکے ڈار ڈار —— گوری کرت سنگھار۔ ملنیاں گڑوا لیائی ہرسوں، طرح طرح کے پھول سجائے، لے گڑوا ہاتھن میں آئے، نظام الدین کے دروازے، آون کہہ گئے عاشق رنگ اور بیت گئے برسوں[۵]

۵؎ حیات خسرو۔ سید رکن الدین نظامی دہلوی۔ ص ۸۷

مغلوں کے آخری سیاہ بخت حکمرانوں میں سے ایک شاہ عالم ثانی بھی تھے۔ ہندو ماں کے بیٹے تھے اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حال ہی میں ان کے کلام کا مجموعہ: نادرات شاہی جناب امتیاز علی عرشی نے کتب خانہ رام پور سے چھپوادیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلی میں عید، بکرعید، آخری چار شنبہ اور عرسوں کی نسبت ہولی اور دوالی کا اہتمام کم نہ ہوتا تھا اس کی تصدیق میر کے کلام سے ہوتی ہے۔

آؤ ساقی بہار پھر آئی ہولی میں کتنی شادیاں لائی

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

بھر لبا لب ہیں آب گیر میں رنگ اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں

جشن نوروز ہند ہولی ہے راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میر کی مثنویات میں دیوالی کا ذکر بھی ملتا ہے۔

مٹھائیوں کی لگا کے دکانیں حلوائی پکارتے ہیں کہ لالہ دیوالی ہے آئی

اس کے علاوہ میر نے بتاشوں کے بازار۔ گہنوں کو گروی رکھنے والے پڑوسی۔ ہارے ہوئے جواری اور جگ مگاتے ہوئے دیئے کا ذکر نہایت وثوق کے ساتھ کیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے متعلق پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ ہندوستانی تہواروں کے دلدادہ تھے بسنت ہولی، دیوالی، "پتنگوں کے نرجلا میلے" اور بلدیوجی کے میلے کا ذکر ان کے کلام میں عام ہے بسنت کے موضوع پر نظیر نے تین غزلیں اور ایک نظم لکھی ہے۔ ان کا ایک مخمس ملاحظہ ہو۔

پھر آگ بسنتی کا ہوا ان کے کھٹکا دھونسے کے برابر وہ لگا یا جنے مٹکا
دل کھیت میں سرسوں کے ہر ایک پھول سے اٹکا ہر بات میں ہوتا تھا اسی بات کا لٹکا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

ہولی کے تہواروں سے متعلق نظیر نے نو (۹) نظمیں لکھی ہیں۔ نظیر کی یہ نظمیں ہندو مسلم اتحاد

اتفاق کے بہترین مرقعے ہیں۔ مشاہدہ کی جس باریک بینی اور گہرائی سے ان نظموں میں کام لیا گیا ہے وہ اس امر کی مظہر ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ برابر رنگ کھیلتے تھے اور ہولی کے دیگر مشاغل میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے اس ہجوم اور خوشی کی اس دھوم کا ایک رخ ملاحظہ ہو۔

خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے ۔ گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے
نشوں کے جوش ہوئے راگ رنگ ٹھہرائے ۔ جھمکتے روپ کے بن بن کے سوانگ دکھلائے

ہوا ہجوم عجب ہر کنار ہولی کا

گلاب کے مٹکوں اور رنگ کی بوچھاروں کے ساتھ ڈھولک اور مردنگ کی تھاپ بھی سنائی دیتی ہے۔ رقص کی گردشوں میں گھنگھروؤں کی یہ جھنکار ملاحظہ ہو۔

گھنگھرو کی پڑی آن کے پھر کان میں جھنکار ۔ سارنگی ہوئی بین طنبوروں کی مددگار
طبلوں کے کھٹکے طبل پہ سازوں کے بجے ساز ۔ راگوں کے کہیں غل کہیں ناچوں کے بندھے تار

ڈھولک کہیں چھنکار رہے ہے مردنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

نظیر کی نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ہندو مسلمان ہولی کا محدود تصور نہیں رکھتے تھے۔ ایسے تہواروں کو بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ اور جب ہولی کا موسم آتا تو شاذ ہی ایسا کوئی دامن ہوتا جو تہی از رنگ رہ جاتا۔

نظیر ہولی کا موسم جو جگ میں آتا ہے ۔ وہ ایسا کون ہے ہولی نہیں مناتا ہے
کوئی تو رنگ چھڑکتا ہے کوئی گاتا ہے ۔ جو خالی رہتا ہے وہ دیکھنے کو جاتا ہے

جو چاہو عیش سو ملتا ہے یار ہولی میں

حسرت موہانی کے ہاں ہولی کا ایک چھتا تلا رومانی تصور ملتا ہے۔ محبت کی چوٹ کھانے کے بعد انسانی روح وجدان کی ان بلندیوں میں پرواز کرنے لگتی ہے۔ جہاں مذہب، رسم و رواج اور ظاہرداری کے سب بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔

موپہ رنگ نہ ڈار مراری ۔ منتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرن کا جائے نہ دیہیں ۔ شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت ۔ دیکھت ہیں نر ناری

ہندوستان میں دیوالی کا تہوار بھی خالی از لطف نہیں۔ مغل بادشاہوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیوالی کے موقعہ پر وہ ایک ایسے برتن سے نہاتے تھے جس میں اکیس (۲۱) چھید ہوتے

تھے۔ بادشاہ کو تولا جاتا تھا اور وہ رقم غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔[۵۱]

نظیر نے اس موضوع پر بھی دادِ سخن دی ہے۔

کھلونے کھیلوں تماشوں کا گرم ہے بازار ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

جوئے کی روائت دیوالی کی جان ہے اور دیوالی کے اس شگون میں بھی ہندو مسلم ساتھ ساتھ شریک ہوتے تھے۔ جواریوں کے مجمع میں اور چوپڑ کی محفل میں مذہب کی تفریق مٹ جاتی تھی۔ اور ہار جیت کے داؤ لگتے تھے۔ نظیر کی نظموں کی مدد سے ہندو مسلم یکانگت کے کئی ایسے مرقعے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اس عہد کے مسلمانوں کے لئے دیوالی سے دسہرہ بھی کم اہم نہ تھا۔ نظیر کہتے ہیں:۔

ہے دسہرے میں بھی یوں گو فرحت و زینت نظیر پر دیوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

اور پھر سلونو تو ایسا تہوار ہوتا ہے جس دن محبت کے رشتہ میں نئی گانٹھ لگتی ہے۔ "سنہری سبز ریشم" کی یہ راکھی بھائی کو بہن سے، حبیب کو محبوب سے اور انسان کو انسان سے جوڑنے کی بے پناہ تاثیر رکھتی ہے۔

پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اُوپر نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھوا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تہوار کی راکھی

دہلی کے پھول والوں کا میلہ (سیر گل فروشاں) آج تک مشہور ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے اپنے سحر کار قلم سے اسے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔[۵۲] یہ ہندو مسلمانوں کا مشترک تہوار تھا۔ اکبر ثانی کو اس میں شرکت اتنی عزیز تھی کہ ایک مرتبہ بیماری کے عالم میں مسہری پر لیٹے لیٹے اس میلہ کو دیکھا اور انعامات تقسیم کئے۔ یہ تمام رسمیں بہادر شاہ ثانی کے وقت تک اہتمام کے ساتھ ہوتی رہیں۔[۵۳]

مرزا کاظم علی جواں نے ۱۸۱۲ء میں ایک بارہ ماسہ لکھا تھا جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ اس کا نام دستورِ ہند تھا۔ اب نایاب ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مضمون "عید میلاد اور جنم اشٹمی" میں ان دونوں تہواروں میں تطابق ظاہر کیا ہے (اخبار منیح جنم اشٹمی نمبر) اس کے علاوہ شوق قدوائی بے نظیر شاہ عظمت اللہ خاں اور حفیظ جالندھری نے بھی ہندو تہواروں کے بارے میں اپنی عقیدت ظاہر کی ہے۔ مقبول حسین کی تصنیف "بھارت کے تہوار" اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔

محرم کی عزاداری میں ہندو اہل قلم حضرات نے جس بے پناہ خلوص سے اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے

---

۵۱ میر تقی میر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۶۳ ، ۵۲ مضامین فرحت جلد ۴

۵۳ دہلی ۱۸۴۲ء میں بحوالہ میر تقی میر۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۶۳

اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے باقی تہواروں پر بھی ہندو حصّہ لیا کرتے تھے۔ قلی قطب شاہ کی ایک نظم عید میلاد نبی سے ظاہر ہے کہ احمد نگر اور بیجا پور کے مسلمان تاج داروں کے علاوہ ہمسایہ ہندو راجگان بھی اس کے جشن عید میں شامل ہوتے تھے۔

جب آشہ ملوکاں سو مجلس بھرا دیں کھڑے ہوئیں دو رست جوڑ ہندو راجاں

شاہ عالم ثانی نے غوث الاعظم کی تقریب پر کئی غزلیں لکھی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بڑی دلچسپی سے سنی جائے گی کہ یہ مہدی ہر سال گیارہ (۱۱) ربیع الاول کو مرزا راجہ رام ناتھ ذرہ تخلص بیشکار نظامت کے یہاں سے بڑی دھوم اور عقیدت کے ساتھ قلعہ میں آتی تھی۔[۵]

لکھنوی معاشرت میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تہوار کس میل و محبت سے مناتے تھے اس سلسلہ میں رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کا محض ذکر کر دینا ہی کافی ہوگا۔

غرض یہ کہ اردو ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو مشترک ہندوستانی تہذیب سے اثر پذیر نہ ہوا ہو۔ اس تہذیب نے صدیوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رکھا ہے۔ اور خود ہمارے زمانے تک اس کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ قدیم روایات کے مطابق دربار و محفل میں شاعروں کی موجودگی شائستگی اور تہذیب کا لازمہ سمجھی جاتی تھی۔ ہندو راجگان کو مسلمانوں کی اور مسلمان امراء و سلاطین کو ہندوؤں کی سرپرستی کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے سرمایہ فخر تھے۔ اردو ادب میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اردو کے ان بے شمار ہندو شاعروں میں سے جو مسلمان نوابوں یا رئیسوں کے ساتھ وابستہ رہے، کچھ کے نام یہ ہیں:۔

۱ منشی جسونت رائے منشی اورنگ آباد کے گورنر دکن سعادت یار خاں کے دربار میں معزز عہدہ رکھتے تھے۔

۲ ولی رام ولی اردو کے اولین ہندو شاعر شاہزادہ دارا شکوہ کے مشیر خاص تھے۔

۳ آنند رام مخلص عہد محمد شاہی میں عماد الدولہ کے وکیل تھے۔

۴ راجہ بینی بہادر، عالم گیر ثانی کے عہد میں صوبہ دار بہار و اڑیسہ تھے۔

۵ راجہ گوپال ناتھ، شاہ عالم بادشاہ کے مقرب تھے اور اس رعائت سے غلام تخلص کرتے تھے۔

۶ مول چند منشی بھی دربار شاہ عالم سے وابستہ تھے۔

---

[۵] مجموعہ نغز۔ بحوالہ نادرات شاہی ص ۶۱

۷ مرزا ہیدر ناتھ بہادر تخلص نسیم دربار دہلی میں ناظر شاہی کے عہدے پر ممتاز تھے اور ان کا شمار شاہی عزیزوں میں ہوتا تھا۔

۸ ہری رام جودت مرشد آبادی نواب علاؤالدولہ کی سرکار میں توسل رکھتے تھے۔

۹ راجہ نول رائے وفا نواب صفدر جنگ کے نائب تھے اور روہیلوں کی لڑائی میں جان بحق ہوئے۔

۱۰ راجہ بینی بہادر، بہادر تخلص، نائب نواب شجاع الدولہ تھے۔

۱۱ راجہ جسونت سنگھ پروانہ شجاع الدولہ کے دیوان تھے۔

۱۲ صاحب رائے صاحب آصف الدولہ کے درباری شاعر تھے۔

۱۳ طوطارام شایاں نواب سعادت علی خاں کے دورِ حکومت میں عہدہ بخشی گیری پر فائز تھے۔

۱۴ جیالال بہادر محمد علی فرمانروائے اودھ کے عہدِ حکومت میں بعہدہ سر دفتر محکمہ خاص سلطانی پر ممتاز تھے۔

۱۵ شیو پرشاد ثاقب کا شمار واجد علی شاہ کے مصاحبین میں ہوتا تھا۔

۱۶ مادھو رام مادھو واجد علی شاہ کے بخشی الملک تھے۔

۱۷ منشی دولت رائے شوق، واجد علی شاہ کے اُن مصاحبین خاص سے تھے۔ جو بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج کلکتہ تک گئے۔

۱۸ منشی رام پرشاد، پرشاد مدارالمہام نواب محسن الدولہ رئیس لکھنؤ کے تھے۔ امام باڑہ حسین آباد کا انتظام ہمیشہ ان ہی کے ہی رہتا تھا۔

۱۹ اجودھیا پرشاد، سحر، اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں کے دیوان تھے۔

۲۰ بخشی بھولاناتھ عاشق، سرکار محمد الدولہ کے دیوان تھے۔

۲۱ نند لال فدائی، نواب ضابطہ خان سے وابستہ رہے۔

۲۲ فوجی رام فوجی، جن سے اُردو کے سات دیوان یادگار ہیں، نواب حسین علی خاں کے ملازم تھے۔

۲۳ راجہ ہلاس رائے مہاراج، دیوان نواب رحمت خاں تھے۔

۲۴ دیبی پرشاد بشاش، ۲۵ لالہ منالال مشتاق، ۲۶ منشی چھتن لال بہجت اور

۲۷ بساون لال شاداں ریاست ٹونک سے وابستہ رہے۔

۲۸ ایسے ہی رام سہائے تمنا، ۲۹ مہاراجہ چندو لال شاداں اور ۳۰ مہاراجہ گردھاری پرشاد باقی دولت عثمانیہ کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

ایسے ہی تحقیق کرنے سے کئی ایسے ہندو مربیوں کے نام بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جن کی دولت وشفقت سے مسلمان اہل قلم فیضیاب ہوتے رہے۔ "میر تقی میر جیسے آشفتہ مزاج اور نازک دماغ کی دستگیری اور ناز برداری جن چند ہندو رئیسوں نے کی، ان کے نام یہ ہیں[۵۱]:" (۱) مہا نرائن دیوان (۲) راجہ جگل کشور (۳) راجہ ناگرمل (۴) بہادر سنگھ اور (۵) رائے بشن سنگھ۔

رجب علی بیگ سرور، مہاراجہ ایشری پرشاد، نرائن سنگھ والئی بنارس و مہاراجہ پٹیالہ و الور کے خوشہ چین رہے۔ مرزا داغ، راجہ ہرکشن سنگھ بیدار کے ہاں کشن کوٹ ضلع گورداسپور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اُردو ادب میں ایسی مثالیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ یہ موضوع بجائے خود ایک الگ مقالہ کا محتاج ہے۔

آج سے پچاس سال بیشتر اُردو ادب میں تقریظوں اور قصیدوں کا رواج عام تھا۔ اُردو ادب میں ایسے بے شمار قصائد ملتے ہیں جو مسلمانوں نے ہندوؤں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی مدح میں یا دوستی سے متاثر ہو کر کہے۔ اس میں شک نہیں کہ عموماً ان محرکات کی پشت پر معاشی ضروریات زندگی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایسی بھی کئی مثالیں کی جا سکتی ہیں، جو بے لوث قسم کی وابستگی اور بے غرض عقیدت کی مظہر ہیں۔

رام سہائے تمنا نے نواب آصف الدولہ کے حالات حکومت کو یوں نظم کیا ہے

عہد نواب آصف الدولہ بہادر خوب تھا　　یہ زمانہ طبع خاص و عام کو مرغوب تھا

تاجران شہر جب اپنی دکانیں کھولتے　　آصف الدولہ کا لے کر نام جو جی بولتے

ہندو و مسلم تھے دونوں سلطنت کے عہدہ دار　　حکمراں کی آنکھ میں ہر اک کا تھا یکساں وقار

تھے وزیر ایسے کہ جن کی ذات سے تھا سب کو چین　　نام میں ان کے ہیں الفاظِ تفضل اور حسین

آپ بھی تھے منتظم ایسے کہ لطف عام تھا　　ان کے دم سے اتفاقِ ہندو و اسلام تھا

---

[۵۱] میر تقی میر۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۱۷۵

ہیں ٹکیٹ راے جن کے نام نامی کے نشاں　　تھے یہیں کا لستھ بھی دیوان فیاض زماں

مندروں اور مسجدوں کی تھی جو عزت دلنشیں　　جا بجا ایسی عبادت گاہیں بھی تعمیر کیں

یہاں اقبال کے اس قصیدے کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے بارے میں کہا تھا۔ اس کے آخری دو اشعار ملاحظہ ہوں[۵۱]:

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا　　محو کر سکتا نہیں جس کو مرور روزگار

شکر یہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے　　مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

منشی جگن نرائن خوشتر نے ۱۸۷۹ء میں رامائن منظوم لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے واجد علی شاہ حکمران اودھ پر پوری منقبت تحریر کی تھی۔ منوّر لکھنوی نے بھی اپنی نظموں میں غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے بارے میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان تعلقات کی پختگی اور گہرائی کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک ان مرثیوں کو نہ دیکھ لیا جائے جو دونوں نے اپنے اپنے دلِ زخم خوردہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھے:

۱۷۷۴ء میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بستی ندی کی جنگ میں اپنی بندوق کے پھٹ جانے سے مارا گیا۔ نامدار خان دت ایک مسلمان نے اس کا مرثیہ لکھا ہے اس کا صرف پہلا بند ملاحظہ ہو۔

احوال چڑت سنگھ لکھتا ہوں فی المثل　　پہونچا جب اس کا حکم قضا سیں دم اجل

آیا ولایت اپنی سے لے کر ہجوم دل　　فرصت نہ دی قضا نے چلا چل میں ایک پل

آیا اجل کا شیر ہرن کے شکار پر[۵۲]

جے سنگھ سکھوں کی کینہ مثل کا بانی تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اس کا اکلوتا فرزند گوربخش سنگھ عین میدانِ جنگ میں گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی وفات پر بٹالہ کے ایک شاعر محمد غوث بٹالوی نے اس کا مرثیہ لکھا۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

سر اپنے پہ غم سوں اٹھا خاک ڈار　　تاسف سوں کہتے ہیں سب شہر دار

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان　　کدھر سو تیاں والا ہے نوجوان[۵۳]

راجہ رام نرائن عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ موزوں تخلص کرتے تھے اور شیخ علی حزیں سے شرف تلمذ تھا۔ جب نواب سراج الدولہ مارے گئے تو راجہ صاحب نے یہ شعر کہا تھا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی　　دوانہ مر گیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گزری

---

۵۱ رسالہ مخزن۔ بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء، ۵۲ پنجاب میں اردو ص ۳۴۴، ۵۳ پنجاب میں اردو ص ۳۵۲

یہ شعر ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کی ایسی مثال ہے جسے تاریخ کے صحیفوں میں ہمیشہ سنہرے الفاظ میں رقم کیا جائے گا۔

سید انشا اللہ خاں کی تاریخ وفات ایک ہندو شاعر بسنت سنگھ نے کہی تھی۔

خبر انتقال میر انشا دل غمدیدہ تا نشاط شنفت
سال تاریخ او زجان اجل عرفی وقت بود انشا گفت [۵۱]
۱۲۳۳ = ۱۲۳۰ + ۳

اردو کے موجودہ ہندو شاعروں سے لال چند فلک نے حالی اور محسن الملک کی موت پر اور منور لکھنوی نے مولانا محمد علی کی وفات پر مرثیے کہے ہیں۔ منور کے اشعار میں خلوص کی بے انتہا چمک ہے

پہلو میں اپنے قلب مصفا لئے ہوئے سر میں عروج قوم کا سودا لئے ہوئے
آزادی وطن کی تمنا لئے ہوئے پیغام اتحاد کا پرچا لئے ہوئے
دنیا سے اپنے ہاتھ اٹھائے چلا گیا
سوئے عدم قدم کو بڑھائے چلا گیا

حسرت موہانی نے لوکمانیہ تلک کی وفات پر دو غزلیں لکھی تھیں۔ ایک کا مطلع ہے

قائم ہو نہ کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک بلونت تلک مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک

مہاتما گاندھی کی شہادت پر اردو کے مسلمان شاعروں نے کئی نظمیں لکھی ہیں جن کا ذکر طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

آج ہم خود جب اقبال یا غالب ڈے منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں تو اس بعد یا تفاوت کو بھول جاتے ہیں جو غلامانہ ذہنیت کے زیر اثر ہم میں راہ پا گیا ہے۔

اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا ذکر کرنا نامکمل رہے گا اگر ہندو اور مسلمانوں کے ان تاریخی معاشقوں کا ذکر نہ کیا جائے، جن کی شہادت اردو ادب سے دستیاب ہوتی ہے۔

روپ متی اور باز بہادر، حکمران مالوہ کا قصہ تو اس قدر عام ہے کہ اس کا صرف ذکر کردینا ہی کافی ہوگا۔ عظمت اللہ خاں نے اس معاشقہ کو نظم کیا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھاگ متی چھلیم کی ایک ہندو رقاصہ کا گرفتار محبت تھا۔ تخت نشینی کے چند سالوں کے بعد اس عاشق صادق نے اپنی محبوبہ کے

---

[۵۱] سیر المصنفین جلد اول ص ۸۹

اعزاز و اکرام میں اس کے موضع چچلم کو ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔ شادی کے بعد بھاگ متی کو حیدر محل کے خطاب سے نوازا گیا اور بھاگ نگر، حیدر آباد کے نام سے مشہور ہو گیا۔ قلی قطب شاہ کے کلام سے اُس کے اس معاشقہ کا سُراغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کلیات میں "بارہ پیاریاں" کے عنوان سے جو نظمیں درج ہیں ان میں موہن، ہندی چھوری، سانولی، سندر، سجن، اور پدمنی کے نام دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو تھیں۔

مرزا محمد مقیم مقیمی دکنی شاعر تھا۔ ایک مثنوی چندر بدن و مہیار سن تصنیف ۱۰۴۳ھ اس سے یادگار ہے جناب نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ چندر بدن اور مہیار کے عشق کا جو قصہ اس میں نظم کیا گیا ہے وہ بظاہر ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر بقول نواب سراین جنگ بہادر اس قصہ کی اصلیت میں شک نہیں اب تک علاقہ مدراس کے ایک قصبہ میں ان دونوں عاشق و معشوق کی قبر موجود ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔ مولف تزک آصفیہ نے بھی اس روداد عشق کی صداقت کے متعلق صراحت کی ہے اور اس کو ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔[۵۱]

اردو کی عشقیہ مثنویوں میں میر کی شعلۂ عشق کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ پرس رام کی بیوی کی دلدوز اور یاس انگیز کہانی ہے۔ پرس رام کا اصل نام محمد حسن تھا۔ جو محمد شاہ بادشاہ کے دور حکومت میں پٹنہ کا باشندہ تھا۔ شیام سندر، وہاں کے ایک مہاجن کی لڑکی پر عاشق ہوا اور آخرکار ہزاروں صدمے اٹھانے کے بعد اس سے نکاح ہو گیا۔ ایک روز محمد حسن کے ڈوب مرنے کی غلط خبر سن کر شام سندر نے کلیجہ پیٹ لیا اور جان بحق ہو گئی۔

شوق نیموی کا بیان ہے[۵۲]: "شام سندر کی جواں مرگی سے (محمد حسن نے) دل پر اتنی گہری چوٹ کھائی کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ادھر دریا کے کنارے کچھ اور ہی تماشا تھا۔ آدھی رات کو ایک تند و تیز روشنی آسمان سے اترتی اور "حسن حسن" پکارتی۔ محمد حسن نے جب شعلۂ آسمانی کا حال سُنا تو بے قرار ہو گئے ...... چند احباب کے ساتھ کشتی میں سوار دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ اور آدھی رات گزر جانے پر آسمان سے وہ شعلہ اترا کناروں پر دوڑا اور "حسن حسن" پکارنے لگا۔ محمد حسن کی عجیب حالت ہوئی۔ بجلی کی تیزی سے وہ شعلہ کی طرف لپکے اور احباب کے دوڑتے دوڑتے یہ جا، وہ جا، آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سطح آب پر دو تیز و تند روشنیاں ابھریں اور "حسن۔ شام سندر، حسن۔ شام سندر" کہتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ جب دونوں مل گئیں تو بھک سے روشنی

---

۵۱ دکن میں اردو۔ ص ۱۲۶، ۵۲ بحوالہ میر تقی میر۔ ص ۴۲۹۔

کی چمک بجلی سی ہوگئی اور دریا سارا منور ہوگیا۔ معاً یہ چمک ماند پڑ گئی اور پھر کبھی کوئی روشنی دیکھنے میں نہ آئی۔ محمد حسن کی لاش کا کوئی پتہ نہ چلا۔"

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا بیان ہے کہ میر اس واقعہ کے مخترع نہیں ہیں[۵۱] اور جلال لکھنوی و شوق نیموی کے ان بیانات، کو جو ڈاکٹر فاروقی نے اپنی تصنیف میر تقی میر میں نقل کئے ہیں، دیکھنے کے بعد اس تاریخی معاشقہ کی صداقت میں شبہ کی گنجائش کم باقی رہ جاتی ہے۔

گلاب سنگھ آشفتہ انیسویں صدی کے قرن اول کے ایک دہلوی شاعر تھے۔ قادر بخش صابر مصنف گلستان سخن نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ "بنو" ایک خوبصورت زنِ خانگی پر عاشق تھے۔ بنو کا جواب دہلی میں کم تھا۔ یہ بھی ان کی طرف ملتفت تھی۔ لیکن نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی کہ آشفتہ نے خودکشی کر لی۔ بنو پر اس سانحہ کا اس قدر اثر ہوا کہ اسے دِق ہوگئی اور کہتے ہیں کہ بعد چندروز راہی ملک عدم ہوئی۔ صابر نے بنو اور آشفتہ کے کئی ایسے اشعار نقل کئے ہیں جن کے سننے سے آج بھی دردمندانِ محبت کو چوٹ لگتی ہے۔

لاش آشفتہ کو بے رحموں نے پھونکا آگ سے　　آتشِ غم بھی جوانا مرگ کی کچھ کم نہ تھی[۵۲]

پشادی لال چمن پچھلی صدی کے نصف آخر کے لکھنوی شاعر تھے۔ الہی جان سے ان کے عشق کے چرچے آج تک لکھنؤ میں ہوتے ہیں۔ ان کا شعر ہے۔

سرنامہ صنم نام خدا ہے　　الہی جان کا رتبہ بڑا ہے[۵۳]

اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو ہی صرف ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندو ابتدا سے اب تک مسلمانوں کے دوش بدوش کام کرتے رہے ہیں۔ اردو کے ہندو شعرا و ادبا کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اسے دہرانا یہاں ممکن نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان تذکروں کے ذکر سے لگایا جا سکتا ہے جو صرف ہندو شاعروں یا ادیبوں کے بارے میں لکھے گئے۔

۱	تذکرہ ہندو شعرا	دیبی پرشاد بشاش
۲	ہندو شعراء	عبدالرؤف عشرت لکھنوی
۳	یاد رفتگان	شام موہن لال جگر بریلوی
۴	منتخب ہندو شعرا	عبدالشکور

---

[۵۱] بحوالہ میر تقی میر ص۲۷۲　[۵۲] دلی کالج میگزین، دلی کالج نمبر ص۱۰۸

[۵۳] تذکرہ ہندو شعرا، دیبی پرشاد بشاش۔

۵ بہار گلشن کشمیر۔ دو جلدوں میں، برج کشن کول بےخبر و جگ موہن ناتھ شوق۔

۶ مثنوی بعنوان اُردو۔ جگن ناتھ آزاد

۷ لالہ سری رام نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف خمخانۂ جاوید میں بھی ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔

کئی ہندو حضرات نے اُردو کے ہندو مسلم شعراء کے تذکرے بھی لکھے ہیں۔ ان تذکروں میں مسلمان شاعروں کا ذکر بلاتفریق مذہب و ملت کیا گیا ہے۔ اُردو کے یہ تذکرے رواداری اور باہمی خلوص و فراخ دلی کے بہترین ترجمان ہیں۔ ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خوب چند ذکا کا تذکرہ معیار الشعرا ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۴۷ھ کے درمیان لکھا گیا۔ اس میں ۱۵۰۰ شعرا کے حالات ہیں اور یہ تین سال میں مرتب ہوا۔ جامعیت اور تفصیل کے لحاظ سے اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہے۔

۲۔ درگا پرشاد نادر دہلوی نے ۱۸۷۱ء میں گلدستہ نادر الاذکار لکھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا بیان ہے[51] کہ یہ دکنی شاعروں کا اولین تذکرہ ہے۔

۳، ۴۔ درگا پرشاد نادر نے اُردو کی شاعر خواتین کے بھی دو تذکرے تصنیف کئے۔ جن کے نام "گلشن ناز" اور "چمن ناز" ہیں۔

۵۔ دیبی پرشاد بشاش کا بیان ہے[52] کہ راجہ جنمی جی ارمان نے ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا مرتب کیا تھا۔ جس کے متعلق تحقیق نہیں ہے۔

۶۔ عشرت لکھنوی نے لکھا ہے کہ راجہ جنم جی متر بنگالی ارمان نے ایک تذکرہ شعرا "نسخہ دلکشا" کے نام سے تصنیف کیا تھا[53]۔ اغلب ہے کہ جنمی جی اور جنم جی متر ایک ہی شخص ہو۔

۷۔ لکشمی نرائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعرا اردو شاعروں کا ایک معروف تذکرہ ہے۔

۸۔ منشی بینی نرائن نے کپتان روبک کے کہنے پر "دیوان جہان" کے نام سے ہندوستانی شعرا کا ایک تذکرہ مع اُن کے منتخب کلام کے ۱۸۱۴ء میں مرتب کیا تھا[54]۔

اس کے علاوہ اُردو ادب میں رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، لالہ سری رام، برج نرائن چکبست، منشی نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، منشی نول کشور، دیا نرائن نگم، سرتیج بہادر سپرو، منشی پریم چند، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، رگھوپتی سہائے

---

۵۱ شعرائے اردو کے تذکرے ص ۳۰۷، ۵۲ تذکرہ ہندو شعراء ص ۵۵، ۵۳ ہندو شعراء ص ۱۶

۵۴ سیر المصنفین۔ محمد یحییٰ تنہا۔ ص ۱۳۶، جلد ۱۔

فراق اور کرشن چندر کے اسمائے گرامی کا ذکر ہی اخوت اور محبت کے ان مبارک جذبات کا پیامبر ہے جو اتحاد و اتفاق کے ضامن ہیں۔

یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ آج بھی اُردو کی ہر صنف ادب میں ہندو و مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ مذہب کی سطحی تفریق ان کی صفوں میں کبھی انتشار پیدا نہیں کر سکتی۔

اُردو ادب کے اس حصہ نے جو فسادات اور اس کے بعد کے دنوں میں لکھا گیا ہے، مذہب کے گمراہ کن جوش کو محبت کے غلو میں بدل دینے کی کوشش کی ہے۔ توہم جہالت اور فرقہ وارانہ عناد کی بیخ کنی ہمیشہ اُردو ادب کا مقصد اول رہا ہے اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں ہندوستان بھر کی علاقائی زبانوں میں کوئی بھی زبان اتحادپسندی کے رجحانات کی ترویج و ترقی میں اُردو سے سبقت نہیں لے سکتی۔ اور حق تو یہ ہے کہ اردو اور اتحاد دو الگ لفظ نہیں ہیں کیونکہ

ریاضِ ہند میں اُردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے
جسے خونِ جگر سے ہندو مسلم نے سینچا ہے (جگن ناتھ آزاد)

امین گجراتی کی یوسف زلیخا

(صفحہ ۷ا کا بقیہ)

عجب ہیں بخت اس کی چھات کیرے
رکھے اپنا سورج اپنے تلے رہے

اگر میں بی ہوتی چونا نے ماتی
تو اس سورج کوں اپنے تل چھپاتی

دیواروں کے بڑے ہیں جگ میں بخت
جہاں یوسف نے کھینچا آپنا رخت

اگر اینٹوں کا میں ہوتی لڈھیں ڈھیر
یوسف کوں اس روش تو راکھتی گھیر

بڑے ہیں بخت اس دلہیز دہلی کے جگ میں
جو بیٹھی بوسے دیتی ہی یوسف کے پگ میں

اگر میں بھی پتھر دہلی کا ہوتی
تو یوں یوسف کے قدموں تل میں ہوتی

✣ ✣ ✣

دلّی کا نوابی مشاعرہ اور مولانا حالی

(پروفیسر قاسم علی سجن لال صاحب ایم اے۔ استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ)

میرے ذاتی کتب خانہ میں بہت سے پُرانے اخبار رہیں، ان میں "نظام الملک" کے بھی کچھ پرچے ہیں محمد احتشام الدین نے مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کی مسند نشینی کی یادگار میں یہ اخبار جاری کیا تھا یہ اخبار ہر شنبہ کو شائع ہوتا تھا، اس کے ہر شمارہ میں بارہ صفحے ہوا کرتے تھے۔ اور مطبع احتشام محلہ قاضی ٹولہ مراد آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں تاریخی مواد کے ساتھ ادبی مواد بھی قابلِ ذکر ہے۔

اس وقت میرے سامنے اس اخبار کا پرچہ نمبر ۱۶ جلد اوّل مورخہ ۲۸ جون ۱۸۸۴ء ہے۔ اس کے تیسرے صفحے پر "دلی کا نوابی مشاعرہ اور مولانا حالی" کی سرخی نے مجھ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ مشاعرہ کی روئیداد اڈیٹر نے لکھی ہے مگر تاریخ یا دن کا ذکر نہیں کیا ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو نے اس مشاعرہ کا انتظام کیا تھا۔ نواب ممدوح اُردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں[۱]

اب میں ناظرین کی خدمت میں مشاعرہ کی روئیداد پیش کرتا ہوں۔ اس روئیداد سے اس عہد کے اخباروں کی زبان کا بھی اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"لکھنؤ کے قدیم اور مشہور و معروف امیر نواب آغا میر مرحوم کے پوتے نواب سید محمد حسین خاں وثیقہ دار کے دلّی میں تشریف لانے پر نواب علاء الدین احمد خاں بالقابہ نے جو پچھلے دنوں ایک تخلیہ کا مشاعرہ قرار دیا تھا اُس میں ہمیں ہمارے مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کو بھی احباب نے تکلیف شمول دی تھی۔ مگر چونکہ مولانائے موصوف کا ایک ایسے ایشیائی مشاعرہ میں تشریف لانا اُن کے مشہور و معروف مسدّس مد و جزر اسلام کے عنوان کی اس مقبول رباعی کو غیرت سے یاد دلاتا تھا ؎

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تونے ہم کو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اس لئے مولانائے ممدوح نے بجائے اس کے کہ کوئی طرحی یا غیر طرحی غزل ارشاد فرماتے ارباب مشاعرہ کی فرمائش سے ذیل کا قطعہ سنا کر سب کو محظوظ و مطمئن فرمایا۔ یہ قطعہ اگرچہ بلحاظ تکلفات شاعری

---

[۱] ان کی زندگی اور ادبی کارنامہ کے لئے ملاحظہ ہو مضمون خان بہادر مرزا شمس الدین احمد خاں سابق ناظم لوہارو اردو جولائی ۱۹۴۴ء صفحات ۳۰۹ تا ۳۲۸ جس میں تاریخ وفات کا خط بھی موجود ہے۔

کے ایسی چیز نہیں ہے کہ اس سے ہمارے شعرا اپنے ترکیب کا مذاق حاصل کر سکیں بلکہ محض اردو کی سیدھی سادی زبان میں ایک مشہور و معروف مصرعہ کی تضمین ہے اور فاضل مصنف نے بھی جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے اس کی تصنیف میں اپنی جانب سے تکلف کا اظہار یا قصد نہیں فرمایا لیکن ہماری قدیم شاعری کے لئے مصرف طریق کو چھوڑنے کی جو عملی وجہ انھوں نے اس میں ظاہر فرمائی ہے وہ ایک ایسی پسندیدہ صورت میں جلوہ گر ہے جسے ہم بے اختیار قبول کرتے اور ملکی شاعروں کے لئے ایک نیک صلاح جانتے ہیں ؎

ہوئی وہ لطف جوانی کی بہار آخر حیف	طبع اپنی تھی مٹی عشق کی جب متوالی
شعر جو کہتے تھے ہوتی تھی وہ اپنی روداد	جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب وہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ	سر ہے سودا سے تہی عشق سے ہے دل خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر	نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو، ہے وہ کہانی بے لطف	گرچہ ہے لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں	لائے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر	کیجئے لذت فرقت کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح	وہ ہوا جس سے داغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل	"قحبہ چو پیر شود پیشہ کند دلالی"

غالباً یہ آخری مشاعرہ تھا جس میں مولانا حالی نے شرکت کی۔ کیونکہ ۵ ماہ کے بعد نواب علاء الدین کا انتقال ہوا۔

میرے کتب خانے میں پنجابی اخبار کے کچھ نمبر ہیں۔ ان میں نواب صاحب کے انتقال پر جو تعزیتی خطوط ان کے فرزند میرزا امیر الدین فرخ کے نام لکھے گئے ہیں وہ پائے جاتے ہیں انھیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

"ہز ہائی نس نواب علاء الدین احمد خاں والی لوہارو نے دہلی میں ۳۱ اکتوبر کو انتقال کیا۔ یہ احمد بخش خاں کے پوتے تھے جو راجہ صاحب نے یہاں ملازم تھے۔ اور لارڈ لیک کے رفیق تھے۔ ان خدمات کے صلہ میں راجہ صاحب الور نے علاقہ لوہارو دیا اور لارڈ لیک نے پرگنہ فیروز پور۔ ان کے بڑے صاحبزادے شمس الدین جو ان کی جگہ پر ہوئے تھے دہلی میں اس باعث مارے گئے کہ انھوں نے مسٹر فریزر رزیڈنٹ کے مارنے والے کو چھپا لیا تھا۔ ریاست

لوہارو دوسرے دو لڑکوں کو دے دی گئی اور پرگنہ فیروز پور ضبط کر لیا گیا" سب سے بڑے لڑکے نواب صاحب ان کے غالباً قائم مقام ہوئے لیکن ان کی زندگی میں سب انتظام میرزا امیرالدین فرخ کرتے رہے۔[۵۱]

صفحہ پانچ پنجابی اخبار کے پہلے کالم میں خبر رحلت نواب صاحب کا ذکر یوں کیا گیا۔

"تعزیت۔ نواب محمد علاءالدین احمد خاں صاحب رئیس لوہارو کے واقعہ جانکاہ کا حال تو ہم پچھلے ہفتہ لکھ چکے تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ اب مکرر لکھنا گویا غم و اندوہ کو تازہ کرنا ہے کیونکہ نواب صاحب مرحوم کی عادات و صفات حسنہ ایسے نہیں تھے کہ اس حال کو کوئی سنے اور بے ساختہ آہ آہ سرد اس کے دل سے نہ نکلے"[۵۲]

لفٹنٹ گورنر پنجاب اور کمشنر دہلی نے تعزیتی خطوط لکھے۔

ملاحظہ ہو ترجمہ خط لفٹنٹ گورنر پنجاب

ڈیر سر میں اس کی شرح نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کے والد کے انتقال کی خبر سے کیا ملال ہوا ہے۔ یہ وفات بہت غیر متوقع تھی۔ آپ کے والد ایک وفادار اور صادق دوست گورنمنٹ کے تھے۔ اور وہ ایک شریف الوضع اور فاضل آدمی تھے۔ آپ کے والد کا انتقال کا ملال و غم ایک کثیر گروہ احباب میں ان کے ہوگا۔ میں اس موقعہ پر زیادہ تر آپ کے غم و ماتم کی نسبت نہیں کہوں گا۔ لیکن صرف خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اور آپ کے اہل خاندان کو اس واقعہ سخت میں صبر عطا فرمائے۔[۵۳]

ترجمہ خط، میجر آر بیری نسبٹ کمشنر دہلی۔

سر۔ میں بکمال افسوس ظاہر کرتا ہوں اپنے ذاتی ملال کو جو ابھی باستماع خبر انتقال ہز ہائی نس نواب فخرالدولہ علاءالدین احمد خاں بہادر مرحوم و مغفور مجھے حاصل ہوا ہے۔ نواب صاحب مرحوم ایک وفادار دوست برٹش گورنمنٹ کے تھے۔ اور افسران انگلش کی جماعت میں بہت مکرم تھے۔ مجھے یقین ہو کہ آنریبل لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب ان کی وفات پر نہایت تاسف فرمائیں گے۔

---

۵۱ پنجابی اخبار از قاسم علی سجن۔ ملاحظہ ہو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۶۔ ۶۰ اور پنجابی اخبار مورخہ ۱۹ نومبر ۱۸۸۴ء۔ نوٹ:۔ کریم الدین خاں نے فریزر کو قتل کیا اور شمس الدین خاں لوہارو اس سلسلہ میں قید کر دئے گئے۔ اور ان کو ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی دی گئی۔ ملاحظہ ہو اخبار "سلطان الاخبار" مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۸۳۵ء اور تفصیل سے ملاحظہ ہو صابری۔ اردو صحافت، صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۳

۵۲ و ۵۳ پنجابی اخبار مورخہ ۱۹ نومبر ۱۸۸۴ء

مہربانی فرماکر میری جانب سے تمام اہل خاندان سے تعزیت کر دیجئے اور مجھے اپنے غم میں شریک تصور کیجئے۔[۵۱]

نواب مرحوم کی قدر و منزلت کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے۔ ہاں جبکہ ڈیوک آف کناٹ دہلی پہنچے تو ان کو نواب صاحب کا بڑا خیال تھا یہاں تک، کہ بیگم لوہارو سے ملنے ڈچس آف کناٹ گئیں اور چائے نوشی میں شامل رہیں[۵۲]

---

[۵۱] پنجابی اخبار مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۸۸۴ء

[۵۲] ملاحظہ ہو حامی ہند مورخہ ۷ر فروری ۱۸۸۴ء

"دستنبو" کا ایک خاص نسخہ

(سید جمیل الدین)

(گذشتہ سے پیوستہ)

"دستنبو" میں دخیل عربی الفاظ کی تفصیل سے پہلے یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے سوانح نگاروں میں سب سے پہلے مولانا حالی اس کتاب کی زبان معرض بحث میں لاتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہتے کہ غالب کا یہ دعوی کہ "دستنبو" میں کوئی لفظ عربی نہیں آیا ہے صحیح نہیں۔ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پایا۔ کیا ان کا اندازِ سوانح نگاری اس کا ذمہ دار ہے؛ ذرا ان کے اندازِ سوانح نگاری پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

حالی کا اندازِ سوانح نگاری:

حالی یہ جانتے ہوئے کہ:

"تاریخ کی طرح بیوگرفی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔ .... بیوگرفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر غوص کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔[۵۱]"

مانتے تھے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں وہ وقت نہیں آیا تھا کہ ہیرو کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ "حیاتِ جاوید" ۱۹۰۱ء کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

"ہندوستان میں۔ جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اُس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرفی کر مکمل طریقے سے لکھی جائے، اُس کی خوبیوں کے ساتھ اُس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اُس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔[۵۲]"

"حیات جاوید" لکھنے سے پہلے جن "دو ایک مصنفوں کا حال" وہ اس احتیاط کے ساتھ لکھ چکے تھے۔

---

۵۱ حیاتِ سعدی، مطبع مفید عام، آگرہ، طبع ثانی، ص ۳ (دیباچہ)

۵۲ حیاتِ جاوید، مطبع مفید عام، آگرہ، طبع ثانی ۱۹۰۳ء ص ۱

ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔" ان میں ایک شیخ سعدی ہیں اور دوسرے مرزا غالب جن کی سوانح عمریاں "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" کے نام سے علی الترتیب ۱۸۸۲ء اور ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئیں۔

حالی کی نسبت مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔"[۵۱]

ان کی یہی خوبیاں، حد اعتدال سے بڑھ کر، ان کی کمزوریاں بن جاتی ہیں۔ وہ نکتہ چینی کی ضرورت سمجھتے ہوئے بھی نکتہ چینی سے دامن بچاتے ہیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے بعد بھی "نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار" رہتے ہیں۔

اپنے دیوان کے مقدمے میں کہتے ہیں:

"اگرچہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحتہً نکتہ چینی کی جائے کیوں کہ عمارت کا بودا پن جیسا بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے۔ اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اُس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔ بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس شخص پر بالتخصیص اعتراض کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعری کے عام طریقہ کی خرابی ظاہر کرنی مقصود ہے جس میں اُس شخص کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک ممکن تھا کسی پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اپنی شاعری کے اصولِ مسلّمہ سے ناواقف ہے۔ یا اُس نے کوئی گرمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یا کوئی ایسی فروگذاشت کی ہے جس سے قدیم طریقہ کے موافق اُس کی شاعری پر حرف آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ایسے اعتراض کیے ہیں جو نہ صرف اُردو شاعری بلکہ تمام ایشیائی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہم وطن کو ناگوار گذرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار ہیں۔"[۵۲]

---

۵۱ چند ہم عصر، لطیفی پریس، دہلی، ص ۱۵۱

۵۲ مقدمہ شعر و شاعری مطبع انصاری دہلی ۱۸۹۳ء ص ۲۲۷-۲۲۸

نیرنگِ خیال (حصّہ اول ۔ ۱۸۸۰ء) کے تبصرہ میں بھی خیال کی یک رنگی قائم ہے:

"شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانہ حال کی عمدہ تصنیفات پر اس طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی کی تصنیفات پر کی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے غوض کرنا کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالات اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنّفوں کی امیدوں کے اور کیا باعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"[۵۱]

غالب تو ان میں سے ہیں جن کا حال اس طرح لکھا کہ "ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی" لیکن جہاں تصویر کے دونوں رُخ دکھانے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے کا دعوی کیا وہاں بھی صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں رہی۔ "حیات جاوید" کی نسبت کہتے ہیں:

"ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے"[۵۲]

لیکن کیا واقعی "حیات جاوید" میں انھوں نے نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا؟ شبلی کی رائے ملاحظہ ہو:

"حیات جاوید میں مولانا نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق، اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعروں میں کیا بُرائی ہے سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے، بہرحال میں حیاتِ جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔"[۵۳]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل خیر۔ و للناسِ فیما یعشقون مذاہبُ"[۵۴]

---

[۵۱] ص۱۴۳، مقالات حالی، حصہ دوم، جامعہ پریس، دہلی، ۱۹۳۶ء، [۵۲] حیات جاوید ص۱ (دیباچہ)

[۵۳] مکتوب بنام مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ص۱۴۳، مکاتیب شبلی حصہ اول مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۱۴ء

[۵۴] مکتوب بنام مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۲۴-۱۲۵

اور "موازنہ انیس و دبیر" میں اس انداز سوانح نگاری پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اُس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں، یہ ان عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے اُن کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ اور عذر کرنے والوں کو خود اُس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس غلامانہ شخصیت پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اس لیے وہ اچھی باتوں کے ساتھ، اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں، اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔"[۵۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی رائے ہے کہ:

"خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے تھے۔"

چنانچہ خواجہ صاحب نے غالب کے قید ہونے کے واقعہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو اُبھرنے دیا جائے۔ "حیاتِ جاوید" میں بھی اُنھوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے آخری عہد کے جن حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ "حیات جاوید" لکھنے کا خیال تک ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ایسے کاموں پر خاک تک نہیں ڈال سکتا۔ بالآخر ان ہی معاملات کو پوری رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔ ...... جوں ہی سرسید کے انتقال سے ان کے تمام نکتہ چیں دوستوں کی زبانیں خاموش ہو گئیں اور اُن کی خدمات کے اعتراف و تحسین کا از سر نو غلغلہ بلند ہوا خواجہ صاحب نے "حیات جاوید" کی تکمیل و تبییض شروع کر دی اور پھر تمام معاملات کو اسی رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا جس طرح وہ سمجھتے تھے کہ سوانح نگار کو بغرض مدحت طرازی لکھنا چاہیئے۔"[۵۲]

(باقی آئندہ)

---

۵۱ موازنہ انیس و دبیر، از شبلی نعمانی، عالمگیر پریس، لاہور، ص ۲۴۴

۵۲ "غالب" از غلام رسول مہر، مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع ثانی ۱۹۴۶ء ص ۱۸۸۔

حیدر آباد (دکن) کے عجائب خانہ کی اُردو قلمی کتابیں

(نصیر الدین صاحب ہاشمی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۴) پنچھی باچا

نمبر (پی ۳۰۰۳-۳۵) سائز (۹×۶) صفحہ (۳۳۴) سطر (۱) خط نستعلیق، کاغذ دیسی

مصنف وجدی، تاریخ تصنیف (۱۱۳۰ ہجری) کتابت

وجیہ الدین نام وجدی تخلص دکن کا مشہور شاعر تھا۔ وہ کب پیدا ہوا اور کب انتقال ہوا اس سے ہم واقف نہیں ہیں بس اتنا معلوم ہے کہ کرنول وطن تھا۔ صوفی مشرب تھا۔ تصوف سے ذوق تھا۔ موسیقی سے بھی آگاہی تھی۔ اس کی کئی شنویوں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں سے (۱) پنچھی باچا (۲) تحفہ عاشقان اور (۳) مثنوی باغ جانفزا زیادہ مشہور ہیں۔ اول الذکر شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا دکھنی ترجمہ ہے۔ اور تحفۂ عاشقان عطار کی مثنوی گل ہرمز سے ماخوذ ہے البتہ باغ جانفزا خود وجدی کی اپنی مثنوی ہے۔ وجدی کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ کلام میں تخیل کی بلند پروازی اسلوب کی جدت واقعہ نگاری ندرت اور زبان کی صفائی اور سادگی موجود ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لکچرار محمد بن عمر نے ایک تفصیلی مقالہ وجدی پر قلم بند کیا ہے۔

آغاز

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر		حمد سوں حق کی بلند آواز کر
شوق سوں ایسا اچا توں یک پچہا		جی رہے ترلوک کا عالم لوبہا
گلشن وحدت ہے تیرا آشیاں		احدیت کا راز سب تجھ پر عیاں

اس مثنوی میں پہلے حمد و نعت ہے پھر خلفاء راشدین کی علیحدہ علیحدہ منقبت کی گئی ہے اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوتا ہے۔

ختم مضمون کے بعد خاتمہ کتاب کا عنوان آتا ہے اس میں وجدی نے بیان کیا ہے کہ عطار کی فارسی مثنوی سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

شکر کر وجدی کہ بر وجہ صواب		ختم ہوئی توفیق حق سوں یو کتاب

اصل میں یو تھا کلام فارسی / اہل معنی کوں مثال آرسی
خوشتریں تصنیف شیخ نامدار / پیشوائے عارفاں روزگار
شیخ صاحب دل فرید نامور / خاص جس کا ہے لقب عطا گر

اختتام:-

اس نسخے کے آخری دو شعر یہ ہیں:-

اس منی یارب میرا ہوتا ہے کام / شکر ہے جو ہوئی پنچھی باچا تمام
جب کیا تاریخ کا دل میں حساب / تب ہوا میزان میں "صاحب کتاب"

تاریخ تصنیف کے متعلق مختلف خیالات ہیں کیونکہ تاریخ تصنیف کا شعر مختلف وضع وطور پر لکھا گیا ہے۔ مثلاً "خاصی" "کتاب۔ خاصا کتاب وغیرہ۔ دراصل "خاصی کتاب" صحیح ہے جو ایک سے زیادہ نسخوں میں درج ہے۔ عجائب خانہ کے اس نسخہ میں کاتب نے "صاحب کتاب" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اس نسخہ میں آخر پر ایک فارسی مخمس بھی ہے جو حافظ کی غزل "گردست دہد ہزار جانم" پر لکھا گیا ہے۔

وجدی کی یہ مثنوی بہت مشہور اور مقبول رہی ہے نہ صرف بمبئی وغیرہ میں طبع ہو کر شائع ہوئی بلکہ کئی ایک قلمی نسخے بھی دستیاب ہوئے ہیں چنانچہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ ہمارے خاندان میں بھی کئی نسخے ہیں نیز یورپ میں بھی اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں

---

(۵) مثنوی میر حسن (سحر البیان)

نمبر (پی ۶۹) سائز (۱۱×۷) صفحہ (۹۰) سطر (۱۵) خط نستعلیق۔ کاغذ دیسی۔ جدول مطلا۔ یہ نسخہ نامکمل ہے۔

مصنف میر حسن، تاریخ تصنیف ۱۱۹۹ھ کتابت ۱۲۱۷ھ

میر حسن اردو شاعروں کی صف اول میں جگہ پاتا ہے۔ اگرچہ اس کا زمانہ متوسطین کا دور ہے۔

میر غلام حسن نام اور حسن تخلص تھا۔ باپ کا نام میر غلام حسین متخلص بہ ضاحک تھا۔ میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر بچپن میں باپ کے ہمراہ فیض آباد آگئے وہاں سے لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہی ہو رہے۔ انھوں نے ایک تذکرہ شعراء اور کئی دوسری مثنویاں بھی لکھی ہیں ان کی ایک دوسری مشہور مثنوی رموز العاشقین ہے، ان کا ایک دیوان بھی ہے، مختصراً میر حسن نے غزلیات اور مثنوی نگاری میں نام آوری حاصل کی اور اُردو شاعری میں اپنا خاص مقام بنا لیا۔ میر حسن کی ایک اور مثنوی گلزار ارم کا تذکرہ مصنف گل رعنا نے کیا ہے اور اس کا قلمی نسخہ دارالعلوم ندوہ میں ہونے کی صراحت کی ہے۔

میر حسن کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا۔ مصحفی نے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

میر حسن نے اپنے حالات بھی قلمبند کئے ہیں جن کی صراحت ہم نے کتب خانہ آصفی کی قلمی کتابوں کی فہرست میں کردی ہے۔ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں میر حسن کے دیوان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

آغاز

کروں پہلے توحید یزداں رقم		جھکا جس کی سجدہ کو اول قلم
سرلوح پہ رکھ بیاض جبیں		کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
قلم پہ شہادت کی انگلی اوٹھا		ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا

میر حسن کی یہ مثنوی مشہور ہے۔ اس کے قصے کی صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اختتام

میاں مصحفی کو جو بھائی یہ طور		اونھوں نے بھی کر فکر از راہ غور
کہی اوس کی تاریخ یوں برمحل		یہ بیت خانہ چین ہے بے بدل
۱۱۹۹ھ

خاتمہ

تیاری تصاویر مثنوی میر حسن از دست حاجی غلام حسن انصراف یافت اس عبارت سے واضح ہے کہ جو تصاویر اس مثنوی میں ہیں وہ غلام حسن مصور کی بنائی ہوئی ہیں۔ کل تصاویر کی تعداد (۳۹) ہے۔ یہ دکھنی اسکول کی ہیں۔ مختلف رنگوں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔

میر حسن کی یہ مثنوی متعدد بار شائع ہوئی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی بے شمار دستیاب ہوئے ہیں جس سے اس مثنوی کی ہردل عزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کے پانچ قلمی نسخے ہیں کتب خانہ نواب سالار جنگ میں کئی ایک با تصویر نسخے ہیں۔

عجائب خانہ میں تین مصور نسخے ہیں اور چونکہ تینوں دکنی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شمال کی طرح دکن میں بھی مثنوی سحرالبیان مقبول تھی۔ عجائب خانہ کے اس نسخہ کے پہلے شعر میں بجائے لفظ سجدہ کے "تجدی" لکھا گیا ہے۔ غالباً کاتب کا سہو ہے۔

---

(۶) مثنوی میرحسن (سحرالبیان) دوسرا نسخہ

نمبر (پی۔ ۱۱۸۸) سائز (۱۱×۷) صفحہ (۲۰۹) سطر (۱۴) خط نستعلیق، کاغذ دیسی، جدول مطلا۔

آغاز

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جس کے سجدہ کو اول قلم
سرلوح پر رکھ بیاض جبیں — کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

اختتام

میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور — انھوں نے بھی کر فکر از راہ غور
کہی اوس کی تاریخ یوں بر محل — یہ بت خانہ چین ہے بے بدل

اس کتاب میں دکھنی اسکول کی (۵۰) تصاویر ہیں۔ مصور کا نام ظاہر نہیں ہوتا

---

(۷) مثنوی میرحسن (سحرالبیان) تیسرا نسخہ

نمبر (پی ۱۴۷۷) سائز (۹×۶) صفحہ (۷۸) سطر (۱۵) خط نستعلیق، کاغذ دیسی۔

آغاز

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جس کے سجدے کو اول قلم

اختتام

کہی اس کی تاریخ یوں بر محل — یہ بت خانہ چین ہے بے بدل

خاتمہ

تمت تمام شد مثنوی میرحسن

اس مثنوی میں (۱۰) تصاویر دکھنی اسکول کی ہیں۔

(۸) چہار درویش

نمبر (۱۸۹۵) حاشیہ (۴×۷) صفحہ (۳۶۶) سطر (۱۳) خط نستعلیق،

کاغذ دیسی، جدول سرخ و سیاہ۔

مصنف میر امن، تاریخ تصنیف ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء کتابت ۱۲۶۳ھ ہجری

میر امان نام امن تخلص تھا۔ دہلی وطن اور مولد تھا۔ کلکتہ گئے اور وہاں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ چہار درویش کے علاوہ اخلاق محسنی کا بھی ترجمہ کیا۔ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے نام آوری حاصل نہیں کی بلکہ اپنی نثر کی وجہ سے مشہور ہوئے اور صرف چار درویش ہی ان کے نام کو اب تک زندہ رکھے ہے۔ انھوں نے اپنے حالات خود لکھے ہیں۔

چہار درویش کے قصہ کو بعض اصحاب امیر خسرو کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بہ تحقیق ثابت کیا ہے کہ وہ محمد شاہ کے عہد میں تصنیف ہوا تھا۔ میر محمد عطا حسین خان تحسین نے اردو میں ترجمہ کرکے نو طرز مرصع نام رکھا تھا۔ میر امن نے اس کو پیش نظر رکھ کر چہار درویش مرتب کیا۔

آخر میں نظم ہے جس کے بارہ شعر ہیں۔ پہلا اور آخری شعر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا شعر

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار تھے سن بارہ سو سترہ در شمار

آخری شعر

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ خدایا بحق رسول کبار

اس سے واضح ہے کہ یا تو امن کا تخلص لطف بھی تھا یا یہ کہ ان کے دوست مرزا علی لطف نے یہ نظم لکھی ہے۔

چہار درویش کو میر محمد علی خان شوق اورنگ آبادی نے دکنی نظم میں لکھا ہے، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں۔

اگرچہ تحسین کی نو طرز مرصع بمبئی، کان پور سے شائع ہوئی تھی مگر مقبول نہ ہو سکی اس کے برخلاف میر امن کی چہار درویش نے مقبولیت عام کا اعزاز پایا۔

اس کے علاوہ محمد عوض زریں نے بھی نثر میں اس کا ترجمہ کیا ہے اور یہ چھپ بھی گیا ہے۔

ترقیمہ

تمت تمام شد کتاب چہار درویش بتاریخ بست و دہم ماہ محرم الحرام ۱۲۶۳ھ نبوی صلعم روز جمعہ یکپاس روز بر آمدہ حسب الفرمایش و پاس خاطر خان صاحب مہربان غلام احمد خاں صاحب مندوزی فرزند شہامت خان مندوزی متوطن امرت سر، کتبہ غلام حیدر علی المتخلص بہ شہوار ابن ملک محمود جوہر بمقام حیدرآباد۔ آغاز کتاب کے پہلے شہوار کے تین قصیدے درج ہیں۔ ایک آنحضرتؐ کی نعت میں ہے اور دو سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں۔

ان کے آغاز و اختتام کے شعر درج کئے جاتے ہیں۔ پہلا قصیدہ فارسی ہے اور ۴۴ شعر کا ہے۔

اے شہ ہر دو سرا سید عالی نسبی — شرف اشرف مخلوق و معلا حسبی

اختتام

رو کجا وصف معلائے تو یا شاہ کجا — جرم شہوار بہ بخشا کہ شود بے ادبی

دوسرا قصیدہ بھی فارسی ہے یہ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں ہے۔

اے سید جیلانی چہ نجیب الطرفینی — اولاد علی آل رسول الثقلینی

تیسرا قصیدہ اس کو مناجات کے نام سے لکھا ہے جو سیدنا عبدالقادر جیلانی کی مدح میں ہے یہ اُردو ہے سترہ بند ہیں۔

کر تو حل مشکل مری یا غوث الاعظمؒ دستگیر — حال میرا تجکو ہے معلوم اے روشن ضمیر

اس زمانے نے کیا ہے مجکو گردش سے فقیر — تجہ سری کا ہے وسیلہ سر پہ میرے بے نظیر

جلد میری کر مدد یا غوث الاعظمؒ دستگیر

اختتام

سیدا کے دل سے اے شاہ دیں تو نہیں ہے دور — صدق دل سے ہر گھڑی رہتا ہے وہ تیرے حضور

تیرے قدموں کی برکت سے سدا ہو اوس پہ نور — بولنا تجکو پکار اب اوس کو ہے وقت ضرور

جلد میری کر مدد یا غوث الاعظمؒ دستگیر

شہوار کا دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ذکر آیا ہے... (ہاشمی ۶۷)

---

(۹) باغ اُردو

نمبر (۱۲۹۲) سائز (۱۰×۶) صفحہ (۶۲) سطر (۱۳) خط نستعلیق، کاغذ دیسی کرم خوردہ۔

مصنف میر شیر علی افسوس، تاریخ تصنیف ۱۲۱۶ھ، کتابت ۱۲۵۳ھ

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کا ایک مشہور مترجم تھا۔ اس کے اجداد آگرہ کے قریب نارنول میں رہا کرتے تھے۔ افسوس کے دادا نے دہلی کو وطن بنا لیا تھا۔ افسوس کی پیدائش کے متعلق قیاس کیا گیا ہے کہ ۱۷۳۵ء سے ایک دو سال قبل ہوئی ہے۔ اس کا باپ علی مظفر خاں تلاش روزگار میں لکھنؤ پہونچا۔ تین چار سال یہاں قیام کر کے حیدر آباد دکن آیا اور یہاں ہی اُن کا انتقال ہوا۔ باپ کی موت کے پیشتر ہی افسوس لکھنؤ میں سالار جنگ کے ملازم ہو گئے تھے اور اپنا دیوان وہیں مرتب کیا تھا۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۱۸۰۱ء میں افسوس فورٹ ولیم کالج میں نوکر ہوئے کئی کتابیں ان کی یادگار رہیں۔ ان میں دیوان، باغ اردو۔ آرایش محفل مشہور ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں افسوس کا کلکتہ میں انتقال ہوا۔

آغاز

شکر و احسان ہے خدا کا کہ غالب ہے سب پر اور بزرگ ہے سب سے طاعت اس کی سبب ہے قرب کا اور شکر اس کا زیادہ کرنے والا ہے۔ نعمت کا جو دم کے پیچھے حلق کے جاتا ہے مدد گار حیات کا ہے اور جو دم اوپر آتا ہے، فرح بخش ذات کا پس ہر ایک سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر ایک نعمت پر ایک شکر واجب ہے۔

یہ گلستان کا ترجمہ ہے جو تمام گلستان کا کیا گیا ہے۔ فارسی نظم اور نثر کو اردو نثر میں لکھا گیا ہے۔

ترقیمہ

تمت بالخیر گلستان ہندی بموجب فرمایش محمد بیگ ۱۲۵۳ھ میں کاتب الحروف فقیر حقیر میر غلام حسین ساکن محمد آباد عرف بیدر دوشنبہ بوقت یک پاس روز آمد انصرام یافت۔

باغ اُردو افسوس کا شہ کار شمار ہوتا ہے اس کی تاریخ تصنیف کے متعلق مصنف ارباب نثر اُردو (سید محمد صاحب) نے جو صراحت کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"باغ اُردو کی تاریخ تالیف میں اختلاف ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو (پاکستان) نے لکھا ہے۔ ۱۸۰۸ء میں تالیف ہوئی، نیز مولف سیر المصنفین (تنہا) نے بھی یہی سنہ لکھا ہے مگر خود افسوس نے اس کے دیباچہ میں ایک قطعہ تاریخ دیا ہے جس سے آغاز تالیف کا سنہ نکلتا ہے۔

میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام ۔۔۔ کہوں دلچسپ بہ آئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا ۔۔۔ آغاز اُردو ہے باغ اُردو

باغ اُردو کے اعداد (۱۲۱۴) میں آغاز یعنی الف کے عدد کا مدخلہ کیا جائے تو اس سے ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی اس کی تالیف کی تاریخ ہے[۵۱]

لیکن عجائب خانہ کے اس نسخہ میں کتاب کے خاتمہ کی عبارت میں مصنف نے صاف طور پر عبارت میں بارہ سو سولہ مطابق اٹھارہ سو دو لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اب تک باغ اُردو کی تاریخ تالیف کے متعلق جو خیالات اور نظریے تھے وہ صحیح نہیں تھے بلکہ اس کی تالیف ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۲ء میں ہوئی باغ اردو ۱۲۱۸ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

باغ اردو کے قلمی نسخے نایاب ہیں صرف ایک آدھ نسخے کا پتہ چلتا ہے۔ اس حیثیت سے عجائب خانہ کا یہ نسخہ نہایت اہمیت رکھتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ نسخہ بہت کرم خوردہ ہوگیا ہے باغ اردو کے متعلق مولف سیر المصنفین نے جو صراحت کی ہے وہ یہ ہے۔

"آپ (افسوس) سے دو کتابیں باغ اردو جو گلستان کا ترجمہ ہے اور آرائش محفل جس میں ہندوستان کے تاریخی حالات درج ہیں یادگار ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے ۱۸۰۱ء میں آپ کلکتہ پہنچے تھے اور آپ نے ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستان کا ترجمہ کیا تھا"

"آج کل دونوں کتابیں نایاب ہیں راقم نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں گلستان کا ترجمہ دیکھا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ جہاں تک خیال ہے افسوس نے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی اردو اشعار میں کیا ہے۔ یہ نایاب اور قابل قدر ترجمہ اگر طبع ہو جائے تو بہت اچھا ہے[۵۲]"

بیان مندرجہ صدر میں دو باتیں قابل اصلاح ہیں۔ اول تو یہ کہ گلستان کا یہ ترجمہ ۱۸۰۸ء میں نہیں بلکہ ۱۸۰۲ء میں ہوا اور دوسرے یہ کہ افسوس نے سعدی کی گلستان کے اشعار کا ترجمہ اکثر نثر میں کیا ہے۔

گلستان جس قدر مقبول رہی ہے وہ اس سے واضح ہے۔ اب تک اس کے ترجموں کا سلسلہ جاری ہے۔ حضرت امجد حیدرآبادی نے بھی گلستان امجد کے نام سے ترجمہ کیا ہے اور اس کے اب تک تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ حال ہی میں جاپان میں ہمارے دوست پروفیسر گاموں نے جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

---

۵۱ پروفیسر سید محمد۔ ارباب نثر اردو صفحہ ۱ ، فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے حالات کے سلسلے میں یہ کتاب مفید ہے۔ ۵۲ محمد یحیٰی تنہا ، سیر المصنفین۔ حصہ اول صفحہ ۹۰۔

(۱۰) اوصافِ سبحانی

نمبر (پی ۳۹۱۳) سائز (۱۶ × ۱۱) صفحہ (۳۲۱) دو کالم ہیں ، فی کالم (۱۳) شعر آخری صفحات فی کالم (۳۵) شعر ہیں۔

مصنف مرزا محسن ، تاریخ تصنیف ۱۲۲۰ھ کتابت

اس مثنوی کا مصنف مرزا محسن ہے، جس کا تخلص محسن تھا۔ افسوس ہے کہ کسی قدیم اور جدید تذکرہ نویس نے محسن کے حالات نہیں لکھے ہیں۔ ارسطو جاہ کے مدحیہ قصیدوں کے مجموعے یعنی "مجموعہ قصائد" میں کسی محسن کا قصیدہ نہیں ہے اور اس مثنوی سے بھی کوئی تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ نواب محمد سبحان خاں کا متوسل تھا۔ سفر و حضر میں ہمراہ رہا کرتا۔ جنگ و جدل۔ رزم و بزم میں شریک ہوتا۔ اپنے چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔ اس کے کلام کو دیکھنے سے اس کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ مثنوی کے ساتھ اس کو غزل گوئی میں بھی اچھی مہارت اور عمدہ سلیقہ تھا۔ افسوس ہے کہ اس کے مرنے کے سنہ سے ہم واقف ہیں اور نہ ہی دفن ہونے کے مقام سے۔

چونکہ اس مثنوی میں ۱۲۲۰ھ تک کے واقعات درج ہیں اس سے ظاہر ہے کہ شاعر ۱۲۲۰ھ بعد بھی زندہ رہا۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محسن نے محمد سبحان خاں کے توسل سے نکل کر کہیں اور جانے کی کوشش نہیں کی اور غالباً مرنے تک ان کی جاگیر میں بسر کرتا رہا۔

آغاز جو دوسرے نسخہ سے حال ہی میں نقل کیا گیا ہے۔

....

کہ یک کن کے کہنے سے سخن آفریں ہویدا کیا آسمان و زمیں

بہشت عرش و کرسی سے تا لامکاں ہر ایک جا پہ تو ہے نہان و عیاں

آغاز قدیم جو ناقص اول ہے۔

علی ولی کا ہے فدوی غلام ....

وہ ہے صاحب عدل فریاد رس جہاں میں وہ ممتاز..... دیکھا ہے بس

سخاوت میں برتر نہیں اوس سے شجاعت ....

خدا کی عنایت سخاوت اوسے بلطف علی ہے شجاعت اوسے

عجائب خانہ کا یہ نسخہ ناقص اول تھا اور درمیان کے اوراق بھی نہیں تھے۔ ان کو کتب خانہ ریکارڈ آفس اور نسخہ مملوکہ محمد شرف سے نقل کرکے کتاب کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے مگر جہاں جہاں اس کو شامل کرنا تھا نہیں کیا گیا ہے اس لئے عجائب خانہ کا نسخہ مکمل ہونے کے باوجود ترتیب طلب ہے۔

اس مثنوی کو فروخت کرنے والے نے اس کے ساتھ بڑا افسوسناک سلوک کیا کیونکہ اس کو منتشر کرکے فروخت کیا ہے۔ (۱۰) تصاویر جو (۲۴) اوراق پر مشتمل تھیں، دفتر ریکارڈ آفس کو فروخت کیا اور (۶۱) اوراق محمد اشرف صاحب کو فروخت کیا اور عجائب خانہ کو (۸۹) ورق فروخت کیا اس طرح اصل کتاب دراصل (۱۷۴) اوراق یا (۳۴۸) صفحے پر حاوی تھی۔ محمد اشرف نے ریکارڈ آفس اور عجائب خانہ کے اوراق سے نقل کرکے اپنا نسخہ مکمل کر لیا اور جہاں جہاں اوراق کم تھے اس کا تکملہ کر دیا اسی طرح عجائب خانہ کے نسخے کے لئے غیر مکمل اوراق نقل تو کر لئے گئے ہیں مگر ان کو جہاں جہاں منسلک کرنا تھا وہ نہیں کیا گیا بلکہ ایک مجموعہ کی صورت میں علیحدہ رکھا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ محمد اشرف صاحب انجینیر کا پورا کتب خانہ فروخت ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ بمبئی کے ایک تاجر نے اس کو خرید لیا اور اس وقت وہ "کوہ نور" لائبریری کی ملک ہے۔

یہ مثنوی محمد سبحان خاں کے حالات پر مشتمل ہے اس لئے اولاً سبحان خاں کے متعلق یہاں مختصر صراحت ضروری ہے۔

محمد سبحان خاں بہادر آصفی دور کے جاگیرداروں میں شامل تھے مگر وہ بڑے جاگیرداروں میں نہیں تھے اس لئے ان کے حالات مصنف گلزار آصفی وغیرہ نے قلمبند نہیں کئے ہیں۔ اسی طرح دوسری مشہور تاریخوں میں بھی ان کا حال نہیں ملتا البتہ گلزار آصفیہ میں بعض مقامات پر ان کا ذکر موجود ہے چنانچہ ارسطو جاہ نے جب پونہ میں فوج طلب کی تھی اور حیدرآباد سے ایک فوج روانہ کی گئی تاکہ پرسرام کو گرفتار کیا جائے تو اس فوج میں سبحان خان بھی اپنی فوج کے ساتھ شامل تھے اور پرسرام کو گرفتار کرنے کے لئے مامور ہوئے تھے اس کے علاوہ راجہ ہیبت رام کی فوج میں بھی سبحان خاں بحیثیت جاگیردار موجود تھے۔

سبحان خاں کرنول کے پٹھانوں سے تعلق رکھتے تھے اور علاقہ برار میں ان کو جاگیر دی گئی تھی "پدتد" ان کی جاگیر کا صدر مقام تھا۔ محمد سبحان خاں شاعر بھی تھے۔ ثابت ان کا تخلص تھا۔ ان کی شاعری کا نمونہ جو ایک مثنوی ہے "اوصاف سبحانی" میں شریک ہے۔ ان کے دربار میں دوسرے شعرا بھی موجود تھے جن میں سے ایک بہلول تخلص رکھتے تھے۔ گلزار آصفیہ سے سبحان خاں کے حالات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ آصف جاہ ثانی نے ارسطو جاہ کے حسب الطلب

پونہ کو جو فوج پرسرام بھاؤ کو گرفتار کرنے روانہ کی گئی تھی اس میں سبحان خاں بہادر بھی شامل تھے اور انھوں نے ہی پرسرام بھاؤ کو گرفتار کیا تھا۔ چنانچہ اس خصوص میں گلزار آصفیہ کے چند سطور پیش کئے جاتے ہیں۔

"بندگان عالی عیسٰی میاں المخاطب میران یار جنگ را و محمد سبحان خاں بہادر و موسٰی پرو فرانسیسی آوردہ موسیٰ ریمو را با جمعیت سہ ہزار سوار و ہشت ہزار بار اول روانۂ پونہ ساختند"

....

محمد سبحان خاں بہادر تعاقب او نمودہ در نیم شب یکایک بر سر لشکرش افتاد...... و پرسرام بھاؤ را دستگیر نمود (صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۱)

اعلیٰ حضرت نے عیسٰی میاں المخاطب میران یار جنگ کو اور محمد سبحان خاں کو موسیو پرو جو فرانسیسی جنرل موسیو ریمو کی فوج سے تھا تین ہزار سوار اور آٹھ ہزار جوانان بہادر کے ہمراہ پونہ کو روانہ کئے

....

محمد سبحان خاں بہادر نے تعاقب کیا اور آدھی رات کو اس کے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور پرسرام کو گرفتار کر لیا۔

اس طرح راجہ مہیپت رام کے ساتھ سبحان خاں شامل ہونے کا داخلہ ملتا ہے۔ چنانچہ مولف "میر عالم" نے صراحت کی ہے۔

"موضع پنچھی اور سلطان پور تنخواہ سہ بندی میں منجانب راجہ مہیپت رام مذکور شاہ باقر حسین اور محمد سبحان خاں کے تصرف میں تھے اور باوجود تاکیدات راجہ رام مہیپت رام وہ بھی ان کا قبضہ نہیں چھوڑتے تھے" (صفحہ ۱۱۶)

"اوصاف سبحانی" میں محمد سبحان خاں بہادر کے حالات ان کی شجاعت۔ معرکے۔ جنگ بزم کے حالات۔ شادی بیاہ کے رسومات وغیرہ کا ذکر ہے۔ عنوانات کے تحت یہ مثنوی لکھی گئی ہے، عنوان فارسی میں ہیں۔ یہاں ان میں سے چند عنوان کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے مثنوی کے اندراجات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حمد (۲) نعت (۳) منقبت حضرت علیؑ (۴) مناجات (۵) اعلیٰ جاہ کا مرہٹوں کے پاس جانا اور آصف جاہ ثانی کا قلعہ کھرلہ میں قیام کرنا۔ (۶) سبحان خاں کا نامدار خاں کی دختر سے ایلچ پور میں شادی کرنا۔ (۷) شادی کا تفصیلی حال (۸) جلوس شب حنا بندی (۹) شب گشت

مثنوی تو اردو ہے مگر عنوان فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ یہاں چند عنوان فارسی میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) سرفراز فرمودن نواب را بجسب........ بعد انفراغ جنگ و جدل۔

(۲) رسیدن لشکر برشکال باسپاہ نزالہ ...... درفامت نمودن نواب

(۳) بعد انقضائے موسم باررش جلوہ فرماشدن برقصبہ مونگی پٹن بالائے دریائے گنگ جہت انفصال نمودن مناقشہ راجہ صاحب دولت راؤ سندھیہ۔

(۴) نامہ والا نواب محمد سبحان خاں بہادر ثانی رستم دوران۔

(۵) خط راجہ دولت راؤ سندھیہ بہ نواب تہور جناب۔

(۶) دران ایام عشرت آغاز فرصت انجام شادی بسم اللہ فرزند اقبال مند۔

(۷) ورود جمعیت کہنو دولت راؤ سندھیہ معہ فوج گوپال بہاؤ قصبہ مونگی پٹن۔ بنا بر دستگیر کردن ساہو تعلقہ راو مذکور بالائے گنگ و متعرض شدن نواب تہور جناب بعزم جنگ۔

اس اقتباس سے اس امر کی صراحت ہوجاتی ہے کہ یہ مثنوی جو نواب محمد سبحان خاں کے حالات پر مشتمل ہے اس سے تاریخ دکن کے بعض واقعات کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ اور تاریخ دکن کی حیثیت سے بھی اس کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔

جیسا کہ مثنوی کے اندراجات سے واضح ہے محسن نے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے ایک کو محمد سبحان خاں کی شجاعت سے موسوم کیا ہے اور دوسرے کو ان کی سخاوت سے۔

جو حصہ شجاعت سے تعلق رکھتا ہے اس میں ٹیپو سلطان کی جنگ میں شامل ہونے اور پیشوایان پونہ کی سیاسی الٹ پھیر جو ارسطو جاہ وزیر اعظم آصف جاہ ثانی کی دل چسپی سے ہوتی ذکر کیا گیا ہے نانا پھرنوس دیوان پونہ اور پرس رام بھاؤ کے واقعات کی تفصیل سے درج ہیں۔ پرسرام کو گرفتار کرنے کا سہرا محمد سبحان خاں کے سر رہا ہے۔

اس موقع پر اوصاف سبحانی کا ایک مختصر نمونہ کا اندراج یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہوئی جب سحر تو ادا کر نماز	بفضل خداوند عالم طراز
رفیقوں سمیت اپنے باعز وجاہ	ہوا چلنے تیار با حکم شاہ
وہ آ پیشوا پیشوا سے کئے	کہ دربار شہ تک رسائی کئے
اگرچہ ارسطو تو ہے ذی شعور	کیا میں نے دے دے کے مبلغ فتور
یہ کہہ کر فوج کو اپنی تیار کر	پرسرام سندھیہ کو کئے خبر

غرض وہ وزیر ارسطو حشم	گروہ شقی سے ہوا جب بہم
لئے سن آکر اوسے پیشوا	بتو قرلے جاکر رکھے اشقیا

مشاہیر سردار اوس راج کے ‌ ‌ قدیمی وہ عہدے نہ کل آج کے
سندھیہ اور وہی بھو نسلا ‌ ‌ پرسرام تھا اور وہ بھی تڑ کیا
دہی پھر نوس اور دہی ہولکر ‌ ‌ وہی کو کلا ....
.... ‌ ‌ ....
کیا تدبیر ایسی ارسطو نہاد ‌ ‌ ہوا راج میں اون کی برپا فساد
کہ شامل ہے نفرت جون شجرسے ‌ ‌ موافق ہوئی تدبیر تقدیر سے
پڑا پھر نوس اور سندھیہ میں بیر ‌ ‌ صفائی نہ ہوئی پھلہ کی سنجر
اراکین میں ان کی تفرقہ ہوا ‌ ‌ ہوئے دشمن آپس میں ہر یک جدا
منت سماجت ہر ایک اپنی سات ‌ ‌ صلاح مشورہ تھے ارسطو کے سات
.... ‌ ‌ ....
کیا اوس نے چند ہی میں یوں بندوبست ‌ ‌ قوی آپ ہو کر کیا ان کو پست
حضور اپنے آقا کی عرض کیا ‌ ‌ کہ یہاں بندوبست اب ہوا آپ کا

محسن کی غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

بہار آئی چمن میں بلبل جو سرو سنبل لچک رہا ہے ‌ ‌ ادھر کو گل ہے مہک رہا ہے ادھر کو غنچہ چٹک رہا ہے
زبان سے کس طرح نکلے پیارے جو چاہ دل میں پڑی ہی میرے ‌ ‌ گلے میں حسرت کے لفظ ارمان گرہ سا ہو کر اٹک رہا ہے
جو دم الفت میں آکے ابھجے تو رام ہوے وہ پھر ہمارا ‌ ‌ ہوا کی تحریک سے وہ چنچل ابھی تو ہر دم لچک رہا ہے
گہر کی موج اب فلک سے گزرنا یہ سوچ محسن کو ہو کہ شاید ‌ ‌ وہی پسینے کو پونچھ مونہہ سے رومال اپنا جھٹک رہا ہے

محمد سبحان خاں کی یہ سوانح عمری جو اوصاف سبحانی سے موسوم ہے با تصویر ہے عجائب خانہ کے مملوکہ نسخہ میں (۱۲) تصاویر ہیں۔ دفتر دیوانی و مال (ریکارڈ آفس) میں جو اوراق ہیں ان پر دس تصاویر ہیں۔ کل تصاویر دکن اسکول کی ہیں۔ ان میں جنگ و جدل اور جلوس کی سواری کا سماں بھی پیش ہوا ہے اور مجلس بزم و نشاط کا منظر بھی بتایا ہے۔ جنگل یا باغ کا منظر بھی ہے تو مجلس عزا کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

ان تصاویر سے اس وقت کے تمدن معاشرت رسم و رواج جنگ و جدل۔ فوج کے لباس۔ ہتھیار۔ آلات جنگ وغیرہ کی پوری وضاحت ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے اس مثنوی میں محمد سبحان خاں ثابت کی شاعری کا نمونہ بھی بصورت مثنوی دیا گیا ہے۔

یہ مثنوی تصوف پر مشتمل ہے مگر اس کو ایک افسانہ کے طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ مثنوی طویل ہے کئی سو شعر ہیں۔ اس کے قصّہ کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک شہزادہ دل نام تھا اس کو روز افسانے سننے کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ آب حیات کا تذکرہ آیا اس کے پینے سے کوئی مرتا نہیں۔ دل کو آب حیات کی فکر دامن گیر ہوئی اس لئے "نظر" کو سفر خرچ دیکر روانہ کیا۔ نظر روانہ ہوا اور عافیت کے شہر میں پہنچ کر "ناموس شاہ" سے ملاقات کی اور دونوں ملکر آب حیات کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

چلتے چلتے ایک پہاڑ پر پہونچے اس کا نام زہد و ریا تھا۔ یہاں ایک راہب "رزق" رہتا تھا۔ نظر اس سے ملکر آب حیات کا پتہ دریافت کیا مگر یہاں سے ناامید ہو کر آگے بڑھے اب شہر ہدایت میں پہونچے۔ یہاں "شاہ ہمت" سے ملاقات ہوئی پھر شہر غیر میں پہونچے اور "غیر" کو ہمراہ لے کر شہر دیدار میں وارد ہوئے یہاں ان کو پتہ چلا کہ چشمہ آب حیات "نو باغ رخسار" میں ہے۔ یہاں کی خوب سیر کی اور نظر کے قاصد نے حسن صاحب جمال کے ساتھ شہزادہ دل کا حال بیان کیا اور اب خیال کا قاصد نظر کے ہمراہ دل کو لانے روانہ ہوا۔ شہزادہ دل نے قاصد سے حسن دل کی صورت و شکل پوچھی پھر نظر اور خیال دونوں مل کر روانہ ہوئے۔ کوہ زہد پر پہونچ کر "توبہ" سے جنگ کی۔ یہاں شاہ عقل نے شہزادہ دل کو نصیحت کی مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاہ عشق۔ شہزادہ دل سے لڑنے کے لئے مہر و وفا کے لشکر روانہ کئے اور شہزادہ دل تیر غمزہ سے مجروح ہوگیا۔ عقل تن کے شہر سے شہر بدر ہوگئی اور شاہ عشق کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد وصال کے پانی سے دل کے غبار کو دھوکر اور حسن میں نامہ و پیام کا آغاز ہوگیا۔ لشکر عقل کو پھر شکست ہوئی۔ شہر ہدایت میں پہنچ کر مکافات سے مدد کی درخواست کی گئی اس کے بعد شاہ ہمت کی ملاقات سلطان عشق سے ہوئی اور حسن دل کا عقد ہوگیا۔ یہ ہے مثنوی کا خلاصہ جو غالباً کسی فارسی مثنوی سے ثابت نے اور نظم میں منتقل کیا ہے۔

دراصل یہ تصوف کی مثنوی ہے جس کو ایک قصہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ سلوک کے مدارج اور طریقے بتائے گئے ہیں۔ اس موقعہ پر ثابت کے کلام کا مختصر نمونہ ان کی اس مثنوی سے پیش کیا جاتا ہے۔

کہ تھا ملک مشرق میں ایک بادشاہ ۔۔۔ جہاں میں بھی مشہور با عز و جاہ
ہے دانا مدبّر بڑا عقل نام ۔۔۔ وہی شاہ وہی مدار المہام
رعیت کی پرداخت ہے بے قیاس ۔۔۔ ہیں آسودہ مانند ہوش و حواس

غلمت ایک ہے اس کو شہرت طلب　　دلاور دل اُس کا رکھا ہے لقب
وہ پیوند حابق ہے محبت کل　　رکھا اوس جگر بند کا نام دل
بغل میں کیا پرورش تربیت　　جو دیکھا ہے قابل سلطنت
حصار عقل کا ہے محکم متین　　کیا عقل نے دل کو واں جانشین
ہے اس شہر کا نام اقلیم تن　　قلعہ میں کیا آپ جا کر وطن
ہے اُس قلعہ سر میں قصر دماغ　　وہاں عقل سلطاں رہا با فراغ

محسن کی اصل مثنوی اور محمد سبحان خاں ثابت کی اس مثنوی کے متعلق ہم نے علیحدہ تفصیل کے ساتھ ایک مضمون میں روشنی ڈالی ہے جس سے پوری کیفیت واضح ہوسکتی ہے اس لیے یہاں اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مصنف کے تخلص کے چند شعر

یہ تخصیص محسن جو سرگشت ہے　　سیاہ نامہ و بخت برگشت ہے

تو ستار یارب تو غفار ہے　　یہ محسن بہت سا گنہ گار ہے

اختتام

تفضل کی تیری حمایت رہے　　سلامت رہے یہ سلامت رہے
بلند ہمت اس کو تو کر کردگار　　کہ حاتم سا ہو اس کا یک بہلہ دار
سلامت رہے جان و ایمان سے　　بجاہ و حشم اپنے ارکان سے
کہ جوں خضر ہو عمر اس کی دراز
جہاں میں الٰہی تو کر سرفراز

خاتمہ

بعون الٰہی اتمام فن شجاعت شد۔

اب تک یہ　　شائع نہیں ہوئی اور اس کے نسخے بھی نایاب ہیں۔

(۱۱) دریائے عشق

نمبر (پی ۲۹۸۳) سائز (۱۳×۸) صفحہ (۲۰) سطر (۹) خط خوشخط نستعلیق، کاغذ دیسی صفحہ اول مطلا، مصنف میر تقی میر، تاریخ تصنیف قبل ۱۲۲۵ھ، سن کتابت درج نہیں، میر تقی میر اور ان کی اس مشہور و مقبول خاص و عام مثنوی کا مفصل تذکرہ وقت کی بربادی ہے، اس لئے اس نسخہ سے متعلق معلومات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آغاز

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اوس کی ایک نئی ہے چال
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

یہ ہے دریائے عشق کا لب لباب۔ اس نہج کا افسانہ مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار میں ہے جو ۱۰۵۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ نیز والہ کی مثنوی طالب و موہنی جو ۱۱۸۴ھ سے قبل لکھی گئی ہے اس مضمون کے مماثل ہے چنانچہ ہم یہاں دونوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

چندر بدن کا خلاصہ یہ ہے کہ سندر پٹن کے راجہ کی دختر موہنی نہایت حسین جمیل تھی۔ یہاں سالانہ ایک میلہ ہوتا تھا ایک جوان مہیار نام موہنی کو دیکھ کر عاشق ہو گیا دامن صبر چاک ہو گیا۔ دیوانگی میں جنگل کی راہ لی۔ انجم نگر کا بادشاہ جنگل میں شکار کے لئے آیا اور مہیار کے حال سے واقف ہو کر اس کو ساتھ لیکر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے دونوں سندر پٹن پہونچتے ہیں۔ یہاں مہیار کی دیوانگی کو سکون ملتا ہے۔ اس عرصہ میں سالانہ میلہ کا دن آتا ہے چندر بدن محل سے برآمد ہوتی ہے۔ مہیار اس کے قدموں پر سر رکھ کر جاں بحق ہوتا ہے۔ مہیار کا جنازہ دفن کے لئے لے جاتے ہیں جب جنازہ محل کے قریب پہنچ جاتا ہے تو وہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چندر بدن باپ سے اجازت لے کر جنازہ کو روانہ کرنے آتی ہے اور میت کے پہلو میں لیٹ کر اپنی جان دیتی ہے اب جنازہ روانہ ہو جاتا ہے اور جب جنازہ دفن کے لئے کھولا جاتا ہے تو دونوں کو ہم بستر پاتے ہیں لاکھ کوشش کی جاتی ہے کہ دونوں کو جدا کریں مگر کامیابی نہیں ہوتی آخر دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

کتب موصولہ برائے تبصرہ وتنقید

۱	برگ سبز	ابو مسلم صحافی۔
		حلقۂ ارباب فکر تین ہٹی کراچی
۲	دل رُسوا	اختر انصاری اکبرآبادی
		حلقۂ ارباب فکر تین ہٹی کراچی
۳	مشاہیر اسلام	ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن
		پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی
۴	علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر	نسیم قریشی
		مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
۵	کف گل فروش	غلام احمد فرقت
		ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ
۶	رخسار سحر	انصر کریم قدوائی
		ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

مہربانی فرماکر خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایئے اور جواب طلب امور کے لئے دو آنے کے ٹکٹ روانہ کیجئے۔

تبصرے

مختصر تاریخ ہند

مترجمہ محمد یوسف کوکن، صفحات ۶۶۰، اوسط درجہ کا ٹائپ، کاغذ معمولی، قیمت ۱۲/۸ ر، پبلشر: مدراس یونی ورسٹی مدراس۔

مورلینڈ اپنی اقتصادی تاریخی تصانیف خصوصاً اگریرین سسٹم اِن انڈیا کی وجہ سے کافی مشہور ہے اور تاریخ کی دنیا میں ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس نے ایک مورخ چٹرجی کے ساتھ مل کر لکھی ہے۔ اس کتاب میں بقول مصنفین "ہند کی کہانی کو بالکل نئی تحقیقات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی" گئی ہے۔ اس میں مصنفین نے محض جنگ و قتال کے واقعات کی کھتونی نہیں کی ہے بلکہ تہذیب و تمدن کی تدریجی رفتار اور نشو و نما دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کو پڑھ کر ہمیں ہندوستانی تمدن کا ایک ہلکا سا اندازا ہو جاتا ہے۔ انداز بیان متین اور سلجھا ہوا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

اس مفید اور اہم کتاب کا ترجمہ پروفیسر محمد یوسف صاحب کوکن نے کیا ہے اور کتاب مدراس یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ محمد یوسف صاحب علمی حلقوں میں ایک عرصہ سے روشناس ہیں۔ وہ کافی دنوں تک دارالمصنفین میں علمی موضوعات پر تحقیق کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کا ترجمہ بقول مترجم "لفظ بلفظ یا جملہ بجملہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ مصنفین کے مفہوم کو سہل اور آسان اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" عبارت بہت سادہ عام فہم اور بامحاورہ ہے۔ کہیں کسی قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی اور نہ ایک لمحہ کے لئے یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہی ایک عمدہ ترجمہ کی خوبی ہے۔

نامعلوم انسان

مترجمہ محمد یوسف و محی الدین، صفحات ۳۷۸، اوسط درجہ کا ٹائپ، کاغذ معمولی، قیمت ۱۲/۸ روپیہ، پبلشر:- مدراس یونی ورسٹی مدراس۔

نامعلوم انسان، مشہور سائنس داں الکسس کیرل کی ایک تصنیف Man The Unknown کا ترجمہ ہے۔ کیرل نے بقول مترجمین "انسان اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خالص علمی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ہمارا جدید تمدن غلط مقاصد کی پیروی کر رہا ہے .... آج انسان کو مشینوں اور بے جان مادے کی دنیا سے الگ ہو کر صرف اپنے جسم اور اپنی روح کی ترقی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اپنے موجودہ طرزِ زندگی میں زبردست تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔"

کتاب میں مندرجہ ذیل آٹھ باب ہیں؛

۱۔ ایک بہتر علم انسانی کی ضرورت ۲۔ علم انسانی ۳۔ جسم اور فعلیاتی سرگرمیاں، ۴۔ دماغی سرگرمیاں، ۵۔ داخلی زمان، ۶۔ توافقی افعال، ۷۔ فرد، ۸۔ انسان کی نئے سرے سے تعمیر۔

جدید تمدن بہ ظاہر مادی نقطۂ نگاہ سے کتنا ہی تابناک کیوں نہ ہو اس کے پس پردہ نہایت خوفناک تاریکی ہے۔ اس تاریکی سے دوری اور گریز نہایت ضروری ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس کا احساس رکھتے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب وقت کے ایک نہایت اہم تقاضے کو پورا کرتی ہے۔

کتاب کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد یوسف کوکن اور محی الدین نے کیا ہے تاریخ ہند کی طرح اس کا ترجمہ بھی نہایت شستہ و رفتہ ہے حتی کہ ترجمہ کے بجائے اصل تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ کتاب بقول مترجمین "خالص علمی، اور سائنٹیفک نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔ اس میں علم فعلیات و طبیعیات کی کثیر اصطلاحات آگئی ہیں جن کو آسان اردو میں ڈھالنا بہت مشکل تھا۔" لیکن مترجمین اس مشکل پر خوبی سے غالب آسکتے ہیں)۔ اردو اصطلاحات کے ساتھ مترجمین نے بریکٹ میں انگریزی اصطلاحات بھی لکھ دی ہیں۔ (ع، ر، ق)

چند نظمیں

از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ تقطیع "۴½ × ۷" صفحات ۶۹، قیمت ایک روپیہ۔ پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

پنڈت کیفی اردو زبان کے ایک مایۂ ناز محقق اور مسلم الثبوت شاعر ہیں، زیر نظر مجموعہ ان کے ۱۹۴۷ء کے بعد کے کلام سے چند نظموں کا انتخاب ہے۔ یہ نظمیں ہمارے سماجی ملکی اور معاشرتی حالات پر لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں بڑی گہرائی ہے۔ انھیں پڑھ کر انسانیت دوستی کے جذبات پورے طور سے ابھر آتے ہیں۔ اور یہی شاعر کا مقصد ہے۔

ذکر غالب

از مالک رام۔ تقطیع ۵×۷، صفحات ۲۸۴۔ طباعت، کتابت دیدہ زیب قیمت ۸ روپیہ، ناشر:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مالک رام کی 'ذکر غالب' کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ کتاب اپنی گوناگوں خوبیوں کی بناء پر علمی و ادبی حلقوں میں مشہور و مقبول ہے۔ غالب کے سلسلے میں لکھی ہوئی چند اچھی کتابوں میں اسے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافہ کے بعد مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب "یہ اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ جو کہیں اور نہیں ملتی۔ پہلا ایڈیشن بھی اس لحاظ سے کچھ کم امتیاز نہیں رکھتا تھا اور موجودہ ایڈیشن میں تو ایسے مفید اضافے ہوئے ہیں کہ اہل ذوق کی نظر

میں کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے

از محمد عمر ایم اے۔ تقطیع ۵ × ۷ صفحات ۹۸ کتابت و طباعت صاف ستھری، قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- کتاب خانہ عابد روڈ، حیدرآباد (دکن)

زیر نظر کتاب محمد بن عمر صاحب کے پانچ مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اردو زبان میں اچھے ڈراموں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں اور مزاحیہ ڈرامے تو اور بھی کم ہیں۔ اس مجموعہ میں اکثر ڈرامے ہمارے سماج و معاشرت پر ایک گہرا طنز ہیں۔ "دو پریس" "مچا مخانہ" اور "انٹرویو" دلچسپ ڈرامے ہیں۔

وجہ الدین وجدی

از محمد بن عمر ایم، اے۔ تقطیع ۴½ × ۷، صفحات ۲۰۶؛ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

یہ کتاب محمد بن عمر صاحب کا مقالہ ہے جو انھوں نے ایم، اے کے امتحان کے سلسلہ میں لکھا تھا اور پھر اسے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ وجدی بارھویں صدی میں دکھنی اردو کا ایک بلندپایہ شاعر تھا جس نے دکھنی اردو میں پنچھی باچھا ترجمہ منطق الطیر (۲) مثنوی تحفہ عاشقاں اور مثنوی مخزن عاشقاں لکھیں۔ لیکن ان کے حالات تذکروں میں بہت کم پائے جاتے تھے۔ مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں بڑی کاوش سے اس کے حالات جمع کئے ہیں۔ کتاب میں وجدی کے حالات شاعری کے پس منظر، اور اس کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ وجدی پر پہلی کتاب ہے، اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی اور ذوق رکھنے والوں کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے آخر میں کتابیات بھی دی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے

رباعیات الہام

از ڈاکٹر آر، آر سکسینہ، تقطیع ۴½ × ۷ صفحات ۱۱۵۔ کتابت طباعت صاف ستھری اور دیدہ زیب، قیمت عہ، ناشر- ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

زیر نظر کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ ڈاکٹر سکسینہ ظاہراً طبیب اور جسمانی امراض کے معالج ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کے جذبات و احساسات جب اشعار کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو وہ زخمی روح اور مجروح قلب کے لئے مسیحائی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی رباعیات کا مجموعہ ہے اس کے مطالعہ سے موجودہ ہنگامہ خیز مادی دور میں بھی انسان کو کافی تسکین و سکون قلب مل سکتا ہے۔

"ف"

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

زباں مجھ خزانہ گہر کا بھوت　　　کہوں حرف گوہر سو لاکھاں بھوت
قصہ یک کہوں گا گہر بار کا　　　سو چندر بدن ہور مہیار کا
سنے کوئی مجھ کوں دعا یاد کر　　　رہے ہو تعجب سیں دل شاد کر
تتبع غواصی کا باندھیا ہوں میں　　　سخن مختصر ایک ساندیا ہوں میں
ولے میں اپس کوں سرایا نہیں　　　شعر میں کسی کا پھرایا نہیں
سرانا پھرانا ننگا کام ہے　　　کرے یو عمل وہ کہ جو خام ہے

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

ابتدا:-

خدا کوں سزاوار کبر و منی　　　جو قادر ہے قدرت کا صاحب دھنی
رحیماں خلق پر دو رحمان ہے　　　نرنکار بے چوں او سبحان ہے
اندھارا کرے ہور اجالا وہی　　　او جاوے سو لاوے تعالیٰ وہی

خاتمہ:-

بقا پر لے بھوت تاثیر ہے　　　سعادت کی اس ہات اکسیر ہے
مرتب ہوا یہاں قصہ کا کام　　　درود بر محمد ہزاراں سلام
دنیا تو فنا ہے مقیمی سبھی　　　رہے کن بچن کی نشانی یہی

ترقیمہ:-

"تمام شد...... ایں قصۂ چندر بدن و مہیار، تحریر فی التاریخ ہفتم شہر شعبان المعظم ۵ سنہ جلوس والاشاہ عالم بہادر شاہ غازی، در لشکر نصرت اثر کہ اول نام معظم شاہ بود، بہ روز سہ شنبہ بہ وقت عصر ۱۱۲۳ ہجری..... کاتب الحروف عاجز و حقیر محمد شاکر... در بلدۂ لاہور نزد سجادہ بدوح ؟ فرود آمدہ بودم"

اِس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات[51] اُردو میں اور کئی ایک یوروپ[52] میں موجود ہیں، علاوہ ازیں یہ بمبئی میں متعدد بار چھپ چکی ہے۔

"گلدستہ"

مصنف صنعتی، سنہ تصنیف ۱۱۵۹، صفحامت ۱۵۴، شعر فی صفحہ ۱۱،

---

[51] تذکرہ اردو مخطوطات ص ۳۷ ؛ [52] اُردو شہ پارے ص ۳۴

خط نستعلیق ، سائز ۶½ × ۱۰

اُردوے قدیم کی تصریح کے مطابق صنعتی ایک دکنی شاعر اور محمد شاہ بادشاہ کا معاصر ہے، اور ساگر کا وطن ہے، اِس مثنوی میں اس نے شاہزادۂ مصر اور دختر فغفور چین کے عشق و محبت کی داستان نظم کی ہے[۵۸]

اصل داستان کی ابتدا سے پیشتر چار باب ہیں، اِن میں حمد، نعت، معراج کا بیان اور شاہ جیلان کی منقبت ہے۔ خاتمہ میں مثنوی کے بہ خیر و خوبی ختم ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا ہے اور قصہ سے نتیجہ نکالا ہے کہ جس طرح فغفور اور دوسرے بادشاہ دنیا میں نہ رہے مگر نام چھوڑ گئے، اسی طرح ایک دن مجھے بھی اس دنیا سے چلنا ہے، لیکن یہ شعر مجھے ہمیشہ زندہ رکھیں گے، چنانچہ لکھا ہے :-

سمج دیکھ جگ یہ کہ برباد ہے ۔۔۔ ولے نام جیتا ہر یک ٹھار ہے
رہا نئیں وو فغفور اور وو شہا ۔۔۔ پن یو نام ہنوز جگ میں رہا
تجے یوں بھی آخر کو چلنا چ ہے ۔۔۔ ولے شعر تیرا یہ جیتا رہے

پھر اس مثنوی کی تصنیف کی غرض یہ بتائی ہے کہ اس کے پڑھنے سے لوگوں کو توحید باری کی پہچان ہوگی، دنیا کی ناپائداری کا احساس ہوگا، امیر و فقیر کے امتیازات ناکارہ معلوم ہوں گے، وغیرہ اور آخر میں لکھا ہے کہ اس قصہ کے ان ہی فوائد کے پیش نظر میں نے اس کو منظوم کیا اور اس کا نام گلدستہ رکھا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں :-

اپتا فیض دیکھا جو میں اس میں پھر ۔۔۔ کیا نظم تب میں نے اس کا نثر
یہ گلدستہ کر نام اس کا میں رکھ ۔۔۔ دیا ہوں بدل یادگاری یو جگ
ادک جیو سے پیارا او مج کو لگا ۔۔۔ تو کر طرح اس کو جگت سر رکھا
اپتا عارفاں سنگ مج عرض ہے ۔۔۔ کہ اصلاح اِن سب اُپر فرض ہے
نظر اس پہ صاحب دلاں اب دھرو ۔۔۔ کم و بیش دیکھ اس برابر کرو

علاوہ ازیں خاتمہ کے بعض اشعار میں سنہ تصنیف کی بھی تصریح کر دی ہے، چنانچہ لکھا ہے :-

کہوں اس کی تاریخ کا اب بیاں ۔۔۔ رہو شاد سن کر اسے عاقلاں
سنو کان دھر کر سنِ ہجرتی ۔۔۔ یو ہدیہ دیا دل لگیت ۱۱۵۰ھ صنعتی
اتھا شہر ذوالقعدہ ستر اتمام ۔۔۔ ستا مشتری خوش تھا اپنے مقام
تب او وقت نیکی اتھا چاشت کا ۔۔۔ ہوا حرف پورا عرضداشت کا

---

[۵۸] تاریخ اردوے قدیم صفحہ

ابتدا:-

کہتا ہوں اول صفت سبحان کا — کہ دونوں جہاں شاہ رزاق کا
کہوں وصف اول میں رزاق جہاں — کہ خالق ہے گلشن کا او بے گماں
رچا جن یہ حکمت سے سب جگ تمام — وہی چاہے جن و بشر دھر مقام

خاتمہ:-

کہ او روز شاہی کا تھا اونول — گندہ طرۂ خاص شوق اوبل
تب او وقت نیکی اتھا چاشت کا — ہوا حرف پورا عرضداشت کا
کیا سعدیت کا یہ قصہ تمام — بہ حق محمد علیہ السلام

ترقیمہ:-

"بہ وقت عصر روزِ دوشنبہ بہ تاریخ ہفدہم شہر شعبان المعظم ۱۲۷۸ھ ہجریہ، کاتب الحروف حقیر العباد شیخ مصطفےٰ مدراجی، نوشتم ایں قصہ برائے خاطر شیخ محمد طاہر ابن شیخ داؤد نیبار"

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ مثنوی قصۂ فغفور چین کے نام سے چھپ چکی ہے اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کریمی لائبریری میں بھی موجود ہے جو ۱۲۹۱ھ میں مطبع حیدری بمبئی سے شائع ہوا ہے، دونوں میں لفظی ہیر پھیر کے سوا اور کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

عشق نامہ

مصنف فگار، سنہ تصنیف ۱۲۱۲ھ، صفحات ۲۷۸، شعر فی صفحہ ۱۱، خط نستعلیق، عنوانات سرخ روشنائی میں، سائز "۶ × "۹۔

فگار کے حالات معلوم نہ ہو سکے، مثنوی کا موضوع یوسف زلیخا کا مشہور قصہ ہے، اس موضوع پر امین کی ایک مثنوی کا تعارف گذر چکا ہے، یہ اس سے مختلف ہے اور تقریباً ایک سو سال بعد لکھی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر امین کی یوسف زلیخا نہ تھی، بلکہ اس نے براہ راست فارسی سے ترجمہ کیا ہے چنانچہ وجہ تالیف میں جہاں اس موضوع پر طبع آزمائی کرنے کی وجہ بتائی ہے وہاں جامی پر دعائیں بھی بھیجی ہیں اور ان کی تصنیف کو گوہروں سے بھرا ہوا دریا کہا ہے، ملاحظہ ہو:-

عجب میں ایک شب بیٹھا تھا مسرور — جہاں کے سب علاقے دل سے کر دور
صفائی کی جو مجلس تھی وہاں پر — فقط ایک شمع مونس تھی وہاں پر
کئی یک پروانہ اس کے گرد بیتاب — پڑی دل بیچ ان کے شمع کی تاب

وہ پروانوں کی بے تابی کو نظر کر　　کہا میں اپنے دل میں ہو کے مضطر
عجب یہ عشق سے حیراں ہوا ہے　　کہ جی دینا اسے آساں ہوا ہے
نہ ہووے عشق جس کے دل کے اندر　　بلاشک جانور سے ہے وہ کمتر
ہوا واقف جو میں رازِ نہاں سے　　کیا ہے خود مجھے دونوں جہاں سے
ہوئی تب آرزو یوں ناگہانی　　کہ کہیئے عشق کی کوئی کہانی
ہر یک معشوق و عاشق کے خیالات　　وہیں دل بیچ گذری عشق کی بات
ولیکن قصۂ یوسف زلیخا　　ہر یک قصہ سے میرے دل کو بھایا

ہزاراں آفریں بر روح جامی　　یہ قصہ کو کیا جو اس نے نامی
مری جانب سے از نیکو سرشتی　　دعا یہ ہے کہ وہ مردِ بہشتی
خدا سے مغفرت عقبیٰ میں پاوے　　کتاب اپنی لئے جنت میں جاوے
یہ قصہ میں سخن ہے فوج در فوج　　سخن کا ہے گا دریا موج در موج
ہر یک موجوں میں گوہر ہے سمایا　　سراپا عشق کا انداز ہے گا

نگار اب داستاں کو ایک باری　　سنا جلدی کہ ہے گی انتظاری

اِس تمہید کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے، خاتمہ میں سنہ تصنیف، تعداد ابیات، نام کتاب کا بھی ذکر کیا ہے، بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

ہزاروں شکر یہ رنگیں کہانی　　ہوئی انجام یہ شیریں بیانی
کشاکش میں پڑا تھا یہ مرا دل　　اب اس کے نظم سے فارغ ہوا دل
قصور اس میں اگر کچھ پاوے یک بار　　معاف اس کو کرے از لطف بسیار
ہزار و دو صد و دہ اور تھے دو　　کیا انجام جب اس داستاں کو
گنے ابیات میں نے اس کے یک بار　　ہوئے تب سہ ہزار و بیست اشعار
لکھا تھا عشق سے جو اس کو خامہ　　رکھا تب نام اس کا عشق نامہ

ابتدا:-

الٰہی عشق سے اپنے تو کر شاد　　مرا دل کر تو اپنا عشق آباد
عناصر کی یہ میری ہے جو ہستی　　بسا تو عشق کی اس بیچ بستی

نکال اب راہ اس میں چاک دل سے	بنا دکان و در اس آب و گِل سے

خاتمہ:۔

رہے حفظ و اماں میں تیرے وائم	رہے عالم کا جب تک نام قائم
نگار اب خامشی ہے تجھ کو بہتر	بھلا ہے اب یہ قصّہ مختصر کر
گئی آنکھوں سے نیند اب ناگہانی	زباں کر بند بس کر یہ کہانی

ترقیمہ:۔

تمام ہوئی یہ کتاب بعون اللہ تعالیٰ بہ تاریخ ہفدہم شہر ربیع الاول ۱۲۵۹ھ ہجری مطابق ۱۸۴۳ء عیسوی در بندر معمورۂ بمبئی "

یہ مثنوی مالک مطبع محمدی اور مولوی فیض اللہ کی کوشش سے تصحیح ہو کر ۱۲۴۷ھ ہجری میں شائع ہو چکی ہے چنانچہ یہ مخطوطہ اسی کی نقل ہے،

اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کریمی لائبریری میں بھی موجود ہے جس کو مطبع حیدری بمبئی نے ۱۳۰۱ھ میں مثنوی میرحسن اور گل بکاؤلی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ایک مخطوطہ کا تعارف ڈاکٹر زور کے تذکرۂ اُردو مخطوطات میں بھی پایا جاتا ہے۔[۵۱]

شمع عشق

مصنف انور، سنہ تصنیف ۱۲۵۹ھ، صفحات ۹۱، سطر فی صفحہ ۱۳،

خط نستعلیق، سائز ۷ x ۹۔

انور کے حالات تفصیلی طور پر معلوم نہ ہو سکے، ممکن ہے یہ کوئی لکھنوی شاعر ہو کیونکہ مثنوی میں اس نے اپنے آپ کو ملک الشعراء قاضی محمد صادق خاں اختر کا شاگرد بتایا ہے، خم خانہ جاوید کی صراحت کے مطابق قاضی محمد صادق خاں صاحب اختر ولد قاضی محمد لعل ہوگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے، مگر وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے، مرزا قتیل کے شاگرد رشید تھے اور تحصیل داری کے عہدے پر مامور رہتے، لکھنؤ کے مشاہیر شعراء میں شمار کئے جاتے تھے، غازی الدین حیدر والی لکھنؤ نے انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا، صبح صادق، نورالانشاء محامد حیدریہ، دیوان فارسی دیوان ریختہ اور تذکرۂ آفتاب عالمتاب ان کی یادگار ہیں، بعد غدر ۱۸۵۸ء لکھنؤ میں وفات پائی۔[۵۲]

مثنوی کی ابتدا حمد و نعت اور مناجات سے ہوتی ہے، مناجات میں حضرت علیؑ کا وسیلہ دے کر اپنی

---

۵۱ تذکرۂ اردو مخطوطات صفحہ ۳۳۲، ۵۲ خم خانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۱۱۰

مراد بر آری کے لئے دُعا کی گئی ہے، بعض دعائیہ شعر حسب ذیل ہیں:۔

بر آوے جو مری آرزو ہو — پاؤں میں اس کو چاہوں جس کو
دے عشق کا اپنے تو مجھے درد — اشکِ گلگوں و چہرۂ زرد
اشکوں کو میرے جگر فشاں کر — آہوں کو مری شرر فشاں کر
تڑپے لذت سے غم کی یوں دل — جس طرح سے زیر تیغ بسمل
کر علم و ہنر میں مجھ کو فائق — ہوں اہل کمال میرے شائق
وہ نور بیان میں بخش میرے — ہو لال زبانِ شمع جس سے
مشہور ہو نظم و نثر میرا — ہر شہر میں ہووے میرا شہرا
تا زیست رہوں بہ عیش و آرام — اور خاتمہ ہو بہ خیر انجام

اِس دُعا کے بعد اپنے استاذ ملک الشعراء قاضی محمد صادق خاں بہادر متخلص بہ اختر کی مدح سرائی کی ہے، مدح کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

نورِ دلِ دانش و فراست — حسن رخ بینش و کیاست
گنجینۂ گوہر تکرّم — آئینۂ گوہر ترحّم
خورشید سپہر عزّ و رفعت — سلطان سریر ناز و نعمت
سرتاج سخن ورانِ عالم — ہر دل میں بسان جانِ مکرم
ممدوح زماں بہ نیک ذاتی — محمود جہاں بہ خوش صفاتی
وہ داورِ کشورِ سخن ہے — یکتائے جہاں بہ جُملہ فن ہے
نثّار مہذب و مدقق — نظّامِ سخن ور محقق
یا رب اسے اپنی رکھ اماں میں — ذات اس کی مغتنم ہے جہاں میں

مثنوی کا پلاٹ میر کی مثنوی دریائے عشق کے پلاٹ سے بہت ملتا جلتا ہے لکھا ہے کہ بنارس میں ایک مسلم نوجوان تھا جو نہایت خوبصورت ہونے کے علاوہ صاحب دولت بھی تھا، بہ ظاہر وہ اپنے یار آشناؤں میں گھرا نہایت دلچسپ زندگی گذارتا تھا مگر حسن کی ایک معمولی سی جھلک اسے کبیدہ خاطر بنا جاتی تھی، ایک بار جب وہ کسی باغ میں اپنے دوستوں کے ساتھ مصروف تفریح تھا تو اس کی نظر ایک برہمن لڑکی پر پڑی اور وہ اس پر اس قدر فریفتہ ہوا کہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے آستانہ پر جا بیٹھا، دوستوں نے اس کی فہمائش کی اور بہ ہزار بہانہ گھر لے آئے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر لڑکی کے رشتہ داروں نے یہ افواہ اڑادی کہ لڑکی چل بسی یہ خبر سن کر وہ دریائے گنگا میں کود پڑا اور جان دیدی، جب لڑکی کو اس کی خبر ہوئی تو

وہ بھی کسی دن بچ بچا کر اپنے گھر سے نکلی اور اپنے آپ کو بھی دریائے گنگا کے حوالے کر دیا جب لاش نکالی گئی تو دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، برہمنوں نے انھیں جلا دیا۔

اس تفصیل کے بعد لکھا ہے کہ یہ تو محض ایک واقعہ ہے ورنہ ایسے کئی واقعات روزانہ پیش آتے رہتے ہیں جن سے عشق و محبّت کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے۔

ابتدا:۔

ہے خال و خطِ عذار نامہ — نامِ خلّاق خط و خامہ
خطِ عشق میں جس کے مو پریشاں — ہے خامہ جگر شگاف و گریاں
عشقِ شیریں چوں نامہ زو یافت — عشقِ فرہاد خامہ زو یافت

خاتمہ:۔

رکھے خلّاقِ ماہ و اختر — روشن اسے تابہ صبحِ محشر
مقبولِ دلِ سخن وراں ہو — مطبوعِ خیال گستراں ہو
مضمون جو ہے سوز کا سراپا — بس نام ہے شمعِ عشق اس کا

قطعۂ تاریخ:۔

یہ مثنوی نفیسِ عنواں — جب ختم ہوئی بہ فضلِ یزداں
تاریخ اس کی ہوئی یہ انشا — سلکِ دُررِ سخن ہے زیبا
۱۲۵۹

دیوانِ ولی

مصنّف ولی، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۲۱۰، شعر فی صفحہ ۱۳۔
خط نسخ، سائز ۷ × ۹۔

ولی کے حالات اور اس کے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہاں ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے، اس نسخہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ولی کی وفات سے متعلق وہ قطعہ تاریخ بھی درج ہے جسے ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اُردو میں شائع کیا اور جو ولی کی وفات کے سنہ کو بڑی حد تک یقینی بنا دیتا ہے۔

ولی کے کلام کا یہ مجموعہ ایک قصیدہ، ایک ترجیع بند، تقریباً تین سو غزلوں، نو مخمسوں، پانچ مستزادوں سات رباعیوں اور پندرہ فردوں پر مشتمل ہے۔

ابتدا اسی غزل سے کی ہے جو عام طور پر مطبوعہ نسخوں میں پائی جاتی ہے اور جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے:۔

کیتا ہوں ترے نام کوں میں وردِ زباں کا — کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

اور خاتمہ اس قطعہ پر ہوا ہے۔ جس سے ولی کی تاریخ وفات نکالی گئی ہے۔

ترقیمہ حسب ذیل ہے:۔

"تمام شد تحریر این نسخہ از دست شہسوار بیگ بہ تاریخ بست و یکم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۲ جلوس والا محمد شاہ بادشاہ غازی"

ولی کا کلام دو بار انجمن ترقی اُردو کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے، پہلی بار ۱۹۲۷ء میں احسن مارہروی نے مرتب کیا تھا اور دوسری بار ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی نے اس کی ترتیب و تدوین فرمائی ان دونوں نسخوں میں ولی کے بہت سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین کے حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں کریمی لائبریری میں ۱۲۹۰ھ میں مطبع حیدری کا شائع کیا ہوا دیوان ولی بھی موجود ہے جس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ابتدا میں محمد منظور جو سورت کا ایک اچھا شاعر، نثر نگار اور اڈیٹر ہے جس کی متعدد مثنویاں وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ کا لکھا ہوا تقریباً پندرہ صفحہ کا ایک مقدمہ ہے، اس مقدمہ میں اُردو زبان کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور ولی کو اُردو شاعری کا باوا آدم ثابت کرتے ہوئے اس کے کچھ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، ان حالات کے سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ ولی کو گجراتی ثابت کرنے کے لئے اس میں بھی حسب ذیل دلیل ہی پیش کی گئی ہے۔

"ہمارے استاد مرحوم جناب منشی غلام محمد صاحب تخلص تمیم جو میر منشی اور وکیل مطلق مختار کار جناب نواب نجم الدولہ مومن خاں ممتاز الملک دلاور جنگ بہادر والی بندر کھمبایت جو کہ شاگرد جناب مغفرت نشان حکیم محمد مومن خان صاحب تھے فرماتے تھے کہ میں احمد آباد کو گیا تھا، ولی محمد ولی کے مزار پُر انوار پر جا کر فاتحہ سے اجر یاب ہوا، قبر ان کی، ان کی وصیت موافق کچی بنی ہوئی ہے اور اس کے سرہانے کے طرف چینی کے پارچے لگے ہیں اور قطعہ سنگ مرمر کا لگا دیکھا تھا وہاں کے رئیسان قدیم کی زبان ان کی تربت کا نشان ملا تھا"[۱]

اس مطبوعہ نسخہ کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں ولی کے کلام کی تمام دکھنی خصوصیات کا مثلی کر دیا گیا ہے۔

دیوان ولی

دیوان ولی کا یہ دوسرا نسخہ ہے جو ۵ × ۹ کے تقریباً ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر سترہ شعر ہیں، خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، مذکورۂ بالا نسخہ کی طرح اس میں کوئی ترقیمہ نہیں، نہایت کرم خوردہ

---

[۱] دیوان ولی مطبوعہ حیدری بمبئی صلا

ہے اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔

یہ تقریباً تین سواسی غزلوں، سات مخمسوں اور ایک ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی غزل بھی وہی ہے جس کا گذشتہ نسخہ میں ذکر کیا گیا۔ اور خاتمہ ترجیع بند پر ہوا ہے[۵۱]

دیوانِ علیم

مصنف علیم اللہ شاہ قادری، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۵۹، شعر فی صفحہ ۱۳
خط نستعلیق، سائز ۴" × ۸"

مصنف کے حالات تفصیلی طور پر معلوم نہ ہو سکے، غزلیات کو شروع کرنے سے پہلے سُرخ روشنائی میں صرف اس قدر لکھا ہوا ہے:۔

"دیوان علیم اللہ تصنیف از حضرت علیم اللہ شاہ قادری قدس سرہٗ العزیز"

دیوان تقریباً ایک سو غزلوں پر مشتمل ہے، ردیف الف، ن اور ی پر زیادہ غزلیں کہی ہیں اور باقی حروف پر صرف ایک ایک دو دو۔ غزلیات متصوفانہ ہیں، زبان قدیم دکھنی ہونے کے باوجود اکثر غزلیں ولی کی غزلوں کی طرح نہایت دلچسپ ہیں۔

ابتدا:۔

عجب چنچل ملیا ہے یار ہمنا — کیا یک بارگی سرشار ہمنا
ندھاں سوں نکہ کر کچھ لوں تکھے — دو عالم صاحب اسرار ہمنا
گل بستاں ہے گو یا خار صحرا — دسیا جب حسن کا گلزار ہمنا
زمیں سوں تا فلک سارے حجابات — ہوا ہے مطلع انوار ہمنا
ہوا دل سرخ ار آیا نظر جب — شگفتہ چہرۂ گلنار ہمنا
نوازش سو رتلطف سوں صنم نے — دیا خلوت میں اپنے بار ہمنا
علیم اللہ حضوری بن صنم کے — نہیں جز بندگی اقرار ہمنا

خاتمہ:۔

جب پیارا گلا سنا تا ہے — جان تازہ بدن میں آتا ہے
ہوش جاتا ہے سروں یک بیکار — جب گھنگھٹ کھول مکھ دکھاتا ہے

---

[۵۱] ان نسخوں سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر جعفری کا مضمون "بمبئی کے کتب خانوں میں دیوانِ ولی کے قلمی نسخے"، نوائے ادب جولائی ۱۹۵۰ء

تب عدو دیکھ کر مجھے میرا — مار کے مثل پیچ کھاتا ہے
خاک ہوتا ہے بلکہ جل اس وقت — مجھ کوں خلوت میں جب بلاتا ہی
مجھ کوں لے جا پیارا اپس گھر میں — بادۂ وصل پھر پلاتا ہے
کر مجازی میں فن حقیقت کا — حاسداں کے دلاں جلاتا ہی
شعر تیرا عجب علیم اللہ — شعلۂ عشق کوں چیتاتا ہے

ترقیمہ:-

"راقم الکلمات من عباد ہ اللہ الصمد قاضی الحاجات خاکسار بندۂ کمیں عظیم الدین تحریر یافت برائے اخلاص معین برادر قلمی یافت، محررہ فی التاریخ شہر شریف رمضان المبارک سنہ ۱۲۳۲ھ"

یہ دیوان بھی چھپ چکا ہے، اس کا جو مطبوعہ نسخہ کریمی لائبریری میں موجود ہے وہ ۱۳۰۹ھ میں مطبع فتح الکریم کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

قلمی نسخہ کی بہ نسبت اس مطبوعہ نسخہ میں اشعار کچھ زیادہ ہیں، مخطوطہ کی جو پہلی غزل اوپر نقل کی گئی ہے اس سے بھی پہلے اس میں تقریباً سولہ غزلیں پائی جاتی ہیں اور آخر میں بھی دو غزلیں ایک ترکیب بند اور ایک مخمس زیادہ ہے، مخمس شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان میں ہے۔ دیوان ولی مطبوعہ بمبئی کی طرح اس کی زبان کو بھی مسخ کر دیا گیا ہے۔

اس مطبوعہ نسخہ کے آخر میں ایک خاتمۃ الطبع بھی ہے، جس کے پڑھنے سے علیم اللہ کے کچھ حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علیم کا تعلق کوکن سے تھا اور وہ یہاں کافی مشہور ہیں۔ خاتمۃ الطبع کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"بہ یمین توفیق خداوند دوجہاں، یہ دیوانِ حقائق بتیان" مجمع انوار لاہوتی، محرم اسرار جبروتی، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، سحر کلام، معجز نظام، طور سخن کے کلیم اللہ جناب علیم اللہ طاب ثراہ کہ جن کا کلام تمام، بادۂ حقائق معرفت الٰہی سے لبریز ہے و عشق حقیقی شاہد رعنائی ازل انگیز اور اس خطۂ کوکن میں جن کا نام نامی مشہور ہے، بلکہ معروف نزدیک و دور ہے، مگر آپ کا دیوان کامل کہیں دستیاب نہ ہوتا تھا اور اکثر شائقین اس در یتیم کے بہ دل و جان طالب، آخر بعد نہایت سعی و کوشش کے چند دیوانین فراہم کر کے ایک دیوان کامل بنایا اور مشتاقین کلام اور شائقین دیوانِ مرحوم و مغفور کے لئے جناب قاضی عبدالکریم صاحب و قاضی رحمت اللہ ابن جناب قاضی فتح محمد صاحب مرحوم نے اپنے مطبع شائع فتح الکریم واقع بمبئی میں بار دوم بہ تاریخ بستم ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۰۹ ہجری حلیۂ طبع سے آراستہ و پیراستہ کیا۔"

بیاضِ قصائد

صفحات ۳۲، خط نسخ، سائز ۶" × ۹"

اگرچہ اس بیاض کا نام بیاض قصاید ہے لیکن اس میں قصیدوں کی جگہ زیادہ تر نظمیں ہیں جو ان کو "دکھڑا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کی ایجاد کا سہرا بڑی حد تک گجرات کے شعراء کے سر ہے۔ یہ بیاض تقریباً نو نظموں پر مشتمل ہے اور ان کے لکھنے والے گجرات و دکن کے مشہور شعرا رحمت، شرفو، خاکی ہاشم اور قادر وغیرہ ہیں۔ ہر نظم کی مختصر سی کیفیت حسب ذیل ہے۔

(۱) زاری غم از رحمت

یہ نظم پندرہ اشعار پر مشتمل ہے، اس میں ایک ایسی لڑکی کے تاثرات بیان کئے گئے ہیں جس کے ماں باپ مر گئے ہوں اور جو اس دُنیا میں اکیلی ہو۔

ابتدا:-

مجھ سر مصیبت آ پڑی اٹھ کر چلے بابا اماں		راحت کہاں اب اک گھڑی اٹھ کر چلے بابا اماں
وحشی طبع ہو کر رہوں، لاکھوں زخم سر پر سہوں		مولیٰ بنا میں کس کہوں اٹھ کر چلے بابا اماں
ہے ہے کڑا پا دل جلا، آنکھوں لہو نالا چلا		کوئی نہ پڑیو اکیلا، اٹھ کر چلے بابا اماں

خاتمہ:-

ماں باپ جنگل جا بسے، یہ گھاؤ نا لگیو کسے		اب ناگ کالے مجھ ڈسے اٹھ کر چلے بابا اماں
ہے ہے اماں جی کیا کیا، بابا بنا پھٹ ہے ہیا		مجھ ساتھ اپنے نا لیا، اٹھ کر چلے بابا اماں
ماں باپ سی نعمت کہاں، شفقت کہاں رحمت کہاں		خدمت کہاں، عظمت کہاں اٹھ کر چلے بابا اماں

(۲) زاری غم از رحمت

یہ نظم بھی پندرہ اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں بھی ایسی لڑکی کے تاثرات ظاہر کئے گئے ہیں، جس کی ماں مر چکی ہو جس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ہو، اور نئی ماں اسے مختلف تکلیفیں دے رہی ہو۔

ابتدا:-

اماں اب تم چلے اٹھ کر، اماں دیدار کہاں پاؤں		اماں چھاتی گئی پھٹ کر، اماں دیدار کہاں پاؤں
اماں آرام نئیں پل پل، اماں دیدار کہاں پاؤں		اماں مجھ گھر دسے جنگل، اماں دیدار کہاں پاؤں

اماں تو نے تمیں مایا، اماں نا کچھ ترس آیا
اماں ہم بھوت دکھ پایا، اماں دیدار کہاں پاؤں

خاتمہ:۔

اماں او جیو گیا سندر، اماں سمبئے تیر اندر — اماں کاں چھپ گیا چندر، اماں دیدار کہاں پاؤں
اماں مجھ نا بھلایو تم، اماں خبران بھلایو تم — اماں بھیگی بلایو تم، اماں دیدار کہاں پاؤں
اماں کھینچوں سدا زحمت، اماں تم سے گئی نعمت — اماں تم پر ہویو رحمت، اماں دیدار کہاں پاؤں

(۳) مخمس از شرفو

یہ سات بند پر مشتمل ایک مخمس ہے، جس میں رسول اللہ سے بعض مرادوں کے بر لانے کے لئے دعا کی گئی ہے۔

پہلا بند:۔

بد رھوں کو رہ پہ لاؤ حضرت نبی محمد — امت میں ہیں بچاؤ حضرت نبی محمد
مولیٰ کی رہ بتاؤ حضرت نبی محمد — اپنا مجھے بناؤ حضرت نبی محمد
روگی نین ہنساؤ حضرت نبی محمد

آخری بند:۔

یا فضل کا ہم کوں سکھلاؤ یا نبی جی — ہر دو جہاں کا مقصد بر لاؤ یا نبی جی
شرفو غریب کوں تم بخشاؤ یا نبی جی — کل مقصداں ہمارے بھلاؤ یا نبی جی
حق کا لقا دکھاؤ حضرت نبی محمد

(۴) مخمس از شرفو

یہ مخمس بارہ بندوں پر مشتمل ہے اور مذکورۂ بالا مخمس کی طرح دعائیہ ہے۔

پہلا بند:۔

یا محمد تم کوں ہے گی دو جہاں کی سروری — تم ستیں ستے ہیں دونوں جگ کے عالم ملتجی
اب یہاں فی الحال حاضر ہی اہیں سب امتی — واسطے اللہ ہمارے غرض سن یا سیدی
جس کی زیارت ہے اسے، ہم کوں شفیع ہو یا نبی

آخری بند:۔

یا نبی ہم سب اپر سایہ فضل کا چھاؤ تم — دین اور دنیا کے سارے نعمتاں پوچاؤ تم
جو کچھ ہے شرفو کا غرض حق کے ستیں دلواؤ تم — کر کر کرم حضرت ہر ایک کے حاجتاں بر لاؤ تم
جس کی زیارت ہے اُسے، ہم کوں شفیع ہو یا نبی

ضمیمۂ

مقالہ نما

مرتّبین

عالی جعفری، فضل اللہ فاروقی، عصمت جاوید، سیّد جمیل الدین

ضروری نوٹ:- مقالہ نما میں شامل شدہ مضامین کی نقل حسبِ طلب (خطِ شکست میں) دو آنے فی صفحہ کی اجرت پر مہیا کی جا سکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱۔ بھگوان داس:

ہندو جات پات کی اصلیت، اس کا برا روپ اور علاج

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ دسمبر ۲۶۳-۲۸۴)

ذات پات کی تفریق کی بنیاد تقسیم کار کے اصول پر قائم ہوئی۔ علم وحکمت برہمنوں نے اپنایا جنگ وجدل چھتریوں کے حصہ میں آیا۔ دھن دولت کو ویشیوں نے لیا اور محنت مزدوری کو شودروں نے یہ تقسیم ناگزیر تھی لیکن خود غرضوں نے اس تقسیم کو موروثی قرار دیا اور انھوں نے انسانی معاشرے کو آب بند خانوں میں منقسم کر دیا۔ یہ ذات پات کا برا اور نقصان دہ روپ ہے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اس تقسیم پر سے مذہب وملت اور پیدائش ونسل کی قید اٹھا دی جائے اور کسی بھی شعبۂ عمل کو ذلیل نہ سمجھا جائے۔

۲۔ پانڈے۔ وشومبھر ناتھ:

دان کی ارتھ نیتی

(نیا ہند الہ آباد ۵۴ دسمبر ۲۹۴-۲۹۹)

یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مذاہب عالم میں "خیرات" پر زور دیا گیا اور اسے واحد ذریعہ نجات قرار دیا گیا ہے۔ خلیل جبران، مہاتما گاندھی اور ونوبا بھاوے کے اقوال کی روشنی میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر انسان اپنی ضرورت سے زیادہ اکٹھی کی ہوئی چیزوں کو دان میں ضرورتمندوں کو دیدے اور ضرورت سے زیادہ چیزیں اکٹھی نہ کرے تو سماجی اونچ نیچ ختم ہو جائے گی۔

۳۔ تاراچند۔ ڈاکٹر:

اسلام کو اپنی خوبیوں کی بناء پر فروغ حاصل ہوا

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ نومبر ۳-۵-۵۵ اور ۱۶)

یہ مقالہ الجمعیۃ سے مقتبس ہے۔ اسلام کے فروغ کے یہ اسباب بتائے گئے ہیں (۱) اسلام دین فطرت ہے (۲) یہ عملی مذہب ہے (۳) ہر مسلمان تبلیغ کا فرض انجام دیتا ہے۔ مقالے میں خصوصاً دکن میں اشاعت اسلام کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

۴۔ جعفر شاہ:

فرمانِ رسول

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ دسمبر، ۱۳-۱۴)

رسول پاک کی ایک حدیث "اللہ تعالیٰ تمھاری چیزوں اور تمھاری باتوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اس کی نظر تو تمھارے اعمال اور تمھارے دلوں پر ہوتی ہے" پیش کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے قوم کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۵۔ عبدالحمید:

عقیدہ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

(ترجمان القرآن، لاہور، ۵۴ اکتوبر ۱۷-۳۹)

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ توراۃ اور انجیل میں آخری نبی کی آمد کی بشارت دی گئی تھی لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد قرآن میں کسی اور نبی کی آمد کی بشارت نہیں دی گئی بلکہ واضح کر دیا کہ آپ آخری نبی ہیں۔ تائید میں، قرآنی آیتیں، احادیث نبوی اور علمائے اسلام کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں سے بعض عقیدہ ختم نبوت کے عمرانی پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

۶۔ فضل قدیر

حکمت لقمان

(فیض الاسلام، راولپنڈی، ۵۴ اکتوبر (۷-۱۰)

سورہ لقمان (رکوع ۲) کی ان آیتوں کی تفسیر جن میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحتیں کرتے ہیں۔

۷۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ دسمبر، ۱۰-۱۲)

پابندی عہد۔ حلت وحرمت۔ نیکی بھلائی، پر تعاون اور عدل وانصاف سے متعلق آیات قرآنی کا ترجمہ وتفسیر۔

۸۔ قطب سید مصری:

عالمی معاشرہ

(چراغ راہ کراچی ۵۴ نومبر ۱۴-۲۰)

سید قطب مصری کے عربی مقالہ مطبوعہ "جریدۃ المسلمون" کے اُردو ترجمہ کی پہلی قسط جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام کا نظامِ معاشرت دُنیا کا وہ واحد نظام ہے جو عالمگیر برادری کے خواب کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ مترجم چیاس اعظمی۔ (باقی آئندہ)

۹۔ قدوائی۔ محمد آصف ڈاکٹر:

اسلام میں نبوّت کا تصوّر

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ دسمبر ۱۷-۳۱)

نبی کا مقام مصلح اور مفکر کے مقام سے اعلیٰ وارفع ثابت کرنے کے بعد یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم میں بھیجے ہیں۔ اسلام سے پہلے انبیا کو غیر از بشر سمجھنے کا عام دستور تھا۔ اسلام نے اس عقیدے کی نفی کی۔ (باقی)

۱۰۔ محمد احمد صدیقی۔ ڈاکٹر:

دو سنگموں کا حیرت انگیز توافق

(برہان، دہلی ۵۴، اکتوبر ۲۲۷-۲۳۶)

قرآن کریم (سورہ کہف، آیت ۶۰) میں مجمع البحرین (دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ) کا ذکر آیا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ کے ایک صاحب علم بندے (حضرت خضر علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی تھی۔ مضمون نگار کو، کچھ تذبذب کے ساتھ، یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان دو برگزیدہ بندوں کی ملاقات دریائے جمنا اور دریائے گنگا کے سنگم پر ہوئی ہوگی۔ جن قرائن کی بنیاد پر وہ ہچکچاتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں ان کی تفصیل مضمون میں دی ہے۔

۱۱۔ محمد منظور نعمانی:

قرآنی دعوت (۱۳)

(الفرقان لکھنؤ، ۵۴ اکتوبر ۷-۱۴)

نبوت و رسالت کے بابت میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ نبوت و رسالت سے متعلق قرآن مجید کی آیتیں، اُردو ترجمہ اور مختصر تفسیری "نوٹس" کے ساتھ، درج کی گئی ہیں۔

۱۲۔ محمد منظور نعمانی:

معارف الحدیث (مسلسل)

(الفرقان، لکھنؤ ۵۴، اکتوبر ۱۵-۲۲)

اپنے اور اپنے خاص متعلقین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقر پسندی سے متعلق حدیثیں مع ترجمہ و تشریح۔

۱۳۔ محمد منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(الفرقان لکھنؤ ۵۴، نومبر ۴-۱۲)

چودھویں قسط۔ قرآنی آیات کی روشنی میں، نبی کی حیثیت اور مقام نبوت کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ قرآن نے پیغمبروں کے بارے میں غلو و افراط کا سدِّباب کر دیا ہے۔

۱۴۔ محمد منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ دسمبر، ۱۳-۱۶)

پندرھویں قسط۔ قرآنی آیات کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ انسانوں کو چاہیئے کہ وہ خدا کی ہدایت اور اس کے احکام کی پیروی کو زندگی کا اصول بنائیں اور اس کے سوا کسی کو اطاعت و پیروی کے قابل نہ سمجھیں۔

۱۵۔ مودودی۔ ابوالاعلیٰ:

روح انتخاب

(فاران کراچی ۵۴ اکتوبر ۵۰-۵۴)

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیمات سے ایک اقتباس جس میں اس بات کا تجزیہ کیا ہے کہ وہ غیر مسلم اکابر جو اسلام کی خوبیوں کے معترف ہوتے ہیں پھر بھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوتے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کیلئے قابل فخر نہیں۔

۱۶۔ ولی الدین میر:
شعور دینی میں انقلاب کس طرح پیدا کیا جائے
(الفرقان لکھنؤ ۵۴ نومبر ۲۶۔۴۰)
شعور دینی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے اخلاق حمیدہ اور اعمال نیک کا صادر ہونا ضروری ہے جو مونست الٰہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ قرب الٰہی کے لئے مجاہدہ لازمی ہے چاہے وہ تزکیہ نفس کے لئے ہو یا تصفیۂ قلب کے لئے۔ مقالے میں تغیر نفس کے لئے کچھ طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

۱۷۔ ہاشمی نصیر الدین:
حیدر آباد کے چند کتب خانوں میں حدیث کی اردو قلمی کتابیں
(برہان دہلی، ۵۴ اکتوبر ۲۱۶۔۲۲۶)
حدیث کی ان اردو قلمی کتابوں کا تذکرہ جو حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ نواب سالار جنگ، کتب خانہ عثمانیہ اور کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۸۔ ابوالحسن علی ندوی سید:
سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ
(الفرقان، لکھنؤ۔ ۵۴ اکتوبر ۲۳۔۳۸)
شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے تحصیل علم، تدریس و اعظ، اصلاح و ارشاد، محامد اخلاق اور علو مرتبہ کا بیان اور بعض مسائل خصوصاً توحید سے متعلق آپ کے مواعظ سے اقتباسات۔ (باقی)

۱۹۔ ابوالحسن علی ندوی سید:
سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ
(الفرقان لکھنؤ ۵۴ نومبر ۱۷۔۲۵)
دوسری قسط۔ اس میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے انہیں حالات زندگی و ارشادات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے عہد حاضرہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ صاحب مقالہ کی زیر تصنیف کتاب "دعوت و عزیمت" کا جزو ہے۔

۲۰۔ ابوالحسن علی ندوی سید:
رحمت عالم
(الفرقان لکھنؤ۔ ۵۴ نومبر ۴۱۔۵۲)
قرآن کے اس دعوے کو محمد صلعم رحمۃ للعالمین ہیں، ایمان و عقیدے سے ہٹ کر خالص تاریخ اور واقعات کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۱۔ ابوالحسن علی ندوی سید:
شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
(الفرقان لکھنؤ ۵۴ دسمبر ۲۳۔۴۵)
عموماً لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو ایک متکلم، مناظر، محدث اور فقیہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مقالہ نگار نے مدارج السالکین اور علامہ ذہبی کے اقوال کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ عارف بھی تھے اور ان کا شمار اہل اللہ میں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اکابر اہلسنت والجماعت اور اولیاء وقت میں سے تھے۔

۲۲۔ ادارہ:
بہادران اسلام
(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ دسمبر ۱۹۔۲۰)
حضرت عباس بن عبد المطلب کے حالات زندگی۔

۲۳۔ حبیب الرحمٰن اعظمی:
پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں
(معارف اعظم گڑھ ۵۴ اکتوبر ۲۸۹۔۲۹۳)
یوپی کے مشرقی اضلاع کے بزرگان دین مخدوم شاہ طیب بنارسی، شیخ تاج الدین جھونسوی کے حالات زندگی۔

۲۴۔ حبیب الرحمٰن اعظمی:
پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں
(معارف اعظم گڑھ ۵۴ نومبر ۳۳۳۔۳۴۸)
۲۔ مولانا محمد احمد کلاں (وفات ۹۴۱ھ)، شیخ

نصیر الدین (وفات ۹۸۰ھ)، شاہ حسن داؤد بناری (وفات ۹۰۰ھ)، شیخ فرید بنارسی (وفات ۹۰۶ھ)، خواجہ مبارک بنارسی اور مخدوم محمد عیسیٰ تاج (وفات ۸۷۰ھ) کے مختصر حالات علم و فضل اور ولایت کے ذکر کے ساتھ دئے ہیں۔

۲۵۔ سخاوت مرزا:

ایڈورڈ بالفور

(اردو کراچی، ۴۴ء اکتوبر ۹۲-۹۸)

ایڈورڈ بالفور مدراس میں ایک مشہور انگریز ہو گزرا ہے جس نے اُردو میں بھی بعض اہم انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اس مستشرق سے متعلق سب اُردو تذکرے اور تواریخ ادب اردو خاموش ہیں۔ مضمون ہذا میں خود اس کی مشہور کتاب سائیکلو پیڈیا اور بعض دیگر کتب کی مدد سے اس کے حالات و تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعض ترجمہ شدہ اصطلاحات کی مختصر فہرست بھی دی گئی ہے۔

۲۶۔ سخاوت مرزا:

ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام

(اردو کراچی ۴۴ء اکتوبر ۹۹-۱۵۲)

غواصی ملک الشعرا قطب شاہی کے مزید حالات جو اس کے دیوان کی داخلی شہادتوں سے حاصل ہوئے ہیں اور اس کے کلام پر روشنی ڈالتے ہیں، درج کئے گئے ہیں۔

۲۷۔ ظفر الہدیٰ:

مخبر الواصلین

(معارف اعظم گڑھ ۴۴ء اکتوبر ۲۷۹-۲۹۲)

اورینٹل کالج میگزین ضمیمہ اگست و نومبر ۱۹۳۵ء میں "شرح حال مخبر الواصلین" کے عنوان سے مدیر رسالہ نے مضمون لکھا تھا، کتاب اور کتاب کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ مصنف کا نام مظہر الحق ہے، کتاب شاہجہاں کے عہد میں لکھی گئی"۔ مضمون نگار نے اسی کتاب سے متعلق اپنے مضمون میں روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ اس نایاب کتاب کا ایک قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے جو پنجاب کے نسخہ سے سو سال قدیم ہے اور مکمل ہے۔ یہ کتاب دو بار چھپ چکی ہے۔ ایک بار کلکتہ میں ۱۲۴۹ھ میں پنجاب کے قلمی نسخہ کی کتابت کے چار سال بعد دوسری بار ۱۲۶۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ میں۔ مخبر الواصلین کلکتہ کے نسخہ کے پیش نظر اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ آخر میں ثابت کیا ہے کہ اس کا زمانہ تصنیف شاہجہاں کا عہد نہیں بلکہ شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں کا (۱۰۶۸ھ-۱۱۸ھ) عہد ہے۔

۲۸۔ ع:

بیان و یزدانی میرٹھی

(فیض الاسلام راولپنڈی ۴۴ء دسمبر ۲۷-۲۸)

ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں۔ بیان اردو میں اور یزدانی فارسی میں۔ انھیں کے مختصر حالات زندگی اور ملکۂ شاعری کی چند مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

۲۹۔ عرشی:

رنگا رنگ یادیں

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۴۴ء دسمبر ۲۹-۳۶)

حکیم اللہ بخش زرگر، عبد اللہ عارف، مولوی عبد اللہ غزنوی اور مولوی غلام علی قصوری کے چشم دید واقعات زندگی دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

۳۰۔ قادری۔ اظہر:

حالی و شبلی

(ساقی کراچی ۴۴ء اکتوبر ۶۹-۷۳)

حالی و شبلی دونوں ہمعصر تھے اور دونوں کا میدان عمل بڑی حد تک ایک تھا باوجود اس کے دونوں کے مزاج، افتاد طبیعت اور طور و طریقے میں زمین آسمان کا فرق ہے مضمون میں ان دونوں ادیبوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔

۳۱۔ ل احمد:

چو یو آن

(آج کل دہلی ۴۴ء نومبر ۱۱-۱۴)

چو یو آن چین کا ایک قدیم محب وطن شاعر اور مدبر

تھا۔ اس مقالہ میں اس کی زندگی معلوم شدہ حالات اور
اس کی شاعری سے گفتگو کی ہے۔

۳۲۔ م:

بزرگانِ دین
(۲)

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ء دسمبر ۱۷-۱۵)
حضرت سید گیسودراز کے حالات زندگی۔ تصانیف
ومکتوبات۔

۳۳۔ محمد حسنی:

حسن البنا۔ عہدِ طفولیت میں
(فاران کراچی ۵۴ء نومبر ۲۴-۲۸)
حسن البنا کے عہد طفولیت کے حالات تفصیل سے
پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی دعوتی زندگی کی
نیو ان کے بچپن کی تعلیم ہی میں پڑ چکی تھی۔

۳۴۔ م:

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ
فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ء اکتوبر ۱۵-۱۶
آدابِ طعام اور جہانداری سے متعلق سید اشرف
جہانگیر سمنانیؒ کے ارشادات درج کئے گئے ہیں۔

۳۵۔ مصلح الدین احمد:

شریمتی وجے لکشمی پنڈت
(آج کل، دہلی، ۵۴ء اکتوبر ۳۰-۳۵)
شریمتی وجے لکشمی پنڈت کی زندگی کے ۔لات بیان
کیے گئے ہیں اور ان کی اہم خدمات کو سراہا گیا ہے۔

۳۶۔ تاتھ رام:

رحمۃ اللعالمین کا سلوک دشمنوں کے ساتھ
(فاران کراچی ۵۴ء، اکتوبر ۸-۴۴)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تین گروہوں نے کی
(۱) مشرکین (۲) یہود (۳) منافقین۔ ان تینوں کی مخالفت
کے اسباب اور طریقے تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔

۳۷۔ نذیر مسلم:

ابن تیمیہ ابتلا و آزمائش کے دور میں
(چراغ راہ کراچی ۵۴ء اکتوبر ۱۷-۲۰)
محمد خلیل ہراس (ریاض) کے عربی مضمون کا ترجمہ
جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے سفر مصر سے متعلق تفصیلاً
بیان کئے گئے ہیں جن میں ان مصائب کا ذکر ہے جو دعوتِ حق
کے سلسلہ میں آپ پر توڑے گئے۔

۳۸۔ نور الحسن ہاشمی ڈاکٹر:

لکھنؤ کے موجودہ ادیب۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ء نومبر ۶۹-۷۳)
مولانا عبدالماجد دریابادی کے مختصر حالاتِ زندگی
تصنیفات اور کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۹۔ نور الحسن ہاشمی ڈاکٹر:

لکھنؤ کے موجودہ ادیب۔ مرزا یگانہ چنگیزی
(فروغ اردو، لکھنؤ، ۵۴ء دسمبر ۶۶-۶۹)
مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی کے حالاتِ زندگی مختصر طور
پر بیان کرنے کے بعد ان کی افتادِ طبع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
چند سطروں میں ان کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اور نو شعر بطور
انتخابِ کلام درج کیے گئے ہیں۔

تاریخ وسیاسات

۴۰۔ ادارہ:

حضرت سعید بن زیدؓ
(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ء اکتوبر ۱۷-۱۹)
حضرت سعید بن زیدؓ کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

۴۱۔ خورشید احمد فارق۔ ڈاکٹر:

اعثم کوفی کی تاریخ فتوح
(برہان دہلی ۵۴ء نومبر، ۳۳-۵۴)
ابتدا میں مصنف احمد بن اعثم کوفی کے حالات کی

چھاپا دیتی اس کے بعد کتاب کا تعارف ہے۔ اصل کتاب عربی میں ۱۰۶۲ھ میں لکھی گئی زیر نظر کتاب اس کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ یہ ترجمہ پہلی بار ۱۸۸۸ء میں بمبئی سے چھپا۔ اس میں حضرت ابوبکرؓ سے لے کر واقعہ کربلا ۶۱ھ کے حالات بیان کئے گئے ہیں مضمون میں کتاب کا تحلیلی جائزہ لیا گیا ہے اور پوری کتاب میں لکھے ہوئے اہم واقعات اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی دوسری اسلامی تاریخوں کے مقابلہ میں جہاں جہاں واقعات میں اجمال و تفصیل ہے مضمون نگار نے ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔

۴۲۔ خورشید احمد فارق۔ ڈاکٹر:

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(برہان دہلی ۵۴ دسمبر ۳۳۱–۳۴۴)

ملک مشرق پر ایک سیاح ابو زید بلخی کے مشاہدات مع نقشہ کے پیش کئے ہیں۔ سیاح نے مشرق کا اطلاق ماوراء النہر اور خراسان پر کیا ہے۔ یہ سارا علاقہ سامانی سلاطین کے زیر نگیں تھا جنھوں نے ۲۷۹ھ سے ۳۸۹ھ تک حکومت کی۔

۴۳۔ صباح الدین عبد الرحمن:

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی عہدے، خطابات و امتیازات

(معارف، اعظم گڈھ، ۵۴ دسمبر ۴۰۵–۴۲۲)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی عہدے، خطابات، امتیازات، مناصب و انعامات سے متعلق تفاصیل پیش کی ہیں۔

۴۴۔ طہٰ حسین ڈاکٹر:
عبد الحمید نعمانی، مترجم

عثمانؓ — صرف تاریخ کی روشنی میں (۵)

(برہان دہلی ۵۴ اکتوبر ۲۰۶–۲۱۵)

حضرت عثمانؓ کی زندگی کے ابتدائی حالات عہد جاہلیت کی تاریکی میں ہیں۔ المردیؓ نسب نامہ آپ کا نسب، باپ کی طرف سے، عبد مناف میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے اور ماں کی طرف سے یہ تعلق اور بھی قریب ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے تجارت پیشہ باپ اور قبیلے کے نقش قدم پر چل کر کامیاب کاروبار کیا اور کافی دولت پیدا کی۔ اللہ کی راہ میں انھوں نے اپنی دولت اس طرح خرچ کی جس کی مثال ان کے ساتھیوں میں نہیں۔ وہ حیا اور سنجیدگی کا پیکر، نہایت نیک، ہمدرد، غم خوار، فیاض منکسر المزاج حلیم الطبع، عشرہ مبشرہ میں سے ایک اور اسلام کے سابقین اولین میں سے تھے۔ دو مرتبہ اللہ کے رسولؐ کی دامادی کا شرف حاصل ہوا اور خدا کی راہ میں جان و مال کی ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔

۴۵۔ طہٰ حسین ڈاکٹر:
عبد الحمید نعمانی مترجم

عثمانؓ — صرف تاریخ کی روشنی میں (۶)

(برہان دہلی ۵۴ نومبر، ۵–۱۳)

حضرت عمرؓ کا اپنے بعد انتخاب خلیفہ کے لئے چند صحابیوں کی مجلس شوریٰ متعین کرنے، اور ان اس وقت کے مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب پر تنقید کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے خلیفہ منتخب ہو جانے کے اسباب و وجوہ پیش کئے ہیں۔

۴۶۔ ظفیر الدین مفتاحی:

تاریخی حقائق

(برہان دہلی ۵۴ نومبر، ۱۴–۲۷)

تاریخ مشائخ چشت سے بعض صوفیائے کرام کی خدمت خلق، تواضع و انکسار، ہمدردی خلق کے واقعات پیش کرتے ہوئے موجودہ دور کے صوفیوں کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالی ہے کہ ان بزرگوں اور موجودہ حضرات میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔

۴۷۔ ظفیر الدین مفتاحی:

تاریخی حقائق

(برہان دہلی ۵۴ دسمبر ۳۴۵–۳۵۲)

دوسری قسط۔ شاہ سلیمان تونسوی کے احکام دین و شریعت و ان کے زمانے کے حالات وغیرہ درج ارشادات۔

تنقید، ادب، لسانیات

۴۸۔ ابنِ انشا:

حرفے چند

(ساقی، کراچی، ۵۴ دسمبر ۴۶ – ۴۸)

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition and Individual Talent کو مدارِ بحث بنا کر مضمون نگار نے لکھا ہے کہ گو اُردو غزل میں حسن و عاشقی سے لے کر تاریخ و فلسفہ اور مذہب و سیاست تک ہر قسم کے موضوعوں پر طبع آزمائی کی گئی ہے لیکن اس کی چھاتی پر روایت پرستی کا بہت بڑا بوجھ ہے جس نے انفرادی صلاحیت کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا آگے چل کر، اردو غزل کے خلاف، کئی وہ باتیں دُہرائی ہیں جو ڈاکٹر کلیم الدین احمد کہہ چکے ہیں۔

۴۹۔ ابو اسماعیل الحسین طغرائی:
مترجم سید امیر حسن نورانی

لامیۃ العجم — عربی زبان کا ایک شاہکار قصیدہ

(آج کل دہلی ۵۴ دسمبر ۴۰ – ۴۴)

ابو اسماعیل الحسین طغرائی کے مختصر تذکرہ کے بعد اس کے مشہور قصیدہ کے اشعار ترجمہ کے ساتھ دیے ہیں۔

۵۰۔ ابو اللیث صدیقی:

ولی دلی میں

(ماہ نو کراچی ۵۴ نومبر ۹ – ۱۱، ۴۰)

دلی آنے سے قبل ولی کے یہاں جنوبی ہند کی شاعری اپنے تمام رچاؤ کے ساتھ پائی جاتی تھی، البتہ دلی آنے اور شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے (۱) فارسی کے خیالات کو اپناؤ (۲) دلی کا محاورہ برتو، پر عمل کرنے کے بعد ولی کی غزلیں بہر جہت صاف اور دلکش ہونے لگیں۔ ولی گجراتی کی آمد سے خود دلی کے شعراء نے "نیم ہندی نیم فارسی" طریقۂ شعر کو چھوڑ کر ولی کے انداز میں غزلیں کہنے لگے۔ یوں ولی کے دلی میں آنے سے ولی کے سوا اُردو شاعری کو بھی زبردست فائدہ ہوا۔ ولی گجراتی کے مصنف کا خیال ہے کہ ولی شاہ گلشن سے برہان پور یا احمد آباد میں ملا تھا۔

۵۱۔ جعفر علی خاں:

اردو زبان کی ترتیب نو

(الحمراء لاہور ۵۴ اکتوبر ۱۷۳ – ۱۷۷)

بہ سلسلۂ اشاعت گذشتہ۔ حروف "ش تا ک" کے تحت اردو الفاظ کے معانی معہ تلفظ دیئے گئے ہیں۔

۵۲۔ اثر جعفر علی خاں:

اُردو زبان کی ترتیب نو

(الحمراء لاہور ۵۴ نومبر ۲۲۷ – ۲۲۹)

(مسلسل) اس قسط میں گ، ل، م کے حروف تلفظ اور معنی بتائے ہیں (جاری)

۵۳۔ اثر جعفر علی خاں:

اُردو زبان کی ترتیب نو (آخری قسط)

(الحمراء لاہور، ۵۴ دسمبر ۲۷۴ – ۲۷۷)

اُردو میں مستعمل بعض الفاظ کے صحیح تلفظ یا معانی کی طرف رہنمائی اور بعض غلط ترکیبوں کی طرف اشارہ۔

۵۴۔ اثر صہبائی:

علامہ سید سلیمان ندوی

(الحمراء لاہور ۵۴ نومبر ۲۳۴)

اثر صہبائی کے نام ۸ فروری ۱۹۲۷ء اور ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء کے دو خط ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے میں شعراء کی بے راہ روی، شہرت کوشی، اور محض غزل نویسی کی شکایت کے ساتھ اثر صہبائی کی رباعیات کے پیش نظر ہمت افزائی کی ہے۔ دوسرے میں ان کی بلند اخلاقی کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس مقدمہ کا ذکر ہے جو انہوں نے خمستان (مجموعۂ صہبائی) کے لئے لکھا تھا۔

۵۵۔ احتشام حسین رضوی۔ سید:

اردو تنقید — حالی اور ان کا عہد

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۰ دسمبر ۸ – ۱۵)

حالی کے عہد تک اردو تنقید جس منزل میں تھی اس

کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ حالی کا عہد "تنقید" کے نقطۂ نظر سے آزاد، حالی اور شبلی کا عہد ہے ان کے کارناموں کے تذکرہ سے پہلے اس عہد کی تاریخی، سماجی اور معاشی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ اس عہد نے اردو تنقید کو صرف ایک مضبوط بنیاد ہی نہیں دی بلکہ اس کا دامن قیمتی سرمایہ سے بھی بھر دیا۔ حالی کا عہد پہلی جنگ عظیم کی ابتدا کے ساتھ ختم ہو گیا۔

۵۶۔ اریب:

جان پہچان

(سب رس، حیدرآباد (دکن) ۵۴ء اکتوبر ۲-۴)

مخدوم محی الدین، نصیر الدین ہاشمی اور مصطفیٰ علی اکبر گرامی کا، یکے بعد دیگرے، سرسری تعارف۔

۵۷۔ اسرار احمد سہاروی:

ترقی پسندوں کا اسلامی اور غیر اسلامی ادب

(فاران کراچی ۵۴ء دسمبر ۲۰-۳۰)

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ترقی پسند ادیب اشتراکیت کی گود میں جا پڑے اور آہستہ آہستہ ترقی پسندی اور اشتراکیت مترادف الفاظ ہو کر رہ گیے۔ ان ادیبوں نے خدا کا، مذہب کا اور اخلاقی اقدار کا دل کھول کر مذاق اڑایا لیکن انھیں میں سے بعض شعراء کا ایسا کلام بھی ملتا ہے جو صالح ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے اور جس پر اسلام کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ آخر میں، مضمون نگار نے اپنے نقطۂ نظر سے، پہلی قسم کے ادب کے نمونے بھی پیش کیے ہیں اور دوسری قسم کے ادب کے بھی۔

۵۸۔ اقبال:

مکاتیب اقبال بنام
مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(معارف۔ اعظم گڑھ ۵۴ء اکتوبر ۲۴۹-۳۱۴)

مارچ ۱۹۲۸ء سے ستمبر ۱۹۳۳ء کے ۶ خطوط (۴۲-۴۸) مختلف کتابوں اور مسائل سے متعلق سوالات وغیرہ۔

۵۹۔ اقبال:

مکاتیب اقبال بنام
مولانا سید سلیمان ندوی رح

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء نومبر ۳۹۳-۳۹۶)

(مسلسل) اس قسط میں پانچ خط ہیں۔ ان میں مولانا کے سفر کابل سے متعلق ضروری ہدایات، مسئلہ آن، مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقہ کی پست فطرتی اور آغا خاں کے اچھے مسلمان ہونے کا ذکر ہے۔

۶۰۔ امتیاز علی تاج:

قومی تھیٹر کی ضرورت

(ماہ نو، کراچی ۵۴ء دسمبر ۲۳-۲۵، ۵۶)

ڈرامے سے دلچسپی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ملک میں کسی نہ کسی مقدار میں ڈراما موجود تھا یونان، مصر وغیرہ کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ زیادہ ترقی یافتہ صورت یونان، روم اور پھر انگلینڈ میں ملتی ہے مگر ہند پاکستانی علاقے خصوصاً اردو میں ڈراما اونچے قسم کا نہیں ملتا۔ اردو ڈراما اگر راگ ناٹک (اندرسبھا) کی بجائے کسی معاشرتی کھیل سے شروع ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اب تک اس نے اپنا بلند معیار قائم کر لیا ہوتا۔ امانت، رونق بنارسی وغیرہم اور احسن لکھنوی طالب بنارسی اور آغا حشر وغیرہ کے ہاتھوں درجہ بدرجہ اردو ڈراما ترقی کرتا رہا۔ اور اب امکان ہے کہ غیر پیشہ ور ڈرامہ نگاروں کے ہاتھوں اور اونچا جائے ڈراما کی پسماندگی دراصل غلامی کے سبب تھی۔ آزاد ملک اور آزاد فضا میں حکومت و قوم کی سرپرستی اس کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ آگے بڑھے اور قومی تعمیر میں دوسرے فنون لطیفہ کی طرح مفید ثابت ہو۔

۶۱۔ امین حزیں:

گل و بلبل

(ساقی کراچی، ۵۴ء دسمبر ۹-۱۲)

گل و بلبل کی داستان کے پردے میں شاعرانہ کامیابی

یا ناکامی کی داستان سناتا ہے۔ گل وبلبل کی آڑ محض اس لئے لی جاتی ہے کہ:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

۶۲۔ انصاری۔ محمد رضا:

لکھنؤ میں اُردو اخبار نویسی کی ابتدا

(فروغِ اُردو لکھنؤ ۵۴ء نومبر ۱۱-۲۲)

لکھنؤ میں سب سے پہلا اخبار فرنگی محل لکھنؤ سے طلسم لکھنؤ کے نام سے ۱۵ جولائی ۱۸۵۶ء کو جاری ہوا۔ یہ اخبار غدر میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد محمد یعقوب انصاری مالک و مدیر طلسم نے کارنامہ نکالا جو لگ بھگ ۱۹۰۸ء تک نکلتا رہا۔ طلسم کے تین سال بعد منشی نولکشور نے نولکشور پریس قائم کرنے کے بعد اودھ اخبار جاری کیا۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ جاری کیا جو اپنے مخصوص سیاسی مسلک اور مزاحیہ شاہکاروں کے لئے ممتاز تھا۔ بیسویں صدی کے اخباروں میں عبدالحلیم شرر کا دلگداز اور گلدستہ پیام یار قابل ذکر ہیں۔

۶۳۔ بال مکند عشرؔ:

سچدانند واتسائن

(آج کل دہلی ۵۴ء نومبر ۲۹-۳۳)

سچدانند واتسائن ہندی کے زبردست شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ اس مقالہ میں ان کے ذہنی ارتقا کو دکھلاتے ہوئے ان کے فن کی عظمت محسوس کرائی ہے۔

۶۴۔ برنی۔ ضیاءالدین احمد:

صوبہ بمبئی کے اردو فارسی اور عربی اخبارات

(اُردو، کراچی ۵۴ء، اکتوبر ۶۵-۷۶)

۱۸۶۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان صوبہ بمبئی میں جو اردو فارسی اور عربی اخبارات جاری ہوئے ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کچھ اردو اخبارات سے بطور نمونہ عبارتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

۶۵۔ بریلوی۔ عبادت:

صنفِ غزل

(اُردو کراچی ۵۴ء اکتوبر ۳-۴۴)

مقالہ ہذا صنفِ غزل کی موافقت میں ہے۔ اس میں مخالفین غزل کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غزل ہندوستانی اور ایرانی کلچر کی علمبردار اور مخصوص ہندوستانی ماحول کی پیداوار ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتی ہے بلکہ اس نے ہماری زندگی کے ذہنی، جذباتی، تہذیبی، سماجی اور عمرانی تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی روایت کے اثرات مثنویوں داستانوں اور ناولوں پر ہی نہیں بلکہ مرثیہ اور جدید دور کی نظموں پر بھی پڑتے ہیں۔ مختصر یہ کہ غزل کے اثرات ہمہ گیر ہیں اور یہ ہمارے کلچر کا جزو لاینفک ہے۔

۶۶۔ بشیر الحق دسنوی:

اُردو کے قدیم پروانے

(آج کل دہلی، ۵۴ء، نومبر ۲۳-۲۴)

۱۸۳۹ء و ۱۸۴۸ء کے دو عدالتی پروانوں کی نقل اور بالمقابل ان کا عکس دیا اور بتایا ہے کہ یہ دونوں پروانے قدیم ہیں اور اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔

۶۷۔ بشیر الحق دسنوی:

آبِ رواں

(آج کل ۵۴ء دسمبر ۳۶-۳۸)

حالاتِ شہباز نوشتہ سید افتخار عالم سے شہباز کے مختصر حالات بیان کئے اور ساؤدے کی نظم مترجمہ شہباز موسوم بہ آبِ رواں کو نقل کیا ہے۔

۶۸۔ تابش، لکشمی نرائن، وشششٹ:

رشید یاسمی کا فلسفہ و اخلاق

(برہان دہلی۔ ۵۴ء نومبر، ۲۸-۳۲)

عہدِ حاضر کے مشہور ایرانی شاعر رشید یاسمی کی شاعری سے ان کا فلسفۂ زندگی پیش کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ان

کی شاعری میں رجائیت وقنوطیت کا حسین امتزاج ہے ان کے ہاں ایسا رچا ہوا اخلاق پایا جاتا ہے جس پر زندگی کی پوری عمارت قائم ہے۔ یہاں ان کی اس اخلاقی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ (باقی)

۶۹۔ تابش۔ لکشمی نرائن وششٹ:

رشید یاسمی کا فلسفۂ اخلاق

(برہان دہلی ۵۴ دسمبر ۶۵ ۳۶۳-۳۷۶)

دوسری قسط۔ رشید یاسمی کی اخلاقی شاعری میں ہوشمندی دنیاداری اور رجوش عمل کی خوبیاں ہیں جو انھیں نہ صرف جدید فارسی شعراء میں ممتاز درجہ دلاتی ہیں بلکہ ان کے درخشندہ مستقبل کی طرف اشارہ بھی کرتی ہیں۔ مضمون میں ان کے چند اشعار کی روشنی میں ان کے فلسفہ اخلاق کی توضیح کی گئی ہے۔

۷۰۔ تمنائی:

لوہسون کے ناول

(سالنامہ مشرب کراچی ۵۴ نومبر دسمبر ۵۹-۶۲)

لوہسون (چین کے عظیم ادیب) کے ناولوں اور کہانیوں کی خصوصیات بتائی ہیں۔ لوہسون زبردست انسان دوست اور پرولتاریہ کا قائل ادیب تھا۔

۷۱۔ جعفری۔ سید ضیا:

سرحد میں فارسی شاعری کا ارتقا

(اُردو کراچی ۵۴ اکتوبر ۷۷-۹۱)

صوبۂ سرحد ایرانی حملہ آوروں کے لئے ہندوستان اور ایران کے درمیان ایک منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے یہ خطہ فارسی ادب اور زبان سے کافی متاثر ہوا۔

سرحدی تہذیب میں آج بھی ایرانی تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

مقالے میں سرحد کے ان شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے فارسی میں طبع آزمائی کی تھی اور فارسی شاعری کی عہد بعہد خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

+ + +

۷۲۔ حامد علی خاں:

بامِ رفعت۔ تعارف

(الحمراء لاہور ۵۴ء، اکتوبر ۱۷۹-۱۸۲)

اکادمی پنجاب نے حضرت اثر صہبائی کے کلام کا تازہ ترین مجموعہ "بامِ رفعت" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مقالۂ ہٰذا اس مجموعہ کے لئے بطور تعارف لکھا گیا ہے اس میں اثر صہبائی کے کلام کو تین دور میں تقسیم کرکے ان کی خصوصیات کا فرداً فرداً جائزہ لیا گیا ہے۔

۷۳۔ حسین عباس فطرت:

اُردو ڈراما نگاری کا ارتقائی وتاریخی پس منظر

(آج کل دہلی ۵۴ دسمبر ۲۰-۲۴)

اُردو ڈراما مذہبی پابندیوں اور مصنفین کی عدم توجہی کے سبب اور اصناف ادب (اردو) کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اُردو ڈرامے کی ابتدا امانت کی اندر سبھا سے ہوتی ہے۔ اگرچہ فرخ سیر کے زمانے میں شکنتلا کا ترجمہ ہوچکا تھا اور محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں بھانڈوں اور نقالوں کو مقبولیت حاصل تھی، مگر معلوم مواد کے پیش نظر اُردو ڈراما آگے نہ بڑھ سکا۔ اندر سبھا کے بعد پارسی ناٹک کمپنیوں کے اسٹیج کے ساتھ اردو ڈراما آگے بڑھتا رہا۔ میاں حسینی ظریف، رونق بنارسی، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی اور آغا حشر وغیرہم نے اس کے ارتقاء میں زبردست حصہ لیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو ڈراما ابھی بہت پیچھے ہے اور ضرورت ہے کہ ساری پابندیوں کو ختم کرکے اور ضروری اصلاح و ترمیم کے ساتھ اسے فروغ پانے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

۷۴۔ علیمہ بانو:

نواب لوہارو شاعر کے رنگ میں

(الحمراء لاہور ۵۴ء اکتوبر ۱۹۰-۱۹۱)

فخر الدولہ نواب کپتان اعز الدین احمد خاں نواب لوہارو المتخلص بہ اعظم کے مطبوعہ دیوان نیرنگ اعظم سے جو تقول

راقمہ مضمون ہذا جو کہ نواب مرحوم کی صاحبزادی ہیں اب ناپید ہو چلا ہے، جستہ جستہ اشعار بطور نمونۂ کلام دیے گئے ہیں اور ان کے حالات زندگی مختصراً پیش کئے گئے ہیں۔

۷۵۔ حنیف فوق:

مشرقی پاکستان کے ادیب

(افکار، کراچی، شمارہ ۳۹، ۶۷-۷۰)

مشرقی پاکستان کے مقالہ نگاروں، افسانہ نویسوں اور شاعروں کے مقالوں، افسانوں، نظموں اور غزلوں کا ذکر۔

۷۶۔ حنیف فوق:

انارکلی

(ادب لطیف لاہور ۵۴ دسمبر ۴۷-۵۳)

امتیاز علی تاج کا شاہکار انارکلی اُردو ڈرامائی ادب میں آج بھی سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے وجوہ جہاں حوصلہ شکن حالات، اسٹیج کی نایابی اور اُردو ڈرامانگاروں کی کم توجہی ہیں وہاں اس ادبی تخلیق کی ناقابلِ تقلید خوبیاں بھی ہیں۔ انارکلی میں فن کی بنیادی وحدت کو برقرار رکھا گیا ہے یہ سامنتی دَور کے تضاد کو واضح طور پر پیش کرتی ہے۔ یہ گویا غیر منصفانہ جاگیرداری سماج میں تشنہ کام آرزوؤں کا نوحہ ہے۔ مقالے میں انارکلی، سلیم، اکبر اور دلآرام کے کرداروں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور انھیں فنی نزاکتوں کے علاوہ تاریخی روح سے بھرپور بتایا گیا ہے۔ مقالے میں اس ڈرامے کے کچھ نقائص بھی بیان کئے گئے ہیں مثلاً ڈرامے کا اختتام، زبان و محاورے کی غلطیاں لیکن انھیں معمولی فروگذاشتوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷۷۔ دونی چند شرما:

کانگڑے کے لوک گیت

(آج کل دہلی، ۵۴، اکتوبر ۴۰-۴۴)

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ کانگڑہ کے لوگوں کے جذبات و خیالات، رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کی جھلکیاں ان کے لوک گیتوں میں نظر آتی ہیں۔ لوک گیتوں کے نمونے بھی، اُردو ترجمہ کے ساتھ دیے گئے ہیں۔

۷۸۔ دیوندر ستیارتھی:

پنجاب کے لوک گیت

(آج کل دہلی ۵۴ نومبر ۴۱-۴۲)

پنجاب میں مختلف اقسام کے لوک گیت مقبول ہیں۔ ان لوک گیتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان لوک گیتوں پر مختصر سا تبصرہ کرتے ہوئے چھتنے کے دو گیت معہ اُردو ترجمے کے پیش کئے ہیں۔ پنجاب کے جدید شاعر ان لوک گیتوں سے اپنی شاعری میں استفادہ کر رہے ہیں۔

۷۹۔ راجندر ناتھ شیدا:

گئو دان اور ترقی پسند نقاد

(آج کل دہلی، ۵۴ اکتوبر ۷-۱۴)

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ترقی پسند نقادوں نے گئو دان کو پریم چند کی ترقی پسندی کے ثبوت میں پیش کیا ہے لیکن "گئو دان" میں اس کی کہیں شہادت نہیں ملتی کہ پریم چند کی نظر میں طبقاتی جدوجہد ہمعصر سماجی مسائل کا حل ہے بلکہ ان کا نقطۂ نظر ایک روحانی اور اخلاقی قدروں کے علم بردار انسان دوست کا نقطۂ نظر تھا جو مارکس کے نظریات سے مختلف ہے اور گاندھی جی کی فکریات سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔

۸۰۔ رحمانی عشرت:

آغا حشر کا دَور

(ادب لطیف لاہور ۵۴ دسمبر ۵۲-۵۵)

بعض نقّاد آغا حشر کے ڈراموں کو زندگی سے دور اور مبالغہ آرائی و لفاظی سے بھرپور بتاتے ہیں لیکن وہ آغا حشر کے دَور کو بھول جاتے ہیں جو فنی سنجیدگی کا نہیں بلکہ فن برائے تفنن اور زندگی کی بھونڈی اور بے ڈھنگی نقالی کو فن سمجھنے کا دور تھا آغا حشر نے انھیں روایات کی روشنی میں اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ اسٹیج کو تصنع سے آزاد کرایا۔ مذکورہ بالا اعتراض حشر کے

ابتدائی مطبوعہ ڈراموں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے جو اصل نہیں بلکہ ان کے ڈراموں کے گھٹیا چربے ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے آخری دَور کے ڈراموں میں ادبیت پختگی فن اور فکر کی گہرائی سبھی پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔

۸۱۔ رضا علی وحشت:

بنگال کے چند اُردو شاعر

(ساقی کراچی ۵۴ نومبر ۱۵-۱۷)

ابوالقاسم محمد شمس حافظ قاضی عبدالحمید متخلص بہ حمید اور نواب سید محمد کے مختصر حالات اور نمونہ کلام پیش کرنے کے علاوہ خالد بنگالی سے اپنی ملاقات کا ذکر اور دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش کئے ہیں اور ڈھاکے کے پُرانے لوگوں میں شرف الحسینی شرف کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈھاکا کی غیر شاعر شخصیت حبیب الرحمٰن کا بھی ذکر کیا ہے جو آسودگانِ ڈھاکہ اور ڈھاکہ پچاس برس پہلے کے مصنف ہیں اور اُردو ماہنامہ جادو ڈھاکہ سے نکالا کرتے تھے۔

۸۲۔ رغیب حسین، ایم، اے:

فیضی کا شاہکار "نلدمن"

(معارف، اعظم گڑھ ۵۴ دسمبر ۴۳۹-۴۵۲)

مثنوی "نلدمن" فیضی کا شاہکار مانی گئی ہے۔ عشق و محبت کا یہ ایک جگر گداز کا قصہ ہے جس کو فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں نظم کیا ہے۔ اس میں چار ہزار دو سو اشعار ہیں۔ لاجواب تشبیہیں، نازک استعارے، زبان کی خوش خوئی، پُرگوئی، بیان کی دلکشی، سب نے مل کر اس کے لیے ایک ایسی جگہ پیدا کر دی ہے جس کا ثانی سوائے خسرو کے کلام کے ملنا محال ہے۔ فیضی کی کردار نگاری، خیالات کی بلند پروازی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، جوشِ بیان، محاکات اور جدت طرازی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور مثال میں "نلدمن" سے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

۸۳۔ رمز محمد عثمان:

ادب کی فلسفیانہ بنیادیں

(چراغ راہ، کراچی ۵۴ دسمبر ۲۱-۲۸)

اس مضمون میں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں لکھا گیا ہے "اسلامی ادب منفی طور پر "ادب برائے ادب" کی پیدا کردہ مجہولیت، فراریت، تخیلی جالیت اور رہبانیت کو ختم کرتا ہے نیز "ادب برائے زندگی" کی پیدا کردہ تشکیک، معیشت پرستی، معصیت آموز جنسیت پر وار کرتا ہے اور یہی ادب مثبت طور پر انسانوں کو انسان کی خدائی سے نجات دلاتا ہے، قوم اور قومیت کے چکر سے نکال کر وحدت انسانیت کا درس دیتا ہے اور ادنیٰ دنیوی فوائد سے اداسے استغنا سکھا کر ابدیت اور آخرت کے بلند نصب العین کے لئے فکر کو مائل بہ پرواز کرتا ہے مختصر یہ کہ دنیا اور دنیا کے ہنگاموں کے درمیان اصول زندگی کو فطری اصول دیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح شب تاریک میں مسافر کو مشعل راہ دی جاتی ہے۔

۸۴۔ سجاد سید۔ ڈاکٹر:

اقبال کی شاعرانہ عظمت

(ساقی کراچی ۵۴ نومبر ۸-۱۰)

ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر شدہ تقریر۔ اس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اقبال نے افلاطون کے نظریہ شعر کی عملی تغلیط کی۔ سرسید کی کوشش یہ تھی کہ ہندوستان میں ایسا مسلمان پیدا ہو جس کا دماغ فرنگی اور قلب صحابی کا ہو، سرسید کے اس نقشے کا ایک ہی مسلمان پیدا ہوا اور وہ تھا اقبال۔ اقبال کا کلام دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کا ہم رُتبہ ہے اس کرۂ ارض کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کو اقبال نے نہ چھیڑا ہو۔

وہ گوئٹے کی طرح صرف معلم و مفکر ہی نہیں بلکہ ان کے پیغام میں پیغمبرانہ قطعیت ہے۔

۸۵۔ سراج الحق مچھلی شہری:

مینا بازار مرتبہ ڈاکٹر محمد احمد پر ایک نظر

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ دسمبر ۴۲۳-۴۲۸)

تبصرہ نگار نے مینا بازار مرتبہ ڈاکٹر محمد احمد کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔

۸۶۔ سید اختر رضوی تپش:

تذکرۂ میر حسن سے چند یادداشتیں

(آج کل دہلی ۵۴ دسمبر ۳۹-۴۲)

مسلمان شعراء و اساتذہ اور محسنین اردو ادب کے ساتھ ہندو شعراء، اساتذہ اور محسنین کے نام گنائے اور ان کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ چند لطیفے اور دلچسپ واقعات بھی پیش کئے ہیں۔

۸۷۔ سلیم احمد:

افسانوی ادب

(ساقی، کراچی، ۵۴ دسمبر ۶۱-۶۴)

اردو افسانوی ادب کا سرسری جائزہ اور کئی افسانہ نویسوں کی فنی خصوصیتوں کی طرف ہلکے اشارے۔

۸۸۔ سمندر خان:

افضل صدیقی

(ساقی، کراچی، ۵۴ دسمبر ۵۵-۵۸)

پشتو زبان کے شاعر سمندر خاں سمندر کئی انگریزوں کے ہاں بحیثیت "بیرا" ملازم رہ چکے ہیں۔ انھیں میں سے ایک کرنل ہکسن ہیں جنھوں نے سمندر خاں کے عادات و اطوار سے متعلق ایک مضمون "ورلڈ وائڈ" میگزین (فروری ۱۹۵۴ء) میں لکھا ہے۔ یہی مضمون اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

۸۹۔ سید عبداللہ:

تقلید میر ـــ یا شارع عام؟

(ماہ نو، کراچی ۵۴ دسمبر ۹-۱۴، ۵۴)

زمانہ (بلا لحاظ دور و عصر) میر کی عظمت کا ہمیشہ معتقد و معترف رہا ہے۔ نقادوں نے میر کی عظمت کے ایک ایک گوشے کو تلاش کیا اور سراہا ہے۔ شاعروں نے محسوس داد کے طور پر کبھی میر کی زمین اختیار کی، کبھی ردیف و قافیہ کو اپنایا اور کبھی میر کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ ایک طریقہ یہ بھی برتا کہ میر کے سوز و گداز اور رچاؤ کو اپنی شاعرانہ کاوشوں میں سمو لینا چاہا۔ چنانچہ میر کے تتبع کی رسم جدید زمانے کی طرح پرانے زمانے میں بھی ایک محبوب رسم تھی۔ میر کے معاصرین سے قطع نظر قائم، سوز و بیان سے لے کر غالب و شیفتہ اور موجودہ زمانے کے شاعروں تک کئی ایک نے میر کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس عام تتبع کے باوجود تقلید میر شارع عام نہیں بنی۔ میر کا اسلوب، مفہوم، گدازی اور الفاظ کا چناؤ اور رچاؤ میر ہی کا حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ کو میر کی ضرورت یقیناً ہے لیکن یہ ضرورت تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی جذبہ و انفرادی رنگ اور ریاض سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ویسے میر کے مقلدین میں بعض جدید شاعر خاصے کامیاب ہیں۔

۹۰۔ شجاع احمد:

پاکستانی قومیت اور زبان کا مسئلہ

(ساقی کراچی ۵۴، اکتوبر ۱۵-۲۳)

مغربی مفکرین کے خیالات پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ قومیت کے اجزا کیا ہیں اور پاکستان میں انتظامی وحدتوں کے لئے جو تحریکیں اٹھی ہیں ان کا جائزہ لیکر انھیں پاکستان کے حق میں ہلاک ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پاکستانی قومیت کے لئے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۹۱۔ شمشیر سنگھ نرولا:

پنجاب کی لوک کہانیاں

(ہندستانی ادب، حیدرآباد (دکن) ۵۴، اکتوبر ۲۰-۲۳)

اہل پنجاب کے لئے لوک کہانیاں نہ صرف تفریح و مسرت کا سرچشمہ ہیں بلکہ ان میں زندگی کی لگن اور نت نئی امنگیں پیدا کرنے کا موجب بھی ہیں۔ ان میں سے کئی کہانیوں کے مآخذ "رگ وید" اور "مہابھارت" ہیں اور بعض کے "پنچ تنتر"

اور "جاتک"۔ نمونہ کے طور پر تین کہانیاں بھی دی گئی ہیں۔

۹۲۔ شوکت سبزواری:

اقبال کا نظریۂ شعر

(آج کل دہلی ۵۸ دسمبر ۹-۱۳)

اقبال کے خیال میں شعر ایسا ئی مفہوم کا نام ہے جو خیال بھی ہو سکتا ہے اور جذبہ بھی، سوچی ہوئی رائے بھی ہو سکتی ہے اور باطن میں محسوس کیا ہوا احساس بھی۔ شعر آرٹ کا ایک شعبہ ہے جس کا رشتۂ سخن دل کی طرف ہے شعر کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے۔ شاعری کو غالباً عام مفہوم میں لیا ہے اور شاعری کو برائے شاعری پسند نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک تخلیق شعر ایک شعوری عمل ہے جس میں سوزِ دل کی ضرورت ہے۔

۹۳۔ شیخ احمد:

پیر و مرید

(فاران کراچی ۵۸ دسمبر ۹-۱۹)

"بالِ جبریل" کی ایک نظم "پیر و مرید" کی شرح۔

۹۴۔ صفی حیدر دانش:

تشبیہات اور استعارے کلام اقبال میں

(ساقی کراچی ۵۸ نومبر ۵۳-۵۶)

اقبال کی بیانیہ شاعری میں مناسب مواقع پر موثر و نادر تشبیہات کی کمی نہیں خصوصیت کے ساتھ وہ مقامات جہاں منظر کشی کی گئی ہے۔ اقبال کی تشبیہوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان وجہ شبہ کا انتخاب سلسلہ واقعات کے پس منظر، محل گفتار اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں ان کی تشبیہوں میں دلکش مماثلت ہی نہیں بلکہ معنوی توضیح اور ایک تشریحی انداز بھی ہوتا ہے۔ اقبال نے تین قسم کے استعارے استعمال کئے ہیں ایک وہ جو کلاسیکی ادب سے مستعار لئے دوسرے وہ پرانے استعارے جو جدید تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں اور تیسرے وہ استعارات جو بار بار کے استعمال سے جامعیت و معنویت کا دفتر بن کر علائم کا کام دیتے ہیں اور صرف انھیں کے کلام سے مخصوص ہیں۔

۹۵۔ عبدالسلام رام پوری:

اقبال کی ریاست

(معارف اعظم گڑھ ۵۸ اکتوبر ۲۴۵-۲۶۲)

مندرجہ بالا عنوان سے یہ مقالہ رضا ڈگری کالج رام پور میں جنوری ۵۸ء میں پڑھا گیا۔ اس میں، ریاست سے متعلق اقبال کے افکار و اشعار سے ان کے تصورات پیش کئے ہیں کہ اس بارے میں اقبال کا نظریہ کیا تھا۔ شروع میں اقبال کے سیاسی تصور کا تاریخی تسلسل بیان کیا ہے، جس میں روسو۔ ہیگل، کانٹ، نٹشے وغیرہ کے خیالات پیش کرتے ہوئے اقبال کی ریاست کے بنیادی عناصر کی تشریح کی ہے، اقبال نے عہد نبوت، خلافت راشدہ کے عملی نمونوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور مغربی فلسفیوں کے افکار سے بھی، پھر آگے چل کر اقبال کے کلام سے ان کے افکار و خیالات کی وضاحت کی ہے۔ (باقی)

۹۶۔ عبدالسلام رامپوری:

اقبال کی ریاست

(معارف اعظم گڑھ ۵۸ نومبر ۳۲۵-۳۴۴)

۲۔ اقبال کے کلام سے مدد لیتے ہوئے دکھایا ہے کہ اقبال کا نظریۂ ریاست اسلامی ریاست سے الگ نہیں ہے۔

۹۷۔ عرشی:

رنگا رنگ یادیں

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۸ اکتوبر ۲۹-۳۶)

کچھ ملاقاتوں اور کچھ بھولی بسری باتوں کا ذکر۔

۹۸۔ فاروقی، خواجہ احمد:

عہد مصحفی کے ادبی رجحانات

(برہان دہلی ۵۸ دسمبر ۳۵۳-۳۶۴)

مصحفی نے تین تذکرے لکھے ہیں۔ تذکرہ ہندی

ریاض الفصحا اور عقد ثریا۔ ان کے تذکیرے اپنی چند خامیوں کے باوجود، اس زمانے کی فضا اور ادبی معیار کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں مضمون میں ان تذکروں کی روشنی میں ان کے زمانے کی ادبی محفلوں اور ان کے معیار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے علاوہ مصحفی کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جو ان کے عہد کی معاشی زبوں حالی کی عکاسی کرتے ہیں۔

۹۹۔ فضا جالندھری:

دل شاہجہانپوری کی اصلاحیں اپنے کلام پر

(الحمرا لاہور ۵۴ نومبر ۲۴)

دل شاہجہانپوری کے دس شعر اور پھر ان پر انہیں کی اصلاحیں اصلاح شدہ اشعار کے ساتھ پیش کی ہیں۔ اصلاحوں سے شعر بلند ہو گئے ہیں۔

۱۰۰۔ قاضی عبدالغفار:

مشاعروں کی اصلاح کیجئے

(سالنامہ مشرب کراچی ۵۴ نومبر دسمبر ۱۵)

مشاعرے ادب و تہذیب کے سنوارنے میں زبردست حصہ لیتے ہیں، مگر موجودہ زمانے میں ان کا معیار گر گیا ہے۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ مشاعروں کے پچھلے آداب محفل کو اختیار کیا جائے۔

۱۰۱۔ گشن پرشاد کول:

خطبہ صدارت

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ نومبر ۴۲- ۴۵)

گذشتہ سے پیوستہ: اس خطبۂ صدارت کی قسط جو بہار ریاستی اردو کنونشن میں پڑھا گیا تھا، اس قسط میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اردو کو عام فہم بنانے کے لئے فارسی و عربی کے جمع بنانے کے قاعدوں کو ترک کرنا چاہیئے اور ہندی کے وہ الفاظ لے لینے چاہئیں جو آسانی سے اردو میں کھپ سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ اردو کی توسیع و اشاعت کے لئے اردو کی معیاری مقبول و دلچسپ کتابوں کو علاوہ فارسی رسم خط کے ناگری بلکہ رومن رسم خط میں بھی شائع کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ نیز اردو حروف تہجی میں جو فالتو حروف ہیں ان کو ترک یا خارج کر دیا جائے۔ (باقی آئندہ)

۱۰۲۔ گوپی چند نارنگ:

اُردو غزل اور ہندوستانیت

(آج کل دہلی ۵۴ نومبر ۳۵-۴۰)

مجموعی طور پر اُردو ادب اس مشترک ہند ایرانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جس کی داغ بیل مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد پڑی۔ اُردو غزل اُردو ادب کی باقی تمام اصناف میں ایرانی شاعری سے نسبتاً قریب ہے، بلکہ ایرانی الاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کا پورا پورا حوصلہ رکھتی ہے اور "ہندوستانیت" سے تہی دامن نہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی طرح غزل میں بھی اصلیت و تخیل کی، مادیت و روحانیت کی ایک حسین آمیزش ملتی ہے۔ (باقی)

۱۰۳۔ گوپی چند نارنگ:

اُردو غزل اور ہندوستانیت

(آج کل دہلی ۵۴ دسمبر ۳-۶)

(۲)

اُردو غزل میں مذہب کی روایتی بندشیں موم کی طرح پگھل کر بے جان ہو گئی ہیں۔ اور باہمی اخوت کے اس غلو میں فرقہ وارانہ عناد خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا ہے۔ بت کدے کی تصویر اور حرم کے خاکے میں جو بنیادی وحدت ہے، اُردو غزل اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور تلاش حسن و حق کا یہ وہ فلسفۂ زندگی ہے جو ہندوستان کی وحدت پسند روح سے پوری پوری ہم آہنگی رکھتا ہے۔

۱۰۴۔ محمد احسن فاروقی:

ناول نگاری اور جدید دور کی زندگی

(ساقی کراچی ۵۸ اکتوبر ۵۹۔۳۴)

مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید دور کی زندگی ناول کے لئے دلچسپ موضوعات مہیا نہیں کر سکتی اس لئے جدید ناول نگار کو چاہیے کہ وہ جدید بدلتی ہوئی زندگی چھوڑ کے بغیر ایک مستقل زندگی کے نقوش سامنے لائے اور اس کے لئے اسے ماضی کی مستقل و مربوط زندگی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔

۱۰۵۔ محمد احسن فاروقی:

ادبی حقیقت

(فروغ اردو، لکھنؤ، ۵۸ دسمبر ۱۶۔۱۹)

ادیب دیکھتا وہی ہے جو مورخ یا صحافی دیکھتا ہے مگر اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو وقت، مقام اور حالات سے بالاتر لے جاکر ایک ایسی شکل دیدے جو آفاقی تجربے سے ہم آہنگ ہو۔

۱۰۶۔ محمد احمد صدیقی:

مینا بازار کا مصنف

(معارف اعظم گڑھ ۵۸ نومبر ۳۷۵۔۳۹۲)

مئی ۵۸ء کے معارف میں مقالہ نگار نے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے مینا بازار کو ظہوری کی تصنیف بتایا تھا۔ اس کا جواب ڈاکٹر نذیر احمد نے معارف ۵۸ جولائی و اگست میں دیا۔ اور اسی جواب سے متعلق یہ مقالہ پیش نظر ڈاکٹر صدیقی نے لکھا ہے، اور اس میں استدلال کرتے ہوئے اپنی رائے کو درست بتایا ہے۔

۱۰۷۔ محمد شفیع:

قصہ وامق و عذرا عنصری کے متعلق کچھ تحقیقی مواد

(ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین ۵۸ اگست و نومبر ۱۔۸۰)

(۱) وامق و عذرا کا قصہ یونانی ہے، جسے عنصری نے بحر متقارب (فارسی) میں لکھا تھا۔ فارسی اور ترکی میں اس کے علاوہ کئی اور شعراء نے بھی اس کو لکھا اور نظم کیا ہے۔ ان کا تذکرہ اس مضمون میں ملتا ہے۔

۱۰۸۔ محمد صادق ڈاکٹر:

"توبۃ النصوح" اور اس کا ماخذ

(ماہ نو کراچی ۵۸ نومبر ۱۲۔۱۶)

اپنے مضمون: "نذیر احمد۔ ایک جائزہ" مطبوعہ ماہ نو بابت مئی ۱۹۵۸ء میں مقالہ نگار نے بتایا تھا کہ نذیر احمد کا مشہور ناول "توبۃ النصوح" پلاٹ انگریزی مصنف ڈینیئل ڈیفو کی تصنیف "دی فیملی انسٹرکٹر" مطبوعہ ۱۷۱۵ء کے پہلے حصے سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب ۱۷۱۵ء میں پہلی اور آخری مرتبہ چھپی، چنانچہ کمیاب ہے۔ اس کی ٹائپ شدہ نقل گورنمنٹ کالج لاہور کے کتب خانہ میں ہے۔ متعلقہ حصہ کے مکالمے بھی ضرور تا دئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے یہاں بھی بہت کچھ ڈیفو سے لیا ہے۔

۱۰۹۔ محمد صادق ڈاکٹر:

"توبۃ النصوح" اور اس کا ماخذ

(ماہ نو کراچی ۵۸ دسمبر ۱۵۔۱۷)

۲۔ پہلی قسط نومبر کے شمارہ میں چھپ چکی ہے جس میں مقالہ نگار نے دکھایا تھا کہ توبۃ النصوح ڈی فو کے ناول "دی فیملی انسٹرکٹر" پر مبنی ہے۔ اس قسط میں ڈیفو کے ناول کے دوسرے حصے کے پانچ مکالموں کا خلاصہ دیا ہے۔ حسب سابق یہاں بھی زبردست مماثلت پیدا ہے۔ تاہم توبۃ النصوح ڈی فو کے ناول سے ماخوذ سہی، لیکن اپنے پلاٹ کی ترتیب و تشکیل میں نذیر احمد نے آزادی سے کام لیا ہے۔ کئی واقعات نظر انداز کئے اور چند نہایت اہم اور دلکش اجزا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہی حال کرداروں کا ہے۔ دونوں کتابوں کے تقابل کے علاوہ اس مقالہ سے بھی نذیر احمد کا ماخذ معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ توبۃ النصوح

ڈی فو کے ناول سے بغایت بہتر اور بلند ہے۔

۱۱۰۔ مختار الدین احمد ڈاکٹر:۔

ایک خط اور ایک غزل

(الحمرا لاہور، ۵۴ء دسمبر ۲۹۸-۲۹۹)

کتب خانہ بوڈلین آکسفورڈ میں اوزلے ( ) کے ذخیرہ کتب میں دوسرے خطوں کے علاوہ، اردو کا ایک خط ہے جو بظاہر کسی نے اوزلے کو لکھا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کی بالکل ابتدا کا ہے اور، جہاں تک مضمون نگار دریافت کر سکے ہیں، ایک خط کے استثنا کے ساتھ یہ اُردو کا سب سے قدیم خط ہے۔ اسی کتب خانے کے ذخیرۂ ایلیٹ میں مضمون نگار نے میر غلام حیدر رونق عظیم آبادی کا دیوان دیکھا ان کی ایک غزل نقل کی ہے۔

۱۱۱۔ مختار الدین احمد ڈاکٹر:

تذکرۂ یادگار ضیغم

(آج کل دہلی ۵۴ء دسمبر ۱۹-۲۴)

یادگار ضیغم اُردو شعرا، کا ایک مطبوعہ لیکن کم یاب تذکرہ ہے جو تیرھویں صدی کے تقریباً اختتام پر لکھا گیا ہے اور جس میں اس صدی کے نصف آخر کے بہت سے مشہور اور ممتاز شعراء کے علاوہ بیشتر ایسے شعراء کے حالات اور اشعار بھی درج ہیں جن کا ذکر دوسرے ماخذ میں نہیں یا کم ملتا ہے، اور جو بعض حیثیتوں سے قابل قدر ہیں۔ اس کے مؤلف محمد عبداللہ خاں ضیغم ہیں۔ اس تذکرہ کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ بیشتر شعراء کی تصویریں بھی اس میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ مدت تحریر ۱۲۹۸ تا ۱۳۰۲ھ ہے۔ ۲۴۰ صفحات تک تذکرہ اور پھر ۲۳ صفحوں کا خاتمہ ہے۔ جن شعراء کی تصویریں درج تذکرہ ہیں، ان کے مختصر حالات لکھے ہیں، ان کی تعداد ۷۷ ہے۔

۱۱۲۔ مدن گوپال:

"ڑ"

(نیا ہند الہ آباد ۵۴ء دسمبر ۲۸۵-۲۹۳)

کھڑی بولی میں مروجہ حرف "ڑ" پر مشتمل تقریباً ۷۰۰ الفاظ کی فہرست دی گئی ہے اور چونکہ آریوں کے ہندوستان آنے سے پہلے ان کی زبان سنسکرت میں حرف "ڑ" کا وجود نہیں ملتا اس لئے اس بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کھڑی بولی آریائی زبان نہیں بلکہ دراوڑی زبان ہے۔

۱۱۳۔ مسیح الزماں:

ایک زمین میں دو استاد

(سالنامہ مشرب کراچی ۵۴ء نومبر و دسمبر ۳۴-۳۹)

"ہائے حسین"۔ "فدائے حسین" کی زمین میں سودا اور میر دونوں نے مرثیے کہے اور غالباً اولیت سودا کو حاصل ہے۔ تاہم درد و اثر میر کے ہاں زیادہ ہے۔ ویسے میر نے کربلا کے درد انگیز واقعات کو موضوع بنایا ہے اور سودا نے امام حسین کے صبر و استقلال اور قربانی کو مرثیہ میں اپنایا ہے۔ اگر ان دونوں استادوں کے مراثی دستیاب ہو جائیں تو غزل، قصیدہ اور مثنوی کی طرح مرثیہ میں بھی انکے متعلق تقابلی رائے دی جا سکتی ہے۔

۱۱۴۔ ممتاز حسین:

رمز و کنایہ

(آج کل دہلی ۵۴ء نومبر ۴-۹)

اپنے ایک مضمون "غزل یا شاعری" میں رمزیہ انداز بیان کے بعض کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ اس مضمون میں رمزیہ اندازِ بیان کے محاسن دکھائے ہیں تاکہ زندگی اور فن کی صداقت کا باہمی رابطہ روشن ہو کر سامنے آ جائے۔ ان کا مقصد محض مخالفت یا محض حمایت نہیں ہے۔ اندازِ بیان اور وہ بھی شعری اندازِ بیان اپنا ایک روایتی پس منظر رکھتا ہے۔ شاعر الفاظ کے محدود معنوں سے بلند ہو کر زندگی،

سماج اور تاریخ کے شعور کے ساتھ انھیں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان میں ہمہ گیریت پیدا ہو جاتی ہے، انفرادیت سے ہٹ کے اجتماعیت کی شان نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کے انداز بیان میں تصور آفرینی اور جذبہ آفرینی لازمی جزو ہیں۔ غزل کی رمزیت محدود ہونے کے باوجود اہمیت رکھتی ہے اور وہ بیانیہ نظموں میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کر سکتی ہے اور عظیم شاعری تب ہی ممکن ہے۔

۱۱۵۔ نجم الحسن صدیقی:

جگن ناتھ آزاد کی شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۴ ۵ نومبر ۲۶-۲۹)

دوسری قسط۔ پہلی قسط فروغ اردو ستمبر ۶۵ء میں چھپی تھی۔ اس قسط میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ستاروں سے ذروں تک ان کے پہلے مجموعہ بیکراں سے فنی و فکری ہر حیثیت سے بہتر ہے اور یہ بتایا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کا شمار عہد حاضر کے اچھے غزل گو شعراء میں کیا جا سکتا ہے (باقی آئندہ)

۱۱۶۔ نجم الحسن صدیقی:

جگن ناتھ آزاد کی شاعری

(گذشتہ سے پیوستہ)

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۴ ۵ دسمبر ۲۸-۲۹)

جگن ناتھ آزاد کی غزلوں کی خصوصیت ان کی تاثیر اور کسک ہے۔ ان میں ایک مخصوص، صداقت پر مبنی حزن ہے۔

آزاد کی شاعری ابھی اپنے ارتقائی دور میں ہے لیکن "بیکراں" اور "ستاروں سے ذروں تک" میں جو فرق ہے اس سے یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری ابھی اور ترقی کرے گی۔

+ + +

۱۱۷۔ نعیم صدیقی:

سورہ شعراء، اسلامی شاعری اور تغزل

(چراغ راہ، کراچی ۶۴ ۵ دسمبر ۱۵-۲۰)

ایک استفسار کے جواب میں والشعراء یتبعہم الغاؤن ... (سورۂ شعراء آخری رکوع) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہاں نفس شاعری زیر بحث نہیں بلکہ شعراء خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔"

۱۱۸۔ ہاشمی نصیر الدین:

کچھ داغ کے متعلق

(سب رس، حیدر آباد (دکن) ۶۴ ۵، اکتوبر ۲۴-۲۸)

حیدر آباد میں داغ کی فرودگاہ ترپ بازار میں تھی انھیں کبوتروں کا بے حد شوق تھا۔ قسم قسم کے کبوتر پال رکھے تھے۔

۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ نماز جنازہ عید الاضحیٰ کے دن مکہ مسجد میں پڑھی گئی اور درگاہ یوسفین میں مدفون ہوئے۔

۱۱۹۔ ہنسراج رہبر:

اکبر تاریخی پس منظر میں

(سالنامہ مشرب کراچی ۶۴ ۵ نومبر و دسمبر ۱۲۸-۱۴۹)

اکبر اپنے خیالات کو سوچ سمجھ کر عملی جامہ پہناتے تھے اور طنز و مزاح سے کام لیتے تھے۔ مگر وہ اپنے فن کو محض تفریح کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کیلئے شعوری ارادہ سے استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مقالہ نگار نے اکبر کی شاعری کا تاریخی پس منظر دکھاتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ زمانے کے مسائل کا صحیح شعور رکھتے تھے اور غلط رجحانات پر کڑی تنقید کرتے تھے البتہ ان کا طریقۂ فکر جاگیردارانہ تھا۔

آرٹ

۱۲۰۔ ابوظفر ندوی سید:

شیدی سعید کی مسجد (احمد آباد)

(برہان، دہلی، ۵۴ء اکتوبر ۷ ۔۱۹۷ - ۲۰۵)

شیدی سعید متوفی ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء کے حالات زندگی ان کی بنوائی ہوئی مسجد (احمد آباد) کی تاریخ اور اس مسجد کی نادر روزگار دیمیوں کو تراش کر بنائی ہوئی جالیوں کا حال۔

۱۲۱۔ الطاف گوہر:

ڈھاکہ میں مصوری کی نمائش

(ماہ نو کراچی ۵۴ء نومبر ۲۰۔ ۲۱، ۵۰)

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مصوری کی کئی نمائشیں ہوئیں لیکن سب سے بڑی نمائش ڈھاکہ میں ہوئی جو وسط اگست سے وسط ستمبر تک ہوئی۔ اس پاکستان کی نمائش میں سبھی مصوروں نے حصہ لیا۔ مقالہ ھٰذا میں اسی نمائش کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

۱۲۲۔ صدیقی محمد یٰسین:

باپ کے حضور میں بیٹی کا نذرانہ عقیدت

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۴ء نومبر ۲۳۔ ۲۵)

آگرے کے مقبرۂ اعتماد الدولہ کی تعمیری خوبیوں کا ذکر۔ اس حسین و مرصع عمارت کو نورجہاں نے اپنے باپ مرزا غیاث بیگ جن کو جہانگیر نے اعتماد الدولہ کا خطاب عطا کیا تھا، کی یاد میں بنوائی ہے۔

معاشرتی حالات

۱۲۳۔ درگا بائی دیشمکھ:

مترجم: حیدر حسین موسوی

ہندوستان میں عورتوں اور بچوں کی قانونی حیثیت

(آج کل دہلی ۵۴ء نومبر ۱۶۔ ۱۸)

ہندو سماج میں عورت کی زبون حالی کے تذکرہ کے بعد تاریخی اعتبار سے دکھایا ہے کہ عورتوں اور بچوں کے کے لئے قانونی طور پر حکومت کیا کچھ کرتی رہی ہے اور "سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ" کی خوش آئند کارگزاری کا ذکر کیا ہے۔

+ + +

تعلیمات

۱۲۴۔ آمنہ ممتاز:

چھوٹے بچوں کی تعلیم

(ساقی کراچی، ۵۴ء اکتوبر ۳۷۔ ۳۸)

چھوٹے بچوں کی تعلیم کی افادیت و ضرورت پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ایک کامیاب ابتدائی مدرسہ کی بنیاد صحیح نفسیاتی اصولوں کے مطابق عمل اور دستکاری پر رکھی جائے۔

۱۲۵۔ محمد احمد:

ارباب علم و نظر کے لئے

لمحۂ فکریہ

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ء دسمبر ۲۱۔ ۲۲)

مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم اور نصاب سے متعلق توجہ دلائی گئی ہے۔

نسائیات

۱۲۶۔ احمد قادری سید (مترجم)

عورتوں کا ایمانی عہد نامہ

امام ربانی کا مکتوب ایک صالحہ کے نام

(الفرقان، لکھنؤ ۵۴ء اکتوبر ۳۹۔ ۴۴)

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک مکتوب (۴۱۔ ج ۳) کا ترجمہ جس میں آیہ کریمہ:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ الخ

(سورۂ ممتحنہ آیت ۱۲) کی تفسیر ہے۔

+ + +

۱۲۷۔ حسین خان:

پاکستان میں آزادیٔ نسواں کی مہم

(چراغ راہ، کراچی ۱۶، ۱۰ اکتوبر ۶۲ء، ۱۶-۱۷)

پاکستان میں آزادیٔ نسواں کی مہم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے ملک و قوم کے لئے مہلک ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فلسفہ

۱۲۸۔ معصومی صغیر حسن:

کندی کا فلسفہ

(معارف اعظم گڑھ ۹۰، ۴، اکتوبر ۶۲ء، ۲۷۲-۲۸۳)

معارف جون ۶۳ء میں ڈاکٹر میر ولی الدین نے کندی پر ایک مقالہ لکھا تھا موصوف کا مقالہ تاریخ الحکما، طبقات الاطباء، اور فلاسفۃ الاسلام کی روشنی میں ترتیب پایا ہے اور نئی تحقیقات پر مشتمل نہیں ہے مضمون نگار نے اپنے مضمون میں نئے مصری مستشرق عبدالباری ابوریدہ کے شائع کردہ "رسائل الکندی الفلسفیہ" کا تعارف کرایا ہے اس سے کندی سے متعلق بہت سے پرانے نظریوں کا ابطال ہو جاتا ہے۔ (باقی)

۱۲۹۔ معصومی صغیر حسن:

کندی کا فلسفہ

(۲)

(معارف اعظم گڑھ ۹۰، ۵، نومبر ۶۲ء، ۳۴۷-۳۶۱)

کندی کے فلسفہ کی یہ دوسری قسط ہے۔ اس میں مضمون نگار نے دین اور فلسفہ، عالم، صفات باری تعالیٰ، کندی اور ارسطو، کندی اور افلاطون، کے عنوانات قائم کر کے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے آخر میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی بعض فروگزاشتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ چونکہ ان کے سامنے کندی کے موجودہ رسائل نہیں تھے اس لئے ان کے مضمون میں بعض فروگزاشتیں ہیں۔ اور انھیں رسائل کی روشنی میں مستشرقین یورپ کے مضامین کی تصحیح کی۔

وفیات

۱۳۰۔ معین الدین احمد ندوی:

رفیع احمد قدوائی مرحوم

(معارف اعظم گڑھ ۹۰، ۵ نومبر ۶۲ء، ۳۲۲-۳۲۳)

رفیع احمد قدوائی مرحوم کی موت ہندوستان کا اتنا بڑا قومی حادثہ ہے کہ اس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی۔ ان کی طبیعت ایک عرصہ سے خراب تھی مگر کام کی دھن کے سبب ڈاکٹروں کے مشورہ کے باوجود آرام نہیں کیا۔ چنانچہ کثرت کار اور مسلسل مشغولیت کے باوجود جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ ان کی پوری زندگی ملک و قوم کی بے لوث خدمت میں گذری۔ اپنے منصب سے ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حالانکہ دوسروں کو ضرور فائدہ پہنچایا۔ ان کی بے تعصبی کے جن سنگھ وغیرہ بھی قائل تھے۔

انھوں نے دار المصنفین کو بھی امداد دی تھی۔

متفرقات

۱۳۱۔ آباد شاہپوری:

تونس

(چراغ راہ، کراچی ۱۶، ۵، نومبر ۶۲ء، ۲۴-۲۸)

تونس کے جغرافیائی و تاریخی حالات پیش کئے گئے ہیں اور وہاں کی تحریک آزادی خصوصاً دستور پارٹی کا جائزہ لینے کے علاوہ وہاں کی دینی اور اقتصادی حالت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳۲۔ ادارہ:

بین الاقوامی تجارت کیسے ہوتی ہے

(چراغ راہ، کراچی ۱۶، ۴، اکتوبر ۶۲ء، ۲۱-۲۴)

بین الاقوامی تجارت کا اصول کیا ہے اسے تشریح

کیسے کہتے ہیں، وہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے، فارن مارکیٹ کیا ہے، اسٹرلنگ ایریا اور ڈالر ایریا کسے کہتے ہیں، ان سب باتوں کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۳۳۔ سعید اختر درانی:

چند روز آغوشِ فطرت میں

(الحمراء لاہور ۵۴ء نومبر ۲۱۳ - ۲۲۵)

۳۔ قیام انگلستان کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ پہنچے پر وہاں کی مشہور تاریخی عمارات اور دوسری ایسی ہی چیزوں کا معلوماتی حال لکھا ہے (جاری)

۱۳۴۔ صالحہ عابد حسین:

کچھ دن المانیہ میں

(آج کل دہلی ۵۴ء دسمبر ۳۰ - ۳۵)

اپنے سفر جرمنی (جون ۱۹۵۴ء) اور وہاں کے قیام کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جرمنی کے لوگ اخلاق و سیرت اور ایمانداری و ہمت کے لحاظ سے ہر جہت اچھے اور قابل تقلید ہیں۔

۱۳۵۔ کوثر تسنیم:

جمہوریۂ ہند میں فلموں کا ماضی اور مستقبل

(آج کل دہلی ۵۴ء نومبر ۴۵ - ۴۷)

جمہوریۂ ہند میں فلموں کا "انڈسٹری" اور "فن" کے لحاظ سے جائزہ لیا اور مشورہ دیا ہے کہ فلموں کو ہندوستانی زندگی اور اس کے مسائل سے قریب ہونا چاہیے۔

۱۳۶۔ مائل نقوی:

بھوپال تال اور رانی کملاپتی

(آج کل دہلی ۵۴ء دسمبر ۲۹ - ۳۹)

بھوپال تال اور رانی کملاپتی کا تذکرہ، تاریخ کی روشنی میں علیحدہ علیحدہ پیش کیا ہے۔

۱۳۷۔ محمد حمید اللہ ڈاکٹر:

کیمبرج کی موتمر مستشرقین عالم

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء دسمبر ۴۵۳ - ۴۶۰)

موتمر مستشرقین عالم کا تیئیسواں اجلاس ۲۱ تا ۲۸ اگست ۱۹۵۴ء کیمبرج میں منعقد ہوا۔ تقریباً نو سو نمائندوں کے اجتماع کے باعث کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس کی سرکاری ترتیب یہ تھی:

(۱) مصریات (۲) سامی لسانیات (۳) اشوریات (۴) ایران آرمینیا، وسطی ایشیا (۵) آلتائی (ترکی) السنہ (۶) ترکیات (تاریخ) (۷) ہندیات، (۸) مشرق بعید (۹) (ا) اسلام (السنہ، ادبیات و فنون لطیفہ) (ب) اسلام (تاریخ و مذہب) (۱۰) مشرق و مغرب کا تماس اور مشرقی ممالک کی عیسائیت (۱۱) افریقہ۔

آخر میں، مقالات کے ایسے ساٹھ عنوانوں کا ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے جو بالفاظ مضمون نگار معارف کے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

✣ ✣ ✣

تبصرے

۱۳۸۔ ادارہ:

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

(برہان دہلی ۵۳ء نومبر ۱۲)

اسلام کسی خاص فرقے یا گروہ یا کسی ایک مخصوص ملک و قوم کا نام نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کا صالح ترین نظام اجتماع و زندگی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اصل عربی کتاب کا اردو قالب ہے مگر ترجمہ نہیں، یہ کتاب صرف مسلمانوں کے پڑھنے کی نہیں

بلکہ عمرانیات، اجتماعیات کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت للعہ، پتہ۔ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

۱۳۹۔ ادارہ:

چند نظمیں۔ از پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی

(برہان، دہلی ۴۷ء نومبر، ۶۱)

اس مجموعہ میں موصوف کی چند نظمیں ان کے تازہ کلام سے منتخب کر کے جمع کی گئی ہیں۔ یہ نظمیں قومی، وملکی اور سماجی و معاشرتی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں ازلی شاہکار بھی ہیں اور سبق آموز دعبرت آفرین بھی ان کا مطالعہ ہر ایک اردو داں کو کرنا چاہیئے۔ قیمت ایک روپیہ۔ پتہ۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

۱۴۰۔ ادارہ:

جمال الدین افغانی، مصنف ضیاء الدین احمد برنی۔

(سالنامہ مشرب کراچی ۵ء،۶ ۔ ج ۵)

جمال الدین افغانی عالم گیر اتحاد کے داعی اول اور علم و عمل کا مجسمہ تھے، ایسی عظیم ہستی کے حالات زندگی اردو زبان میں منتقل کر کے برنی صاحب نے ایک خدمت انجام دی ہے قیمت تین روپے چھ آنے۔ ملنے کا پتہ تعلیمی مرکز کراچی ۱

۱۴۱۔ ادارہ:

مشرقی بنگال میں اُردو، مصنفہ پروفیسر اقبال عظیم۔

(سالنامہ مشرب کراچی، ۵ء-۶ ، ج ۵)

موصوف نے ایک ایسی ترتیب و تصنیف پیش کی ہے جو مشرقی بنگال کی ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں اُردو سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ مغربی پاکستان میں۔ قیمت:۔ سات روپئے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مشرقی کوآپریٹیو پبلیکیشنز آغا صادق روڈ ڈھاکہ۔

۱۴۲۔ ادارہ:

برگ گل

(سالنامہ مشرب کراچی ۵ء-۶ ، ج ۵، ۱۹۱)

یہ ایک منتخب مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ افضل الرحمٰن ممتاز اور خواجہ تہور حسین نے مرتب کیا ہے۔ ہر چند کہ زیبا صاحب کی شمولیت نے ایک خوبصورت ترتیب کو داغدار بنا دیا ہے مگر مجلس ادارت کے دوسرے اراکین نے اسے خاصہ کی چیز بنانے کی کوشش کی ہے، طباعت و ترتیب کا حسن اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ ناشر اردو کالج کراچی،

۱۴۳۔ ادارہ:

آداب و اخلاق۔ مولفہ ایم عبدالرحمٰن خاں

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء، اکتوبر۔ ۳۱۷)

عقائد، عبادات، معاملات و اخلاق تہذیب و معاشرت وغیرہ انسانی زندگی کے جملہ شعبوں اور انسانی اعمال کے سارے اچھے مظاہر کے متعلق بڑی تفصیل و استیعاب سے آداب و اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ درس اخلاق کی حیثیت سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ قیمت مجلد چھ روپئے۔
ملنے کا پتہ:۔ ۲۶ ریلوے روڈ، لاہور،

۱۴۴۔ ادارہ:

پیام انسانیت:۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء، اکتوبر ۳۱۸)

اگر قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش کو دور کرنے کے بجائے ان کے مادی نقطہ نظر کو بدلنے اور ان کی اخلاقی و روحانی اصلاح کی کوشش کی جائے تو یہ ساری خرابیاں آج دور ہو سکتی ہیں۔ مولانا نے اسی نقطہ نظر سے انسانیت کے فساد اور اس کی اصلاح و فلاح پر چار تقریریں کی تھیں۔ پیام انسانیت ان ہی کا مجموعہ ہے اپنے موضوع اور فوائد کے لحاظ سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلموں کے بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ قیمت ۱۰ ار
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

پرنٹر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی
مطبوعہ اجمل پریس بمبئی ۳

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی، ایچ، ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونی ورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور اُنھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔ جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے اُنھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

جولائی ۱۹۵۵ء

جلد (۶) نمبر (۳)

چندہ سالانہ .... تین روپے
" ششماہی .... دو روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

قیمت فی پرچہ .... ایک روپیہ

نمائندۂ خصوصی

ترسیل زر کا پتہ

رائیٹرس امپوریئم لمیٹڈ

پیلس بلڈنگ، سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

فہرست مضامین

شذرات

اس سہ ماہی کا سب سے اہم اور جاذب توجہ ادبی اور علمی مسئلہ انڈیا آفس کے اُس کتب خانہ کا ہے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد نے صدیوں پہلے قائم کیا تھا اور جس میں ہندوستان کی آزادی سے پہلے تک مسلسل انمول مخطوطات اور مطبوعات جمع ہوتی رہیں۔ اس لائبریری میں اہم دستاویزوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، مصوری اور خطاطی کے بیش بہا نمونے ہیں، اور ہندوستان کی قدیم و جدید زبانوں کے علاوہ فارسی اور عربی مخطوطات بھی تقریباً آٹھ ہزار کی تعداد میں موجود ہیں، اور اردو مخطوطات کی بھی ایک بڑی کافی تعداد یہاں پائی جاتی ہے۔

شاید اسی علمی ذخیرہ کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی ایک نظم میں اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی — جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آزادی کے بعد چاہے دوسری قیمتی چیزیں ہم کو نہ مل سکیں لیکن یہ ذخیرہ ضرور مل جائے گا۔ اور اس کی واپسی ہمارے صد پارہ دل کے لئے مرہم کا کام دے گی۔ چنانچہ جب ہماری مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد یوروپ کے دورے پر تشریف لے گئے تو سب کو اس کا یقین تھا کہ جب وہ واپس آئیں گے تو اس کتب خانہ کے متعلق ہندوستان کی توقع کے مطابق ایک فیصلہ ہو چکا ہوگا لیکن اُن کے ولایت پہنچنے کے ساتھ ہی واقعات نے پلٹا کھایا اور ہم یہ معلوم کرکے حیران رہ گئے کہ برطانوی حکومت اس کتب خانہ سے متعلق کسی فیصلہ کُن گفتگو پر تیار ہی نظر نہیں آتی بلکہ اس کی نیت اس معاملہ میں بہت مشتبہ ہے۔

برطانیہ کے اس رویہ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ایک مایوسی کی فضا پیدا کردی ہے۔ ہم اپنی کھوئی ہوئی دولت پھر پیدا کرسکتے ہیں، اپنے کھوئے ہوئے ہیروں کے عوض ویسے ہی یا اس سے بہتر ہیرے نکال سکتے ہیں، لیکن ہم کبھی بھی کسی قیمت پر بھی، کتنی ہی سعی و کوشش کے بعد بھی اس علمی ذخیرہ کا بدل نہیں پیدا کرسکتے، اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس معاملہ کو پورے زور اور سنجیدگی کے

ساتھ اٹھائیں اور برطانیہ کو بتادیں کہ ہم کسی حالت میں بھی اِس ذخیرہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں ورنہ ہم کو غنی کی طرح نہایت افسوس سے کہنا پڑے گا کہ

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

اس سلسلہ میں ہم کو یوروپ اور امریکہ کے اُن دوسرے کتب خانوں کا بھی جائزہ لینا ہے جہاں ہماری لاکھوں کتابیں پہنچ چکی ہیں یا پہنچ رہی ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک طرف حکومت ہند اُن ممالک سے جن سے اِس کے تعلقات بہت دوستانہ ہیں یہ درخواست کرے کہ وہ اپنی دوستی کا بہترین ثبوت اس طرح پیش کرسکتے ہیں کہ وہ ہماری کتابیں ہم کو واپس کردیں اور دوسری طرف مرکزی حکومت اُن تمام ذخیروں کو جو مختلف گوشوں میں منتشر ہیں اپنے قومی مرکزی کتب خانہ کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ایسے قوانین بنائے کہ جن کے ماتحت کوئی اہم تاریخی اور قیمتی چیز ہندوستان سے باہر نہ جائے۔

کتب خانوں ہی کے سلسلہ میں یہ خبر یقیناً مسرت بخش ہے کہ اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے کتب خانہ کے لئے ایک مستقل عمارت خریدے یا بنائے۔ اِس کتب خانہ میں اُردو مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اِس وقت تک اِس کے اُردو مخطوطات کی فہرست کی دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ ادارہ بہت جلد اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگا اور اِس کا یہ اقدام اس کے نقرئی جشن کی بہترین یادگار ثابت ہوگا۔

اُردو کے ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد کی انجمن ترقیٔ اُردو نے تعمیری کاموں کی طرف قدم بڑھایا ہے اور وہ بھی بہت جلد ایک عمارت بنانے کا انتظام کرنے والی ہے لیکن ان عمارتوں اور کتب خانوں سے زیادہ اہم کام جس کی طرف اِن اِداروں کو متوجہ ہونا چاہئے وہ اُردو کی عوام میں عملی ترویج اور اس سے متعلق جذبۂ شوق و محبت کا پیدا کرنا ہے۔ اب سے کچھ سال پہلے تک ادارہ ایک طرف تعلیم بالغان کا کام بڑی حُسن و خوبی سے انجام دے رہا تھا اور دوسری طرف اپنے امتحانات کے ذریعہ کم پڑھے لکھے لوگوں میں اردو ادب کے مطالعہ کا صحیح ذوق پیدا کر رہا تھا، ضرورت ہے کہ ادارہ اور حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو دونوں مل کر اِن کاموں کو پھر شروع کریں، کیونکہ اب پہلے سے ہزار گُنا اِن کی زیادہ ضرورت ہے۔

اِس سہ ماہی میں ہم کو اپنے دو قدیم ادیبوں کا داغِ مفارقت سہنا پڑا۔ مرحوم اعظم کریوی اُردو اور ہندی کے بڑے اچھے ادیب تھے اُن کی موت جن حالات میں واقع ہوئی وہ بہت ہی درد ناک ہیں۔ اِسی طرح چراغ حسن حسرت ہمارے صحافی اور علمی دنیا کے ایک روشن چراغ تھے۔ انھوں نے تقریباً ایک ربع صدی تک علم و ادب اور ملک و قوم کی اپنے مخصوص انداز سے بڑی خدمت انجام دی، خاکسار کو مرحوم سے اس وقت سے نیاز حاصل ہے جب وہ کلکتہ میں مختلف اخبارات سے وابستہ تھے اور برسوں تک تقریباً روزانہ ان سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی تھی، مرحوم ایک زندہ دل، بذلہ سنج، باوفا اور مخلص دوست تھے۔ خدائے تعالیٰ ان دونوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

عرصہ کے انتظار کے بعد معارف کا سلیمان نمبر شائع ہوا اگرچہ ایک حد تک اِس سے علامہ رحمتہ اللہ علیہ کے خاندانی حالات، اخلاقی رفعت، علمی بلندی اور روحانی عظمت کا پتہ چل جاتا ہے لیکن پھر بھی اِس کی ضرورت ہے کہ حیاتِ شبلی کی طرح حیاتِ سلیمان بھی شائع کی جائے کیونکہ انھوں نے اپنی پنجاہ سالہ مشغول و مصروف زندگی میں اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے ہر حیثیت سے بہتر کارنامے چھوڑے ہیں۔

گذشتہ اشاعت میں ہم نے اس چیز کا ذکر کیا تھا کہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو بمبئی یونی ورسٹی نے اردو میں پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لئے ایک مرکز تسلیم کر لیا ہے اور اِس سلسلہ میں ہمارا اِرادہ ہے کہ ہم ادارہ کو تحقیقاتی کام کرنے والوں کا ایک اہم مرکز بنا دیں۔ چنانچہ ادارہ کی مجلس عاملہ نے اس بات کی منظوری دے دی ہے کہ ادارہ دو ایسے ادبی کام کرنے والوں کا ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تقرر کرے جو قدیم اردو اور اس کے متعلقات سے کافی واقفیت رکھتے ہوں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

امین گجراتی کی "یوسف زلیخا"

(بہ سلسلۂ ماسبق)

از ڈاکٹر عبدالحمید صاحب فاروقی ۔ (صدر شعبہ فارسی و اردو کرناٹک کالج دھارواڑ)

زلیخا بوڑھی ہو جاتی ہے اور وہ رہ گذر پر آکر بیٹھتی ہے، حضرت یوسف وہاں سے گذرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے اور ایسی حالت کیوں بنائے ہوئے ہے، زلیخا جو جواب دیتی ہے اُسے ہاشمی اور جامی نے صرف تین تین چار چار شعر میں ادا کیا ہے، ہاشمی کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کہے کون توں ہے تیرا کیا ہے نام　　قبیلہ تیرا کون ہے کاں مقام
زلیخا سنی جب یو یوسف کی بات　　اٹھی بول کر یوں بی بی پن کی دھات
یو دو میں ہوں جو تجہ کو لیتی ہوں مول　　تیری عشق میں ہونت کھنکر کھول
زلیخا یو ہے کر کہ یوسف نے پائے　　انکھیاں میں انجولیا او ساسانچہ بھائے

جامی کہتے ہیں:

ز بس خندید نش یوسف عجب کرد　　از و نام و نشان وی طلب کرد
بگفت آنم کہ چون روی تو دیدم　　ترا از جملہ عالم برگزیدم
فشاندم گنج و گوہر در بہایت　　دل و جان وقف کردم در ہوایت
جوانی در غمت برباد دادم　　بدین پیری کہ می بینی فتادم
گرفتی شاہد دولت در آغوش　　مرا یکبارگی کردی فراموش
چو یوسف زین سخن دانست کو کیست　　ترحم کرد بروی زار بگریست

لیکن امین کے ہاں زلیخا جو جواب دیتی ہے وہ پندرا شعروں پر مشتمل ہے اور سوز و گداز کی بہترین مثال ہے: ملاحظہ ہو:

سنا آواز یوسف کا اونے جب　　لگی رونے انے بولی سویوں تب
کہے اے یوسف بجے تیں نا پچہانی　　پہچانا تجہ کوں میں اے یار جانی
جو ہاں میں ہوں زلیخا نام میرا　　وہی یوسف توں دل آرام میرا
وہی میں ہوں جو تیں میرے سپن ماں　　دیکھا صورت نے کیتی مجہ کوں بے جاں
وہی میں ہوں جو تیں میرے وطن سوں　　کہے تجہ بے وطن اور دکھ دیا یوں

وہی میں ہوں کے جس سوں نا اٹھتا توں　　وہی توں ہے کے جس پر دوڑتی ہوں
وہی میں ہوں جنے تجہ کوں لیا تھا　　لکھوں در لکھ بہتر مو لجہ دیا تھا
وہی میں ہوں جو تیرے عشق میں سب　　عمر کھوئی کچھ پایا نہ مطلب
وہی میں ہوں تیرے غم بیچہ گلنار　　وہی توں ہے نہ کیتا مجہ اُپر پیار
وہی میں ہوں جو تیں مجہ دل میں بستا　　وہی توں ہے جو میں روتی توں ہنستا
وہی میں ہوں جو تجہ پر ہوئی دیوانی　　وہی توں ہے میرا محبوب جانی
وہی میں ہوں تیرے درسن کی جانار　　وہی توں ہے مجے دکھ میں جلانار
وہی میں ہوں جو تھی تجہ رنگ راتی　　وہی توں ہے جو ہوں تجہ کو نہ بھاتی
وہی میں ہوں جو تھی قربان تجہ پر　　وہی توں ہے جو تھا طغیان مجہ پر
وہی میں ہوں جو تجہ پر بل کیا تن　　وہی توں ہے نہ لایا مجہ ستیں من
وہی میں ہوں جو تجہ بن ہوگئی پیر　　وہی توں ہے جو لایا عشق کا تیر
نشانیاں جب اونے یہ سب بتایاں　　یوسف کے دل میں تب تحقیق آیاں

حضرت یوسف کی وفات پر زلیخا کی جو حالت ہوتی ہے اس کے اظہار میں آئین اپنے فن کی انتہا کو پہنچ گیا ہے، یہ ٹکڑا مستقل بین ہے جو کسی مرثیہ نگار کے شاہکار سے کم نہیں۔ ملاحظہ ہو:

جو اس کن موت کے میں وقت آتی　　نین کے نیر سوں اوس کو نہلاتی
میں بیترتی کفن ہاتوں سجن .... کا　　ہوتا مطلب سو تب کچہ میرے من کا
انے پلکوں کی میں سویاں بناتی　　رگوں سیتیں سو میں تاگے پروتی
کفن کوں سیوتی ہاتوں منیں لے　　نین پر جھورتی میٹھے بوت دے
میرے محبوب کوں میں آپ کر　　پناتی وے کفن خوشبو لگا کر
جگر کوں عود کر کر جالتی ہوں　　نین کوں پیس سرماں ڈالتی ہوں
پیشانی کے اُپر صندل لگاتی　　چھبیلا درسن میں نظروں بیچہ لاتی
جنازے بیچہ سلاتی یار کوں میں　　لیتی کاندھے اُپر دلدار کوں میں
میرے ہاتوں سوں جامیں کھودتی گور　　کسی کوں آونے دیتی نہ اوس ٹھور
میں اندر بیٹھ کر تربت چناتی　　یوسف کے گور سوں باہر نہ آتی
سلاتی گور میں یوسف کوں میں ہاں　　رتی ندامت بہتر میں بھی ادسی تھاں
قیامت لگ رتی اوس گور بیچہ ہوں　　ہمیشہ لاگتی یوسف کے قدموں

حکم رب کے سو جب دے روز آنا — خدا قبروں سیتیں سب کوں اٹھانا

۵۷ اکٹھے — آین دونوں تب اٹھتے اکٹھے رہے — سو تب میدان محشر دیکھتے رہے

جدی خدمت منے سوں میں نہ ہوتی — عمر اپنی میں اوس ہی ٹھام کھوتی

اسی حالت کو جامی نے بھی بیان کیا ہے لیکن وہ سوز و گداز اور جذبات کا خلوص جو آمین کا خاصہ ہے جامی کے یہاں مفقود ہے۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کفن چوں بر تن او راست کردند — بہ تکفینش نشست و خاست کردند

نکرد م رشتہ اندوزی فن خویش — کہ تا دوزم بر و لاغر تن خویش

دہان پُر از نوائی بے نوائی — نکردم تحمل او را درائی

چو جائی خواب در خاکش کشادند — چو دُرِ پاک در خاکش نہادند

زمیں زیر برِ دوشش نہ رفتم — بکام دل در آغوشش نہ خفتم

دریغا زین زیان کاری دریغا! — دریغا! زین جگر خواری دریغا!

منظر کشی، آمین نے اکثر مقامات پر باغ کا منظر، رات کا سماں اور صبح کی کیفیت بیان کی ہے، یہاں بھی اس نے اپنے اعلیٰ تخیل اور محاکاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے، زلیخا کے باغ کا نقشہ دیکھئے اس میں ایرانی پھولوں کے ساتھ ساتھ آمین نے ..... ہندوستانی پھولوں اور پودوں کا بھی ذکر کیا ہے:

زلیخا کا اتھا نادر سو یک باغ — جنت کے تھا سینے پر اوس تیں داغ

گیا تھا کوٹ تو اوس کا فلک پر — چنا تھا اوس کے تئیں از سنگ مرمر

عجب صد برگ کھیلے سو اوس میں — گل لالہ ہزاری بوت تسمیں

گلاباں اور چنبے موگرے تھے — چمیلی بیل نرگس کیوڑے تھے

کھلے تھے تختے نافرمان کے واں — عجب صنعت تھی سب سبحان کی واں

گل کیوڑی کے اور بولچ سری کی — عجب باڑی منے خوشبو بھری تھی

کھلے تھے یاسمن ریحان باراں — بنفشے کی عجائب تھی قطاراں

سرو شمشاد آپس میں ملے تھے — چنار آنار آپس میں بھلے تھے

گل سوسن، گلِ کوزہ کھلے واں — اتھے نارنگ اور انجیر تھے تاں

عجائب سیب اور دوجے سفرجل — کھجور، انگور، پستے، کشمش اول

بہی، اخروٹ، فندق، ناشپاتی — اتھے سردے سو جوں آب حیاتی

ترو پے، ناریل اور سبز بادام — نہ تھی میوں منے کچھ کھوٹ استحکام

اچھے دو حوض اوس باڑی کے بھیتر   نہ تھے چھوٹے بڑے دونوں برابر
بنائے تھے وے حوض از سنگ مرمر   نہ تھا اون کے بھیتر اور دوجا پتھر
نہ تھے معلوم اون میں کوئی سانہے   ایسی کارگیری وے حوض باندھے
چندر سورج کے مانند تھے جھلکتے   بلک چندسورسیں روشن وے لگتے
زلیخا باغ بھیتر جب سو آتی   حکم کر اون دونوں حوضاں بھراتی
بھراتی ایک بھیتر دودھ نرمل   انے دوجے کے بھیتر شہد اول
بچھا تھا تخت ان دونوں کے درمیاں   زلیخا بیٹھتی اوس کے اوپر ہاں
سہیلیاں کھیلتیاں حوضوں اُپر آ   زلیخا دیکھتی بیٹھی تماشا
اوپتیاں شہد ایدھر سے اُودھر دود   زلیخا دیکھ کر ہوتی تھی خوشنود

میر حسن نے باغ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے بعض اشعار سنیئے:

چمیلی کہیں اور کہیں موتیا   کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جانشان   مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں جعفری اور گیندا کہیں   سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
کھڑے سرو کی طرح چمپا کے جھاڑ   کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھانوں   لگی جائے آنکھیں لئے جن کا نانوں

آمین نے شب معراج کا سماں اس طرح بیان کیا ہے:

اتھی ایک رات سب راتوں میں بہتر   بلک تھی سب دنوں سیتیں وہ خوشتر
اتھی لونڈی سو اوس کی لیلۃ القدر   کمینہ تھی اوس آگل لیلۃ البدر
سیاہی اوس کی سوں حوراں خجل ہے   خجل رضوان و غلمان اوس اگل ہے
نسیم اوس کے سو خوشبویاں لجادیں   ہوا اوس کے سو مردے جیو پادیں
خدا کی رحمتوں نے اس رین میں   کیا تھا لطف بوت اوس آسماں میں
کئے تھے بند بدبختی کے سب باب   ہوا تھا مہرباں یوں آپ وہاب
نہ تھا اوس رات میں کئیں ظلم کا نام   بھرا اور بھیڑ چرتے تھے سو اتھام
اتھا اس رات میں انصاف جاری   تھی اوس بیچ باگ اور بکرے کی یاری
نہ تھا اوس بیچ کس کوں فکر اور غم   تھے سب اوس رات کوں خوش حال خرم

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

گفتار ملک محمد

(جناب ضیاء الدین احمد ڈیسائی)

گجرات کی تاریخ اُردو موجودہ معلومات کی روشنی میں میاں خوب محمد چشتی کے بعد (خوب ترنگ سن تصنیف ۹۸۶) تقریب قریب ایک صدی تک ادبی سرگرمیوں کی بہت کم حامل نظر آتی ہے، اس عرصہ کے کوئی اہم ادبی کارنامہ سے علمی دنیا روشناس نہیں ہے، البتہ بارہویں صدی میں قدیم اردو کی طرز پر کئی کتابیں نثر اور نظم میں تالیف ہوئیں جس کی طرف آخری چند سالوں میں وقتاً فوقتاً ارباب علم ہماری توجہ دلا چکے ہیں، اس ادبی خلا کے متعدد اسباب بیان کئے جا چکے ہیں جن کا اعادہ محض طوالت بیجا کا موجب ہے لیکن اس کی ایک اہم وجہ کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے، اس خلا کے لئے خود اہل گجرات کی لاپرواہی کم ذمہ دار نہیں، انھوں نے اپنے اسلاف کے علمی ذخیروں اور ادبی کاوشوں کی طرف بہت کم توجہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی علمی اور ادبی کتابیں حوادث زمانہ کی نذر ہوگئیں، آج بھی کئی ایسی ہوں گی جو کسی گوشۂ گمنامی میں پڑی کسی محقق کے شوق تجسس اور سعی بے کراں کی منتظر ہوں گی یہی وجہ ہے کہ اُردو کے علاوہ فارسی زبان کی ادبی یا علمی کتابوں کا سراغ بمشکل ہی ملتا ہے حالانکہ یہی زبان صدیوں تک گجرات کی سرکاری زبان رہی۔

اسی عہد خلا یعنی گیارہویں صدی کے وسط کی ایک مختصر نظم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، یہ نظم مجھے کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ایک کتاب (فن نمبر ۸ کتاب ۲۶۵) کی پشت پر لکھی ہوئی ملی ہے، نظم کا عنوان "گفتار ملک محمد" ہے ملک محمد نے شہر بھڑوچ میں جو گجرات کا پرانا اور مشہور شہر ہے ۱۰۶۹ھ میں اپنے دور کی عام حالت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر دور کے شاعر اپنے اپنے عہد کی خوبیوں کے مقابلے میں برائیوں سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں، شاعر پر ہی کیا منحصر ہے عام لوگ بھی اپنے دور کی برائیوں اور خرابیوں کو آثار قیامت سمجھ کر مذمت کرتے ہیں گجرات کے دیہات میں آج بھی شریر اور بدخصال بچوں کو آخری دور کی پیداوار سمجھتے ہیں اور انھیں تیرہویں صدی یا چودھویں صدی کے فلاں کے لقب سے پکارتے ہیں۔ ملک محمد بھی اپنے دور کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر یقین کرتا اور اپنے قارئین کو یقین کرانا چاہتا ہے کہ قیامت کا دن نزدیک آگیا ہے۔ جھوٹ، غیبت، تہمت، مذہب اور اس کے اصولوں سے انحراف، باطل پرستی اور ناحق کوشی ہوس رانی، عورتوں کی بے پردگی اور ان کا غیروں کے گھر روز روشن میں جانا، مفتی، عالم، قاضی وغیرہم کی دولت پرستی، روپیہ کی لالچ میں رزاق پر عدم توکل کا اظہار، زہد تقویٰ سے ان کی محرومی، اہل ثروت کی تنگ چشمی اور خست، دھن دولت سے ان کا پیار، حالانکہ

یہی دھن اور یہی دولت یا تو یہاں چھوڑ کر چلے جائیں گے یا حاکم زمانہ کی نذر ہو جائے گی، مذہب کے علمبرداروں یعنی قاضی مفتی ملا اور عالم کی حکام پرستی، ان کا حاکم کے گھر "مجرے" کو جانا، حکام کا جادۂ انصاف سے عدول، ظلم اور تعدی کی گرم بازاری، بھیلوں اور کولیوں کی راہ زنی، اگر کوئی فریاد لے کر جائے تو بجائے دادرسانی کے اسے دھکے دے کر نکلوا دینا، ان سب چیزوں کا ذکر کر کے شاعرانہ لفظوں پر نظم ختم کرتا ہے کہ قیامت کا دن نزدیک آگیا ہے، آخری شعر میں شاعر بتاتا ہے کہ سن ایک ہزار اونہتر میں شاہ جہاں کے عہد حکومت میں شہر بھڑوچ میں میں نے یہ حال دیکھا۔

نظم میں کل سترہ شعر ہیں، زبان بڑی حد تک صاف ہے، ٹھیٹھ ہندی کا عنصر بہت کم ہے، البتہ گجراتی زبان کا اثر کافی پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر بھائی کی جمع حالت خطاب میں بھایو گجراتی کے بعینہ ہے، لفظ 'عورتوں' کا حالت فاعلی میں استعمال بجای "عورتیں" گجراتی اثر کا غماز ہے، اس کے علاوہ 'ادکی' بمعنی نیاری' دارو' بمعنی شراب، بہو (جس کی اصل سنسکرت میں بُہُو ہے اور گجراتی میں بہون مع نون غنہ) بمعنی زمین۔ بہُودُچ بمعنی بہت ہی، 'پُر' بمعنی پرائے 'بہار' بمعنی باہر (بھیق نون غنہ) بمعنی میں، آئی بمعنی یہ 'مُوئی' بمعنی مرے قریب قریب یہ سب الفاظ اسی شکل میں آج بھی گجراتی زبان میں رائج اور کثیر الاستعمال ہیں کتابت کا یہ انداز ہے کہ ٹ کی ط کی جگہ چار نقطے (::) ہیں ک عربی اور گ فارسی میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا، اسی طرح چ فارسی کو ج عربی سے لکھا ہے، پ فارسی عموماً ب عربی سے تحریر ہوا ہے اگرچہ کبھی کبھی پ فارسی بھی لکھا ہے ڑ ہندی (ڑ) کو ر ہی لکھا ہے، املا بحیثیت مجموعی صحیح ہے، صرف ایک جگہ غلط ہے، شعر نمبر ۱۲ میں وظیفہ کی جگہ وضیفا لکھا ہے کاتب کا نام درج نہیں ہے البتہ سن کتابت بقید تاریخ اور ماہ درج ہے۔

نظم کی مندرجہ نقل میں ناظرین کی سہولت کے لئے رائج املا استعمال کیا گیا ہے اور حاشیہ میں ایسے الفاظ کی شکل دی گئی ہے۔

گفتار ملک محمد

ایسا وقت آیا ہے[1] بھایو جون حضرت فرما کر گئے ہیں[2]
اگہڑ دی د(؟) نہین اب اس جگ[3] میں ظاہر دیکھو پرکھو من میں
نہیں سو پرگٹ[4] سب کھین حرکت ناحق تہمت جھوٹا[5] بولیں
میری تیری بہت کریں اور یہی وضوسون مصحف کھولیں
امر نہی کا کریں تفاوت حق کون باطل کر دکھلا دیں
قاضی مفتی ملان عالم دیکھہ ردپیہ[6] دین پھرا دیں[7]

نہین محبت اس جگ[8] مین عجب روش دن دن سواد کی
کیا مادر کیا باپ برادر رہی انست کر خلقت سب کی

جون شیرین فرہاد زلیخا یوسف جون مجنوں اور لیلی
کہو نہ کوئی کون سو ویسا اب اس آخر دور منین بھی

شرم حیا سب عورتوں چھوڑی[9] روز اجالے[10] پر گھر[11] جاویں
کیا ہندو کیا مسلمان بے[12] پردے ہو آپ[13] دکھادیں

نہیں سو روزا نہیں کچھ[14] بندگی حرام حلال سب ایک کیا ہے[15]
بھنگ[16] تنباکو دارو[17] پی کر دوزخ میں گھر[18] ڈھونڈھ لیا ہے[19]

صبر نہین درویش منین کچھ[20] زہد ریاضت تقوی کیسا
بے[21] صبری سوں گھر گھر[22] مانگے اور سر پر[23] رزاق سو دیسا

بے[24] مذہب بے قید[25] جماعت بے[26] مرشد گمراہ[27] ہوے ہیں
حکم شرع کا جن نہیں مانا ں اکثر وے[28] بے دین ہوے ہیں

انصاف عدالت بادشاہوں میں نہیں مطلق آپ[29] جیون فرمایا
ظلم تعدی سب شہروں میں لالچ[30] کر انصاف چھپایا[31]

راہ مسافر پر دیسی[32] کا ناحق بھیل کولی سر کاٹیں
جو کوئی فریاد کرے[33] اس دے دکھے[34] اور بہار نکالیں

نہیں سخاوت دولت مند میں کیا ہندو کیا کوئی سو کیسا
لاکھ کروڑ[35] ہو دیں جس گھر میں[36] وہ ہی شوم نہ دیوے[37] پیسا

جون قارون سب بہو میں گاڑیں[38] مال زکوۃ نہ حق کی دیویں
آخر چھوڑ[39] مریں سب دو ہیں یا حاکم دے[40] سر میں لیویں

قاضی مفتی ملان عالم حاکم کیان مجرے[41] کون جاویں
عمل کریں نہین جون فرمایا ناحق بول وظیفہ[42] کھاویں

جو کوئی فریادی آوے[43] بھوج حاکم کون بناو (۶) چکاویں
ایسے[44] بے دین ملانے جان بھوج[45] دوزخ میں جاویں

آخر دور نزدیک آیا ہے[46] پوری قول نبی کی دیکھو
صرف مصحف کی اور ایمان ای دونوں جان بیچ[47] سیکھو

شاہ جہاں^٤٨ کے راج بھروچ^٤٩ میں ملک محمد نیں یہ دیکھی
ایک ہزار اوہتر تھی تب قول نبی کی لیکھی

روز شنبہ بتاریخ ۱۲ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۰۹۳ رقم تحریر یافت

۱ہ دراصل ہی ۲ہ کئی ہمی ۳ہ جاک ۴ہ پرکٹ ۵ہ جہونتا ۶ہ روبیہ ۷ہ بہرادین ۸ہ جک ۹ہ جہوری ۱۰ہ اجالی ۱۱ہ گھر ۱۲ہ ہی ۱۳ہ آب ۱۴ہ کچھ بندگی ۱۵ہ ہی ۱۶ہ بھنک ۱۷ہ بی ۱۸ہ گھر دوندھ ۱۹ہ ہی ۲۰ہ کچھ ۲۱ہ بی ۲۲ہ کھرکھر مانگی ۲۳ہ بر۔
۲۴ہ ۔ ۲۵ہ ۔ ۲۶ہ بی ۲۷ہ گمراہ ہوئی ۲۸ہ بی دین موی ۲۹ہ آب ۳۰ہ لالچ ۳۱ہ جہبایا ۳۲ہ بردیسی ۳۳ہ کری ۳۴ہ دی دیکھی ۳۵ہ کرور ۳۶ہ کھر ۳۷ہ دیوی ۳۸ہ کارین ۳۹ہ جہور ۴۰ہ دی ۴۱ہ مجری ۴۲ہ وضیفا ۴۳ہ آدی ۴۴ہ ایسی بی دین ملانی ۴۵ہ بہوج = بوجھ ۴۶ہ ہی ۴۷ہ بمعنی بوجھ ۴۸ہ کی ۴۹ہ بھروچ

آمین گجراتی کی "یوسف زلیخا"

(ص ۹ کا بقیہ)

فرشتوں کے دلوں میں شادیاں تھیاں — طرف چاروں مبارک بادیاں تھیاں
فرشتے آسمانوں سیں زمیں .... پر — لکھاں لکھ آئے تھے اوس رات بھیتر
سبوں کے ہات میں روشن چراغاں — تھے دوڑا دوڑ کرتے اوس جگت ماں

جس رات زلیخا خواب دیکھتی ہے اس کی کیفیت ملاحظہ ہو:

کہتے ہیں رات یک آرام کی تھی — خلق نے نیند سوں انکھیاں کوں موندی
بوت آرام تھا سارے خلق کوں — نہ مارے کوئی اوس راتیں پلک کوں
ہوا ایسی ٹھنڈی اوس میں چلی تھی — کے گرمی سب جگت کیری ٹلی تھی
اتھا آرام سب کوں اوس رین میں — نہ تھی بیداری کس ہی کے نین میں
فجر کا مرغ بھی بولا نہ اوس رات — موذن بھی نہ بولا بانگ صلوات
سگاں اوس رات میں ناتک پکارے — وے بی آرام سے سوتے تھے سارے

"نور علی نور"

۱۸۵۷ء سے پہلے کا ایک اُردو ماہنامہ

(فضل اللہ فاروقی)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے "دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب" کے عنوانوں سے ایک بلند پایہ مقالہ لکھا جو پہلے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) اور دوبارہ احوال غالب میں چھپا ہے اس کے فٹ نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں" ادبیات[1] کا شوق رکھنے والوں سے درخواست کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جہاں کہیں پرانی یا قلمی، مطبوعہ کتابیں اخبار، رسالے، یا متفرق چیزیں ملیں، ان کو محفوظ کرنے اور منظر عام پر لانے کو لازم جانیں، تاکہ ادبی تاریخ کی تصحیح اور تدوین کسی حد تک، تو ہو سکے۔" میں

حُسن اتفاق سے کتب خانہ سید جمیل الدین (بمبئی) میں ایک رسالہ "نور علی نور" نظر سے گذرا، سنہ دیکھا تو ۱۸۵۶ تھا جنگ آزادی ہند سے ایک سال قبل یہ ماہنامہ نکلتا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی "درخواست" یاد آئی اور ارادہ ہوا کہ اہل علم حضرات کی خدمت میں اس کا تعارف کرا دیا جائے۔ بظاہر تو کوئی مشکل نہ تھی لیکن جب اس پر کچھ لکھنے کی ہمت کی تو ایک بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ رسالہ پر مطبع کا نام چشمۂ فیض تو ہے لیکن جگہ اور مقام کا نام نہیں کہ یہ مطبع کس شہر میں تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے خطبات گارساں دتاسی کی طرف نظر گئی کیونکہ اس نے اپنی بیش بہا معلومات جن میں اس نے ہندوستانی زبان کے سلسلہ میں کافی تحقیقات کی ہے قدیم مطابع کے نام بھی دئے ہیں شائد ان میں چشمۂ فیض بھی ہو۔ لیکن اس میں کچھ پتہ نہ چلا۔ تاریخ صحافت اردو مرتبہ مولانا امداد صابری جو تازہ تصنیف ہے اس میں ایک عنوان ہے "غدر[2] سے قبل اور بعد کے اخبارات" اس عنوان کے تحت ان اخبارات کی فہرست ہے جو مولانا امداد صابری کے کتب خانہ میں موجود ہیں ان میں نور علی نور کا ذکر نہیں۔ اس کتاب میں غدر سے قبل کے اخبارات کی فہرست صفحہ ۲۹ پر دی ہے۔ اس میں ایک اخبار "نور علی نور" کا نام ہے جس کے اڈیٹر محمد حسین نامی کوئی بزرگ تھے لیکن یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور لدھیانہ سے نکلتا تھا، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اخبارات کی فہرست میں ماہناموں کا کیا ذکر، لیکن صابری صاحب نے اسی فہرست میں معیار الشعراء آگرہ (ماہنامہ) اور محب ہند جو ماسٹر رام چندر کی ادارت میں دہلی

---

[1] احوال غالب ص۱۴۳ فٹ نوٹ ۲ [2] تاریخ صحافت اردو ص۱۴-۱۵ [3] تاریخ صحافت اردو

سے نکلتا تھا یہ بھی ماہنامہ تھا، مرکزی لائبریری (بمبئی) کی فہرست میں چھان بین کی تو ایک کتاب ملی جو مطبع چشمۂ فیض دہلی میں چھپی تھی۔ سنہ طباعت ۱۸۹۶ ہے اور اس مطبع کے مالک ایک مسلمان ہیں زیر تعارف رسالہ نورعلی نور کے مطبع کے مہتمم منشی دیوان چند ہیں۔

اگست ۱۹۸۲ء ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بمبئی تشریف لائے تھے ان سے دریافت کیا کہ کیا انھیں معلوم ہے کہ "نورعلی نور" کون نکالتا تھا اور مطبع چشمۂ فیض کس شہر میں تھا؟ انھوں نے فرمایا ممکن ہے کہ نیشنل آرکیوز آف انڈیا دہلی کے کیوریٹر کچھ معلومات بہم پہنچا سکیں۔ ان سے استفسار کیا تو انھوں نے ایک صبر آزما انتظار کے بعد ۱۸ ردسمبر کو مندرجہ ذیل جواب دیا جس کا اقتباس و ترجمہ پیش ہے۔

جناب والا!

'نورعلی نور' سے متعلق آپ کے خط مورخہ ۴ ستمبر کے جواب میں ہم افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اس کے اڈیٹر اور مطبع کے مقام سے متعلق ہم آپ کو کوئی اطلاع نہیں دے سکتے، اس سلسلہ میں کافی ریسرچ کی ضرورت ہے ......

قاضی عبدالودود صاحب سے دریافت کیا وہ اپنے خط مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں مطلع فرماتے ہیں۔ "دتاسی تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی جلد ۲ صفحہ ۳۵۷ میں لکھتا ہے کہ محمد حسین پسر سید محمد باقر متعلم دہلی کالج، 'نور علی نور' لدھیانہ سے نکالنے والے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں جاری ہوا۔ یہ مطبع نورعلی نور کے منتظم بھی تھے جہاں سے یہ نکلتا تھا، ہفتہ وار تین (۹) اوراق پر نکلا کرتا تھا۔ تاریخ صحافت اردو ج ۱ مصنفہ جناب امداد صابری میں ہے کہ یہ اخبار لدھیانہ سے ۱۸۵۱ء میں جاری ہوا۔ اور ۱۸۵۵ء میں بند ہوگیا۔ صفحہ ۲۵۳۔ اس کتاب میں یہ صراحت نہیں کہ یہ محمد حسین کون تھے مجھے یہ بات بہت مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ محمد حسین خلف محمد باقر کا اس سے تعلق تھا۔ ماہوار رسالہ نورعلی نور کا حال مجھے معلوم نہیں اور نہ دتاسی یا امداد صابری صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے ...... ظاہر ہے تو یہ ہفتہ وار اخبار سے بالکل مختلف ہے"۔

عرشی صاحب ناظم کتب خانہ رام پور سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "چشمۂ فیض کے تین مطبع تین جگہ تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور میرٹھ (۱) دہلی کا مطبع قاضی کے حوض پر تھا اس کی مطبوعہ تین کتابیں رام پور لائبریری میں ہیں۔ نقش روحانی ۱۸۸۳ء دیوان غالب ۱۸۸۶ء (۳) محاسن الاخلاق ۱۸۹۱ء۔

لکھنؤ کا مطبع محلہ محمود نگر "اکبری دروازہ پر واقع تھا...... اور نادر حسین خاں اس کے مہتمم تھے۔ اس کی دو کتابیں یہاں محفوظ ہیں (۱) جوانی کا ماتم از خلق لکھنؤ ۱۸۸۲ء السعی المشکور ۱۸۷۹ء (۳) میرٹھ کا پریس کہاں یعنی کس محلہ میں تھا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ البتہ اس کی مطبوعہ کتاب

یہاں ہے وہ جمادی الثانیہ ۱۲۷۳ھ ...... مطابق ۵۷-۱۸۵۶ء کی ہے ...... "نور علی نور" کا کوئی پرچہ ہمارے ہاں نہیں ہے اس لیے خاص طور پر اس کے مطبع کے متعلق کچھ عرض نہیں کرسکتا۔"

اب تک جن کتابوں، اور محققین سے معلومات حاصل کی گئیں، 'نور علی نور' کے بارے میں عدم واقفیت کا پردہ اسی طرح پڑا رہا۔ حتی الامکان اس بات کی تلاش و جستجو کی گئی کہ 'نور علی نور' کے مقام اشاعت کا پتہ لگ جائے اور اس کا تعارف مکمل ہو جائے۔

رسالہ کا تعارف: زیر نظر پرچہ چھوٹی تقطیع ۷×۵ کے سائز پر ۸۴ صفحات کا ہے سرورق پر حوض کے کنارے بیل بوٹے ہیں۔ اوپر حوض میں درمیانی خط نستعلیق میں " رسالہ نمبر چہارم ماہ اپریل ۱۸۵۶ء لکھا ہے۔ درمیان حوض میں 'نور علی نور' بخط جلی نستعلیق میں لکھا ہوا ہے نیچے کی سطر میں "مطبع چشمۂ فیض میں منشی دیوان چند کی اہتمام سی چھپا" مرقوم ہے۔ سرورق کی دوسری سمت سادہ ہے۔

پھر صفحہ نمبرا پر داہنی طرف نمبر۴۔ درمیان میں 'نور علی نور' اور بائیں طرف صفحہ کا نمبرا ہے، صفحہ کے اوپر خط نستعلیق میں یہ شعر درج ہے ؎

در فیض است نشیں از کشاکش نا امید اینجا　　　برنگ دانہ از ہر قفل میروید کلید اینجا

اس کے نیچے درمیان میں نمبر ۴ ہے اور اس کے نیچے مطبوعہ ماہ اپریل ۱۸۵۶ء تحریر ہے۔ پھر لفظ اشتہار لکھ کر اس چھوٹے سے صفحہ کو دو کالموں میں تقسیم کیا ہے۔ ملو

اشتہار یہ ہے، "یہ رسالہ 'نور علی نور' رشک تجلی طور، علوم و فنون متذکرۃ الذیل کی تذکار میں ہئیت، ہندسہ، حساب، حکمت طبیعی، طبابت، جغرافیہ، حیوانات، معدنیات، جرثقیل طلسمات، تہذیب اخلاق، قانون ذکر تجارت، پیداوار ملک، حکایات عبرت آمیز، لطائف و ظرائف، نکات، انتخاب اشعار، طریقۂ تعلیم، عمارات و انہار ذکر ریاست تواریخ متفرقات ماہواری چھپایا جاتا ہے اور با ایں ہمہ فوائد، چار روپیہ سالانہ اس کی قیمت لی جاتی ہے۔ جن صاحبوں کو بمقتضائے قدر دانی، اوس کا ذوق ہو ذوق فرمائیں۔"

سب سے پہلا مضمون علم ہئیت پر ہے مضمون نگار کا نام نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرتب ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہو۔ دوسرا مضمون علم ہندسہ پر ہے۔ صفحہ ۷ پر علم حساب صعود و نزول کے موضوع پر بحث ہے۔ پھر صفحہ ۸ پر 'حکمت طبیعی و طبابت' سرخی قائم کر کے دو انچ جگہ خالی ہے صفحہ ۹ سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ مضمون نگار کا نام اس طرح لکھا ہے "مولفہ وارث علی خاں صاحب داروغہ آبکاری کیمپ جالندھر۔ دوسری سطر سے مضمون شروع ہوتا ہے اس مضمون کے پہلے صفحہ پر کالم نہیں ہے لیکن دوسرے ہی صفحہ سے پھر صفحات کے دو کالم ہو جاتے ہیں۔ یہ مضمون صفحہ ۹ سے

شروع ہو کر صفحہ ۱۸ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں علم طب کی نظری و عملی تعریف ستہ ضروریہ کی تشریح، قوت شامہ کا بیان چند نسخے اور علاج۔ انیسویں صفحہ سے علم جغرافیہ شروع ہوتا ہے اس کے مضمون نگار کا بھی نام نہیں لکھا زمین کی کیفیت بیان کی ہے ۲۲ ویں صفحہ پر بیان حیوانات" کا عنوان ہے اس کے لکھنے والے محمد سبحان الدین طالب علم دہلی کالج ہیں بیان حیوانات میں شتر مرغ ہے۔ گربہ ہے بیان ذیب ہے۔ بھیڑیے کے بیان کے آخر میں لکھا ہے کہ "ایک کتاب میں میں نے لکھا ہوا دیکھا ہے کہ اس کے گوسفند کے ساتھ اس قدر دشمنی ہے کہ اگر دونوں کی کھالوں کو ملا کر رکھو تو بکری کی کھال دراز ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ڈھول نقارہ وغیرہ بکری کی کھال سے منڈھا ہوا ہو اور گرگ کی کھال کو اس سے ملا کر رکھیں تو وہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے واللہ اعلم بالصواب" ۔۔ "

علم معدنیات میں سیماب کا بیان ہے جس کے لکھنے والے شیخ عبداللہ صاحب مدرس اسکول شملہ ہیں۔ صفحہ ۲۷ پر ایک کالم کا مضمون طریقۂ تعلیم پر ہے۔ اس کے لکھنے والے کا نام نہیں ہے۔ مضمون یوں شروع ہوتا ہے "ہندی کو سبق معمولی بلحاظ زمین ویسی ہی کتابوں کا چاہیئے۔ کچھ رواج و رسم پر منحصر نہیں بلکہ اردو کی سلیس قصہ کی کتاب سے اس میں خصوصاً اخبارات ہندیوں کو زیادہ سبب توجہ طبیعت ہوتی ہیں......"

اسی صفحہ پر چار سطروں کے بعد "در بیان تجارت" کا عنوان ہے مضمون نگار کا نام نہیں مضمون یوں شروع ہوتا ہے "تجارت بالایمان ہے و سنت انبیا و صلحا و باعث برکت و تزائد دولت.... عزت و آسودگی و سیر ملک ہے۔" ذکر پیداوار ملک میں پنجاب کی پیداوار کا حال بیان کیا ہے۔ "پنجاب کی پیداوار یہ سب اشیاء ہیں اطراف کالاباغ، پتھر ہر قسم کا، در خصوصاً سنگ سوختہ وغیرہ صفحہ ۳۰ پر ذکر عمارات و انہار کا عنوان ہے اس مضمون میں راولپنڈی کی زیارت گاہ شاہ چراغ اور موضع نورپور میں شاہ بری لطیف اور کہنہ کاک میں شاہ عبداللہ بیابانی کی زیارت گاہوں کا ذکر ہے دو کالم کے اس مضمون کے بعد ریاست اور اس کے انتظام کا ذکر ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ذکر ریاست ہا و انتظام آں" اس کے بھی لکھنے والے کا نام نہیں دیا گیا، مضمون کی ابتدا یوں ہوتی ہے "نظم ریاست ان باتوں پر منحصر ہے۔ عصمتہ سے احتراز، صدق، دوستی مشورہ با دانشمندان اور محبت عقلمندان ـــ دو صفحوں کا مضمون طلسم پر ہے اس میں ایک نقشہ شب قدر معلوم کرنے کا دیا ہے۔ لکھا ہے "نقشہ موجدہ شیخ ابوالحسن شاہ ولی قدس سرہٗ مشعر دریافت شب قدر رمضان کی" نقشہ میں تین خانے ہیں پہلا نمبر کا دوسرا نام روز غرۂ ماہ رمضان تیسرا تاریخ شب قدر جو باعتبار غرہ کے ہو گے" اگر غرہ رمضان شنبہ کو ہوگا تو شب قدر ۲۳ شب رمضان کو پڑے گی۔

۲۶ ویں صفحہ پر حکایات کا سلسلہ ہے جو ۳۸ صفحہ پر ختم ہوتا ہے۔ ۳۹ ویں صفحہ پر غزلیات ہیں پہلی غزل ناسخ کی ہے جس کا مطلع ہے ؎

تکلف چھوڑ کر عزم سفر کو دل میں ٹھانا ہے   خدا جانے قضا کس وقت آئے کیا ٹھکانا ہے

دوسری غزل کسی مجذوب نامی شاعر کی ہے۔ مقطع ہے

بس کہ ہے مجذوب سودا زلف عنبر فام کا   کاسۂ سر ہے یہی ہمارا طبلۂ عطار ہے

چالیسویں صفحہ کے دوسرے کالم کے نصف سے قانون شروع ہو کر ۴۱ ویں صفحہ کے دوسرے کالم کے چوتھائی حصہ پر ختم ہوجاتا ہے قانون کا تعلق مال سے ہے، روپے اور رتن بالوفاکی مانش کے سلسلہ میں سوال و جواب قائم کر کے وضاحت کی ہے۔ ۴۱ ویں صفحہ کے دوسرے کالم سے علم جرثقیل ۴۲ ویں صفحہ کے دوسرے کالم کی پہلی سطر پر ختم ہوجاتا ہے ص۴۲ کے دوسرے کالم پر لطائف کا عنوان ہے اور اس میں ترک دنیا کی تعلیم ہے۔ پھر تاریخ کا موضوع آجاتا ہے اور روس کی تاریخ بیان کی ہے۔ ابتدا یوں ہے۔ "پیٹر اکبر شاہنشاہ روس کی عہد دولت میں اوس ملک کی بزرگی اور روز افزونی شروع ہوئے ہیں...... الخ۔ ۴۵ صفحہ کے آخر میں" باقی بہ نمبر آئندہ میں لکھا ہوا ہے۔ خدا معلوم آئندہ نمبر نکلا بھی کہ نہیں۔

سب سے آخری مضمون دربیان تہذیب اخلاق و نکات ہے جو ۴۸ ویں صفحہ پر ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ایک صفحہ سادہ ہے۔ اندرونی کاغذ بالکل سادہ ہے باہری حصہ میں صفحہ پر ایک خوبصورت باریک سی بیل ہے اور حوض سادہ۔

مضمون نگاروں اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ چشمۂ فیض، دہلی یا اس کے آس پاس رہا ہوگا کیونکہ "در نظم ریاست" کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں سرکار انگریزی کے انتظام حکومت کی تعریف کی گئی ہے مثلاً انتظام سلطنت کے لئے جن امور کی ضرورت ہے اس میں تعینا تی جاسوسیاں و تفقد حال عمائد و ارکان و اہل خدمت و عدل و نیک نیتی و دفع طائفہ دزداں رہزناں و بیدار مغزی بہمہ کارہا موجب بقا و حفظ و مزید سرور و دولت و مملکت ہے یہ باتیں اکثر سرکار انگریزی میں ظاہر ہیں۔ اسی لیے یہ سلطنت روز افزوں اور مستحکم ہے۔ باقی ریاستیں اس ملک کی جیں پٹیالہ کپورتھلہ جموں کابل ہیں۔ ہندستانی ریاستوں میں یہ قیامت ہے کہ سوائے عیش و عشرت کے نظم مملکت پر ملتفت نہیں ہوتے......... ذکر پیداوار ملک میں پنجاب اور ذکر عادات و اخبار میں راولپنڈی اور اسی اطراف کی اجناس و عمارات کا ذکر ہے۔

طریقۂ تعلیم کے عنوان سے جو مضمون ہے اس کے لکھنے والے محمد مردان علی خاں صاحب

(باقی ص۲۳ پر)

حیدر آباد (دکن) کے عجائب خانہ کی اُردو قلمی کتابیں

(نصیرالدین صاحب ہاشمی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

والہ کی مثنوی طالب و موہنی اس سے زیادہ دریائے عشق کے مماثل ہے چنانچہ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک خوبصورت مسلمان مرد طالب نام کا ایک گاؤں کے پن گھٹ پر گزرا۔ یہاں موہنی نام گاؤں کے مہاجن کی حسین و جمیل دختر پانی کے لئے آئی، طالب اس کو دیکھ کر عاشق ہوگیا اور اس کے ساتھ ہولیا جب موہنی اپنے مکان کے اندر چلی گئی تو طالب وہیں بیٹھ گیا جب مہاجن کو معلوم ہوا ایک جوان اس کے دروازہ پر بیٹھا ہے اور اس سے اس کی دختر کی بدنامی ہوتی ہے تو اس نے جوان کو فہمایش کی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں نے کہا دیوانہ ہے جانے دو، آخر مجبور ہو کر گاؤں کے عامل کو مطلع کیا گیا۔ اس نے طالب کو طلب کر کے واقعات معلوم کئے اور جب اس کے سچے عشق سے واقف ہوگیا تو مہاجن سے کہا کہ اس کو اپنے مکان میں حفاظت سے رکھئے رفتہ رفتہ کوئی انتظام کیا جائیگا۔ مہاجن طالب کو اپنے مکان میں مہمان رکھا اور ایک مرتبہ موہنی کے ذریعہ طالب کو کھانا دیا جاتا مگر دونوں کی کبھی بات چیت نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ مہاجن کا ایک سخت گیر ملازم ساتھ ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں ہولی کی عید آئی اور موہنی کی دایہ جو طالب پر مہربان ہوگئی تھی اطلاع دی کہ وہ ایک باغ میں جائے موہنی سے بات چیت ہوسکتی ہے۔ طالب باغ میں موہنی کا منتظر رہا اس کی اطلاع مہاجن کے ملازم کو ہوگئی وہ طالب کو مار ڈالنے کے ارادہ سے روانہ ہوا مگر راستہ میں ایک کالے ناگ نے اس کو ڈس لیا اس طرح طالب کی زندگی بچ گئی مگر مہاجن کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور بخاص لوگوں کے مشورہ سے دایہ جو طالب پر مہربان تھی دوسرے گاؤں کو روانہ کردی گئی اور مشہور کیا گیا کہ موہنی بیمار ہے اور پھر چند روز کے بعد اس کا فرضی جنازہ چلاتے لے چلے طالب غم ماتم کرتا ہوا جنازہ کے ہمراہ ہولیا، لوگوں نے ملامت کی اور طعنہ دیا، معشوق تو مرگیا اور عاشق کہلا کر زندہ ہے۔ طالب پر اس ملامت کا فوری اثر ہوا اور ایک کنوئیں میں گر کر مرگیا۔ اس واقعہ کی جب موہنی کو اطلاع ملی تو وہ اس کنوئیں پر آئی اور اپنے آپ کو اس میں گرادیا۔ لوگوں کو اطلاع ہوئی سب لوگ کنوئیں پر جمع ہوئے اور لاش نکالی گئی تو موہنی کی لاش طالب کی لاش سے ملی ہوئی تھی یعنی عاشق و معشوق دونوں پیوست ہوگئے ہیں ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر کار دونوں کو ایک قبر میں دفن کردیا گیا۔

مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار کے قطع نظر والہ کی مثنوی طالب و موہنی جس طرح دریائے عشق کے ہم معنی ہے اس سے اس امر کا گمان ہوتا ہے میر نے ضرور والہ کی مثنوی دیکھی ہوگی اور اسی کے قصہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی مثنوی دریائے عشق لکھی ہوگی۔

والہ کی مثنوی ۱۸۴؁ھ کے بہت پہلے مرتب ہوئی ہے کیونکہ والہ کا انتقال ۱۱۸۴؁ھ میں ہوا والہ نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ ایک براہمن سے اس نے یہ حالات سنے جس کو اس نے نظم کیا ہے۔ اور میر اس کے بعد عرصہ تک زندہ رہے کیونکہ ان کا انتقال ۱۲۲۵؁ھ میں ہوا ہے بہرحال میر کے افسانہ کو ان کا طبع زاد نہیں کہا جا سکتا۔

اختتام

اپنی قدرت جہاں دکھاتا ہے — اس سے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی قدرت تری زبان میں ہے — کتنی وسعت تری زبان میں ہے
لب پہ اب مُہر خامشی بہتر — اس سخن سے فرامشی بہتر

اس کتاب میں (۱۳) تصاویر ہیں جو دکھنی اسکول کی ہیں مگر اس سے لکھنوی معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دریائے عشق طبع ہو چکی ہے لیکن باتصویر قلمی نسخے نایاب ہیں اس لئے عجائب خانہ کا نسخہ اہمیت رکھتا ہے۔

---

(۱۲) پورن سد پرت دسمی کندہ

نمبر (پی ۲۴۸۰) سائز (۱۱×۶) صفحہ (۵۷۴) سطر (۲۰) خط نستعلیق، کاغذ دیسی،
مصنف: بھوپت رائے کایستھ، تاریخ تصنیف ماقبل ۱۲۰۰؁ھ کتابت ۱۲۱۴؁ھ

اس کے مصنف بھومیش کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئے "ہندی" کے اساتذہ ایک شاعر "بھوپتی" کا تذکرہ ہندی تاریخ ادب میں ملتا ہے، ممکن ہے یہ وہی شاعر ہو۔ مگر اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دکن میں زیادہ مشہور تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے کئی نسخے حیدر آباد میں ہیں ان میں سے کئی نسخے کتب خانہ آصفیہ میں اور دو باتصویر نسخے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ میں دو نسخے ہیں۔

آغاز

شمرون ادھم نجن دیو — جہہ کو روپ دیو نجانب بہوا

جوت روپ بھگوان بدھاتا   پرکھ پران پراتن کو داتا
کیول ناتھ نارائن سوامی   سب جیون کو انتر جامی

اس میں مذہبی نظمیں ہیں اس ضخیم کتاب میں شاعر نے مہابھارت کے دسویں حصے کو ہندی نظم میں قلم بند کیا ہے۔

اختتام

وجہیں دیس نبب میں پورن بھو پران   جو ہت سون گاوے سبے پاوے بد پران
سادھن سون بیتی کرت دھری چرن کی پرتنس   پدہت ست مو دین کو من تج دبھو انس
بنتی دو جے جور کر کرت سو سب گوہی   پدھو برم بو تر ہوے جانیں پاپ نہ ہو

خاتمہ

ات سری بھی کوت مہاپورا ئے سمس کندہ درماہ چیت پورن مانسی بروز چہار شنبہ بتاریخ سیز دہم شہر ذیقعدہ ۱۲۱۴ھ دربلدہ ایلچ پور از خط عاصی رام برائے ولد ہولاس رائے ابن منسبر لعل بن تلسی رام کایستھ سکنہ سابدی بالے۔ تمت تمام شد

اس کتاب میں (۱۸۴) دکنی اسکول کی تصاویر ہیں۔ اس کتاب کے نسخے کتب خانہ آصفیہ میں ہیں۔ عجائب خانہ میں ایک اور نسخہ ہے۔

(۱۴) پورن سد پرت پران دوسرا نسخہ

نمبر (پی ۸ ۴۶۱) سائز (۱۰×۶) صفحہ (۶۲۲) سطر (۱۳) خط شکستہ کاغذ دیسی ناقص اول اور ناقص الآخر ہے۔

آغاز

پاس پاس دیو مہادو   روپ کہرب لوسی نچھاور
جب ہیں بابن چاوک دیٹو   کل نارن مل ٹیکا کیسیو
کنچن بیٹار سنوار کی باتیں دیپک بان
بھونت پر بھو کون ارمی لئے زمین بوجنار

اختتام

بہوا سرن کیول رو دو جہو دیو نرت تروان تن داتسین میں اب پھر با پوکست بدان

جبین پاتا سر بر باپو جدن کرن سو ماچون ابو

ناقص الآخر

اس کتاب میں (۸۱) تصاویر دکھنی اسکول کی شامل ہیں۔ مصور کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

---

(۱۴) رسالہ شطرنج

نمبر (پی ۲۵۴۹) سائز (۹×۵) صفحہ (۱۵۷) خط نستعلیق خوشخط، کاغذ دیسی۔

مصنف سید مصطفے، تاریخ تصنیف ۱۲۶۶ھ، کتابت درج نہیں ہے۔

مصنف نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ صاحبزادہ منور الدولہ منور الملک فرزند سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کا مصاحب تھا اور شطرنج کے کھیلنے میں خوب ماہر تھا۔ نہ صرف کھیل کی مہارت تھی بلکہ اس کی تاریخی ترقی اور مغربی طرز سے بھی اچھی آگاہی تھی۔ اگرچہ مصنف نے اپنے نام کی صراحت کتاب میں کردی ہے مگر اس کو اس طرز اور نہج میں لکھا ہے کہ بادی النظر میں دھوکہ ہوتا ہے۔ حسب ذیل عبارت سے مصنف کے نام کی صراحت کی جاتی ہے۔

"کتنے ایک شاطران عصر اور جانبازان بازی عشق اوس عرصہ بساط کی ملازم اوس بارگاہ عالی کے تھے چنانچہ یہ عاصی پر معاصی کیا گیا۔ سید مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم متخلص شاعر فدوی اوس درگاہ کا تھا۔

آغاز

سپاس بے قیاس اوس شاطر عرصہ قدرت کو سزاوار ہے کہ بنی نوع انسان کو بساط روئے زمین پر مانند مہرہ ہائے شطرنج کے عالی قدر مرتبت عزت و بندگی بخشا اور ہر فرد بشر کے واسطے روبہ معاش کا علیحدہ علیحدہ اور چال چلن جدی جدی مقرر ٹھہرایا۔

اس رسالہ میں شطرنج کھیلنے کے مسائل اور گر لکھے گئے ہیں۔ کتاب ایک مقدمہ اور دو باب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں تین فصل ہیں جو قواعد شطرنج اور شطرنج کے ذکر وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب شطرنج کی چالوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس باب میں کئی اشخاص کی چالوں کا ذکر ہے۔ منور الملک۔ ذوالفقار بیگ۔ قربان علی بیگ وغیرہ کی چالیں بتائی گئی ہیں۔ پھر مغربی

ممالک کے طریقہ شطرنج بازی کا بھی ذکر ہے، فردوسی کے شاہ نامہ سے مدد لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ ایران میں شطرنج رائج تھا اور نوشیروان کے زمانہ میں یہ کھیل ایجاد ہوا۔ کتاب کے لکھنے میں شیر محمد خان ایماد کے رسالہ سے بھی مدد لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب نامکمل ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہی مصنف کا اصلی نسخہ ہے۔

اختتام

"منصوبہ عباس خاں صاحب سرخ سبز کے .... بغیر مزے رخوں کے کرتا ہے"

یہ کتاب شایع نہیں ہوئی اور حیدر آباد کے کسی دوسرے کتب خانہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا۔

"نور علیٰ نور"

(صـ۱۸ کا بقیہ)

تحصیلدار پنڈی کیمپ ضلع راولپنڈی ہیں۔

رسالہ کی زبان اپنے عہد کے مطابق فارسی آمیز اردو ہے، مثلاً "مشورہ با دانشمندان اور صحبت عقلمندان"، تفقد حال اور اکثر حکام کو عادت اور پروری کی ہے۔

ممکن ہے کہ کسی صاحب کو اس پرچہ کا کوئی نمبر کہیں مل جائے اور وہ اس پر اور زیادہ روشنی ڈال سکیں کہ یہ کہاں سے شائع ہوتا تھا، کب تک جاری رہا اور کب بند ہوا؟

عارف باللہ قاضی سید محمود بحری قدس سرہٗ
اور اُن کی تصنیفات

جناب سخاوت مرزا، بی، اے۔ ال، ال، بی (عثمانیہ)

قاضی محمود بحریؒ کے حالات تاریکی میں ہیں۔ قدیم تذکرہ جات شعراء و اولیاء و تواریخ باستثنا، چند آپ کے حالات سے خالی ہیں، جدید مصنفین اور مورخین تاریخ ادب اردو نے بھی سوائے تعارف کے اور کچھ زیادہ حالات نہیں لکھے، حتٰی کہ موجودہ محقق ڈاکٹر حفیظ سید مرتب کلیات بحریؒ[1] نے بھی باوجود اس کے کہ بہت سی مستند تواریخ و تذکرہ جات (انڈیا آفس و برٹش میوزیم) کا حوالہ دیا ہے ان حالات کے علاوہ جو حکیم شمس اللہ قادری مرحوم کی "اردوئے قدیم" میں درج ہیں کچھ قابل قدر اضافہ نہیں فرمایا۔ معاصرین شعرا بحری کی تفصیل میں موصوف نے کوئی تذکرہ نہیں چھوڑا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تذکرہ بہار و خزاں مؤلفہ بہاؤالدین عروج بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزرا ہے۔ ہم نے بہت کچھ کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ وہ سالہا سال گزرے چوری ہو چکا ہے اور پھر سوال یہ ہے کہ عروج کا تذکرہ فارسی شعراء کا ہے یا اردو شعراء کا۔ تذکرۂ مذکور ایک صاحب کے پاس موجود ہے اُس میں تو سب فارسی شعراء کا کلام ہے؟ غرض بحری اور ان کے حقیقی معاصرین پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ البتہ کلیات بحری پر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا تبصرہ[2] بہت کچھ وزن رکھتا ہے تاہم اس تبصرے میں بھی بعض فرو گذاشتیں ہیں (مثلاً ڈاکٹر حفیظ سید کا یہ بیان کہ سراج اورنگ آبادی $\frac{۱۱۲۴}{۱۱۱۲}$ھ بحری کے معاصر تھے کس حد تک درست ہے؛ جبکہ بحری کی وفات کے وقت سراج نہایت کم سن تھے بعض اشعار کی تنقید اور دکھنی تلفظ کے سمجھنے میں بھی غلطی ہوگئی ہے) جس کا ہم آیندہ سطور میں ذکر کریں گے۔

بحری کے حالات کے ماخذ کتاب الاعراس و لب الاعراس، بساتین السلاطین و گلدستہ بیجاپور، اور سب سے اہم ماخذ خود بحری کی تصنیف عروس عرفان ہے جو ان کے ملفوظات کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز ہم نے شجرہ جات اور اسناد خاندانی اور بہت سی دوسری کتابوں کی مدد سے یہ مختصر اور بڑی حد تک جامع حالات مرتب کئے ہیں۔

---

[1] کلیات بحری مطبوعہ نولکشور لکھنؤ بابت ۱۹۳۹ء

[2] علی گڑھ میگزین دسمبر ۱۹۳۹ء

ہماری رائے میں بحری کے متعلق سب سے پہلے، محمد نجیب ناگوری رح نے اپنی تالیف کتاب الاعراس[51] تالیف ۱۱۵۵ھ میں ذکر کیا ہے۔ تالیف مذکور دراصل مخزن الاعراس مؤلفۂ شیخ شرف الدین ابن قاضی شیخ محمد نہروالی کا تکملہ ہے۔ اس میں مولانا ناگوری رح نے جنوبی ہند و دکن کے بہت سے اولیاء اللہ کے اعراس کی تاریخیں اضافہ کی ہیں، اس میں نہ صرف قاضی محمود بحری رح بلکہ ان کے پیر و مرشد شاہ محمد باقر[52] کی تاریخ وفات اور مقام مدفن وغیرہ درج ہے۔ یہ تالیف بحری رح کے وصال سے قریب ترین زمانہ یعنی چھبیس سال بعد ہی کی ہے۔ جس میں مؤلف مذکور نے، قاضی صاحب رح کے متعلق مختصر طور پر یہ لکھا ہے:

شیخ محمود بحری ابن شیخ فخر الدین مرید و خلیفہ شیخ محمد باقر روز جمعہ در سال یک ہزار و یک صد و بست و نہ، سلسلۂ قادریہ، قبر در گوگی سرکار سگر عرف نصرت آباد، صوبہ بیجاپور دکن، از سید احمد مرید و خلیفہ و ہمشیر زادۂ ایشان شنیدہ (ص ۱۲۸ کتاب الاعراس مطبوعہ) بحری کے والد کا نام بجائے بحر الدین کے فخر الدین غلط لکھا ہے غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

اور ص ۱۴۱ پر بحری کے پیر طریقت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"شیخ محمد باقر قادری مرید و خلیفہ شاہ عبد الستار کہ در چیگری تعلقہ ادونی صوبہ بیجاپور آسودہ روز شنبہ در سال یک ہزار و ہفتاد و سہ، قبر در گوگی سرکار صوبہ بیجاپور از سید احمد مرید ایشان شنیدہ۔"

مگر سید شاہ حسین محرم[53] نیلوری رح نبیرہ شاہ حسین مجرم نیلوری رح (مدراس) اپنی شرح من لگن[54] میں بحوالہ تالیف خود لب الاعراس جس میں بعض اور اولیاء کے پیران طریقت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

"شیخ محمد باقر قادری مرید و خلیفہ سید عبد الستار قادری کہ در چیگری تعلقہ ادونی صوبہ بیجاپور آسودہ اندو وے از عم خود سید[55] اشرف قادری و وے از پدر خود سید ابو الحسن قادری ہمچنیں تا محبوب سبحانی سلطان الاولیاء رض میرسد، وفات در سنہ یک ہزار و ہفتاد و سہ یازدہم شوال مزار در گوگی کذا فی مخزن الاعراس وغیرہ"

---

[51] کتاب الاعراس مطبوعہ نول کشور، رسالہ معارف ۱۹۴۸ء میں گجرات کے کتب خانوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ تالیف نظام الدین اورنگ آبادی کی ہے [52] کتاب الاعراس مطبوعہ ص ۱۴۱

[53] شاہ حسین محرم نبیرہ شاہ حسین مجرم (وفات ۱۲۵۰ھ)، نیلوری مرشد مولانا عبد الرحمن شاطر مدراسی دیکھو اعجاز عشق از شاطر مطبوعہ ص ۳۴-۹ [54] شرح من لگن مخطوطہ آصفیہ ۱۶۶۸ ص پر اپنی کتاب لب الاعراس کا حوالہ دیا ہے۔ لب الاعراس نظر سے نہیں گزری۔

[55] رسالہ پیران ہادی۔ (بیاض قلمی مولوی عبد اللہ نیرنگ کرنولی)

ان مولفین نے بحری کی تاریخ وفات ۱۱۲۹ھ[51]، اور شاہ محمد باقرؒ کی ۱۱۰۲ھ لکھی ہے، جس کی مطابقت تاریخ ہائے وصال مندرجہ واقعات مملکت بیجاپور وغیرہ سے نہیں ہوتی، بحری کا وصال ۱۱۳۰ھ میں ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ باقرؒ ۱۱۸۹ھ[51] میں واصل بحق ہوئے۔ قطعہ تاریخ خود بحری نے کہا تھا، مگر ۱۱۸۹ھ بھی غلط ہے اس میں تخرجہ کی بحث ہے۔ جس پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ مولوی محمد عبد اللہ نیرنگ (کڑپہ) نے اپنی بیاض قلمی میں سید میراں محمد اشرف ابن شیخ ابوالحسنؒ کو بھروچی لکھا ہے۔ صاحب موصوف کا ماخذ ایک کتاب "رسالہ پیران ہادی" و نسب نامہ امیر بادشاہ قلمی ہے۔

تیسرا ماخذ دکن کی مشہور تاریخ بساتین السلاطین[52] مولفہ محمد ابراہیم زبیری بیجاپوری ہے جو ۱۲۴۱ھ کی تالیف ہے یعنی حضرت بحریؒ کی وفات سے ایک صدی بعد کی مگر زبیری کا ماخذ خود بحریؒ کی تصنیف عروس عرفان تصنیف ۱۱۱۷ھ ہے۔ مولف مذکور نے سلطان سکندر عادل شاہ ۱۰۸۳ھ/۱۰۹۷ھ کے حالات کے ضمن میں بحریؒ اور سلطان سکندر کے باہمی مکالمہ تحقیق روح وغیرہ کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ سکندر عادل شاہ نے شاہ نعیم اللہ بخاریؒ کے علاوہ بحریؒ سے بھی استفادہ کیا تھا، کہتا ہے :-

نیز در صحبت دیگر کاملان زمان و صاحب دلان آوان رسیدہ ذہا بر داشتہ و فایدہا حاصل نمودہ چنانچہ مست بادہ عرفان سرشار خمخانۂ وجدان عارف باللہ شیخ محمود بحری صاحب عروس عرفان در زیور روح می نویسد سببے با سکندر عادل خان کہ ختم والیان بیجاپور است چنیں صحبت ہا، اتفاق افتادہ بود بلکہ مخبر گاہ خسرو لیش یک دو سال سکونت داشتم روزے بکمال ادب و اختصاص برسید کہ روح چیست الخ

.... کے متعلق سلطان سکندر نے سوالات کئے تھے۔ اور دوسرے زیور میں دنیا کی حقیقت کے متعلق سلطان سکندر نے سوالات کئے تھے۔

بساطین السلاطین کے سوا ایک اور تاریخ گلدستہ بیجاپور مولفۂ خواجہ میر احمد علی خان میں ہے حالات بجنسہ وہی ہیں جو مولف بساتین نے لکھے ہیں۔

ان کے سوا شیخ محمود بحریؒ کی تصانیف خصوصاً دکن کے محققین صوفیاء میں بڑی مقبول رہی ہیں، ان کی تصانیف میں بھی بحری کے اشعار کے حوالے ملتے ہیں۔ ہمارے ناقص خیال میں شاید سب سے پہلی کتاب

---

[50] انوار جلالیہ صفحہ مطبوعہ مؤلفہ سید محمد حسینی سجادہ درگاہ سید چندا حسینی گوگی مطبوعہ اعظم اطیم پریس حیدر آباد و واقعات مملکت بیجاپور مؤلفۂ مولوی بشیر الدین احمد مطبوعہ صفحہ ۳۶۷

[52] بساطین السلاطین قلمی ۲۶۶ مملوکہ حق۔

جو دکن کے صوفیا، مدراس میں مقبول رہی ہے وہ اساس المعرفت[51] مصنفۂ خواجہ کمال الدین صدیقیؒ ہے جو شاہ کمال گرم کنڈوی (کڑپہ) کے خاص دوست اور معاصر تھے۔ اور شاید یہ وہی فاضل اجل ہیں جن کو مولوی مہدی واصف مدراسی مولف[53] حدیقۃ المرام نے اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ غرض مصنف اساس المعرفت نے بحریؒ کی عروس عرفان سے قال اور حال کی معرکۃ الآرا بحث پر بحری کے مشہور اشعار نقل کئے ہیں، جو قاضی صاحبؒ نے حضرت سید شاہ رزاق اللہ حسینیؒ[54] معاصر عالمگیر[55] کی ملاقات کے ضمن میں کہے تھے چنانچہ لکھتے ہیں "قاضی بحری قدس سرہٗ در مقدمۂ عروس العرفان خود می فرماید ؎

حال را دانند مردم بہ ز قال   لاکنم در دل چنیں سرزد خیال
حال بس مفت است نزد عارفان   قال را صد مایہ باشد اے جوان الخ

چنانچہ فرماتے ہیں:-

"خواجہ کمال الدین ہرکان صاحب العلم والفضل و صاحب الجاہ والمال، رایتہ[56] فی سن الصبا، فی محمد پور رحمتہ اللہ علیہ"

بحری کی من لگن اور عروس عرفان ہی نہیں بلکہ دیوان بھی خصوصاً دکن کے صوفی شعرا میں معروف تھا، چنانچہ راجوٹی (کڑپہ) کے مشہور صوفی سید محمد حسینی شاہ میر[57] المتوفی ۱۱۸۶ھ نے اپنی تصنیف انتباہ الطالبین[58] (تصنیف تقریباً ۱۱۶۸ھ) میں بحری کا ایک شعر سنداً لکھا ہے جو یہ ہے ؎

گر نین ہے موحد متوکل تو بی کچھ نین   توحید کے کھڑے پو توکل سون ہے پانی

نیز بحری کے ایک فارسی شعر کی بھی توضیح و تشریح کی ہے جو یہ ہے ؎

گنج مخفی شاہد اول بود ذات احد   شاہد ثانی خلقت الخلق نور احمدی

نیز شاہ میر صاحبؒ کے برادر خورد[59] (وفات ۱۲۲۴ھ) نے بھی من لگن کے ابتدائی دو شعر (؟) اے ردپ ترارتی رتی ہے الخ اپنی تصنیف کلمات کمالیہ میں سنداً نقل کئے ہیں۔ اور بحری کے ایک مصرعہ

---

۵۱ اساس المعرفت قلمی کتب خانہ آصفیہ و مطبوعہ حیدرآباد ص۱۲۹ ، ۵۲ دیوان مخزن عربی مصنفہ شاہ کمالؒ قلمی کتب خانہ سید قادر علی بادشاہ (کڑپہ) ۵۳ حدیقۃ المرام کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد (تذکرہ عربی) ۵۴ عروس عرفان قلمی آصفیہ ورق ص۱۴ ۲۵۹ (مکتوبہ ۱۲۹۰ھ از نسخہ خاص مصنف) ۵۵ تاریخ محمدیہ مؤلفۂ جہاں نما علی شاہ مطبوعہ ص ۵۶ اساس المعرفت مطبوعہ ص۱۲۹ محبوب النظایر حیدرآباد ۱۳۴۰ھ۔ ۵۷ نوائے ادب بمبئی ۱۹۵۳ء

۵۸ انتباہ الطالبین مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۸ھ

۵۹ کلمات کمالیہ فارسی قلمی آصفیہ ص

پر عربی گرہ بھی لگائی ہے جو یہ ہے ؎ فیما ظہر ابداً جمالہ　　اس بات کو ثبوت نا بدانا[۵۱]
تو کیا بحری کا یہ مصرعہ ضرب المثل ہوگیا تھا؟ نیز شاہ صاحب رح نے بحری کے مشہور فارسی شعر ؎

قال را صد مایہ باشد اے جوان　　حال بس مفت است نزد عارفان

کی یوں ترجمانی کی ہے ؎

قال کو چاہیئے ہزار فنون　　حال کو بس ہے یک جنون جوشی

نیز مؤلف انشاء چمنستان سخن[۵۲]، بندہ علی ابن شمشیر علی المخاطب بہ عطارد رقم خان از اولاد سید مخدوم زندہ رفیق، نظام شاہ بحری بیجاپوری، منشی جمدۃ الملک اکبر جاہ ابن آصف جاہ ثانی (۱۲۱۸ھ) نے بحری کا ایک عارفانہ طرز کا بہترین مکتوب نقل کیا ہے۔ جس میں مشہور انشاء پردازوں کے مختلف نمونے مثلاً مہر نویسی اور رنگ زیب ہدایت نویسی رقعہ مقبول باری شیخ محمود بحری وغیرہ جمع کئے ہیں
من لگن کی سب سے پہلی فرہنگ الموسوم بہ ارت من لگن[۵۳] مولانا سید شاہ اسمٰعیل قادری ملتانی الورنگلی نے بایماء نواب شہامت جنگ غالباً نواب انورالدین خاں شہید گوپاموی (وفات ۱۱۶۲ھ) یا ان کے فرزند نواب محفوظ خاں شہامت جنگ[۵۴] (وفات ۱۱۹۳ھ) نے لکھی، محفوظ خاں بڑے زبردست عالم تھے۔ جن کو نواب آصف جاہ نے بوجہ مبلغ علم، جلدیں (۹) تحفۃً عطا فرمائی تھیں۔
من لگن کے اشعار سید شاہ غلام محی الدین ویلوری وفات (۱۲۸۹ھ) کی کتاب تنبیہ الجاہلین[۵۵] اردو مطبوعہ اور جان سخن[۵۶] شرح رسالہ سفر در وطن، مرتبۂ آصف یار الملک وزیر حیدرآبادی وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔
تذکرہ جات شعراء دکن و اولیاء دکن و تذکرہ جات شمالی ہند میں بحری کے حالات نہ مل سکے مگر یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ شمالی ہند کے مشہور تذکرۂ شعرا، مؤلفۂ میر حسن تالیف ۱۱۹۲/۱۱۹۴ھ، میں جو بحری کی وفات سے ساٹھ باسٹھ سال کی تصنیف ہے۔ بحری کی غزل کا ایک شعر درج ہے۔ جس کو غلط طور پر سلطان ابوالحسن تاناشاہ والی گولکنڈہ (۱۰۸۳/۱۰۹۸ھ) کی طرف منسوب کرتے چلے آتے ہیں جو یہ ہے ؎

کس دھر کھون کان جادن میں دل پہ بہن پہ بھراٹ ہے
اک بات گئے ہوں گی سجن یان جیو بارا باٹ ہے

---

[۵۱] کلیات مخزن العرفان مصنفہ شاہ کمال رح مطبوعہ بنگلور ۱۳۰۳ھ [۵۲] انشاء چمنستان سخن قلمی کتب خانہ آصفیہ [۵۳] ارزوئے قدیم ص [۵۴] تذکرۂ گلزار اعظم مطبوعہ مدراس ص — وتذکرۂ شعراء دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری [۵۵] تنبیہ الجاہلین مطبوعہ [۵۶] جان سخن مطبوعہ (آصفیہ) [۵۷] تذکرۂ میر حسن مطبوعہ علی گڈھ ص ۶۸

بحری کی یہ غزل پانچ بیت کی ہے ۔ اور کلیات بحری مطبوعہ میں موجود ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

مطلع ۱
جا بان کان پوچھوں کسے منج پر کیل بچھراٹ ہے
یک ماٹ گئی ہوں گے سجن پن جیو بارا باٹ ہے

مقطع ؎
بحری بہت سنبال توں اپنا پرانا پیسر ہن
یعنی گلی یو برہ کی بہو لوگ ڈاٹا ڈاٹ ہے

مرزا علی لطف نے تذکرۂ گلشن ہند[۵۱] (تالیف ۱۲۱۵ھ) میں تذکرۂ گلزار ابراہیم مؤلفہٗ نواب علی ابراہیم خاں (تالیف ۱۱۹۸ھ) سے، اس بیان کے ساتھ نقل کیا ہے ۔

"غرض شاہ عالی جاہ تانا شاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار محاورۂ دکن کے اور بندش قدیم کے اس مطلع میں ہے ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی ، گوش دل کو دھرتے ہیں "

غرض وہی بحری کا مطلع لوگوں کی سُنی سنائی باتوں پر ابوالحسن تانا شاہ سے منسوب کر دیا ہے جس کی تتبع میں بہت سے مشہور تذکرہ نویس مثلاً سید علی اصغر بلگرامی[۵۲]، مولوی طاہر بخش کاکوروی[۵۳] فرزند نیر مرحوم، حکیم شمس اللہ قادری مولف اردوئے قدیم، وغیرہ تانا شاہ سے اس شعر کو منسوب کرتے چلے آتے ہیں، اور ڈاکٹر حفیظ سید نے کلیات بحری میں اس غزل کو نقل تو کیا ہے۔ مگر اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

بحری ابوالحسن تانا شاہ کے معاصر تھے، اور فتح گولکنڈہ سے کچھ عرصہ قبل بھاگ نگر (حیدر آباد) آئے تھے، قرین قیاس ہے کہ یہ غزل بحری نے حیدر آباد میں کہی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اور فتح گولکنڈہ کے خلفشار کے زمانہ میں یہ مطلع ابوالحسن تانا شاہ سے منسوب کر دیا گیا۔ بحری کی پوری غزل یہ ہے ؎

اب جا دن کان پوچھوں کسے منج پر بکل بچھراٹ ہے	یک باٹ گئے ہوں گے سجن پن جیو بارا باٹ ہے
جان بیقراری برہ کی تان کیا گدا کیا بادشہ	جو ہر سوں جڑیا تخت جنوں کمبل سوں بھریا کھاٹ ہے
نیں کون میرا سر سو کیا اس عشق کی شمشیر تے	دن عید اضحیٰ کے نمن سب ٹھار کاٹا کاٹ ہے
یارب رہنا کیوں ہوے گا مل اس دلاور عشق سوں	مغرب میں للکارے تو جن مشرق میں ٹھاٹا ٹھاٹ ہے

[۵۱] تذکرۂ گلشن ہند مولفہ علی لطف مطبوعہ [۵۲] رسالہ ذخیرہ حیدر آباد مئی ۱۹۱۶ء
[۵۳] رسالہ ہندستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۷ء

بحری بہت سنبال تون اپنا پرانا پیرہن یعنی گلی یو برہ کی بہلوگ ڈاٹا ڈاٹ ہے

جدید تذکرہ نویسوں اور مضمون نگاروں میں واقعہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے بحریؒ پر ایک مضمون مولوی محمد علی عرش ملیح آبادی[51] کا رسالہ دبدبۂ آصفی بابتہ ۱۳۲۴ھ میں چھپا تھا، اس کے بعد اسی رسالہ کی کسی دوسری اشاعت میں مولوی مودود احمد تشنہ کا شائع ہوا۔ نیز رسالہ "دستور آصفی" جو سگر مضافات گوگی سے نکلتا تھا، جلد ۱ نمبر ۳و۲ بابتہ خورداد وتیر ۱۳۳۷ف میں کچھ حالات لکھے تھے، اس کے کچھ عرصہ بعد مولوی سید علی اصغر بلگرامی مددگار ہوم آفس نے آثار قدیمہ کے ضمن میں تعلقات ضلع گلبرگہ شریف و اورنگ آباد وغیرہ کا دورہ کیا۔ نصرت آباد، سگر، شاہ پور اور گوگی بھی تشریف لے گئے، اور ۱۹۲۲ء ۱۳۳۲ف میں رپورٹ[52] شائع کی، جس میں بحری کے وطن، وفات، مدفن اور تصنیفات مثنوی من لگن اور عروس عرفان کا ذکر فرمایا ہے۔

دوسرا تذکرۂ تاریخ اردوئے قدیم مولفۂ سید شمس اللہ قادری جو سب سے پہلے رسالہ تاج حیدرآباد ۱۳۳۴ف میں شائع ہوا۔ نیز دکن میں اردو[53] مولفۂ نصیر الدین ہاشمی و اردو شہ پارے[54] زور و شعرالہند[55] مولفہ عبدالسلام ندوی، گل رعنا[56] مولفۂ حکیم عبدالحی ندوی اور ترجمہ تاریخ ادب اردو[57] مولفۂ رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر حفیظ سید کا مقدمہ کلیات بحری و دیوان بحری ہے اور تقریباً ایک دوسرے کی نقل ہے البتہ ڈاکٹر حفیظ سید کے کلیات میں سب سے اہم چیز "دیوان بحری" ہے۔ جو حقیقتہً نادر و نایاب ہے مگر غلطیوں سے خالی نہیں موصوف کو دکھنی تلفظ اور رسم الخط کی وجہ سے بعض جگہ غلط فہمی بھی ہوئی ہے۔ دوسری سب سے اہم فہرست اردو مخطوطات[58] جامعہ عثمانیہ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ہے جو بابائے اردو ڈاکٹر (مولوی) عبدالحق و ڈاکٹر سجاد مرتب ہوئی جس میں بحری کی من لگن کے ضمن میں بہت سی فارسی مثنویات کا ذکر ہے۔ جس سے بحری کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ جس کی تفصیل ہم تصنیفات بحری کے سلسلہ میں کریں گے۔ ہماری مزید تحقیقات میں بحریؒ کے حالات کا بہترین ماخذ عروس عرفان[59] خود ان کی تصنیف ہے۔ جس میں ان کے معاصرین اولیاء امرا، تعلیم و تربیت، مرشد

---

[51] رسالہ دبدبۂ آصفی کتب خانہ شاد (مہاراجہ کشن پرشاد بہادر) [52] رپورٹ آثار قدیمہ ۲۴-۱۹۲۲ کتب خانہ محکمہ آثار قدیمہ ص۲۴ مرتبہ مولوی سید علی اصغر بلگرامی [53] دکن میں اردو مولفہ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ ص۲۲ (طبع سوم) [54] اردو شہ پارے مولفۂ ڈاکٹر زور حیدرآبادی ص۱۳۹ مطبوعہ ۱۹۲۹ء [55] شعرالہند مرتبۂ عبدالسلام ندوی جلد ۲ ص۲۰۹، [56] گل رعنا، مطبوعہ۔ [57] ترجمہ تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ۔ [58] فہرست اردو مخطوطات جامعۂ عثمانیہ مطبوعہ جلد ۲، [59] عروس عرفان قلمی (آصفیہ) (۳۵۹م) فہرست مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مرتبہ ایوانو مطبوعہ ۱۹۲۴ء و انڈیا آفس مرتبہ ہرمن ایتھے بابت ۱۹۰۳ء مطبوعہ کتب خانہ محمد اشرف صاحب حسینی نیر۔

بلکہ دادا مرشد، والد ماجد، راجگان علاقہ سگر، گوگی، وغیرہ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

نیز موصوف کا شجرۂ خلافت[۵۱]، اور اسناد[۵۲] معاش کے نقول عطیہ سکندر عادل شاہ وشہنشاہ عالمگیر بھی بہ تلاش بسیار ہم نے فراہم کئے مگر افسوس یہ ہے کہ نسب نامہ دستیاب نہ ہوسکا بیان کیا جاتا ہے کہ پولیس ایکشن کی گڑبڑ اور ہنگامہ کی نذر ہوگیا۔ غرض ہم یہاں ان ماخذات کی مدد سے حضرت بحریؒ کی زندگی وشاعری اور تعلیمات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

نام ونسب :۔ سید محمود لقب وتخلص بحری ابن قاضی سید بحر الدین عرف قاضی دریا ابن قاضی امام اللہ حسینی ابن قاضی شفیع الدین ابن قاضی اسحاق حسینی ابن قاضی داؤد حسینی ابن قاضی عبد الرزاق حسینی ابن قاضی محمود حسینی ابن قاضی سیران حسینی، ابن قاضی محمد حسینی ابن قاضی مخدوم حسینی۔ ابن قاضی داؤد حسینی ...... ابن حضرت سید جلال مکرانیؒ؛ قدس سرہٗ وطن آبائی دھناسیر یا دھناسری (علاقہ مدراس)۔ اور وطن مابعد گوگی[۵۳] (ضلع گلبرگہ شریف) کہا جاتا ہے کہ مدراس میں ایک مقام دھناسری ہے مگر کہاں ہے پتہ نہیں چلتا۔ ایک قصبہ دھناسری ضلع بیدر میں، شہر بیدر سے پندرہ میل ہے۔ ہمارا قیاس ہے کہ بیدر شریف میں سید جلال الدین چنداشاہؒ کا وطن ہے چنانچہ حضرت

---

[۵۱] شجرۂ خلافت بحری کتب خانہ مسعود بحری [۵۲] نقول اسناد معاش مملوکہ سید محمود بحری نبیرۂ قاضی محمود بحری سجادہ نشین، وسند مملوکہ ہمشیرہ مولوی عزیز الدین وکیل۔

[۵۳] گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ شریف) شاہ پور سے ۸ میل ہے اور موجودہ تحقیقات کی رو سے جنوبی ہند کا نہایت قدیم ماقبل تاریخ شہر ہے۔ جہاں سے حجری دور کے آلات و اوزار برآمد ہوئے ہیں (دیکھو مقالہ مولوی سید یوسف نائب ناظم آثار قدیمہ مشمولہ روداد تاریخی کانگریس منعقدہ حیدرآباد بابت ۱۹۴۶ء) گوگی میں سب سے قدیم کتبہ اسلامی دور کا سلطان محمد تغلق ۷۳۸ھ / ۱۳۳۸ء قلعہ استاد آباد سے متعلق ہے جو اب اربعہ مسجد گوگی میں محفوظ ہے، گوگی، یوسف عادل خاں کی جاگیر میں شامل تھا عطیہ سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی نے یہاں سید جلال الدین الملقب بہ چنداشاہ وفات ۸۵۸ھ / ۱۴۵۴ء جو احمد شاہ ولی بہمنی وسلطان علاء الدین حسن بہمنی کے معاصر تھے۔ یہاں سے ۸ میل دکن کا مشہور قلعہ 'سگر' ہے جہاں مجاہد اعظم شیخ محمد محمود صوفی سرمست ۵۵۹ھ / ۱۱۶۳ء تا ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ء کی درگاہ ہے۔ یوسف عادل شاہ، حضرت چنداشاہ کا مرید ومعتقد تھا۔ پہلے چار سلاطین عادل شاہیہ یہاں دفن ہیں۔ حضرت صوفی سرمست گھوگرڈ (ڈہلی) اور حضرت جلال الدین چنداجو ایک واسطہ سے حضرت میراشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ شریف) کے خلیفہ تھے۔ گوگی ان حضرت کے فیوض وبرکات، اور اولاد وافکار کی وجہ سے علم وفضل اور تعلیم باطنی تصوف کا مرکز رہا ہے۔ صوفی سرمست حضرت محبوب الٰہی کے خلیفہ تھے۔ (اپی گرافا انڈو مسلیمکا مرتبہ غلام یزدانی ۳۲-۳۳ء)

چند ا شاہ کی والدہ ماجدہ بی بی فردوس رح اور عم بزرگوار عجب شیر حسینی اور جد امجد سید خضر حسینی بیدر شریف میں باحا طۂ جو کھنڈی سید شاہ خلیل اللہ بت شکن رح آسودہ ہیں، اس خاندان سے قدیم تعلقات کی وجہ سے بحری رح کے والد ماجد میر بحر الدین رح شاید دھنا سری (بیدر) سے، گوگی آگئے ہوں۔ (۵۰ انوا جلالی)

سادات، سبز پوش،[۵۱] از اولاد حضرت میراں محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی بغدادی رض، شاہ عبد الغفار حسینی مسکین[۵۲] خلیفہ قطب ویلوری شارح و مرتب من لگن نے وفات (۹) بحری کے والد کا نام بجائے بحر الدین کے وجیہہ الدین گجراتی مصنف سبرس بیان کیا ہے۔ مگر اس کی تردید خود بحری کے اس بیان سے ہو جاتی ہے:

"سر خیل خلل دماغان قاضی محمود بحری ولد قاضی بحر الدین المعروف بقاضی دریا[۵۳]"

دوسری جگہ اس طرح اشارہ کیا ہے

"غواص بحر صفا قاضی بحر الدین المشہور بقاضی دریا کہ پدر فقیر است" ~~

از بحر بر آمدم یقین است نام پدرم چو بحر دین است

بحری لقب کی وجہ تسمیہ یا تو والد کے نام کی مناسبت سے ہو سکتی ہے یا مرشد کے لقب "بحری" کے لحاظ سے مگر بحری کوئی سلسلۂ طریقت نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قاضی بحر الدین شیخ تھے یا سادات، خود قاضی صاحب نے اپنے نام کے ساتھ میر یا سید نہیں لکھا، اور نسب نامہ بھی موجود نہیں ہے۔ مگر آپ کی اولاد و احفاد اب بھی موجود ہے۔ اور شجرہ میں[۵۴] آپ کے پوتوں کے بعض ناموں کے ساتھ لفظ سید لکھا ہوا ہے۔ اور خود موجودہ

---

۵۱ سادات سبز پوش، بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خاندان مدینہ شریف سے بزمانہ سکندر لودی (۸۹۴-۹۲۳ھ) ہندوستان وارد ہوئے تھے، ایک بزرگ شیخ عبد اللہ گورکھپور میں زمیندار تھے، سبز لباس، خصوصاً عمامہ، قبا، مابہ الامتیاز ہے۔ دکن میں کب وارد ہوئے صحیح پتہ نہیں چلتا، ایک بزرگ گلبرگہ سے رائچور آئے ان کا خاندان اب بھی موجود ہے۔ غالباً سلاطین بہمنیہ و عادل شاہیہ کے زمانہ میں ان کی قدر و منزلت ہوئی ہوگی مگر یہ دراصل سادات کا بانا ہے، کوئی تخصیص نہیں معلوم ہوتی۔ سبز پوش خاندان کاکوری (لکھنؤ) اور سندھ میں بھی آباد ہیں۔

۵۲ عینی شاہ نظامی نے شاہ مسکین کی سوانح طبع کرائی ہے، شاہ عبد الغفار حسینی نام (از اولاد شاہ عالم گجراتی) غنی شاہ مرید تھے۔ شاہ صاحب نے من لگن معہ شرح و فرہنگ ۱۳۱۶ھ میں مرتب کی تھی ۱۳۵۳ھ میں مدراس میں چھپی ہے۔ شاہ مسکین رح سید شاہ غلام محی الدین ویلوری (وفات ۱۲۸۹ھ) کے خلیفہ اور شاہ عبد الحی داعظ بنگلوری کے پیر بھائی تھے۔ ۵۳ عروس عرفان قلمی آصفیہ ص۲۵۹

۵۳ عروس عرفان قلمی آصفیہ ص۲۵۹ ۵۴ شجرۂ خلافت مملوکہ سید محمود بحری سجادہ گوگی۔

سجادہ صاحب کا بیان ہے کہ وہ سادات سبز پوش، قادری اور حضرت پیرانِ پیر غوث الاعظم رض بغدادی کی اولاد سے ہیں۔ چونکہ بحری رح نے بھی خود اپنے چچا اور خسر کا نام عروس عرفان میں ایک جگہ میر شفیع اللہ[۵۱] لکھا ہے اس لئے بحری رح کے سید ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

بحری کے آباد اجداد کے اصل وطن کا پتہ نہیں چلا۔ دراصل ان کا خاندان بیجاپوری ہے یا گجرات سے تعلق رکھتا ہے۔ مسکین شاہ آرکاٹی نے ان کو گجراتی لکھا ہے۔ اور والد کا نام وجیہ الدین گجراتی مصنف سبرس بیان کیا ہے، سبرس کا مصنف تو وہی مشہور شاعر وجہی گولکنڈوی ہے۔ مگر یہاں ایک چیز غور طلب ہے اس لئے کہ "سبرس" نام کی دکھنی زبان میں کئی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ میراں جی شمس العشاق وفات (۹۰۲ھ) نے بھی ایک سبرس لکھی تھی جس پر ایک مضمون پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کا رسالہ "النور[۵۲]" حیدرآباد بابت شعبان ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا تھا، مگر ابتدائی سطور کے مقابلہ سے یہ سبرس، دراصل ملک الشعرا وجہی کی "تاج الحقایق" معلوم ہوتی ہے اور نسخہ تاج الحقایق، مخزونہ کتب خانہ جامعہ بمبئی کی ابتدائی تحریر، مندرجہ فہرست مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز[۵۳] سے مطابقت ہوتی ہے؟۔ یا شاہ مسکین کو جو خود بھی گجرات سے تعلق رکھتے تھے، اور شاہ عالم گجراتی کی اولاد سے ہیں، مغالطہ ہوا، اور مشہور شاعر وجیہ الدین وجہی گولکنڈوی سے ان کو خلط ملط کر دیا۔ یا وجیہ الدین گجراتی بحری کے اجداد میں کوئی بزرگ تھے اور "سبرس" نام کی کوئی کتاب لکھی تھی؟ بحری کے والد کے نام کے ساتھ "قاضی دریا" کے لقب سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کا تعلق گجرات کے کسی دریائی خاندان سے تھا، گجرات میں ایک مشہور بزرگ قاضی محمود دریائی مرید شاہ عالم گجراتی گزرے ہیں (تحفۃ الکرام از ملی شیر قانع[۵۴]) اور جب یہ حضرت پیران پیر رح کی اولاد سے ہیں تو تسعۂ قادریہ دکن کی کسی نہ شاخ سے ان کا تعلق ہونا چاہئے گلبرگہ کی شاخ سید یوسف شرف جہاں رح (معاصر سلاطین بہمنیہ) یا رائچور کے خاندان شاہ حضرت قادری انا ھسور سے یا گولکنڈہ و کرنول کے حموی خاندان سے، مگر کوئی صحیح پتہ نہیں چلتا۔ آپ کا شجرۂ خلافت حضرت غوث اعظم رض کے نبیرہ حضرت ابو صالح آمر رح سے ملتا ہے۔ شجرہ بھی مسلسل نہیں بلحاظ خلافت بعض دوسرے نام بھی آ گئے ہیں۔ البتہ بعض ناموں یعنی سید موسیٰ ابن۔۔۔۔ سے پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلہ کے بزرگ گولکنڈہ کے مشہور بزرگ میراں ابدال حموی رح کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

۵۱ عروس عرفان (قلمی آصفیہ) ۵۲ رسالہ النور حیدرآباد (کتب خانہ عمر یافعی صاحب حیدرآباد)
۵۳ فہرست کتب خانہ بمبئی یونیورسٹی مطبوعہ ۵۴ تحفۃ الکرام مطبوعہ

بحری کے والد ماجد قاضی بحرالدین عرف قاضی دریا بڑے اہل دل تھے، اور دھنا سیر علاقہ مدراس کے قاضی تھے۔ مؤلف انوار جلالیہ[۵۱]، شاہ محمد حسینی سجادہ درگاہ سید جلال الدین چندا شاہ گوگی نے لکھا ہے کہ "محمود بحری، قصبہ دھنا سیر علاقہ مدراس کے قاضی ہیں، ملک دکن کی سیاحت کرتے ہوئے گوگی تشریف لائے اور یہیں کے ساکن ہوئے" مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ بحری کا بچپن گوگی میں گزرا ہے۔ جس کا کئی جگہ خود بحریؒ نے عروس عرفان میں اشارا کیا ہے۔ اس لئے ان کے والد ماجد خود قاضی بحرالدینؒ دھنا سیر سے گوگی آئے ہوں گے، بلکہ ہمارا قیاس ہے کہ قاضی صاحب پیر صاحب کی تلاش میں دھنا سیر سے پہلے بیجاپور گئے ہوں گے، کیونکہ مولانا بحرالدین[۵۲] کے متعلق بحریؒ نے جا بجا لکھا ہے کہ میرے پدر بزرگوار شاہ برہان الدین بیجاپوری ابن میراں جی شمس العشاق قدس سرہٗ کے خاندان میں مرید تھے، گویا انھوں نے شاہ برہانؒ کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور خلفاء شاہ برہان الدینؒ نے زیادہ تر سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو، (۹۸۸ھ/۱۰۳۷ھ) سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ/۱۰۶۷ھ) اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ/۱۰۸۳ھ) کا زمانہ پایا ہے۔ نیز قاضی صاحبؒ بحری کے پیر[۵۳] شاہ محمد باقر جن کی وفات (۱۰۷۳ھ) یا (۱۰۸۹ھ) میں ہوئی ہے اور ان کے پیر شاہ عبدالستار بادی[۵۴] المتوفی ۱۰۸۴ھ کی صحبت با برکت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور اس زمانہ میں شاہ برہانؒ کے مشہور خلفاء میں شیخ محمود چشتی[۵۵] مصنف معرفت[۵۶] السلوک، اور حاجی اسحٰق چشتی[۵۷] نیز ان کے دیکھنے والے شیخ راج محمد شطاری چشتی اور شاہ امین الدین علی چشتیؒ، ابن شاہ برہانؒ بیجاپوری جیسی زبردست ہستیاں موجود تھیں۔ قاضی بحرالدینؒ کے مرشد کے نام کا پتہ نہیں چل سکا، بہرحال ایک ہی واسطہ سے قاضی صاحبؒ شاہ برہان بیجاپوریؒ کے خلیفہ تھے جن پر جذب بہت غالب رہتا تھا اور قلندر منش تھے، چنانچہ بحریؒ لکھتے ہیں[۵۸]:۔

قدوۃ قلندران حضرت قبلہ گاہی | از مے مجاز کہ مروجہ مناقل معنوی ست
سخت سرگران بودند الخ[۵۹]

اور مے مجازی کے متعلق بحری کی رائے یہ ہے:۔

ایں بیخودی اگرچہ مجازی ست لیکن پرتو بیخودی حقیقی است و اغلب کہ ہمچنیں باشد

---

۵۱ انوار جلالی مولفہ سید محمد حسینی گوگی مطبوعہ حیدرآباد ص۴۲ ، ۵۲ عروس عرفان قلمی ۵۳ واقعات مملکت بیجاپور مولفہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی مطبوعہ ص۳۰۲ ، ۵۴ بیاض نیرنگ قلمی و کتب خانہ قادر علی شاہ کرنول۔
۵۵ روضۃ اولیاء بیجاپور قلمی آصفیہ ۵۶ معرفت السلوک قلمی (آصفیہ) ۵۷ ملفوظ مخدوم ساویؒ مرتبہ قربی ویلوری قلمی (آصفیہ)، ۵۸ ملفوظ مخدوم ساویؒ قلمی (آصفیہ)، ۵۹ عروس عرفان قلمی ص۲۵۹ (کتب خانہ آصفیہ)

بعضے یکہ تازان عرصہ وحدت عمداً رو از مدرسہ و مصطبہ آوردہ کیوپۂ رسوائی رہ بردہ برائے ہمیں بیچو دیست وگرنہ لعنۃ اللہ علی المحمر وخلیلہ الخ

(عروس زیور ۱۴۴)

اس مجلس میں خود بحری اور بحری کے مرشد حضرت شاہ باقرؒ بھی موجود تھے، ایک مرتبہ اصطلاحات تصوف وضع کردہ میران جی شمس العشاق، مثلاً لازم الوجود وممکن الوجود وممتنع الوجود وغیرہ کے متعلق بحث تھی۔ تو شاہ باقرؒ نے ان کی توضیح وتشریح کی۔

قاضی بحرالدینؒ کے ایک اور بھائی میر سفیر اللہ[۵۱] بھی تھے، جو حسب بیان بحری، مرفہ الحال اور جاگیردار تھے، نیز قاضی صاحب کی بحریؒ کے سوا ایک اور صاحبزادی بھی تھی۔ چنانچہ محمد نجیب ناگوری مولف کتاب الاعراس نے بحری کے مختصر معلومات، آپ کے ہمشیر زادہ، سید احمد[۵۲] مرید وخلیفہ بحری سے حاصل کئے ہیں۔ مگر شجرہ خاندانی میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

بحری کی تاریخ ولادت :۔

شاہ محمود بحری کی تاریخ ولادت صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکی، یوں تو بحریؒ نے عارفانہ انداز میں تاریخ ولادت کے متعلق اپنی ایک فی البدیہہ فارسی غزل مندرجہ عروس عرفان میں بڑا اچھا نکتہ فرمایا ہے ؎

اے مورخ گر بتاریخ تولد پرسیم[۵۳] من ازاں روزم کہ عرفان شد بنور اندر نمو

ہم یہاں عروس عرفان اور من لگن کی بعض داخلی شہادتوں سے بحری کے زمانہ ولادت پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں :۔

شاہ محمود بحریؒ کی گوگی کے ایک مشہور بزرگ شاہ مجنوں قادری[۵۴] بیجاپوری سے بھی ملاقات ہوئی ہے جو ۱۰۷۰ھ (۱۶۶۰ء) میں بیجاپور سے گوگی وارد ہوئے اور شاہ صاحبؒ کا ۱۰۷۶ھ میں یہیں وصال ہوا، اور خود بحری نے تاریخی قطعہ وصال کہا جس کا تاریخی مادہ "آں سکۂ شاہ مجنوں" ہے جس سے ۱۰۶۱ھ (۱۶۶۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ گویا بحری نے یہ قطعہ وصال اپنی وفات سے ستر سال قبل کہا تھا، اس لحاظ سے بحری کا اس وقت عالم شباب تھا، دوسرے یہ کہ بحری تصنیف من لگن (۱۱۱۲ھ) میں بہت ضعیف تھے۔ جب بحریؒ شاہ مجنوں کے وصال کے وقت جوان تھے تو تصنیف

---

۵۱ عروس عرفان قلمی کتب خانہ آصفیہ ص ۵۹ ۵۲ کتاب الاعراس مطبوعہ اور صفحہ پر شاہ باقرؒ کے ضمن میں سید احمدؒ کو شاہ باقرؒ کا مرید لکھا ہے۔ ۵۳ عروس عرفان قلمی ۵۴ واقعات مملکت بیجاپور مولف بشیر الدین احمد صاحب مگر لکھا ہے کہ ان کی درگاہ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے زمانہ ۱۰۲۱ھ میں تعمیر ہوئی جو صحیح نہیں ہے! ان کا وصال سلطان محمد عادل شاہ ۱۰۷۶ھ کے زمانہ میں ہوا ہے۔ تو کیا قبل وفات تعمیر ہوئی تھی؟

من لگن کے وقت ان کی عمر اسّی سے متجاوز ہوگی اس لئے ان کی تاریخ ولادت تقریباً سنہ ۱۰۳۲ھ قرار پاتی ہے۔ اور یہ زمانہ حکومت سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو ۹۸۸/۱۰۳۷ھ مصنف نورس نامہ کا ہے۔

بحری کا بچپن :

بحری رح فطرتاً غیر معمولی طور پر نہایت ذہین تھے۔ چنانچہ خود من لگن [51] میں فرماتے ہیں :

یعنی کسی بزرگ نے فرمایا کہ میاں بسم اللہ کہو تو تیزی طبع کے جوش میں رحیم تک گویا پوری بسم اللہ سنادی کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں علم درسی متداولہ کی تکمیل نہ کرسکے، بعض کہتے ہیں [52] کہ کچھ ہوش سنبھالنے کے بعد تکمیل کی، روایت ہے کہ ایک مرتبہ کنوئیں پر دیکھا کہ رسّی کی رگڑ سے پتھر گھس گیا تو خیال پیدا ہوا کہ کیا میں پتھر سے بھی کم حیثیت رکھتا ہوں، اور کیا محنت کروں تو یہ لوہے کے چنے چبا نہ سکوں گا، مگر بحری رح نے خود یہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے کسی کے سامنے زانوئے ادب نہیں تہہ کیا نہ کسی مکتب میں گئے اور نہ استاد کی مار کھائی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مار پیٹ کی تو اوس کو ضرورت ہے جو کند ذہن اور غبی ہو۔ اور بحری طبعاً بہت ذہین تھے، بعض اشخاص کی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کوئی نظم اُن کے سامنے پڑھو، تو وہ لفظ بہ لفظ دہرا دیتے ہیں مگر بحری رح محض امی نہیں تھے۔

تعلیم و تربیت :-

ہمارا خیال ہے کہ بحری رح کے استاد صوری و معنوی خود اُن کے پدر بزرگوار، یا پیر و مرشد حضرت شاہ محمد باقر رح تھے، دوسرے یہ کہ آپ کا ماحول نہایت اچھا تھا رات دن علماء و فضلاء اور عرفا کی صحبت حاصل تھی، تیسرے یہ کہ قدیم تعلیم میں ایک بات قابل داد یہ تھی کہ ہمارے اساتذہ متقدمین کے مرتبہ نصاب کچھ ایسے اچھے تھے، کہ کوئی شخص گلستان، بوستان، کریما، مامقیان، نصاب الصبیان ابو نصر فراہی، خالق باری، رازق باری وغیرہ دو چار کتابیں ہی محنت سے پڑھ لیتا تھا تو نہ صرف اس کی بصیرت دوسری کتابوں کے مطالعہ میں تیز ہو جاتی تھی بلکہ اعلیٰ کردار اور اخلاق کا حامل ہو جایا کرتا تھا۔ علامہ باقر آگاہ رح مدراسی نے باوجود اس کے کہ ابتدائی تعلیم اچھی طرح ہوئی اساتذہ کا بھی تذکروں میں ذکر ہے۔ مگر اُن کو علم و فضل میں کچھ ایسا غیر معمولی عبور ہو گیا تھا کہ وہ اپنے علم و فضل کو وہبی [53] تصور کرتے ہیں۔

---

[51] من لگن مصنفہ بحری قلمی [52] بیاض نیرنگ مولوی محمد عبداللہ رانت پوری قلمی [53] مثنوی خمسہ او ج متحیرہ از باقر آگاہ قلمی کتبخانہ آصفیہ

غرض بحریؒ کی کوئی باقاعدہ درسی تعلیم ہوئی اور نہ معقول و منقول میں مہارت حاصل کی، بلکہ بقول اُن کے قدیم محققین کی حقایق و دقایق کی کتابیں پڑھنے میں بڑا انہاک تھا خصوصاً اپنے پیر طریقت سے استفادہ کیا اور بیجاپور کے مشہور بزرگ شاہ برہان الدین بیجاپوری قدس سرہٗ کے رسالے ہاتھ سے نہ چھوٹے، فرماتے ہیں:-

"اشاراتے[1] از مربی صاحب ہم یافتہ ام و سوائے این در کتب دیرینہ و رسالہ جات حضرت شاہ برہان الدین ابن شاہ میران جی قدس سرہٗ را باندازۂ استعداد خود مطالعہ کردم، عمرے ہمدرین گفتگو خرچ کردم و ہمدرین جستجو بسر آوردم آخر کار معلوم شدکہ خلاصۃ آدم و آدم علم است الخ"

یہ شاہ برہان بیجاپوریؒ وہی عظیم شخصیت ہے، جن کے متعلق شاہ ابوالحسن قربی ویلوریؒ نے ملفوظات[2] شاہ عبدالحق مخدوم ساوی (۱۱۶۵ھ) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم کا اشارہ حضرت حاجی اسحٰق چشتیؒ کو ہوا کہ "تم بیجاپور جاؤ اور شاہ برہانؒ سے فیض حاصل کرو، اور اون کو یہ سمجھو کہ وہ میں ہی ہوں" ——— پروفیسر اعجاز حسین مولف. تنویر ادب نے لکھا ہے کہ شاہ میرانجیؒ اور شاہ برہان کی تصانیف سطحی ہیں، کہاں تک درست ہے؟ شاہ برہان قدس سرہٗ کے رسایل کی دکن کے اکابر صوفیاؒ نے بڑی تعریف کی ہے۔ خصوصاً مخدوم ساویؒ فرماتے ہیں کہ شاہ برہانؒ کے نکات و غوامض کو سمجھنا ہرکس و ناکس کا کام نہیں ... محققین عرفا، تصوف کو تمام علوم کا نچوڑ سمجھتے ہیں۔ شاہ کمال فرماتے ہیں ؎

مغز علوم فقہ و حدیث و کتاب ہے   یہ علم مغز فقہ و حدیث و کتاب کا

مولوی عبدالقدوس ایم۔ اے تلمیذ خلیفہ عبدالحکیم سلمہٗ نے اپنے مقالہ "وحدت الوجود[3]" میں لکھا ہے کہ "شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ (وفات ۶۳۸ھ) عالم اسلامی کا بہت بڑا صوفی فلسفی ہے تصوف کے قلم پر فلسفہ کا پیوند لگانا ابن عربی کا کام تھا، چھٹی صدی ہجری میں عالم اسلام کا سب سے بڑا فلسفی ابن رشد (۵۹۵ھ) تھا اور اس کا چھوٹا ہمعصر محی الدین ابن عربیؒ"

"تمام خارجی اثرات کے باوجود اسلامی وحدۃ الوجود دنیا کے تمام نظامات سے مختلف و متمایز، لطیف تر اور زیادہ مکمل نظام ہے الخ"

اس طرح مولوی صاحب نے نہ صرف ڈاکٹر اقبال بلکہ مسٹر و نیفیلڈ[4] کی بڑی خوبی سے تردید کی

---

[1] عروس عرفان قلمی [2] ملفوظات مخدوم ساوی قلمی (آصفیہ) [3] مجلۂ عثمانیہ جلد ۶ نمبر ۱ حیدرآباد
[4] دیباچہ لوائح جامی انگریزی مولفہ و نیفیلڈ مطبوعہ۔

"The source of sufi -
"Theology was new platonism." ہے جو یہ کہتا ہے کہ:۔

یعنی تصوف اسلام کا ماخذ نو فلاطونی فلسفہ ہے۔

مولوی صاحب موصوف کے سوا اور بھی محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے۔

بحریؒ کو رات دن گوگی کے صوفیائے کرام کی صحبت حاصل تھی بعض وقت حقایق و دقایق پر بحث ہوتی تو بحری کان لگا کر سنتے، اور جودت طبع کی وجہ سے باوجود کمسنی کے اس مجمع میں بولنے سے نہ چوکتے تھے چنانچہ عروس عرفان میں بحریؒ اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

بحریؒ کا لڑکپن اور ذہانت کا ایک واقعہ:۔

درمحفل ولایت پناہ حضرت شاہ احمد سجادہ نشین اسوۂ اولیاء حضرت شاہ چند اقدس سرۂ همه صاحبدلان گوگی حاضر بودند، من هم بسیار نابالغ، سیادت پناه سید محمد که مرشد حضرت شاه موی الیه بود و هم عمش، سخن در سخن گفتند که سالک تا پوست ناسوتی را از تن ملکوتی بر آورده بر زمین نیندازد و خود علیحده شده نه بیند .... فتحیاب ملکوتش ممکن نه باشد ـــ. صدائے آرے آرے برخاست .... من که نزد سید جلال نشسته بودم از راه ابلهی به سید معلوم گفتم، پوست ناسوتی را بر زمین انداختن و خود از دورش معاینه نمودن چه فرض است، اگر کسے هم بر وجود خود دانست و دید که آن تن ملکوتی است و نظر از وبر گرفت گویا بگذاشت، انچه باقی ماند همان تن ملکوتی است الخ ـــ" سید مشاراً الیه بآواز بلند گفتند که این کودک چنین خورد سالی هیچه حرفها می زند، بعد چندے چه خواهد شد و کجا می رسد، خدا داند الخ

یعنی جسم ناسوتی و ملکوتی کی بحث تھی، ملکوت کس طرح منکشف ہو، ان بزرگوں نے کہا کہ جب تک تن جسمانی پائمال نہ ہو جائے ملکوتی جسم کا پانا محال ہے، واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ میں بہت صغر سن تھا اپنے بھولے پن سے سید جلالؒ سے کہا جو قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ اس قدر مشقت کی کیا ضرورت ہے ناسوتی سے نظر اٹھا لینے کی مشق کافی ہے۔ تو سید صاحب نے سب کے سامنے کہا کہ بچپن میں جس کا یہ حال ہو تو نہ معلوم یہ نونہال آیندہ کس مرتبہ کو پہنچے گا۔" خدا ہی جانے۔

غرض بحریؒ کا علم و فضل وہبی تھا چنانچہ عجز و انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

"دریں مجموعۂ بے معنی من جا بجا که ذکر علم است، سبب آن باشد که دقتے بر آسمان شهادت من آفتاب علم پرتو انداخت و خاطر نشان من ساخت" ۵

من فدائے علم خود زانم کہ روزے بر سرش
پرتوے از آفتاب علم غیب افتادہ است الخ (عروس عرفان)

بحری کا عقد:۔

بحری نے عروس عرفان میں تحریر فرمایا ہے کہ میر سفیر اللہ میرے خسر اور چچا تھے اور گوگی ہی میں رہتے تھے ایک مرتبہ اپنی جاگیر گئے تو وہیں دفعتاً ان کا انتقال ہو گیا۔ میں خود وہاں گیا اور باوجود سخت بارش کے نعش لاکر گوگی میں درگاہ سید چندا حسینی ؒ میں سپرد خاک کی۔ فرماتے ہیں:۔

"خسر این خیر خواہ خلایق و ہم عم باشد اسمہٗ میر سفیر اللہ بجاگیر خود رفتہ بودند ہمانجا بجاگیر حقیقی نقل نمودند، و ہنگام برشکال بہ ہزار شدت بقصبۂ گوگی بروضۂ بہشت آئین حضرت دستگیر دوسرا شاہ چندا صاحب نور مرقدہٗ آوردم شب شد، علی الصبح دفن کردم۔" (ورق ۱۳۵ ب۔ نسخہ ۲۵۹ آصفیہ، عروس عرفان)

غرض بحری ؒ کی شادی آپ کے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ جو گوگی ہی میں رہتے تھے، اور آسودہ و مرفہ الحال تھے، جن کو شاہان وقت نے جاگیر عطا کی تھی۔

بحری کا مذہب و مشرب:۔

بحری ؒ حنفی المذہب اور سنت جماعت گروہ سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ عروس عرفان کے ایک قصیدہ میں اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

من مسلمانم بود بر حق خدا و مصطفےٰ دوستدارم مذہب سنت جماعت رانکو

منقبت صحابہ رضہ:۔

منقبت صحابہ کرام رضہ میں ایک فارسی جملہ کیا خوب فرمایا ہے:۔[1]

"بمنزل فقرآں تاج نبوت است و درۃ التاج ولایت شتاب بشتابی بحق حق و حبیب حق و بحق اصحاب کبار کہ ہر یکے ستارہ ایست، از سپہر رسالت تابان و درخشان الخ

مذہبی رواداری:

بحری ہندو مسلمان سب سے نہایت شفقت و مروت سے پیش آتے تھے اور ان کا مشرب صلح کل تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

آنکہ از بند تعصب ہمچو بحری باز رست ہم بمومن مرشد آمد ہم برہمن راگرو

یہ شعر حافظ کے شعر کا مرادف ہے ؎

---

[1] عروس عرفان قلمی

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

مگر بحریؒ کا تخیل کسی قدر بلند ہے وہ یہ کہ جو شخص بحریؒ کی طرح تعصب نہ برتے اوس کو مسلمان تو اپنا پیر اور برہمن اوس کو گروجی پکارنے لگیں گے۔

اتباع شریعت

بحریؒ عروس عرفان میں، ایک لطیف نکتہ فرماتے ہیں کہ طریقت و حقیقت، شریعت کی ممنون ہے لوگ شئی موجود کی تجسس میں رہتے ہیں نہ کہ معدوم کی۔ جب شریعت سے یہ عقدہ کھل گیا کہ حق کا وجود ہے تو پھر متجسس کے لئے آگے راستہ طریقت کا خود بخود کھل جاتا ہے۔ اور وہ جستجو میں لگا رہتا ہے۔ کیا خوب فرمایا ہے:۔

حال سیمرغ چسان است وصدائے بحری اوبہ کہقاف و تو در کوہ سگر میجوئی

من لگن ؎

سید کی شبد سند ہے ہمنا ایسی بی سند جو سد ہے ہمنا

کیا طوایف کا ناچ اور گانا سننا جائز ہے؟ اور یہ کل شئی محیط میں داخل ہیں؟

بحریؒ نے ایک عجیب بات کہی ہے جو کسی صوفی نے نہ کہی ہوگی، خواجہ میر درد بھی گانا سنتے تھے۔ اتفاق سے شیخ عبدالعزیز محدث آگئے تو کہا کہ یہ ماں بہن کے برابر ہیں، تو فوراً شیخ نے کہا کہ کیا ماں بہنوں کو مجلس میں لانا جائز ہے؟

غرض بحریؒ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حصار محمد نور میں ناچ اور گانا پاترنیوں (طوائفین) کا ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ اگرچہ یہ پلید ہیں۔ مگر ان میں جلوہ خدا کا ہے۔ ایک موحد کامل نے ڈانٹا اور کہا کہ غلط کہتا ہے، ابھی پردہ و دیوار حایل ہے۔ اس موقعہ و محل میں ”از دو درد و آمو راگنجایش نباشد“ عبرت!—

عجز و انکساری:

بحریؒ کی طبیعت میں معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ عجز و انکساری تھی۔ جگہ جگہ، خود کو سب سے فروتر بلکہ باوجود کمال ظاہری و باطنی ہیچ مدان سمجھتے ہیں۔ جو ہمارے اسلاف کا ہمیشہ شعار رہا ہے کہتے ہیں ؎

از بسکہ ضعیف و ناتوانم تن گشتہ لطیف تر چو جانم
در جان و تنم نماندہ ہیچے یک ہست لسوئے حق نسیچے
دانند عدا ایگان گو تنی کیں ابلہ بود میان گوگی الخ

بیعت:۔

قراین سے پتہ چلتا ہے کہ بحری ابتداءِ جوانی سے برسوں ایک رندانہ وقلندرانہ زندگی گزاری

عشق ومحبت:۔

بچپن ہی سے فطرتاً حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ اور عشق ومحبت الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی چنانچہ اس کا اشارہ بھی صاف طور پر من لگن اور عروس عرفان میں اس طرح کرتے ہیں ؎

اس عمر نیں عشق جیو میں جاگ — یو بیر لیا جو بھیڑ کون باگ
یو آنک تھنی تھی یا بڑی تھی — یک آنک اپر اڑی پڑی تھی

....

آگ عشق کی دل منے دھکی تھی — پھر تن میں تمام تکبکی تھی
یو درد سو کیا یو دل جلے کیوں — تن آنچ سوں عشق کے جلے کیوں
لڑکا تی تھی مجہ اپر مسلم — بولوں تو یہی جو عشق کا غم الخ

عروس عرفان میں اس کی اس طرح ترجمانی فرماتے ہیں:۔

"چوں از شکم مادر برون آمدم سہ چہار سالہ شدم کہ دیدہ مرہون حسن محبوبان گشت و دل مفتون جمال مہرویان، بخاطرمی رسید کہ ہمچو این دلبندیہا و ہمچو این دردہا پیش از من رواجے داشتہ باشد یا ہمیں کہ ظہور یافتہ آغاز است مدتے معلوم شد کہ عالم پر از عشق است و درد عشق" الخ

بقول سرمد ؎

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند — سوز پر پروانہ مگس را ندہند

ایک جگہ لکھا ہے:۔ جوانی کا عشق بڑا کارگر ہوتا ہے بشرطیکہ ناسور ہو جائے۔

"ہنگامۂ نوجوانی را یا نزدہ تا بست و پنج سال بسیار گرم باشد و درین ہنگام ریزش فیض فیاض بیش از بیش است، اگر زخمے از شمشیر محبت مجازی یا جراحتے از حسام عشق حقیقی بدل رسد ناسور شود یعنی بہ نگردد عاشق برا ردر بہ نا شدن است، ناگاہ شوق لقائے حضرت الٰہی جل شانہ گریبان خاطر گردد الخ

(عروس عرفان)

غرض بحری قدس سرہٗ معلوم ہوتا ہے کہ طفلی سے ادھیڑ عمر تک عشق ومحبت الٰہی میں سرگرداں رہے اب صرف ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی تھی اُس کی تکمیل مرشد نے کی۔

عروس عرفان میں بحریؒ نے لکھا ہے کہ میں کم و بیش پیر کی صحبت میں بیس سال رہا، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"ماکم و بیش بست سال چہ ضحیٰ و چہ زوال چہ شام و پگاہ بخدمت آن خدا آگاہ حاضر بود و بنظر کیمیا منش او پرورش می یافت"

حضرت شاہ باقرؒ کا وصال بقول مولف کتاب الاعراس ۱۰۷۳ھ میں ہوا ہے چنانچہ لکھتا ہے :-

"شیخ محمد باقر قادری....... روز دوشنبہ در سال یک ہزار و ہفتاد و سہ قبر در گوگی سرکار سگر صوبۂ بیجاپور از سید احمد مرید ایشان شنیدہ"

بعض ادیبوں نے مادۂ تاریخ بحریؒ کے ایک قطعہ کے آخری مصرعہ "محمد باقر آن دریائے وحدت" ۱۰۸۹ھ سے سنہ وفات ۱۰۸۹ھ درج کیا ہے مگر اس قطعہ کے پانچویں شعر پر تو غور کرنا چاہیئے جو یہ ہے ؎

حساب سالش از مصراع آخر بگیر اے شمع محفل ہائے وحدت

کا مطلب یہ ہے کہ آخری مصرعہ سے یا تو ھائے حطی کے ۸ عدد یا لفظ ھائے کے ۱۶ عدد خارج کئے جائیں، اگر ۸ عدد خارج ہوں تو سنہ وفات ۱۰۸۱ھ، اور ۱۶ عدد نکال دیئے جائیں تو ۱۰۷۳ھ بر آمد ہوتے ہیں، اس طرح مولف کتاب الاعراس کے بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ سنہ وفات ۱۰۷۳ھ ہے۔ اس لحاظ سے قاضی بحریؒ کا سنہ بیعت $\frac{۱۰۵۳}{۱۰۷۳}$ھ کا درمیانی زمانہ قرار پاتا ہے۔ اور یہ زمانہ سلطان محمد عادل شاہ ($\frac{۱۰۳۷}{۱۰۶۷}$ھ) کا ہے۔

بحریؒ کے مرشد طریقت :-

بحریؒ کے مرشد کا نام محمد باقر، لقب شمس الدین عرف شاہ منجن بحریؒ ابن عبدالمحمد، ابن شیخ عبدالخالق عرف مومن توکلی، ابن شیخ اسحٰقؒ، شیخ اسحٰق سے سگر کے مشہور و معروف صوفی شیخ محمد محمود صوفی سرمست الملقب بہ اسد الاولیاء خلیفہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ کی نواسی منسوب تھی، اس طرح شیخ صاحبؒ حضرت سید جلال الدین چندا شاہ حسینی قدس سرہ کے ہم زلف تھے۔ شاہ باقرؒ بڑے ذی علم اور عارف کامل تھے، جن کے غلبۂ جذب کا حال بحریؒ نے عروس عرفان میں یہ لکھا ہے کہ ایک روز فرمایا کہ گوگی میں تو لوگ صرف لعنت و ملامت کرنے والے ہیں اور قتل کرنے والا کوئی نہیں، جی چاہتا ہے کہ دارالسلطنت بیجاپور جاؤں اور ہنگامۂ منصور از سر نو تازہ کروں، اور اپنی انانیت یعنی خودی کو آزما کر تو دیکھ لوں، اس قول کو فرانس کے مشہور مستشرق موسیو لوی میاسونان نے بھی دیگر مشاہیر اسلام صوفیا

فلاسفہ و حکماء کے اقوال کے ساتھ اپنے ایک مجموعہ تصوف[۵۱] میں نقل کیا ہے۔ شاہ باقر نہایت سادگی پسند اور متوکل درویش تھے، اور بحری سے کہا کرتے تھے کہ میاں سو سال کی فقیری میں مجھے یہ دو باتیں ملی ہیں جو موٹا ڈھوٹا مل جائے پہن لو اور وقت پر جو مل جائے کھالو۔ رحلت کے وقت شاہ باقر کی عمر سو سال کی تھی، اور آپ کی گھنی ڈاڑھی اب بھی سیاہ تھی۔ چنانچہ بحری لکھتے ہیں:-

"عمر حضرت ہادی ام نور مرقدہٗ کم و بیش یک صد سال بود لیکن محاسن مبارک
کہ ازبس انبوہ بود سیاہ تر از شب قدر و روئے منور روشن تر از بدر"

بیہوشی طاری تھی حالت نزع میں بحری نے ناف مبارک پر ہاتھ رکھا تو ہوش آگیا، بحری کو دیکھ کر فرمایا:- "اے محمود بحری حالا مسافر میشوم" آنسو ڈبڈبا آئے۔ ہر بن مو سے ذکر اسم ذات جاری تھا۔ بلکہ ذرہ ذرہ سے یہی آواز آرہی تھی۔

۱۱ر شوال ۱۰۷۳ھ[۵۲] کو واصل بحق ہوئے۔ جدید گوگی میں دفن کئے گئے، بحریؒ نے قطعہ تاریخ کہا:-

فغان کان محرم اسرار وحدت　　تو ازن در عہد باقائے وحدت؟
محمد باقر آں بحر معانی　　کہ روشن بود از ماوائے وحدت
دہ و یک رفتہ بود از ماہ شوال　　بہ شنبہ آں شہ والائے وحدت
ز کثرت دست دادہ از سر شوق　　بہ قلب وحدت وچوں جائے وحدت
حساب سالش از مصراع آخر　　بگیرا سے شمع محفل ہائے وحدت
ولے در پردہ دارد او شمارہ　　محمد باقر آں دریائے وحدت

۱۰۸۹ھ

پانچویں شعر کے مصرعہ پر بعض مورخین[۵۳] نے غور نہیں کیا ہے۔ جس میں کچھ اعداد کے تخرجہ کی طرف اشارہ ہے یعنی اس میں سے اگر "ہائے" وحدت، ہو تو ۸ عدد کا تخرجہ ورنہ لفظ "ہائے" کے (۱۶) عدد کا تخرجہ؟ جس کی رو سے مولف کتاب الاعراس کی تاریخ ۱۰۷۳ھ سے مطابقت ہوتی بحریؒ نے اپنے مرشد کے مزار کے اطراف چوکھنڈی بنوائی تھی جس کا تاریخی قطعہ[۵۴] یہ ہے:-

چوکھنڈی شاہ باقرؒ

زیر سپہر بے ستون، آرے عمارتہا بسے است　　نبود ولیکن ہمچو این، و رہست داغ اند کے
در باب.... تاریخ وے این مصرعہ از غیبم رسید　　محمود بحری بندۂ باقر محمد بے شکے

۱۱۱۶ھ

---

[۵۱] مجموعۃ العربیہ۔ طبوعہ فرانس ۱۹۲۹ء [۵۲] کتاب الاعراس
[۵۳] واقعات مملکت بیجاپور صـ۲۷۳ و انوار جلالی مطبوعہ صـ۷۴ (مولوی تمکین کاظمی رسالہ نگار لکھنو مارچ ۱۹۲۷ء
[۵۴] خاتمہ عروس عرفان قلمی صـ۱۵۵

شاہ باقر کا ایک فارسی شعر: "من عرف اللہ کل لسانہ و من طال لسانہ" کے ضمن میں بحری نے اپنے مرشد کا یہ ایک شعر سند" پیش کیا تھا ؎

چو بلبل روئے گل بیند زبانش در نوا آید
مرا اندر دیدن رویش فرو بست است گویائی

بحری قادری المشرب تھے چشتیہ طریقہ کا حال معلوم نہ ہوا، غالباً چشتیہ طریقہ کی اجازت والد ماجد سے ملی ہوگی جن کا سلسلہ ایک واسطہ سے حضرت شاہ بیجاپوریؒ سے ملتا ہے۔ بحری سماع کے عاشق تھے اس کے لئے چشتیہ طریقہ کی اجازت لازمی ہے۔

شجرۂ خلافت قادریہ[1] یہ ہے:-

شاہ محمود بحری خلیفہ تھے شاہ محمد باقر عرف منجن بحریؒ اور وہ سید شاہ عبد الستار ہادیؒ اونکو شاہ میران اشرف اپنے عم بزرگوار سے اونکو اپنے والد ماجد سید ابو الحسنؒ (بہروچی) سے اور اونکو سید سلطانؒ سے اور اون کو سید علیؒ سے اور اون کو سید جلال الدینؒ سے اور اون کو سید ظہیر الدینؒ سے اور اون کو سید ابو القاسم سے اور اون کو سید ابو الحسن سے اور اون کو سید موسیٰ سے اور اون کو سید محمدؒ سے اون کو سید حسنؒ سے اون کو سید احمدؒ اون کو سید احمد اون کو سید ابو صالح نصر، ابن سید تاج الدین عبد الرزاقؒ ابن میران محی الدین عبد القادر جیلانیؒ بغدادی سے اولاد غوث الاعظم یعنی شعبۂ قادریہ دکن میں کس شاخ سے بحری کا تعلق تھا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ البتہ حضرت ابو صالح نصرؒ سے چھٹے پشت کے بزرگ حضرت سید موسیٰؒ تک یہ سلسلہ میران ابدال حسینی حموی گولکنڈوی المتوفی ۱۰۴۹ھ تک پہنچتا ہے۔

اخلاف بحری کا شجرہ تا ایندم یہ ہے:-

شاہ محمود بحریؒ کے خلیفہ شاہ محمد حسین بحری (فرزند) اون کے بحر الدینؒ اور اون کے شاہ میران بحریؒ اون کے شاہ محمد بحری عرف دادے پیرانؒ، ون کے سید قادر محی الدین بحریؒ اون کے سید شاہ محمود بحری، اون کے سید شاہ مسعود بحری سجادہ نشین ساکن حیدر آباد۔

بحری کو اپنے پیر کی مفارقت کا شدید صدمہ ہوا، اور خانگی پریشانیوں کی وجہ سے بےچین رہے۔ وطن بہت پیارا تھا، بالآخر فتح بیجاپور سے دو تین سال قبل بیجاپور گئے سلطان سکندر عادل شاہ کے پاس باریاب ہوئے، دو ایک سال شاہی مہمان رہے۔ سلطان نے آپ کی بڑی تعظیم و توقیر کی، بلکہ فیض روحانی حاصل کیا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

شنیدم با سکندر عادل خان کہ ختم والیان بیجاپور است و چندیں صحبت ہا اتفاق افتاد

---

[1] شجرۂ خاندانی قلمی۔

بود بلکہ بجر گاہ خسرو بیش یک دو سال سکونت داشتم، روزے بکمال ادب و اختصاص
پرسید کہ روح چیست، گفتم روح نہ چنان چیز یست کہ کسے کیفیۂ آں سخن در گنجد و دیگر
در حوصلہ ادراک در آید از غایت لطافت از جمیع تصورات و توہمات ہمچوں ذات
پاکست الخ (عروس عرفان قلمی آصفیہ)

بیش بہا خلعت، تلواریں، اور تحائف نذر دئے، جس کا ذکر بحریؒ نے عروس عرفان میں کیا ہے
اس کے سوا، ایک سو بیس ایکڑ آراضی متعلقہ مواضعات انگن ہال و ہنچن ہال کی سند بھی[۵۱] عطا کی تھی،
جس کی توثیق شہنشاہ عالمگیر، و شہزادہ اعظم، و دیگر حکام وقت نے کی اور بحال رکھی اور آج تک آپ
کی اولاد میں جاری ہے۔ ڈاکٹر زور قادری کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ شہنشاہ عالمگیر نے بحری کی باوجود
مدحت کچھ قدر نہ کی۔ شاہی فرامین میں آپ کو "حقائق و معارف آگاہ قاضی محمود بحری درویش" کے
القاب سے مخاطبت کی گئی ہے۔

افسوس ہے کہ سلطان سکندر عادل شاہ نے جو کچھ تحایف نذر دئے تھے نہ صرف وہی بلکہ آپ
کا سارا کلام فارسی و اردو جو پچاس ہزار ابیات پر مشتمل تھا حیدر آباد (بھاگ نگر) کے سفر میں
رہزنوں نے لوٹ لیا، شاید قدرت کو یہی منظور تھا، جس کے متعلق بحری کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اشعار رنگا رنگ چہ از مثنویات و غزلیات و رباعیات و قصاید وغیرہ خاصہ در
معارف ہم دکنی و فارسی بہنگام ہنگامہ گرم جوانی و جوش سرجوش عشق جا و دانی کم و بیش
پنجاہ ہزار بیت کہ از دریچہ دل دار بر دل برجستہ بود با اخگر ہائے سوزان از علاوہ
علم غیب بر افراشتہ خلعتہائے گراں قیمت و بعضے اشیاء بیش بہا کہ از رخت خانہ خاص
سکندر خان بیجاپوری بہ آئین نذر رسیدہ بہ شہر حیدر آباد بہ تقریبے برابر بردہ بردم، دزدان
سیاہ چہر با شارہ سپہر بے مہر شبخون زدند و آں دفتر سخنان سنجیدہ و اجناس پسندیدہ
را پاک بردند" (صفحہ ۴۴ نسخہ عروس عرفان ۹۵ قلمی آصفیہ)

---

[۵۱] نقل سند خاندانی، بمہر خاص عبداللطیف عہد نواب منصور خاں سنہ ۲ جلوس (شاہ عالم) سند بمہر
ظفر خان سنہ جلوس، سید مسعود بحری، سجادہ گوگی کے متن کا اقتباس یہ ہے:۔

"مقررہ منرح ضمن بموجب فرد دستخطی آنکہ قاضی محمود بحری، موضع ہنچن ہال
سمت اندلا (اندولہ) و موضع انگن ہال سمت مُدّبہ کی معمولی پرگنہ نصرت آباد بموجب
سکندر خان بیجاپور و غازی الدین خان بہادر و حسین علی خاں بہادر دسر دیپ سنگھ و لسالت خاں
در وجہ معاش مقرر داشتہ، در یہ ولا .... دستخط خاص مزین شد"

سفر حیدرآباد سے واپس لوٹے تو معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی چین نصیب نہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بحریؒ نے ایک اور مختصر[۵۱] ثنوی فارسی ایک دوست نرنجن داس کو کسی امیر کی شکایت میں لکھی جس میں بیان کیا ہے کہ امارت پناہ معنی خان؟ درویشوں کی قدر کرتا ہے مگر میری طرف توجہ نہیں کرتا اس لئے مجھے اس سے سخت تکلیف ہے نیز علاقہ سگر مضافات گوگی کی قحط سالی پر فارسی ثنوی[۵۲] لکھی تھی شاید یہ وہی ۱۱۳۰ھ کا عالمگیر قحط ہے جس کے متعلق مولف بساتین السلاطین[۵۳] لکھتا ہے:۔

اوّلاً ہرج مرج ایام عہد سکندری و آمد عالمگیری کہ مجملے سابق ذکر یافتہ ثانیاً طوفان وبائے عام کہ آن ہم مذکور شد ثانیاً قحطے جہانگیر در سنہ یکہزار و صد و سی کہ محیط عالم شدہ تا این زمان ذکرش بر زبانہا جاری بود الخ"

غرض بحریؒ کی پریشانی کے مختلف اسباب تھے۔ بالآخر بحریؒ نے دل میں ٹھان لی کہ اب پیر کے مرقد مبارک کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں، اور تقریباً تیس سال مرتے دم تک پیر کے آستانہ مبارک کو نہ چھوڑا چنانچہ ایک قطعہ اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے جو یہ ہے ؎

چوں دیدم بحری گم کردہ دل را　　　کہ بد گرداں چو گرد از باد جستہ
چہ رو روشن کہ باز آمد ز گردش　　　بہ نزد گور پیر خود نشستہ
بہ شرط آنکہ او ہرگز نہ خیزد　　　بود تا جانش اندر جسم خستہ
توکل را کفیل کار خود ساخت　　　وسیلتہائے گوناگون گسستہ
بہ پرسید چند سال ست از نشستت　　　بگفتا پیر پائے من شکستہ

۱۱۰۰ھ

دوسرا قطعہ بھی بہت خوب ہے اور ایک لطیف معمہ ہے فرماتے ہیں:۔

چو من بہ تکیۂ بحری رسیدم و گفتم　　　کہ چند سال گذشت از نشست اے ہمہ دان
جواب ہیچ نہ گفتنش ولے چو دیوانہ　　　دو دید و داد بدستم دو گوے دو چوگان

دو گوئے سے مراد دو صفر، اور دو چوگان سے دو الف عدد کے یعنی (۱۱۰۰ھ)

یہ قطعات دراصل اس واقعہ کے متعلق ہیں۔ مگر مولف انوار جلالیہ نے لکھا ہے کہ قطعات مذکور بحری نے اپنی مریدی (بیعت) کے متعلق لکھے ہیں جو صحیح نہیں بلکہ یہ پیر کے وصال کے دس گیارہ

---

۵۱ نسخہ من لگن مشمول مثنویات فارسی مخزونہ جامعہ عثمانیہ، فارسی مثنوی ورق ۹۰ ب بجواب نرنجن داس ۵۲ من لگن جامعہ عثمانیہ ورق ۹۲ در شکایت ملک سگر و قحط سالی ۵۳ تاریخ بساتین السلاطین قلمی ص ۲۹۶ ۵۴ عروس عرفان قلمی آصفیہ
۵۵ انوار جلالیہ مولفہ سید محمد حسینی سجادہ درگاہ حضرت چندا شاہ قدس سرہ گوگی مطبوعہ حیدرآباد ص ۴۹

سال بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔

قال اور حال:

بحریؒ مجذوب سالک تھے اور رشد وہدائت میں سرگرم رہا کرتے تھے چنانچہ بحری کا ایک شعر ہے ؎

نپٹ مجذوب کا مایا تیوں پوچھا ہوئے گا بحری ہے ہشیاری میں جی گھر باند مجذوبی سومیری ہے

اور قال صحیح کے حامل تھے جس کے متعلق دکن کے صوفیا، کہتے ہیں کہ ہمارا قال عین حال ہے اور کسی اہم مسئلہ میں گفتگو کے لئے ہزار فن چاہیئے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

قال را صد مایہ باشد اے جوان حال بس مفت است نزد عارفاں

آں درست آید بیک دیوانگی ایں نہ زیبد جز بصد فرزانگی

چنانچہ گلبرگہ شریف کے ایک مشہور بزرگ سید شاہ رزاق اللہ[۵۱] محمد محمد الحسینیؒ از اولاد گیسو دراز قدس سرہٗ ایک مرتبہ معہ اپنے مریدین و معتقدین گوگی تشریف لائے تو شاہ صاحبؒ بھی حضرت موصوف سے ملاقات کے لئے گئے۔ حال اور قال کی بحث چھڑ گئی۔ چنانچہ بحریؒ اس کی تفصیل عروس عرفان میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

''میاں[۵۲] شاہ رزاق اللہ از اولاد حضرت گیسو دراز قدس سرہٗ با مریدان خاص و معتقدان با اختصاص بگوگی رسیدند، فقیر جہت اکتساب فیض بخدمت والاش رفتہ ذکرے بود درمیان احوال اولیا، چوں بفقیر دیدند فرمودند دریں سرزمین کہ معدن ولایت است و منبع ہدایت بسیارے از اولیاء آسودہ اند از بعضے کلامے وارداست و از بعضے نہ و مرا یقین است اغلب کہ باشد لیکن از وقوع حوادثات روزگار گم شدہ و کسے از ملازمانش نگاہداشت نہ نمودہ چونکہ حال البتہ بقال آورد و قال ہر آئینہ بحال، ایں عجیب کہ ولی باشد و حال بنا شد و نیز حالش بقال رجوع نکند، اگر کسے را حال باشد و قال نبود مراد رحال او وہمے است، یعنی نخواہد بود

...... گفتم اے اسوۂ سادات اکثر مردمان حال را برقال ترجیح می دہند

---

۵۱ تاریخ محمدیہ صفحہ ۹۶ مولفہٗ جہاں نما علی شاہ (متعلق خاندان حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ گلبرگوی) شاہ صاحبؒ کو عالمگیر نے حسب ایماد خواجہ بندہ نوازؒ بہ عالم ردیا۔ شاہ قطبیؒ کو تولیت سے علیحدہ کرکے چند مواضعات نذر دئے تھے جو موضع ہمنی (گلبرگہ) وغیرہ میں ہیں ان کا نام سید رزاق اللہ ابن مخدوم حسینیؒ عرف محمد ثانی تھا جو متولی مزار روضۂ بزرگ گلبرگہ شریف تھے اور سید شاہ منجھلے حسینی نبیرہ شاہ یداللہ چہارم کے معاصر تھے۔

۵۲ عروس عرفان قلمی ورق ۱۴ نسخہ ۲۵۹ آصفیہ۔

اما ہیچدان مطابق سخنان سامی وموافق گفتگوئے گرامی ہمین میداند کہ حال بسیار مفت است و قال فراوان مشکل چنانچہ اگر حریصے عہد اعادت جبلی نمود عوامش برحال کنند رخد متحاشش از دل بظہور آرند اما قال را از ہر طرف صد ہزار قابلیت می باید تا قبول مقبلان گردد و مطبوع صاحب دلان ہ

حال را دانند مردم بہ ز قال درکنم در دل چنیں سر زد خیال" الخ

بحریؒ بعض معترض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اسرار حق بیان کرنے میں مجھے کچھ عذر نہیں ہے مگر کیا کروں کہ کوئی طالب صادق نہیں ملتا آپ کے الفاظ یہ ہیں :۔

طالب صادق کمیاب ہے :

"بعضے[1] عزیز بر آنند کہ محمود بحریؒ با فشائے راز بخیلی می کند، عیاذاً باللہ منہا کہ سائر حق کا فراست اما چکند دلش نمی خواہد بعلت قلت طلب و نقصان تمنا" الخ

افشائے راز اور کشف و کرامات سے کشف باطنی اور واردات قلبی بند ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو پوشیدہ رکھنا چاہیئے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دیگ بلا ڈھکن کے :۔

"طغیان عشق و طلاطم عرفان چون[2] جوش دیگ بلا سرپوش، بشر کم می شود و بزم نزہت و نشاط باطنی برہم می گردد ہ

گرچہ شد از دولت عشقت در و بام آئینہ کشف خود منما بہر کس ہیچو جام آئینہ"

بقول شخصے ع یار درخانہ و من گرد جہاں می گردم ۔ بحریؒ پر بعض وقت عالم استغراق طاری ہو جایا کرتا تھا ۔ جس کا حضرت موصوف گو صاف طور پہ اظہار نہیں فرماتے مگر ایک عجیب واقعہ کے طور پہ بیان کرتے ہیں ۔

بحریؒ کی ایک نایاب انگشتری کا عجیب واقعہ :۔

یہ واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جس طرح حضرت شاہ فرہاد[3] دہلویؒ اپنے مصلے پر خود کو ڈھونڈنے لگے اور کہا کہ " فرہاد کو ڈھونڈ رہا ہوں ابھی یہاں بیٹھا ہوا تھا کہاں چلا گیا ۔ بحری اپنے ہاتھ میں ایک انگشتری نایاب پہنے ہوئے تھے مگر گھنٹوں ڈھونڈتے رہے ۔ بالآخر ایک دوست آئے تو اس کا پتہ چلا چنانچہ فرماتے ہیں :۔

چنانچہ[4] ـــ از ما ہر کہ ہفتاد شصت جمع می شدند عتاب و تراش او برابر

---

[1] و [2] عروس عرفان قلمی [3] شاہ فرہاد قدس سرہٗ وفات ۱۱۳۵ھ مزار دہلی خلیفہ سید دوست محمد برہان پوریؒ (ابو العلائی ص ۱۶۸) اسرار ابو العلا مطبوعہ آگرہ [4] عروس عرفان قلمی (آصفیہ)

نمی کردند و دران ایام دل ہم بدو از وبس میلے داشت در ابہام راست من بود، روزے بوقت خوردن طعام برائے حفاظت آب و رنگ از وے برآوردہ بہ نز انگشت چپ درآوردم، بعد فراغ طعام چون نگریستم نیست، گران خاطر گردیدم، ہرچند تلاش و تفتیش نمودم تجسس و تفحص را بکار بردم نیافتم، برائے یک شصت ہیچ شصت با بہام شصت ہزار غم و الم بدلم محاصرہ نمود، اتفاقاً یکے از دوستان روشندل از در درآمد و گفت امروز متردد می نمائی و متفکر موجب آن معلوم نہ شد، گفتم شصت گم شد، گفتا قدیم یا جدید، گفتم قدیم، گفتا این عجب بل ہزار عجب کہ شصت تو در نز انگشت چپ تو بپیش نظر موجود و مہیا ست و تو از غلبۂ غفلت چپ و راستش می بوئی و پریشان وار می پوئی ؎

معنوی موجود باشد عارفش بیند مدام
از سر غفلت بچشم عاشقان ننمایدش

معاصرین اولیاء:۔ بحریؒ نے اپنے دادا مرشد شاہ عبد الستار ہادیؒ[۵۱] وفات (۱۰۸۵ھ) اور شاید بیجاپور کے مشہور بزرگ شاہ امین الدین اعلیٰ[۵۲] بیجاپوریؒ کو بھی دیکھا ہے اور شاہ صاحب کے بعض اقوال و اسرار و معارف بیان کئے ہیں اور شاہ برہانؒ بیجاپوری کے بعض خلفاء کا کئی جگہ عروس عرفان میں ذکر فرمایا ہے جو شاہ باقرؒ کی کسی مجلس میں موجود تھے۔ مگر نام ظاہر نہیں فرمائے شاہ برہانؒ کے مشہور خلفاء میں شاہ محمود چشتی[۵۳]

---

[۵۱] آپ کا پورا نام عشاق محمد عبد الستار عرف شاہ ہادی قادری المشہور بہ ستار ہادی بیجاپوری (۱۰۸۵ھ) بعمر ۱۲۰ سال۔ مزار جہانگیری تعلقہ ادھونی (امتیاز گڑھ) ضلع بلھاری مرید و خلیفہ عم بزرگوار سید میران اشرف قادری (بہروچی؟) آپکی اہلیہ ام سلمہ خواجہ گیسو درازؒ گلبرگوی کی اولاد سے تھیں، لاولد۔ دوسری بیوی کی اولاد میں اس وقت سید پیر پادشاہ قادری ابن سلطان محی الدین عرف بم بم صاحب ابن سید شاہ ابو الحسن (وفات ۱۱۲۸ھ) ابن سید میران محی الدین ابن ستار ہادی قدس سرہٗ بقید حیات ہیں۔ (بیاض نیرنگ قلمی) جن کا ماخذ رسالہ پیران پیر ہادی ہے۔ شاہ ستار ہادیؒ کا مادہ تاریخ وفات "لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون" (۱۰۸۵ھ) ہے۔ [۵۲] شاہ امین الدین بیجاپوری وفات ۱۰۸۶ھ (روضۂ اولیاء بیجاپور قلمی) معاصر شاہ ستار ہادیؒ [۵۳] شاہ محمود چشتی عرف محمود خوش دہان قدس سرہٗ، بڑے زبردست شیخ تھے جن کی کتاب معرفت السلوک کا ترجمہ معرفت السلوک از شاہ ولی اللہ وفات ۱۱۵۷ھ مزار حیدر آباد مرشد نواب انور الدین خان شہید، بڑی مشہور تصوف کی کتاب ہے جس سے سینکڑوں اولیاء اللہ مستفید ہوئے۔ مطبع نولکشور میں طبع ہوئی ہے اس کی اصطلاحات تصوف دکن کے صوفیا میں رائج ہیں بعض لوگوں نے ان کو با تصویر بھی شائع کیا ہے۔ اور اس کتاب کا زیادہ تر حصہ ایک تالیف "جان خم خانہ" (۱۳۵۰ھ) اردو، مولفہ خواجہ جہانگیر علی خلیفہ محمد قاسم علی شاہ کلیمی دہلوی میں نقل ہے۔

مصنف معرفت السلوک، شیخ حاجی اسحٰق چشتی، اور اسی سلسلہ کے بعض مشہور بزرگ شیخ راج محمد، و دریا محمد چشتی، شاہ باحسینی ابن شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری اور شاہ ناصر الدینؒ خلیفہ شاہ دریا محمد جو حضرت مخدوم عبدالحق ساوی کے مرشد تھے۔ بقید حیات تھے۔ ان کے سوا، جن سے آپ کا مکالمہ اور ملاقات ہوئی ہے وہ شاہ مجنوں بیجاپوری وفات (۱۰۶۱ھ) شاہ بینوا، شاہ بہلول مجذوب، میاں شاہ رزاق اللہؒ از اولاد گیسو درازؒ مگر جن سے بحید راہ و رسم اور جن کی محفلوں میں آپ شریک ہوئے ہیں وہ سید احمدؒ ابن سید اسمٰعیلؒ ابن سید شاہ حبیب اللہؒ، سجادہ درگاہ حضرت سید جلال الدین چنداشاہ اور سید صاحب مذکور سید جلالؒ نے بحریؒ کی ذہانت کی بڑی تعریف کی ہے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ سید احمد مذکور، مولانا شاہ سید احمد ثانی سجادہ معاصر بحریؒ کے جد امجد تھے،..... اور وہ بھی سید احمدؒ ثانی ہیں، جن کے ایماء سے بحری صاحب نے من لگن اور عروس عرفان لکھی۔ ڈاکٹر حفیظ اور مولف آئینہ ادب کا یہ کہنا کہ گاؤں کے مکھیا یا حیدرآباد کے کسی امیر کی فرمائش پر من لگن لکھی غلط ہے۔

حسین چابک بینواؒ سے آپ کی ملاقات موضع انب میں ہوئی جہاں بحریؒ کے پیر و مرشد اپنے جد امجد شاہ مومن توکلیؒ یعنی (عبدالخالق ابن شاہ اسحٰقؒ) کے عرس میں گئے تھے، شاہ باقرؒ نے بینواؒ سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے اپنا پیر بڑھا دیا، مگر شاہ باقرؒ کو کچھ ملال نہ ہوا اور پیر کو بوسہ دے دیا۔ اس کے بعد نفس اور روح کی بحث چھڑ گئی۔ اور شاہ باقرؒ نے ایسے ایسے نکات فرمائے کہ حسین بینواؒ نے قدم چوم لئے اور معافی چاہی۔ (عروس عرفان) (باقی آئندہ)

"دستنبو" کا ایک خاص نسخہ

(سید جمیل الدین)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ڈاکٹر عبداللطیف کا قول ہے:

"حالی کی اصل غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک شاعر اور دلفریب شخصیت کی حیثیت سے غالب کی عظمت کا سکہ قارئین کے دلوں پر بٹھا دیا جائے۔"[۵۱]

قاضی عبدالودود صاحب کہتے ہیں:

"حالی نے حیات جاوید میں اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب سے قبل اس فن کی جو کتابیں میرے قلم سے نکلی ہیں، ان میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے (تمہید)، اس صورت میں ظاہر ہے کہ حقیقت سے انحراف ناگزیر ہے۔ اس سے قطع نظر، تحقیق ان کا مطمح نظر ہی نہیں، وہ لوگوں کو غالب کی عظمت کا معترف بنانا چاہتے ہیں اور بس۔"[۵۲]

یہ تصریحات غمازی کرتی ہیں کہ حالی کو ان کے انداز سوانح نگاری نے یہ ظاہر کرنے سے باز رکھا کہ "دستنبو" میں عربی الفاظ آگئے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہیں اور وہ باور کرتے تھے کہ بقول غالب اس کتاب میں کوئی عربی لفظ نہیں آیا تو: ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

حالی نے ان الفاظ پر پردہ ڈالا یا ان الفاظ کی اصل ان کی نگاہوں سے چھپی رہی اور بعد کے محققین "گفتۂ غالب" اور "نوشتۂ حالی" نقل کر دینے پر قانع رہے۔

"دستنبو" میں عربی لغات:

دستنبو کے کتنے ہی اوراق عربی لغات کے پھولوں سے یوں گل بداماں ہیں کہ گویا ان میں کا ہر ورق

دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

یہاں ان میں سے چند چن کر پیش کیے جاتے ہیں:

---

[۵۱] "غالب" از ڈاکٹر عبداللطیف، مترجمہ معین الدین قریشی، حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۸

[۵۲] "احوال غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۶۱-۲۶۲

ماتم

دستنبو[51]

"ہریکی در سرای خویش بماتم نشست یکی از آن ماتم زدگان منم کہ در خانۂ خویش بودم" صفحہ: ۱۱ سطر: ۲-۴

"و نا آگہی از دوست ماتم را نسزد" صفحہ: ۱۷ سطر: ۱-۲

"و بریں ماتم بیغارۂ[52]...... روا باشد" صفحہ: ۱۷ سطر: ۵-۶

"گوئی آن کاشانہ در ماتم خویش کبود پوشید۔" صفحہ: ۲۲ سطر: ۲-۳

"ماتم کدۂ ایں مردہ دل بہ پہنائے[53] شہر .... بودہ است۔" صفحہ: ۲۷ سطر: ۸-۱۰

"آدینہ روز کہ بست و ہشتم ماہ[54] ماتم و ہژدہمیں روز از ستمبر بود"
صفحہ: ۲۹ سطر: ۷-۸

"دریں ماتم آور جادور[55] کہ آغاز آن فراموش است و انجام آن ناپدید"
صفحہ: ۴۶ سطر: ۳-۴

"شاہ ارک آرامگاہ ماتم زدۂ تاب و توانست" صفحہ: ۵۵ سطر: ۱۲

"و بد انسان کہ ماتم زدہ از ماتم زدۂ دیگر اندر رز پذیرد بدیں زمزمہ خود را ..... از بند رنج آزاد میکنم۔" صفحہ: ۶۹ سطر: ۵-۶

ماتم کے معنی:

مصباح اللغات[56]:

"لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ عموماً اس کا استعمال اس مجمع کے لیے ہوتا ہے جو اظہار غم کے لیے ہو۔"

صحاح[57]:

والماتم عند العرب النساء یجتمعن فی الخیر والشر والجمع الماتم وعند العامۃ المصیبۃ یقولون

---

[51] طبع اول، مطبع سعید خلائق، آگرہ، ۱۸۵۸ء　[52] "بیغارہ بفتحہ بای فارسی طعنہ ۱۲"

[53] "پہنا عرض ۱۲"　[54] "ماہ ماتم ماہ محرم ۱۲"　[55] "جادور بروزن باور حال ۱۲"

[56] مرتبہ عبد الحفیظ بلیاوی، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۵۰ء

[57] تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ، تالیف ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری، طبع ۱۲۸۲ھ

کنا فی ماتم فلان ":

قاموس[51]:

"والماتم کمقعد کل مجتمع فی حزن او فرح او خاص بالنساء او بالشواب"

لسان العرب[52]:

"اذا جمع بین شیئین ومنه سمی الماتم لاجتماع النساء فیہ .... والماتم کل مجتمع من رجال او نساء فی حزن او فرح ...... وحض بعضھم بہ النساء یجتمعن فی حزن او فرح وفی الحدیث قاموا علیہ ماتما الماتم فی الاصل مجتمع الرجال والنساء فی الغم والفرح ثم خص بہ اجتماع النساء للموت":

تاج العروس[53]:

"قال ابن البری لا یمتنع ان یقع الماتم بمعنی المناحۃ والحزن والنوح والبکاء لان النساء لذالک اجتمعن والحزن ھو السبب الجامع":

آہ

دستنبو:

"آہ از ان خاتونان پریچہرۂ نازک اندام" صفحہ: ۱۱ سطر: ۱۱

"چہ دل ہنم بگہر پاشی سخن چومرا ۔ ہزار آبلہ بر دل بود زگرمی آہ"

صفحہ: ۱۷ سطر: ۷-۸

"آہ اگر باشد ہمیں امروز من فردای من" صفحہ: ۴۷ سطر: ۳

"کشیدم آہی وگفتم دریغ دیوانہ" صفحہ: ۵۰ سطر: ۲

"پس از کشیدن آہی" صفحہ: ۵۰ سطر: ۵

آہ کے معنی:

مصباح اللغات: "درد مند ہو آہ آہ کرنا"

صحاح: "قولھم عند الشکایۃ اوہ من کذا ساکنۃ الواو انما ھو توجع

---

[51] قاموس اللغہ، تالیف (مجد الدین) محمد بن یعقوب الفیروز آبادی، طبع بمبئی، ۱۲۷۲ھ

[52] تالیف جمال الدین محمد بن مکرم۔ مطبع میریہ، مصر، ۱۳۰۲ھ

[53] تالیف سید محمد مرتضیٰ الحسینی، مطبع خیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ

قال الشاعر:

فاوه لذکراها اذا ماذکرتها ومن بعد ارض بیننا و سماء ......

وقد اوه الرجل تاویها و تاوه تاوّها اذقال اوّہ والاسم منہ الآ

ہة بالمد قال مثقب العبدی

اذا ماقمت ارحلها بلیل تاوّه آهة الرجل الحزین

ویروی اهة من قولهم اه ای توجع قال العجاج:

باهة کاهة المجروح"

قاموس:

"کلمة تقال عند الشکایة او التوجع"

لسان العرب:

الازهری: "آه" هو حکایة المتاهه فی صوته وقد یفعله الانسان

شفقة وجزعا و انشد:

آه من تیاك آها ترکت قلبی متاها وقال ابن الانباری:

آهِ من عذاب الله ... وآهٍ من عذاب الله ... ابن المظفر: اوّه

واهّة اذا توجع الحزین الکئیب فقال آه اوهاه عند التوجع ..

قال ابو سیده:

وقد تاوّه آها و آهة ویکون هاه فی موضع آه من التوجع"

خنجر

دستنبو:

"رده رده چون مژه با خنجرہا آختہ" صفحہ: ۱۴ سطر: ۷-۸

"سرگزشتی است بر زبان کہ زبان برمن از خویش خنجر اندازد"

صفحہ: ۲۰ سطر: ۱۲

خنجر کے معنی:

مصباح اللغات: "بڑی چھری"

صحاح: "سکین کبیر"

---

۵۶ مرتبہ عبدالحفیظ بلیاوی

۵۷ تاج اللغہ و صحاح العربیہ صفحہ ۱۲ رده رده صفحہ در صفحہ ۲"

قاموس: "السکین او العظیمۃ منھا"

لسان العرب:

"الخَنجَرَۃُ من الحدید والخَنجَرُ والخِنجَرُ السکین ومن مسائل الکتاب المرء مقتول بما قتل بہ ان خنجرا فخنجر و ان سیفا فسیف قال: یطعنھا بخنجر من لحم تحت الزنابی فی مکان سخن

رضا قلی خاں ہدایت نے "فرہنگ انجمن آرای ناصری" (۱۲۸۸ھ) میں صراحت کی ہے کہ خنجر فارسی نہیں عربی ہے۔ کہتے ہیں:

"اگرچہ در اشعار پارسی بسی مشہور است اما عربیست و دشنہ پارسی آن است"

زمزمہ

دستنبو:

"ہر زمزمہ را ہنجار"　　صفحہ: ۵ سطر: ۴

"زمزمہ سنج شیراز را میرم کہ درین　　پردہ ہوش فزا نوای دارد"

صفحہ: ۶۳ سطر: ۱۱-۱۲

"بدین زمزمہ خود را اگر شاد نتوان گفت باری از بند رنج آزاد میکنم۔"

صفحہ: ۶۹ سطر: ۵-۶

زمزمہ کے معنی:

مصباح اللغات:

"دور سے گنگناہٹ سنائی دینا...... عجمی کافروں کا کھانے کے وقت حلق یا نتھنوں سے آواز نکالنا اور ایک کا دوسرے کے مفہوم کو سمجھنا...... بادل کی گرج۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز۔ شیر کی گونج۔"

صحاح:

"والزمزمۃ صوت الرعد عن ابی زید والزمزمۃ علام المجوس عند اکلھم"

قاموس:

"الصوت البعید لہ دوی وتتابع صوت الرعد وھو احسنہ صوتا

وابنته مطرا وترا لمن العلوج على طعامهم وهم صموت لايستعملون لسانا ولا شفتا لكنه صوت تديره في خيا شيمها وحلوقها فيفهم بعضها عن بعض وصوت الاسد"

لسان العرب:

"والزمزمة تراطن العلوج عند الاكل وهم صموت لايستعملون اللسان ولا الشفة في كلامهم لكنه صوت تديره في خيا شيمها وحلوقها فيفهم بعضها عن بعض والزمزمة من الصدا اذا لم يفصح وزمزم العلج اذا تكلف الكلام عند الاكل وهو مطبق فمه ... وفي حديث قباث بن اشيم والذى بعثك بالحق ما تحرك به لسانى ولا تزمزمت به شفتاي الزمزمة صوت خفى لا يكاد يفهم ... وزمزم اذا حفظ الشئ والرعد يزمزم ثم يهدهد قال الراجز: يهدّ بين السحر والغلاصم

هدًّا كهد الرعد ذى الزمازم

تاج العروس:

"وقال الجوهرى الزمزمة كلام المجوس عند اكلهم زاد ابن الاثير بصوت خفى ... والزمزمة من الصدا اذا لم يفصح وتزمزمت به شفتاه تحركت ومن امثالهم حول الصليان الزمزمة يضرب للرجل يحوم حول الشئ ولا يظهر مرامه والصليان من افضل المرعى والمعنى في المثل ان ما تسمع من الاصوات والجلب لطلب ما يؤكل ويتمتع به وقال ابوحنيفه الزمزمة من الرعد ما لم يعل و يفصح وسحاب زمزام والعصفور يزمزم بصوت له ضعيف والغطام من الزنابير يفعلون ذالك وفرس مزمزم في صوته اذا كان يطرب فيه وزمام النار اصوات لهبها"

شرر

دستنبو:

"زین نوای شرر فشاں ترسم کاتش اندر نوا گر اندازد" صفحہ ۲۰ سطر ۱۱

شرر (مادہ: شرر) کے معنی:

مصباح اللغات:

"آگ کی چنگاری جو اڑے"

صحاح:

"والشرارة واحدة الشرار وهو ما يتطاير من النار وكذلك الشرر الواحدة شررة"

قاموس:

وشرة الشباب بالكسر نشاطه وكتاب وجبل ما يتطاير من النار واحدتهما بهاء"

لسان العرب:

" والشرر ما يتطاير من النار وفي التنزيل العزيز إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ واحدة شررة وهو الشرار واحدته شرارة"

تاج العروس:

"... (و) الشرار (كتاب و) الشرر (مثل جبل يتطاير من النار واحدتهما بهاء) هكذا في سائر النسخ التي بايدينا قال شيخنا الصواب كسحاب وهو المعروف في الدواوين... قال الشاعر:

اوكشرار العلاة يضربها القين على كل وجهه تثب -

اوپر "لسان العرب" کی عبارت میں گزر چکا ہے کہ "شرر" قرآن کریم میں (ایک جگہ) آیا ہے:

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (سورۃ المرسلات آیت: ۳۲)

صاحب

دستنبو:

"آوازۂ بخون غلتیدن صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار ..... بلند گشت"

صفحہ: ۱۱ سطر: ۵-۸

"صاحب کمشنر بہادر دہلی ..... سوی خود خواند"

صفحہ: ۱۵ سطر: ۹-۱۰

"آوازہ آمد آمد..... سرجان لارنس صاحب..... بلندی گرفت۔"

صفحہ: ۵۷ سطر: ۱۰-۱۲

"چارلس سانڈرس صاحب کمشنر بہادر۔"

صفحہ: ۶۲ سطر: ۲-۳

صاحب کے معنی:

مصباح اللغات:

"ساتھی۔ ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والا۔ مالک۔ وزیر۔ گورنر۔ کہا جاتا ہے: "صاحب حماۃ" یعنی حاکم حماۃ۔"

صحاح:

صحبه يصحبه صحبة بالضم وصحابة بالفتح وجمع الصاحب صحب مثل راكب وركب وصحبة بالضم مثال فارِه وفرهة وصحاب مثل جائع وجياع

قال الشاعر امرؤ القيس:

وقال صحابي قد شأونك فاطلب وصحبان مثال شاب وشبان والاصحاب جمع صحب مثل فرخ وافراخ والصحابة بالفتح الاصحاب وهي في الاصل مصدر وجمع الاصحاب اصاحيب وا صحبته الشئ جعلته له صاحبا واستصحبته الكتاب وغيره وكل شئ لاءم [illegible] فقد استصحبه"

قاموس:

"صحبه كسمعه صحابة ويكسر وصحبة بالضم عاشره وهم اصحاب واصاحيب وصحبان وصحاب وصحابة وصحابه وصحب واستصحبه دعاه الى الصحبة ولازمه ... واصحبته الشئ جعلته له صاحبًا وفلان احفظه كاصطحبه ومنعه والرجل صار ذا صاحب"

"المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم"[1] کی رو سے قرآن کریم میں یہ لفظ، مختلف شکلوں میں ۹۷ بار آیا ہے۔

صاحب "لغات القرآن" لکھتے ہیں:

"صاحب۔ والا۔ ساتھی۔ رفیق۔ صُحْبَۃٌ سے جس کے معنی ساتھ رہنے

---

[1] مرتبہ محمد فؤاد عبد الباقی، مطبع دار الکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۳۶۴ھ

کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر اصحابؓ اور صحابہؓ جمع۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"ساتھ رہنے والا صاحب ہے۔ انسان یا حیوان، مکان ہو یا زمان اور اس امر میں فرق نہیں کہ مصاحبت (باہم ساتھ رہنا) بدن سے ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت و ہمت کہ جس کے متعلق کہا ہے:

لئن غبت عن عینی لما غبت عن قلبی

(اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں)

اور عرف میں "صاحب" صرف اسی کو کہا جائے گا کہ جو کثرت سے ساتھ رہا ہو اور کسی شئی کے مالک کو بھی "صاحب" کہہ دیا جاتا ہے اور اسی طرح اس کو بھی کہ جو اس شئی میں تصرف کا مالک ہو[۵۱]۔"

غوغا

دستنبو:

"ہمہ تیر از تبر ناشناسندگان و از غوغای دُزد در تیرہ شب ہراسندگان"

صفحہ: ۱۰ سطر: ۱۰-۱۱

"چون غریو و غوغا شنودم" صفحہ: ۱۱ سطر: ۴

"بخت کہ در غوغای سپاہ سر از خواب گران بر داشتہ بود بچشم نیم باز باز فرو خفت۔" صفحہ: ۲۵ سطر: ۶

"غوغای زد و کُشت و گیرو دار تا بدین کوچہ نیز رسید۔"

صفحہ: ۳۰ سطر: ۱

غوغا کے معنی:

صباح اللغات:

"ٹڈی جو اڑنے کے لیے تیار ہو یا جس کے پر نکل آئے ہوں۔ بہت سے مختلف لوگ۔ نیچے طبقے کے لوگ۔ فسادی لوگ۔"

صحاح:

"والغوغاء الجراد بعد الدبي و به سمي الغوغاء والغاغة

---

۵۱ لغات القرآن، تالیف محمد عبدالرشید نعمانی، دہلی، ۱۹۵۳ء

من الناس وھم الکثیر المختلطون قال الاصمعی الجراد اذا صارت له اجنحه وکاد یطیر قبل ان یستقل فیطیر غوغاء وبه شبه الناس وقال ابو عبیدہ الغوغاء شیٔ شبیه بالبعوض الا انه لا یعض ولا یوذی وھو ضعیف فمن صرفه وذکرہ جعله بمنزلة قمقام ومن لم یصرفه جعله بمنزلة عوراء۔

لسان العرب:

" والغوغاء الجراد اذا احمر وانسلخ من الالوان کلھا وبلت اجنحته بعد الد با ابو عبید الجراد اوّل مایکون سروة فاذا تحرک فھو دبا قبل ان تنبت اجنحته ثم یکون غوغاء وبه سمی الغوغاء والغاغة من الناس وھم الکثیر المختلطون وقیل ھو الجراد اذا صارت له اجنحه وکاد یطیر قبل ان یستقل فیطیر یذکر و یونث ویُصَرِّفُ ولا یصرف واحدته غوغاءة وبه سمی الناس والغوغاء سفلة الناس . . . والغوغاء الصوت والجلبة قال الحرث بن حلزہ اجمعوا امرھم بلیل فلما اصبحوا اصبحت لھم غوغاء "

تاج العروس:

"(والغوغاء الجراد) یذکر ویؤنث ویصرف ولا یصرف ھو اولا سروة فاذا تحرک فدبی فاذا ابنتت اجنحه فغوغاء کذا فی التھذیب وقال الاصمعی اذا انسلخ الجراد من الالوان کلھا احمر فھو الغوغاء (و) الغوغاء (الکثیر المختلط من الناس) بسمو بغوغاء الجراد علی التشبیه کالغاغة نقله الجوھری . . . . . وتغاغی علیه الغوغاء رکبوه بالشر۔

قلعہ

دستنبو:

"بخون غلتیدند . . . قلعه دار در ارک[۵۱]" صفحہ: ۱۱ سطر: ۵-۶

قلعہ کے معنی

مصباح اللغات:

" بڑا ٹیلہ ۔ قلعہ ۔ بادل کا پہاڑ جیسا ٹکڑا ج قَلَع چٹان جو پہاڑ سے جدا ہو گئی ہو اور دشوار گزار ہو ج قلاع و قَلَع ۔

---

۵۱ " ارک بروزن درک قلعہ کہ درمیان حصار باشد ۔"

"والقلعة الحصن على الجبل ... والقلاع ايضاً قشر الارض الذي يرتفع عن الكمأة فيدل عليها والقلاعة ايضاً صخرة عظيمة فى فضاء سهل"

قاموس:

"والحصن الممتنع على الجبل ويحرك ج قلاع وقلوع .... والقلعة محركة صخرة تنقلع عن الجبل منفردة يصعب مرامها او الحجارة الضخمة ج قلاعٌ وقِلَعٌ"

لسان العرب:

والقلعة الحصن الممتنع على جبل وجمعها قلاعٌ وقَلَعٌ قال ابن برى: غير الجوهرى يقول القلعة بفتح اللام الحصن فى الجبل وجمعه قلاعٌ وقَلَعٌ وقيل القلعة بسكون اللام حصن مشرف وجمعه قلوعٌ"

کیسہ

دستنبو:

"دو در کیسۂ شبرواں[۱] .... است" صفحہ: ۱۵ سطر: ۶

کیسہ کے معنی

مصباح اللغات:

"تھیلی ۔ بٹوہ ۔ ج اکیاس و کیسہ، تھیلی جس میں بچہ رہتا ہے"

صحاح:

"والکیس واحد اکیاس الدراهم"

قاموس:

"والکیس بالکسر للدراهم لانه یجمعها ج اکیاس وکِیَسَةٌ"

لسان العرب:

"والکیس من الاوعیة وعاء معروف یکون للدراهم والدنانیر والدر والیاقوت قال: انما الذلفاء یاقوته اخرجت من کیس دهقان۔

تاج العروس:

"(والکیس بالکسر) من الاوعیة وعاء معروف یکون (للدراهم) ... (لانه یجمعها) ویضمها ج (اکیاس وکیسه) علی مثال عنبه (و) من المجاز (الکیس (المشیمه) لما یکون فیه الولد علی التشبیه بالکیس" (باقی آئندہ)

[۱] "شبرو دزد ۱۲"

تبصرے

(تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے)

ایک اُردو روزنامچہ

مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، تقطیع ۵ × ۷½، صفحات ۲۰۸ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ طباعت و کتابت بہتر۔

ناشر:۔ ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ۔

تراجم (سوانح) و تاریخ میں روزنامچوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اُردو ادب میں اس صنف کی بہت کمی تھی اس لئے جب کبھی بھی اس قسم کی کوئی چیز شائع ہوتی ہے تو اسے خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے، زیرِ تبصرہ روزنامچہ سندیلہ کے ایک بزرگ سید مظہر علی کی مفصل ڈائری ہے جسے انھوں نے بڑی پابندی سے ۱۸۶۲ء سے اپنے انتقال ۱۹۱۱ء تک لکھا، یہ کتاب ۸ ہزار فل اسکیپ سائز کے صفحات کا انتخاب ہے۔ فاضل مرتب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اسے بڑی خوبی سے مرتب کیا ہے۔ تقریباً نصف صدی کے روزنامچہ کی مکمل اشاعت عام دلچسپی کی نہ ہوتی اس لئے مرتب نے خاص خاص واقعات کا انتخاب کرکے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے واقعات روزنامچہ نگار کے ذاتی اور خانگی حالات، ہندو بیرون ہند کی مشہور شخصیتوں کے انتقال کی تاریخ وغیرہ کا انتخاب کیا ہے۔ جو پڑھنے والوں کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔ اخیر میں ایک اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس سے بہت سے وہ نام جو روزنامچہ میں آتے ہیں، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

اپنی موج میں

از آدارہ، تقطیع ۵ × ۷½، صفحات ۱۲۰، کاغذ، طباعت و کتابت بہتر، قیمت:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر: ادارۂ فروغ اُردو امین آباد پارک لکھنؤ۔

اگرچہ ادارۂ فروغ اُردو کو قائم ہوئے بہت زیادہ مدت نہیں گزری ہے اسی قلیل مدت میں اس نے اُردو ادب کی متعدد اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں، زیرِ تبصرہ کتاب بھی ادارۂ فروغ اُردو کا کا اہم کارنامہ جناب آدارہ کی کتاب "اپنی موج میں" کی اشاعت ہے جناب آدارہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہیں۔

یہ مجموعہ انھیں کے مضامین اور تقریروں کا مجموعہ ہے، اس میں انھوں نے ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی نقاشی کی ہے۔ پوری کتاب میں جتنے بھی کردار ہیں، ہو بہو، ان کا نقشہ نگاہوں کے

سامنے آجاتا ہے، مصاحب، بانکے، رکاب دار، مغلانی، مشاطہ، بھٹیاری، مرغ باز، اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ ہم کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ لفظوں کے مختصر معنی سمجھ لیئے جاتے ہیں، قدیم تہذیب کے یہ سب کردار ایک ایک کرکے ختم ہوگئے یا ختم ہوتے جارہے ہیں، لیکن آوارہ صاحب نے اپنی موج میں ان کی کچھ اس طرح کردار نگاری کی ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے انھیں کی شکل و صورت و رنگ روپ انھیں کے محاورات و اصطلاحات، انھیں کا طرز کلام انھیں کی زبان کچھ اس خوبی سے پیش کی ہے کہ پورے کردار سامنے آکھڑے ہوتے ہیں کتاب کے شروع میں، مولانا عبد الماجد دریا بادی کا پیش لفظ ہے۔ ایسی زبان لکھنے والے اور سمجھنے والے کچھ دنوں بعد ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے، اردو ادب میں یہ قابل قدر اضافہ ہے۔

ثنائے حبیب | از بہزاد لکھنوی، تقطیع ۵×۷۔ صفحات ۱۰۳۔ قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنے۔ ناشر:۔ ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ

بہزاد لکھنوی کی ۱۱۵ نعتوں کا مجموعہ ہے۔ تقسیم ملک سے قبل بہزاد صاحب آل انڈیا ریڈیو سے ہر جمعہ کی صبح کو ایک نعت سنایا کرتے تھے۔ مکتبۂ برہان نے ان نعتوں کے مجموعہ کو نعت حضور کے نام سے شائع کیا تھا، زیر نظر مجموعہ میں تمام وہ نعتیں ہیں جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی ہیں۔ ادارۂ فروغ اُردو کی شائع کردہ کتابوں میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔

دیوانِ صفی، صحیفۃ الغزل | مرتبہ ممتاز حسین جون پوری۔ تقطیع ۵×۷۔ صفحات ۱۶۰، کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت دو روپے۔

ناشر:۔ مرتب، ملنے کا پتہ درج نہیں۔

حضرت صفی لکھنوی مرحوم نے اردو شاعری کی آبیاری میں ۷۶ سال کی طویل مدت صرف کی، ۱۸۷۵ء سے ۱۹۵۰ء تک ان کی شاعری کا زمانہ پھیلا ہوا ہے۔ صحیفۃ الغزل، ان کے کلام کا مختصر انتخاب ہے۔ ابتدائی دور سے آخر دور تک کے کلام کا انتخاب بقید ادوار بہت سلیقہ سے کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مرتب کے علاوہ جناب جعفر علی خاں اثر، سید احتشام حسین اور سید شہنشاہ حسین صاحبان کے مقدمات کا خلاصہ دیا گیا ہے ان میں حضرت صفی کی شاعری اور ان کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جوئے رواں | از حامد اللہ افسر۔ تقطیع ۵×۷۔ صفحات ۲۳۸۔ طباعت و کتابت اور کاغذ بہتر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ناشر:۔ انوار بکڈپو لکھنؤ

حامد اللہ افسر اردو کے ایک کہنہ مشق اور مشہور شاعر ہیں۔ جوئے رواں ان کے کلام

کا تازہ مجموعہ ہے۔ کتاب مندرجۂ ذیل عنوانات پر تقسیم ہے۔ عالم اسرار، سوز وساز، گلبانگ، راہ گرد۔ طرح نو۔ غزلیات قطعات و رباعیات۔

حامد اللہ افسر بڑوں کے بھی شاعر ہیں اور بچوں کے بھی، اس مجموعہ میں ۱۵۳ صفحات تک بڑوں کے لئے نظمیں ہیں، جن میں عالم اسرار کے تحت درگہ حسن و عشق، مہمان اور میزبان بزم گہ تصورات خوب ہیں سوز و ساز کے تحت، ہندوستان و انگلستان، اک گدائے بے نوا، آج کل شکوۂ حور و جواب شکوہ حور اچھی نظمیں ہیں۔ نسیم سحر اور چاندنی رات میں شاعر نے مناظر فطرت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔

کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

دلِ رُسوا از اختر انصاری، تقطیع $\frac{1}{2}$۴ × ۷۔ صفحات ۱۲۰۔ کاغذ طباعت و کتابت عمدہ و صاف۔ ناشر:۔ حلقۂ ارباب فکر تین ہٹی کراچی۔ قیمت مجلد دو روپے

اردو ادب و شاعری میں اختر انصاری نئے نہیں ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے متعدد رسائل میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام قدیم و جدید خیالات و رجحانات کا سنگم ہے۔ خیالات میں سادگی اور اثر آفرینی ان کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہے۔

برگ سبز از ابو مسلم صحافی۔ تقطیع $\frac{1}{2}$۴ × ۷ صفحات ۱۰۴۔ کاغذ و طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنے۔ ناشر:۔ حلقۂ ارباب فکر تین ہٹی کراچی۔

ابو مسلم صحافی کے کلام کا مجموعہ، حلقہ ادب کراچی نے خوبصورت شکل میں شائع کیا ہے صحافی صاحب نے نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے کتاب کی ظاہری شکل و صورت جتنی پاکیزہ اور جاذب نظر ہے، کاش اسی طرح معنوی حیثیت سے یہ مجموعہ حسین و دلکش ہوتا۔ ("ف")

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

(۵) قصۂ پسو از رحمت

یہ نظم تیرہ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں اُس ماں کے تاثرات ظاہر کئے گئے ہیں جس کا معصوم بچّہ مرگیا ہو۔

ابتدا:-

پسو میرا سو اٹھ چالیا، سیاں ہر دم پکاروں میں　　بہاؤں اب ندی نالے، زمیں پر سر پچھاڑوں میں
سینہ پر رات دن سوتا، صبر اک تل نہیں ہوتا　　او میرا اڑ گیا طوطا، یہ دن رو رو گذاروں میں
پھروں دن رات دیوانی، پسو بن ہے پشیمانی　　نہ جاؤں باغ مہمانی، نہ تن اپنا سنواروں میں

خاتمہ:-

مسی اب ناکھسوں داتوں، یہ مہندی ترک دوں ہاتھوں　　کہ ڈالوں جیو سب باتوں، پسو کی گور جھاڑوں میں
مرا خوش بولتا پوپٹ، شکر قند گھولتا پوپٹ　　مرا دل رولتا پوپٹ، ملا جنت کے پاڑوں میں
بڑی مجھ سر مصیبت ہے، ولے یہ رب کی رحمت ہے　　صبر کا اجر جنت ہے، دکھوں تھیں سوس پاڑوں میں

(۶) زاری غم از رحمت

یہ نظم چودہ اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں ایک ایسی لڑکی کے تاثرات ظاہر کئے گئے ہیں جو عین جوانی میں موت کے حوالے ہو رہی ہو، اور ماں کو بے صبر دیکھ کر دلاسا دے رہی ہو۔

ابتدا:-

ہمیں جاتے ہیں گھر اپنے، اماں اب تم صبر کر لیو　　کہ چھایا تھا یوں ہی رب نے، اماں اب تم صبر کر لیو
کہ قاصد شاہ کا آیا، سچا فرمان دے لایا　　اتارو ہم سیں اب مایا، اماں اب تم صبر کر لیو
ہمارا شاہ رنگ داتا، نہ اس کوں خویش ناناتا　　کرے سب آپ من بھاتا، اماں اب تم [illegible]بر کر لیو

خاتمہ:-

اتارو اب زرینہ سب، جواہر ہور نگینہ سب　　لٹاؤ یہ خزینہ سب، اماں اب تم صبر کر لیو
ہمارے بال کوں جھاڑو، سیاں اب مانگ بیچ پاڑو　　سبھی سنگار سیں کھاڑو، اماں اب تم صبر کر لیو
سیاں کہہ دیکھ لیو چھیلا، نہ ڈالو انجواں ریلا　　ہووے کل حشر میں میلا، اماں اب تم صبر کر لیو

(۷) زاری غم از غاکی

یہ نظم بارہ اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں داغ مفارقت فرزند اور اس کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

ابتدا:-

سبھی اس کا ہی بوجھو غم، کہاں تھے تم کہاں تھے ہم　　کسی شی کا نہ کریو غم، بڑا ہے داغ فرزند کا
بی بی عائشہؓ نیں پوچھا کہ کھو، مجھ یا رسولؐ اللہ　　سخن یہ پوچھتی تم کوں، بڑا ہے داغ فرزند کا

کہ جس کے دو پسر جاویں ، ننھے بالک او مرجاویں کھووے کیا اجر پاویں، بڑا ہے داغ فرزند کا
خاتمہ :۔
کہایا عائشہؓ سنیو ، شفاعت اُس مری گنیو سدا ان میں سیں تم رہیو، بڑا ہے داغ فرزند کا
پچھوں بولے رسولؐ اللہ جسے دیوے اُسے مولیٰ اجر ہے باغ جنت کا، بڑا ہے داغ فرزند کا
کہا خاکی سو یوں کر کر ، صبر ہے سب منیں بہتر اجل آوے گی سب اوپر بڑا ہے داغ فرزند کا

(۸) مرثیہ از ہاشم

یہ چودہ بندوں پر مشتمل ایک چو مصرعی نظم ہے، جس میں حضرت حسینؓ کی شہادت سے متعلق بی بی فاطمہؓ کے تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پہلا بند :۔

آ کہی خیر النساء اے ماں کے دلبر دے جواب کیوں پڑا ہے خاک وخوں میں ہو کے بے سر دے جواب
پوچھتی ہے ماں تجھے اے ناز پرورد ے جواب بولتا کیوں نہیں بچن، کیا دکھ ہے تجھ پر دے جواب

آخری بند :۔

اِس حیاتِ مستعار اوپر تکبر عجب کیا جگ میں جو آیا سو جاوے گا نہیں کس کوں بقا
کرتا مل دل میں اے ہاشم کہ آخر ہے فنا کاں گئے ہیں گے حسین بابا او دلبر دے جواب

(۹) مرثیہ از قادر

یہ نظم بھی پندرہ بندوں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی حضرت حسینؓ کی شہادت سے متعلق بی بی فاطمہؓ کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پہلا بند :۔

کیا فاطمہؓ آج نشارا حسینؓ پڑا جگ میں غم کا اندھلا احسینؓ
گگن لگ ہوا سب دھولارا حسینؓ تجھے ظلم سوں حیف مارا حسینؓ

آخری بند :۔

نکینا میں کمتر کمینا غلام ہے قادر تمارا یا حضرت امام
علیک الصّلوٰۃ علیک السّلام ختم جگ پہ ہے غم تمارا حسینؓ

(۱۰) نصیحت نامہ از رحمت

یہ سترہ اشعار پر مشتمل ایک اصلاحی نظم ہے، جس میں شاعر نے مختلف طریقوں سے بے نمازوں کو چوکنا کرنے اور نماز کی ترغیب دینے کی کوشش کی ہے۔

ابتدا :-

تیرے سبب عالم اُپر آئی بلا اے بے نماز	واقع ہوا اندر شہر قحط و وبا اے بے نماز
شامت تری ایسی پڑی، راحت کسے نئیں اک گھڑی	سارے گناہاں میں بڑی تیری خطا اے بے نماز
حق نے تجے بخشا جیا، صورت شکل خوشتر دیا	اِس کا شکر تیں نا کیا یک دم ادا اے بے نماز

خاتمہ :-

توں یک وقت کیتا قضا دے حق تجھے اس کی سزا	شرمندہ توں نزدِ خدا اب کیوں ہوا اے بے نماز
جن یک نماز کیتے نہیں، وہ چھ ہزار برسوں تھیں	جالے اسے دوزخ میں قہر خدا اے بے نماز
مسجد طرف اب کر گذر، ہو حق میں رحمت کی نظر	دع ماکدر دع ماکدر، خذ ما صفا اے بے نماز

(۱۱) مخمس از شرفو

یہ گیارہ بندوں پر مشتمل ایک مخمس ہے جس میں شاعر نے اپنے وطن عزیز ہندوستان کی اخلاقی اور سماجی بدحالی کا ذکر کرنے کے بعد اُس سے ہجرت کرجانے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ یہ مخمس بہت دلچسپ ہے۔

پہلا بند :-

الہی تلخ لگتا ہے وطن ہندوستان اپنا	مدینہ میں کروں جاکر شتابی سیں مکاں اپنا
سناؤں جاکے حضرت کوں مصیبت کا بیاں اپنا	مبارک ان کے روضہ پر کروں قرباں جاں اپنا

چھڑاؤں قبر پہ ان کے جگر کا گلستاں اپنا

آخری بند :-

گئی رانڈوں میں سرداری حکومت گئی زنانوں میں	شکستہ حال شرفو کا دوشالے فلتبانوں میں
کنارے پکڑے پیروں نے ادب اٹھ گئی جوانوں میں	دیوانے ہو وے ہیں عاقل گئی عقل دوانوں میں

کہ الٹا پھیر پھرتا ہے یہ دور آسماں اپنا

(۱۲) نصیحت نامہ از نامعلوم

یہ نظم سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اس میں مذہبی اصلاح سے متعلق کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں۔

ابتدا :-

حق کا فرض کرتا نہیں، دن رات کچھ ڈرتا نہیں	انجھو چشم بھرتا نہیں، عابد ہوا تو کیا ہوا
رنگ راگ کے منہ منیں، ڈالا مدام کینہ منیں	مانے نہیں سینہ منیں، روزے رکھے تو کیا ہوا
بھونڈے عمل دائم کرے، دل میں نفاقی نت دھرے	بے ہوش ہو جگ میں پھرے، مومن ہوا تو کیا ہوا

خاتمہ:-

غافل نہ ہو دنیا بدل، کر کے سدا التقویٰ عمل　　تب پاوے گا حوراں محل، مسکیں ہوا تو کیا ہوا
جگ میں صبوری نا کرے جس دن قیامت آ ملے　　تب ہاتھ حسرت کے ملے پہلواں ہوا تو کیا ہوا
وے پلصراط ہے سخت تر، ہے بال سوں باریک تر　　تجھ کوں وہاں کرتا گذر سر پر چھتر تو کیا ہوا

(۱۳) مدح نبیؐ از رنگیں

یہ سات بندوں پر مشتمل ایک مخمس ہے، جس میں رسولؐ اللہ کی نعت بیان کی گئی ہے۔

پہلا بند:-

واللیل موں مبارک تو والضحیٰ محمدؐ　　حق کی عطا سیں نازل شد ھل اتیٰ محمدؐ
شمس الھدیٰ محمد، بدر الدجیٰ محمدؐ　　خیر الوریٰ محمد، صلوا علےٰ محمدؐ
درکار ہے شفاعت یا مصطفےٰ محمدؐ

آخری بند:-

اے دل قبول مت کر توں شیوۂ منافق　　لعنت ہے کاذباں پر نزد رسول صادق
اے صورت مسلماں نئیں کفر تجھ کوں لائق　　رنگیں سخن کوں اپنے کہہ شرع کے موافق
دیں گے جزائے نیکی روز جزا محمدؐ

(۱۴) زاری غم از رحمت

یہ نظم پندرہ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ایسی لڑکی کے تاثرات ظاہر کئے گئے ہیں، جس کا باپ مر چکا ہو اور ماں نے نئی شادی رچالی ہو۔

ابتدا:-

بابا مصیبت سر پڑی، بابا تموں بن کس کہوں　　بابا پگوں بیڑی جڑی، بابا تموں بن کس کہوں
بابا بڑا ہے درد اب، موں ہو گیا ہے زرد اب　　ماں نے کیا ہے مرد اب، بابا تموں بن کس کہوں
بابا پڑا مجھ دکھ نیا، ہے باپ سر پہ متریا　　ر... نہیں یک تل میا، بابا تموں بن کس کہوں

خاتمہ:-

بابا سدا غم میں رہوں مولیٰ بنا کس سیں کہوں　　جو کچھ پڑے سر سو سہوں، بابا تموں بن کس کہوں
بابا اماں تھو کے اِسی، اس دکھ نیں میں ہوں پھنسی　　دیوے نہ مجھ کا جل مسی، بابا تموں بن کس کہوں
بابا چلے تم ہو ودا، رحمت کرے تم پر خدا
کرتی ہوں اب یوں کرندا، بابا تموں بن کس کہوں

بیاض اشعار نزہت

یہ امیر الدین نزہت کی بیاض ہے، جس میں چار فارسی اور دو اُردو قصیدے ہیں، اس کے پہلے صفحہ پر حسبِ ذیل عبارت ہے:۔

"حسب فرمائش سید محمد قمر الدین صاحب الملقب بہ شاہ کلیم اللہ قادری، صوفی المتقی، صائم الدھر۔ خاکسار امیر الدین نزہت تخلص، بہ مدارات و اعتقاد تصنیف آورد، جائے سکونت ممدوح ضلع گواہ پنچی، تحت پھونڈہ"

ابتدائی تین قصیدے جو شیخ عبد القادر صاحب شافعی، مولوی عرفان صاحب حنفی اور قاضی عبد العلیم صاحب کی شان میں ہیں، فارسی ہیں، اور چوتھا شاہ محمد غوث گوالیاری کے عربی قصیدے کا فارسی ترجمہ ہے۔

باقی دو اردو قصیدوں میں سے ایک میں رسول اللہ کی وفات کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں ان کی نعت۔

گلشن قدس معروف بہ مجموعۂ عطر کے نام سے سیّد امیر الدّین نزہت کا ایک مجموعۂ کلام کریمی لائبریری میں موجود ہے، جس کو قاضی نور محمد صاحب بلندری نے ۱۲۹۶ھ میں مطبع مرغوب ہر دیار بمبئی سے شائع کیا ہے۔

یہ مجموعہ نزہت کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے اور اس کے آخر میں مختلف شعرا کے جو قطعات تاریخ درج ہیں، اُن سے کچھ مصنف کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اِن قطعات میں سب سے پہلا قطعہ خود مصنف کا ہے جس کے پہلے حسب ذیل عبارت ناشر کی طرف سے لکھی ہوئی ملتی ہے:۔

"تواریخ مصنف کتاب ہذا جناب سیادت مآب سیّد امیر الدین صاحب مرحوم و مغفور تخلص نزہت ساکن برہان پور دار السرور"

اس کے بعد تاریخ تصنیف سے متعلق خود نزہت کا لکھا ہوا حسب ذیل قطعہ درج ہے:۔

"یہ وہ مجموعہ کہ ہے گلشن قدس اس کا نام
حمد اور نعت میں واللہ غرائب ہے یہ
ہیں شگفتہ گلِ مضمون ہزاروں اِس میں
گلشنِ جنتِ فردوس عجائب ہے یہ"
۱۲۸۹

اس کے بعد بھی تاریخ تصنیف ہی سے متعلق منظور، آرزو اور فدا وغیرہ کے تقریباً تین چار مزید قطعات درج ہیں، اور آخر میں وفا کا لکھا ہوا یہ قطعہ ملتا ہے جس میں مصنف کے وفات کی تاریخ بیان کی گئی ہے :۔

وا دریغا کہ میر امیر الدین		کرد در گلشنِ جناں منزل
بود مدّاحِ احمد مختار		صاحب فہم و شاعر کامل
متخلص چو او بہ نزہت بود		شعر را بود تازگی حاصل
خبرِ رحلتش شنیدم چوں		بہر تاریخ شد دلم سائل
بلبلِ خامۂ وفا بنوشت		بہ جناں رفت نزہت بیدل
۱۲۹۴

اِن سب کا ماحصل یہ ہے کہ سید امیر الدین نزہت دارالسرور برہان پور کے رہنے والے ہیں انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں اپنے مجموعۂ کلام گلشن قدس کی ترتیب دی، انھیں رسول اللہ سے بے حد شغف تھا، ۱۲۹۴ھ میں انتقال کیا۔

سلک گوہر کے نام سے جاوید انصاری صاحب برہانپوری نے برہان پور کے شعرائے قدیم کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں نزہت کا کہیں ذکر نہیں۔

بیاض نزہت کے جز، دو اردو قصیدوں کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے، وہ گلشن قدس میں موجود ہیں۔

(۱) اشعار غم انگیز حسرت خیز، دربیان وفات شریف سلطان الانبیاء صلعم از نزہت غفرلہٗ

ابتدا:۔

بڑا داغ جگر داغ جگر ہے		بڑا دورانِ سر دورانِ سر ہے
قیامت پر بھی ہے ترجیح اس کو		بیانِ رحلتِ خیر البشر ہے
زمیں پر کیا ذرا دیکھو فلک پر		کہ ابر تر بھی کیسا چشم تر ہے

خاتمہ:۔

خدا کے واسطے شاہِ مدینہ		یہ ازبس درد و غم شدت اثر ہے
دکھا دیجے کفِ پا ہی خدا را		کہ وہ حد درجہ آرام جگر ہے
یہ ہو مقبول عرضِ نزہت اے شاہ		کہ یہ تیرا غلام و خاکِ در ہے

جملہ شعر (۱۳) خط نستعلیق۔

(۲) قصیدہ بر وزن غزل از میاں سید امیر الدین صاحب تخلص نزہت

ابتدا:-

ہے دین ذی عروج ہمارا محمدی ‌ ‌ ‌ ‌ بجتا ہے پنجگانہ نقارا محمدی
ہر جا ہے ذکر خیر صلوٰۃ و سلام کا ‌ ‌ ‌ ‌ کیا عروج اوج پر ہے ستارا محمدی

خاتمہ:-

آتا ہے جب زبان پہ ہوتا ہوں میں نثار ‌ ‌ ‌ ‌ ہے جس سے مجھ کو نام پیارا محمدی
نزہت پڑھیں درود صباح و مسا مدام ‌ ‌ ‌ ‌ مومن ہیں ہم وظیفہ ہمارا محمدی

جملہ شعر ۲، خط نستعلیق

بیاض اشرف

اشرف کا پورا نام سید عبدالفتاح اشرف علی ہے، یہ گلشن آباد (ناسک) کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام سید عبداللہ حسینی تھا، انھیں اپنے وقت کے بہت سے جید علماء سید میاں سورتی، ملّا عبدالقیوم کابلی، مفتی عبدالقادر تھانوی، مولوی خلیل الرحمٰن رامپوری، مولوی فضل رسول بدایونی مولوی محمد اکبر کشمیری اور مولوی محمد ابراہیم باعلکلہ وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد یہ ضلع خاندیش کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور ۱۲۸۴ھ میں الفنسٹن ہائی اسکول کی ملازمت اختیار کر لی اور پھر حکومت کی طرف سے وظیفہ یاب ہوئے۔ حکومت نے انھیں ان کے مذہبی اور علمی کارناموں کے صلہ میں جسٹس آف پیس اور خان بہادر کا خطاب دیا، مرتے دم تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

ان کی تصانیف میں جامع الفتاوی چہار جلد، خزینۃ العلوم دو جلد، تائید الحق، خزینۂ دانش کلید دانش فارسی، کلید دانش ہندی، اشرف القوانین، تحفۃ المقال، اشرف الانشاء، باقیات الصالحات، رحمۃ اللعالمین، تاریخ روم، تاریخ اولیاء اور دیوان اشرف الاشعار وغیرہ قابل ذکر ہیں[۵۱]

مذکورۂ بالا بیاض اشرف کے دس اردو اور دس فارسی قصائد پر مشتمل ہے، جن کو خود انھوں نے اپنے دیوان قصائد اردو و قصائد فارسی سے نقل کر کے مولانا محمد صدیق ملتانی ثم احمد نگری کی خدمت میں بھیجا ہے، پہلا قصیدہ مشہور قصیدۂ بردہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے، اور باقی رسول اللہ صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی حیدرؓ اور حسنؓ و حسینؓ کی شان میں ہیں، اور آخری قصیدہ

---

[۵۱] تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۱۲۶

دیوان قصائد اشرف کی تاریخ سے متعلق ہے۔

ابتدا:-

ہے محبت کس حبیبِ خاص کی اس جا بیاں — یاد میں جس کی ہوا خوں میری آنکھوں سے رواں
یا چلی ہے فاطمہؓ کے باغ سے بادِ نسیم — یا درخشاں برق صحرائے اضم سے ہے عیاں
کیا ہوا آنکھوں کو روئیں منع کرنے سے زیاد — کیا ہوا دل کو جو بہلا دیں تو ہو شورش کناں

خاتمہ:-

بیاض اس کی مقدس اور شعر ہے طور کا ہر حرف — نہاں ہے روشنائی میں تجلا سنگ اسود کا
ترا ممدوح ہے محبوب حق، اور نعت ہے مقبول — صلہ جنت میں ہے تجھ کو محل لعل و زمرد کا
مرتب جب ہوا دیوان مدح احمدی اشرف — کہا ہاتف نے یہ ہے اشرف الاشعار سید کا
۱۲۷۹

آخر میں وہ خط ہے جس کو اشرف نے اپنے اشعار کے ساتھ مولوی صدیق صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے، اس میں اپنی بے بضاعتی کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ منسلکہ قصائد پر بھی روشنی ڈالی ہے، اشرف نے یہ خط اور انتخاب دھولیا سے ۱۲۸۲ھ میں اپنے ہاتھوں سے لکھ کر روانہ کیا ہے۔

دیوان اشرف الاشعار جس کے منتخب قصائد پر یہ بیاض مشتمل ہے چھپ چکا ہے۔

ضمیمۂ

مقالہ نُما

مرتبین

عالی جعفری ، فضل اللہ فاروقی ، عصمت جاوید ، سیّد جمیل الدّین

ضروری نوٹ :- مقالہ نُما میں شامل شدہ مضامین کی نقل حسبِ طلب (خطِ شکست میں) دو آنے فی صفحہ کی اجرت پر مہیّا کی جا سکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائیگی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱۔ آصف قدوائی ڈاکٹر:

اسلام میں نبوت کا تصور

(دوسری اور آخری قسط)

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ جنوری، ۲۵-۳۱)

خدا ہی گناہ معاف کرسکتا ہے اور وہ نہ چاہے تو کوئی معاف نہیں کرا سکتا۔ سارے پیغمبر ایک ہی خدا کے فرستادہ ہونے کے باعث اصولاً ایک ہی پیغام لے کر آئے۔ انبیاء خدا کے بندے تھے۔ خدا ان پر اپنے احکام نازل فرماتا وہ ان احکام کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ ان سب کا دین واحد تھا اگرچہ شریعتیں مختلف تھیں۔

۲۔ آصف قدوائی ڈاکٹر:

پیغمبر اسلام اور تلوار

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ مارچ ۱۳-۲۲)

قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ محمدؐ کی سیرت ہی میں کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جو دین کی جبری اشاعت کی طرف اشارہ کرتا ہو۔

۳۔ ابوالحسن علی ندوی۔ سید:
عتیق الرحمٰن۔ مترجم:

پرچم محمدیؐ کی طرف

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ فروری ۱۶-۲۴)

عرب دوستوں کے نام ایک طویل خط جس میں انھیں اسلام کے عہد اول کی یاد دلائی گئی ہے اور دعوت دی ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و ترقی اسلامی تعلیمات و اخلاق پر عمل کرنے ہی میں ہے۔ اگر انھوں نے تعلیمات محمدی سے منہ موڑا تو باوجود حکومت و سلطنت کے قوم برباد ہو جائے گی۔ مسلمانوں خاص طور سے عربوں کو اعمال صالحہ کی طرف دعوت دی ہے اور مغرب کی مادی اندھی تقلید کرنے سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

۴۔ ابوالحسن علی ندوی:

زندگی میں فرد کی اہمیت

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ مارچ ۲۳-۲۸)

مولانا ابوالحسن علی کی تقریر جو انھوں نے ۱۲ر فروری ۵۵ء کو جون پورٹاؤن ہال میں کی تھی۔ اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمیں ہر اجتماعی کام میں فرد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ صالح افراد کی تیاری ہی ہر اجتماعی تحریک کا مطمح نظر ہونا چاہیئے۔

۵۔ راشد برہانپوری:

مجمع البحار پر تحقیقی نظر

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ مارچ ۲۰۲-۲۱۱)

مجمع البحار نام کی دو علیحدہ تصنیفیں ہیں۔ ایک قرآن مجید کی تفسیر ہے اس کے مصنف شیخ طاہر محدث ہندی ہیں اور دوسری صحاح ستہ کی شرح ہے جس کے مصنف شیخ محمد طاہر یا محمد بن طاہر پٹنی ہیں بلکہ محمد بن طاہر ہی زیادہ قرین قیاس ہے مضمون میں موخر الذکر تالیف کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

۶۔ جعفر شاہ:

عصبیت

(فیض الاسلام لاہور ۵۵ جنوری ۱۹-۲۵ و ۲۶)

قول نبوی کہ عصبیت ظلم میں قوم کا ہاتھ بٹانا ہے کی تفصیلی تشریح پیش کی ہے۔

۷۔ جعفر شاہ:

فرمان رسولؐ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ فروری ۱۳-۱۴)

مختلف احادیث جن میں سود کی متعدد قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ترجمہ اور تشریح۔

۸۔ جلال الدین انصر عمری:

دورِ رسالتؐ و صحابہؓ اور علم حدیث

(فاران کراچی ۵۵ مارچ ۹ - ۳۹)

منکرین حدیث جس نہج اور جس ڈھنگ سے حدیث کا انکار کرکے صرف قرآن پاک کو قابل عمل تصور کرتے ہیں ان کے دلائل اور ان کے خیالات کی نہایت وضاحت اور دلائل سے تردید کی گئی ہے۔ مختلف عنوانات قائم کرکے مثلاً حضورؐ کے دور میں علم حدیث تبلیغ احادیث کا حکم دورِ رسالت میں کتابت حدیث، دورِ صحابہ میں علم حدیث دورِ خلفائے راشدین وغیرہ میں تفصیلی بحث کی ہے کہ بغیر احادیث کو مانے ہوئے اسلام کی صحیح تعلیم ہو ہی نہیں سکتی۔

۹۔ ضیاء الدین اصلاحی:

امام ابوحنیفہ کی فقہ.....

(معارف اکتوبر ۵۵ فروری ۴۲، ۱۵۲-۱۳۲)

امام ابوحنیفہ کو تارک حدیث کہنا یکسر غلط ہے۔ آپ کے فقہی دلائل سات چیزوں پر منحصر ہیں (۱) کتاب (۲) سنت (۳) اقوال صحابہ (۴) اجماع (۵) قیاس (۶) استحسان (۷) عرف۔

۱۰۔ عبدالحمید:

عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

(۲)

(ترجمان القرآن۔ اچھرہ لاہور ۵۵ فروری ۹-۱۴)

عقیدہ ختم نبوت پر مفصل بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ عقیدہ ختم نبوت ایک مابعد طبیعی تصور کی حیثیت سے اسلام میں شامل نہیں، بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کی ترتیب و تشکیل میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی ایک عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے قیامت تک ایک پیکر محسوس کی شکل میں واحد معیار حق پیش کیا۔

انھیں رشد و ہدایت کی معرفت قدریں عطا کیں۔ ملت اسلامیہ میں ہر قسم کے نسلی، نسبی، اور قومی امتیازات کو مٹا کر سوسائٹی میں ایک صحیح قسم کی معاشرتی، معاشی، اور سیاسی مساوات کی داغ بیل ڈالی۔

۱۱۔ عبدالقادر عودہ شہید:

ادارہ۔ مترجم۔

اسلام اور ہمارا قانونی نظام

(۲ و ۳)

(ترجمان القرآن اچھرہ لاہور ۵۵ فروری ۲-۵۶
مارچ ۹ - ۱۵)

مصری فاضل و اخوان المسلمین کے رہنما عبدالقادر عودہ شہید کے مضمون کا ترجمہ اس میں، اسلام کے قانونی نظام، مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ قانون کا مقصد و منشا، ہر قوم کا اپنا اپنا قانون ہے۔ بلاد اسلامیہ کے اجنبی قوانین۔ قانون کا مقصد خیر کا قیام ہے۔ مندرجہ بالا عنوانات پر بحث کرنے کے بعد، مصر کے موجودہ قوانین سے متعلق سخت تنقید کی ہے کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ اور مصر میں شراب اور حرام کاری جائز ہیں۔

تیسری قسط میں مغربی قوانین کی تقلید کرتے ہوئے اسلامی ممالک اور خاص طور سے مصر میں مروجہ یورپی قوانین کے مضر اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ جن قوانین کی بنا محض مصلحت اور منفعت پر رکھی جاتی ہو انھیں فرد اور جماعت کا دائمی احترام کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ آج کل کے بیشتر قوانین عالم کا یہ حال ہے کہ ان کا رشتہ دین، عقائد، اخلاق اور خصائل انسانی سے منقطع ہو چکا ہے۔

۱۲۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ فروری ۹۔ ۱۱۰)

لین دین کے معاملات میں قرآنی احکام اور ان کا تفسیر

۱۳۔ مجیب اللہ ندوی:

قرآن مجید میں آیات رجم

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ مارچ ۱۶۵-۱۸۲)

زنا، محرکات زنا اور سزائے زنا کے تدریجی قرآنی احکام کا جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ بات صحیح نہیں، جیساکہ اکثر محدثین و مفسرین سمجھتے ہیں کہ قرآن میں آیات رجم کا نزول ہوا تھا جو بعد میں منسوخ التلاوت قرار دی گئیں بلکہ آنحضرتؐ نے سورۂ نساء کی آیت کی روشنی میں مرضیٔ خداوندی کے مطابق رجم کی سزا تجویز فرمائی تھی (باقی)

۱۴۔ محمد منظور نعمانی:

معارف الحدیث

(مسلسل)

(الفرقان، لکھنؤ ۵۵ جنوری ۱۸-۲۴)

حُسنِ عمل سے متعلق احادیث، مع ترجمہ و تشریح۔

۱۵۔ محمد منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(قسط ۱۶- ۱۷- ۱۸)

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ء، جنوری، فروری، مارچ
۱۱-۱۷، ۹-۱۵، ۵-۱۲)

قسط ۱۶ میں عمل صالح کی اہمیت اور قرآن کریم کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں ایمان و عمل صالح کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا ان دونوں سے مل کر وہ زندگی بنتی ہے جو مطلوب ہے۔

قسط ۱۷-۱۸ میں تقویٰ سے متعلق قرآنی آیتیں مع ترجمہ و تفسیر لکھی گئی ہیں اور تقویٰ سے متعلق قرآنی دعوت کے مختلف پہلوؤں پر آیات کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے۔

۱۶۔ نعیم صدیقی:

شدت اور تجدد

(ترجمان القرآن اچھرہ لاہور ۵۵ مارچ)

پاکستان اسٹینڈرڈ کے اڈیٹر مسٹر فرید جعفری نے اپنے اداریہ میں قرارداد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد "سنت" کے اضافہ سے متعلق ایک سخت نوٹ لکھا کہ حدیثوں میں اختلافات کی وجہ سے قوم میں اختلافات کا دریا اور وسیع ہو جائے گا۔ اور ملّا ازم کو فتح ہوگی۔ مضمون نگار نے مسٹر فرید جعفری کے اداریہ سے اقتباس دیتے ہوئے نہایت تفصیل اور سنجیدگی سے ایک ایک بات کا جواب دیا ہے۔

۱۷۔ نعیم صدیقی:

نظام اسلامی اور اطاعت رسولؐ

(۷)

(ترجمان القرآن اچھرہ لاہور ۵۵ فروری ۱۸-۳۸)

نظام شریعت میں حدیث کا کیا مقام ہے، نبیؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی لازمی اور ضروری ہے، یہود کی گمراہی کا راز ان کی تاویلات ہی ہیں اسلامی ریاست کے نظام سمع و طاعت سے متعلق آیات سے شہادت، خدا، نبی اور اولی الامر کی اطاعت کی توضیح، اس سلسلہ میں مزید مسایل کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۸۔ واحدی ملا:

ختم نبوت

(فاران کراچی ۵۵ مارچ ۴۰-۴۶)

ختم نبوت سے متعلق قادیانی عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے "خاتم" کے لغوی معانی متعدد لغات عرب سے پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ قدیم الہامی کتابوں میں نبی آخر الزماں کو بشارت دی گئی تھی لیکن قرآن میں کسی آنیوالے نبی کی بشارت نہیں پائی جاتی بلکہ قرآن و احادیث سے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اب کوئی نبی نہ آئے گا۔ اگر کوئی نبی آنے والا ہوتا تو پچھلی الہامی کتابوں کی طرح قرآن پاک نازل کرنے والا خدا جس نے چھ ہزار آیات نازل کی ہیں کم از کم ایک آیت تو اس موضوع پر بھی نازل کرتا۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۹۔ ا۔ ا:

پریذیڈنٹ ٹیٹو

(ہندستانی ادب، حیدرآباد (دکن) ۵۵ فروری ۱۸۔ ۱۹)

مارشل ٹیٹو صدر ریپبلک یوگوسلاویا کی زندگی کے مختصر حالات۔

۲۰۔ ادارہ:

میرزا غالب کی سرگذشت خود ان کے قلم سے

(فروغ اُردو لکھنؤ، ۵۵ فروری ۱-۲)

غالب کے حالات، خود ان کی تحریروں اور خطوط سے جمع کرکے خاندان و نسب سے آخر تک کے مختصر حالات ترتیب دئے گئے ہیں۔

۲۱۔ ادارہ:

حضرت جعفر طیارؓ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ فروری ...)

حضرت جعفر طیارؓ کے حالات اور ان کے مختصر کارنامے۔

۲۲۔ اشرف حسین محمد:

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر

(برہان دہلی ۵۵ مارچ ۱۶۸۔ ۱۸۳)

حضرت امیر خسرو کے مختصر حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔

۲۳۔ اقتدار حسین:

لکھنؤ کے موجودہ ادیب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی

(فروغ اردو۔ لکھنؤ ۵۵ فروری۔)

جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی، ان کی تصانیف کی فہرست، اور ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ۔

۲۴۔ اکبر علی ترمذی سید:

جلالی احمد آبادی

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴، اکتوبر ۲۶۔ ۳۴)

اس قسط میں بتایا ہے کہ دربار شاہیہ سے علماء، قرا اور شعراء وابستہ تھے اور ان وابستگان میں سے بعض کے حالات درج کیے ہیں۔

۲۵۔ الطاف گوہر:

میراجی

(ماہ نو کراچی، ۵۵ جنوری ۱۱۔ ۱۶، ۶۰)

میراجی کی شخصیت کو لوگوں نے پُراسرار بنادیا ہے حالانکہ وہ ایک بھلے چنگے سیدھے سادے انسان تھے۔ وہ پرسکون، باقاعدہ اور باصول زندگی گذارنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جب وقت اور ماحول نے ان کا ساتھ نہ دیا تو انھوں نے مستقبل سے رشتہ توڑ لیا اور ذاتی دحال کے دائرے میں سمٹ گئے جس کے سبب ان کی زندگی اور شعر کا انداز لازمی طور پر بدل گیا۔ ان کی شاعری دراصل اپنی شخصیت کو چھپانے اور فنا کردینے کی کوشش ہے۔ ان کی شاعری پر ابہام اور جنس کا الزام بڑی حد تک زیادتی ہے۔

۲۶۔ امجد علی۔ سید:

فیضی رحمین

(ماہ نو، کراچی، ۵۵ فروری ۲۲۔ ۲۴)

مشہور مصور فیضی رحمین کے کارناموں کے ذکر کے بعد لکھا ہے:۔ "فیضی رحمین نے ہمارے اپنے تمدن کی روح کو اپنے اندر بڑی شدت سے جذب کیا ہے اس کے فن پر ہماری مصوری موسیقی اور عمارت گری کا بہت گہرا اور نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے۔

(۲) ہمارے لوگوں کی زندگی نہ صرف اپنے تمام نقوش

اور داستانوں بلکہ روزمرہ کی سرگرمیوں اور مشغلوں کے ساتھ اس کی تصاویر میں جھلکتی ہے اور سب باتوں سے زیادہ اس نے ہمالیہ کے عظیم سلسلہ کوہسار کی لازوال برفانی چوٹیوں کے روبرو حیات ومرگ کے مسائل پر غور کیا ہے اور اس نے مشرق ومغرب کے بہترین قدیم و جدید افکار وخیالات خصوصاً مذہب کے گوناگوں مظاہر پر پوری توجہ دیتے ہوئے اپنے تخیلات کو ایک مربوط ومتوازن شکل عطا کی ہے۔"

۲۷۔ جمیل الدین سید:

طالع یار خاں دہلوی

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴، اکتوبر ۵-۲۰)

غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مُردے سے بدتر ہوں گے۔"

مقالہ نگار نے انہی طالع یار خاں کے نسب، نام مولد، مسکن، کمالات اور مدفن پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی اولاد کا حال لکھا ہے۔

۲۸۔ رغیب حسین سید:

ابو علی ابن سینا بحیثیت ایک فارسی ادیب اور شاعر

(برہان دہلی ۵۵ مارچ ۱۴۳-۱۴۴)

بوعلی سینا کے حالات زندگی اور ان کی کتب و رسائل فارسی کا ذکر کرنے کے بعد ان کی ادبی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور بعض سفینوں، مجموعوں اور کتابوں میں پائے جانے والے ان کے پراگندہ اشعار میں سے کچھ اشعار پیش کرکے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے قطعات، رباعیاں اور قصائد لکھے ہیں۔

۲۹۔ سلطان برنی:

سراج الدین ظفر

(ماہ نو کراچی ۵۵ جنوری ۵۳-۵۴)

سراج الدین ظفر کی آواز صحیح معنوں میں "آواز" ہے۔ مجازی نہیں حقیقی، بڑی گونجتی پاٹ دار آواز جس میں صرف گونج ہی نہیں بلکہ گرج بھی ہے۔ اس کی شخصیت کی طرح اس کا لب ولہجہ اور انداز بیان بھی ہنگامہ آفریں ہے۔ ظفر جو کچھ کہتا ہے نہایت بے باکی اور "بے حجابی" سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کسی اخفا کو جائز نہیں سمجھتا۔ ماحول مشیت اور قضا وقدر کو دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ یہ پانچ دریاؤں کی سرزمین کی تند رستی تنو مندی اور صاف گوئی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں ابیقورس اور خیام دونوں کی روحیں ایک نئی شوخی و مستی اور شان جلالی کے ساتھ اتر آئی ہیں۔ ظفر نے فارسی و اردو کی رندانہ جسارتوں پر چونکا دینے والے اضافے کئے ہیں۔ اس نے غزل کی زبان تو اختیار کی ہے لیکن اس میں اپنی انفرادیت سے ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے۔

۳۰۔ عبدالعلیم نامی۔ ڈاکٹر:

رونق بنارسی

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴ اکتوبر ۴۴-۵۰)

رونق بنارسی کا حال لکھا ہے ان کے ڈراموں کی فہرست دی ہے اور ڈراموں کے پلاٹ درج کیے ہیں۔ ضمناً ابتدائی ہندوستانی تھیٹر اور ابتدائی ہندستانی ڈراموں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۳۱۔ عقیل احمد جعفری:

یاد خیر آباد

(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۴۸-۵۵)

عشق، اطہر خیر آبادی، حکیم اقتدار حسین، انیم خیر آبادی، عبدالجبار خاں شروانی عرف جھبن قوال قیصر

سعید احمد بلگرامی اور حاجی جلیس احمد کا تذکرہ پیش کیا ہے۔

۴۳۔ گھنشیام سیٹھی:

غواصی ۔۔ دکن کا ملک الشعراء

(آج کل دہلی ۵۵ مارچ ۲۰-۲۴)

ملا غواصی قطب شاہی دور کا دوسرا اہم ترین شاعر گذرا ہے۔ مگر قطب شاہی عہد کی تاریخیں اور تذکرے اس عظیم شاعر کے تفصیلی حالات سے بالکل خالی ہیں۔ اس نے اگرچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا مگر قرار واقعی قدر عبداللہ قطب شاہ کے عہد ہی میں ہوئی۔ اس نے اسے محمد عادل شاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ عادل شاہ نے اس کی بڑی قدر اور عزت کی۔ غواصی پورے ہندوستان میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی قدرت کلام کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ اس کی دو ہی کتابیں (۱) سیف الملوک اور بدیع الجمال اور (۲) طوطی نامہ ہی منظر عام پر آئی ہیں اور یہ بھی فارسی سے ترجمہ ہیں تاہم اس نے ترجمہ میں اصل تخلیق کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اول الذکر ثانی الذکر سے کہیں بلند ہے حالانکہ زبان کے لحاظ سے طوطی نامہ بہتر ہے۔

۴۳۔ "م":

بزرگان دین

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۵ فروری ۱۵-۱۶)

شیخ فضیل بن عیاض کے حالات زندگی۔

۴۴۔ مسعود حسن رضوی:

یاد رفتگاں
حضرت آرزو لکھنوی

(فروغ اردو لکھنؤ۔ ۵۵ فروری ۷-۱۴)

آرزو لکھنوی کی شاعری، زبان و محاورات پر قدرت۔ نئی نئی تشبیہات و استعارات اور ان کا خوبصورت استعمال عربی فارسی الفاظ استعمال کئے بغیر غزل میں کامیابی حاصل کرنا ان سب پر اشارہ کرتے ہوئے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں۔ آخر میں حضرت آرزو کی زندگی پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

۴۵۔ مصلح الدین احمد:

رفیع احمد قدوائی مرحوم

(آج کل دہلی ۵۵ جنوری ۲-۴)

رفیع احمد قدوائی کے مختصر حالات ان کی سیاسی زندگی اور بحیثیت وزیر مواصلات اور وزیر خوراک ان کی کارگزاریوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

۴۶۔ نذیر احمد ڈاکٹر:

حضرت شیخ سماء الدین دہلوی

(معارف اعظم گڈھ، ۵۵ جنوری ۵-۱۲ فروری ۱۱۱-۱۱۲)

قسط (۱)

حضرت شیخ سماء الدین کے مولد، اساتذہ و مرشد کا ذکر کیا ہے ناگور، گجرات، رنتھنبور، بیانہ اور دہلی میں شیخ کے قیام اور سلاطین لودی سے ان کے روابط کا حال لکھا ہے۔

قسط (۲)

۹۰۱ھ میں تقریباً سو سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ تجہیز و تکفین میں بڑے بڑے علما شریک تھے۔ اپنے قول و عمل اور اخلاص کے لحاظ سے بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ رات دن ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ مولانا عبداللہ بیابانی اور نصیر الدین آپ کے بیٹے تھے۔ آپ کے ایک بیٹی بھی تھی۔ مریدوں اور شاگردوں میں شیخ عبدالشکور و شیخ عبدالغفور، مولانا عطاء اللہ شیخ الادن، شیخ ادھن اور مشہور نغمہ گو شاعر جمالی شامل ہیں۔ شیخ گدائی انہیں

جمالی کے بیٹے ہیں۔ آپ کی تصنیفات ہیں (۱) حواشی لمعات شیخ عراقی اور (۲) رسالہ مفتاح الاسرار کا پتہ چلا ہے۔

۳۷۔ نذیر احمد ڈاکٹر:
اسد بیگ قزوینی
(معارف اعظم گڑھ ۵۵ مارچ ۱۸۴۔۲۰۱)

عہد اکبری کی مشہور شخصیت اسد بیگ قزوینی کے حالات اور دیگر سیاسی و معاشرتی حالات ان کی اپنی تصنیف وقائع اسد بیگ کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں۔

۳۸۔ نعیم صدیقی:
مدیر و مرتب۔
مسعود عالم نمبر
(چراغ راہ۔ کراچی ــ ۵۵ مارچ)

چراغ راہ کی یہ اشاعت خاص مسعود عالم ندوی مرحوم سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی کارناموں اور سیرت و کردار پر مضامین لکھے گئے ہیں۔

خاص خاص لکھنے والوں کے یہ مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ سوچ بچار۔ نعیم صدیقی۔ ایک خط۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ الاستاذ مسعود الندوی ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی۔ داعی حق جو ہم سے جدا ہوگیا۔ محمد محمود الصواف (بغداد) کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ استاد احمد مظہر المغلہ۔ (دمشق) اللہ کے حوالے۔ طہٰ فیاض (بغداد) دن جو گزر گئے محمد ناظم۔ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔ رئیس احمد جعفری۔ دوست کی یاد میں۔ سید ابوالحسن علی ندوی مسافر۔ جیلانی۔ اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوں، مظفر حسین شاہ ندوی، بھائی جان۔ محمد عاصم جینداپور پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ سوانح اور شخصیات کا مطالعہ کے عنوان کے تحت۔ مولانا مرحوم کی بعض ناقابل فراموش خوبیاں۔ امین احسن اصلاحی۔ حالات زندگی۔ محمد عاصم۔ مولانا مسعود عالم ندوی خود اپنی نظر میں لالۂ صحرائی۔ علمی و فکری کارنامے کے تحت مختلف حضرات نے مسعود عالم ندوی مرحوم کی تصنیفات و مضامین پر روشنی ڈالی ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۳۹۔ ابوظفر ندوی، سید:
گجراتی بادشاہوں کے سکے
(معارف اعظم گڑھ ۵۵ جنوری، ۲۲۔۴۱)

مقالہ نگار نے جنہیں سکے جمع کرنے کا شوق رہا ہے اس مقالہ میں ۸۰۰ھ سے لے کر ۹۸۰ھ تک کے ۱۶ گجراتی بادشاہوں کے متعدد سکوں کا ضروری تشریح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ گجرات کے آخری بادشاہ مظفر شاہ نے جام نگر کے راجہ جام اور راناپور بندر کو سکہ ڈھالنے کی اجازت دے دی تھی ان کے مسکوکات کا ذکر بھی آگیا ہے۔

+ + +

۴۰۔ ادارہ:
پچھمی بھارت کی تہذیبی نشوونما
(آج کل دہلی ۵۵ جنوری، ۵۱)

مغربی ہندوستان کے قدیم تجارتی تعلقات تاریخ و معاشیات، اور فنون لطیفہ کی خدمات کا مختصر جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں اس کی پنج سالہ منصوبہ میں شمولیت کا ذکر کیا ہے اور اس کے قدرتی وسائل کی ترقی سے توقعات وابستہ کی ہیں۔

۴۱۔ اسعد گیلانی:
مکتوب بنگالہ
(چراغ راہ کراچی ۵۵ جنوری ۱۲۔۲۴)
(۲) اسعد گیلانی صاحب نے یہ خط نعیم صدیقی

کے نام لکھا ہے اس میں مشرقی بنگال کے تاریخی جغرافیائی، سماجی سیاسی، اور مذہبی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۲۔ تاراچند۔ ڈاکٹر:

ہندستان اور ایران کے تعلقات

(ہندستانی ادب، حیدرآباد (دکن) ۵۵ فروری ۳-۱۱)

ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ بہت قدیم زمانے میں ہندستان اور ایران کے مابین کافی وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور کئی صدیوں تک باہمی تبادلے کا یہ سلسلہ جاری رہا آپس کے میل جول سے علوم و فنون، دھارمک اور اخلاقی خیالات قصے کہانیاں اور شعروادب ملکی حدود سے بے نیاز ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی بہبود و خوش حالی کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اپنے قدیمی تعلقات بحال کریں بلکہ ان میں اور گہرائی اور استحکام پیدا کرائیں۔

۴۳۔ خورشید احمد فارق:

حضرت عمرؓ کی آخری زندگی کے چند واقعات

(برہان دہلی ۔ ۵۵ جنوری ۳۳ ۔ ۴۸)

تاریخ اعثم کوفی جو کربلا کے حالات تک مشتمل ہے اس کا فارسی ترجمہ مضمون نگار کے زیر نظر ہے۔ حضرت عمرؓ کی آخری زندگی سے متعلق واقعات اس کتاب میں بہت زیادہ جامع اور مربوط ہیں اس کتاب سے حضرت عمرؓ کی (۱) خلافت سے بیزاری (۲) ممتاز صحابہ کی اہلیت کے بارے میں ان کی رائے اور (۳) ان کے قتل کی روئداد مفصل طور سے بغیر کسی اضافہ کے کتاب سے ترجمہ کر کے نقل کئے گئے ہیں۔

۴۴۔ خورشید احمد فارق ڈاکٹر:

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں۔ ملک مشرق (ب) خراسان و ہیطل

(برہان دہلی ۵۵ فروری، مارچ ۲۲ ۔ ۴۰)

پچھلی قسط ماہ دسمبر ۵۴ء میں چھپی تھی۔ اس میں خراسان کا عام تعارف ممتاز شہروں کی حالت و کیفیت ہیطل و خراسان کے موسم اور دیگر حالات وغیرہ بیان کئے ہیں۔

مارچ کی قسط میں محصول۔ رسم و رواج ملک مشرق کے باشندوں کا رنگ و روپ زبان۔ مذاہب۔ مذہبی تعصبات اور جنگیں۔ ان عنوانات کے تحت وہاں کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔

۴۵۔ سعید رمضان:

ابوالحسن علی ندوی مترجم:

ایک نئی اسلامی نسل کی ضرورت

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ فروری ۵۰ ۔ ۵۳)

اخوان المسلمین کے رہنما استاذ سعید رمضان نے اپنے دورۂ دہلی کے موقع پر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان انتشار کی گھڑیوں سے گزر رہے ہیں اور یہ تین قسم کی ہے (۱) نفسیاتی (۲) اجتماعی (۳) سیاسی آگے چل کر انھیں تینوں اسباب کی وضاحت کی ہے۔ اور اخوان المسلمین یا اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والوں کو دعوت سے متعلق مشورے دئے ہیں۔

۴۶۔ شہاب رفعت:

وادئ سندھ کی میراث

(ماہ نو کراچی ۵۵ مارچ ۴۸ ۔ ۵۲)

وادئ سندھ کی تاریخ پیش کی گئی ہے وادئ سندھ کی آغوش سے موہنجوڈارو، چنہوڈرو، ٹیکسلا کے آثار نمودار ہوتے ہیں، یہاں سلاطین مغلیہ کے مہتم بالشان قلعے ہیں سیوہان، بھکر اور ٹھٹھہ جیسے تاریخی شہر ہیں، یہاں لال رخ کا مقبرہ، خواجہ خضر کا روضہ، جناح بیراج اور سکھر اور کوٹری کے زبردست بند اور دنیا کی بہترین نہروں کا سلسلہ ہے۔

۴۷۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر: عبدالحمید عثمانی مترجم

حضرت عثمانؓ صرف تاریخ کی روشنی میں

حضرت عثمانؓ کا سب سے پہلا امتحان

(برہان دہلی ۵۵ جنوری ۲۱ ۔ ۳۲)

خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عثمانؓ کے سامنے

سب سے پہلا مقدمہ حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہ ابن عمرؓ کا پیش ہوا جنھوں نے حضرت عمرؓ کی شہادت کی خبر سن کر ہرمزان حفینہ اور ابولولو کی بیٹی کو قتل کر دیا تھا۔ قصاص کے مسئلہ میں دو مختلف رائیں ہوئیں آخر میں حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے دیت ادا کر کے معاملہ کو ختم کیا۔ اس فیصلہ پر اکابر صحابہ کے اختلاف اور حضرت عثمانؓ کے فیصلہ کو امت کے لئے مفید قرار دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے عمال حکومت کو جو خطوط اور احکام بھیجے ہیں۔ ان کی روشنی میں خلیفۂ ثالث کی پالیسی کی وضاحت کی گئی ہے۔

۴۸۔ عبدالحمید صدیقی:

فسطائیت اور اس کی ستم رانیاں

(ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور ۵۵ مارچ ۴۲-۶۱)

ایک مختصر سی تمہید کے بعد فاشسزم کی تعریف۔ اس کے مفکرین کے خیالات اور اس کو عملی جامہ پہنانے والے ہٹلر و مسولینی کے افکار و خیالات سے حوالہ دیتے ہوئے فاشسزم کی حقیقت واضح کی ہے۔

۴۹۔ غلام حیدر خان چودھری:

تاریک ترین دور

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ فروری ۲۵-۳۰)

ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے ہندو رہنماؤں کے تاثرات تعلیمات بیان کرنے کے بعد مغربی طاقتوں کے عروج کے اسباب بیان کئے ہیں اور آخر میں مسلمانوں کو سچا مسلمان اور اسلامی تعلیمات کی صحیح پیروی کی تلقین کی گئی ہے۔

۵۰۔ محفوظ الکریم معصومی:

البیرونی اور اصفہبند جیلجیلان مرزبان بن رستم

(برہان دہلی ۵۵ مارچ ۱۴۵-۱۶۰)

البیرونی نے القانون المسعودی لکھ کر اسے سلطان مسعود غزنوی کے نام سے معنون کیا تھا اور اپنی ایک تالیف سپہبند مرزبان بن رستم بن شروین کے نام سے موشح کی۔ مضمون میں بیرونی کی اس کتاب کے تعارف کے ساتھ سپہبند مذکور کی شخصیت سے بحث اور معلومات فراہم کی گئی ہے۔

۵۱۔ محمد احمد صدیقی۔ ڈاکٹر:

وجوہ شرف آدم

(برہان دہلی ۵۵ جنوری ۷-۲۰)

تکریم بنی آدم کے مختلف سات اسباب کے عنوانات قائم کرنے کے بعد ہر ایک عنوان کے تحت شرف آدم کی بحث کی ہے۔ کتب سماوی۔ احادیث، تفاسیر، اور اس اہم موضوع پر غور و فکر کرنے والے مفکرین کے خیالات پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ (باقی)

۵۲۔ محمد احمد صدیقی ڈاکٹر:

انسانیت اور تمدن کی صبح

(برہان دہلی ۵۵ مارچ ۱۶۸-۱۷۷)

اولاً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہد قدیم کی واحد معتبر تاریخ روایات مذہبی ہیں۔ اس کے بعد روایات مذہبی کی روشنی میں آفرینش عالم کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اول حضرت آدم میں تہذیب و تمدن کے عناصر پائے جاتے تھے۔

۵۳۔ مناظر احسن گیلانی۔ سید:

ہندوستان کی ایک قدیم پنجسالہ اسکیم جس نے موت کو بھی زندگی بنا دیا

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ فروری ۲۵-۴۲)

شیر شاہ سوری نے اپنی پنجسالہ مدت حکومت میں ہندوستان میں فلاح عامہ اور پبلک مفاد کے لئے جو کچھ کیا ان کا مفصل بیان۔

۵۴۔ نعیم صدیقی:

جیل کا نظام مسیحائی

(چراغ راہ کراچی ۵۵ جنوری ۲۷-۴۳)

نعیم صدیقی صاحب کی جیل میں لکھی ہوئی ڈائری کے یہ چند اقتباسات ہیں جیل میں ایک بیمار کو کن کن مشکلات

ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی تفصیلات۔

۵۵۔ ہاورڈ۔ اے۔ ریڈ:

قطب الدین احمد مترجم۔

ترکوں میں مذہبی احساسات کی بیداری

(برہان دہلی ۵۵ جنوری، فروری ۴۹-۵۸، ۱۰۵-۱۱۹)

ہاورڈ اے۔ ریڈ ناظر ادارہ مطالعات اسلامی میک گل یونی ورسٹی کے مقالہ کا ترجمہ ہے اس میں ترکان آل عثمان کے مذہبی آزادانہ انداز فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۹۰۸ء کے انقلاب و اصلاحات، اور دور مصطفےٰ کمال میں ترکوں کی مذہبی زندگی میں یکسر انقلاب اور موجودہ دور میں پھر مذہبی احساسات کی بیداری اور تلافی مافات کے جذبات کی وضاحت کی گئی ہے۔

تنقید، ادب، لسانیات

۵۶۔ آفاق حسین آفاق دہلوی:

مکتوباتِ غالب و مجروح

(ماہ نو کراچی، ۵۵ فروری، ۱۶-۲۱)

مقالہ نگار کے پاس غالب و مجروح کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ہے جس میں غالب و مجروح کی مراسلت کے علاوہ غالب کے دیگر غیر مطبوعہ مکاتیب بھی ہیں۔ جن میں ایک نواب یوسف علی خاں والی رامپور، ایک آغا محمد حسین مالک مطبع حسینی، ایک مولانا محمد علی کے والد علی بخش نجیب آبادی اور ایک میرن صاحب کے نام ہے۔ مقالہ نگار کے الفاظ میں اس مجموعے کے چھپ جانے کے بعد:

"مرزا کے بہت سے خطوط کی تاریخی تدوین میں مدد ملے گی، بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور مرزا کے عادات پر مزید روشنی پڑے گی۔"

۵۷۔ ا، ا:

کرالا میں ڈرامے کی روایات

(ہندستانی ادب، حیدر آباد (دکن)، ۵۵ فروری ۴۳-۴۴)

ڈرامے کا جو مطلب آج کل سمجھا جاتا ہے ویسا ڈراما کرالا میں موجودہ صدی میں ظہور میں آیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کرالا نا ٹیاناٹک ڈرامائی روایات کے متعلق عوام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ کتھا کلی کرالا ناٹیاناٹک کی نہایت ترقی یافتہ صورت ہے۔ ڈرامے کی موجودہ روایت کلاسیکل روایت کے تماشوں اور ڈراموں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔

۵۸۔ ا، ا:

ہندستانی ڈرامے کی نشو و نما اور ارتقا

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن)، ۵۵ جنوری ۴۴-۴۹)

ہندستانی (اردو) ڈرامے کی مجمل تاریخ۔

۵۹۔ ا، ا:

پنجابی ڈرامے کا ارتقا

(ہندستانی ادب۔ حیدر آباد (دکن)، ۵۵ مارچ ۲۶)

پنجابی ڈرامے کی ابتدا اور نشو و نما عوامی روایات کی مرہون منت ہے۔ جدید ڈرامے کی داغ بیل آئی سی نندنے ۱۹۱۳ء میں ڈالی۔ ان کے بعد مختلف پنجابی ڈرامہ نگاروں نے پنجابی ڈراموں کو ترقی دی۔

۶۰۔ ابوالحسن علی ندوی:

مترجم: طیب عثمانی ندوی۔

اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر

(فیض الاسلام لاہور ۵۵ جنوری ۲۳-۴۲،)

حب نبوی، قرآن مجید، عرفان نفس و خودی، آہ سحر گاہی اور مثنوی معنوی اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر

ہیں ان کے بغیر اقبال "اقبال" نہیں ہو سکتے۔ (منقول از رسالہ "نئی نسلیں")

۶۱۔ ابوالخطیب:

کچھ اسلامی ادب کے بارے میں

(چراغ راہ کراچی ۵۵ فروری ۴۰-۴۴)

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی زندگی کی بنیادی قدریں یہ ہیں توحید، تصور آخرت، وحدت انسانی اور معروف و منکر کا تصور، اسلامی ادب کا کام یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند ہو کر ان قوتوں کی ترجمانی کرے جو انسان کی بنیا بنانہ عظمت کو برقرار رکھنے میں اس کی مدد و معاون ثابت ہو۔

۶۲۔ احمد میاں اختر جوناگڑھی:

مرزا غالب اور امیر مینائی

(نوائے ادب بمبئی ۵۴، اکتوبر ۲۱-۲۵)

غالب نے اپنے خط کے ساتھ شیو نراین کو منشی امیر احمد امیر مینائی کی غزلیں بھیجی تھیں اور سفارش کی تھی کہ وہ انھیں رسالہ معیار الشعراء میں چھاپ دیں۔ مقالہ نگار نے اس خط سے غالب اور امیر کے دوستانہ تعلقات پر استدلال کیا ہے۔ اور "ہنگامہ دل آشوب" سے ایک قطعہ نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ قطعہ "قاطع برہان" کے مناقشے کے سلسلے میں امیر مینائی نے غالب کی حمایت میں لکھا تھا۔

۶۳۔ ادارہ:

ہندستانی ڈرامہ

(آج کل دہلی ۵۵ فروری ۳۴-۴۴)

تامل مرہٹی اور گجراتی ڈرامہ کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔

۶۴۔ اسلوب احمد انصاری:

شعری صداقت

(ادب لطیف لاہور ۵۵ جنوری ۸-۱۳)

واقعاتی کائنات سے قریب تر ہونے میں شعری کائنات کو مختلف نظریاتی ادوار سے گذرنا پڑا ہے۔ ویسے واقعاتی کائنات اور شعری کائنات میں خاصا فرق ہے۔ ان کے مفہوم اور اظہار کے رشتے ہی جداگانہ نہیں ہیں بلکہ ان کے وجوہ بھی الگ الگ ہیں۔ ان کا صداقت کا مفہوم بھی یکساں نہیں ہے۔ شعری صداقت پروفیسر گرین کے مطابق لسانی اور خیالی ربط کا مرادف ہے۔ اس تصور کا ہلکا مگر بہت پر معنی پرتو ارسطو کے لوازمات المیہ میں ملتا ہے جو وسیع معنوں میں شاعری پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ شعری صداقت خارجی اشیاء سے نہیں بلکہ شاعری کے مختلف اجزاء صداقت کی نسبت سے متعین ہوتی ہے، مختصر یہ کہ شعری صداقت نجی ماحول اور شاعر کے خلوص کے علاوہ اس کی بصیرت و معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔

۶۵۔ اقبال:

مکاتیب اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ جنوری ۶۲-۷۳، مارچ ۲۲۴-۲۳۲)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے ۱۲ مکاتیب جن میں سے پہلا یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء کا ہے اور آخری ۱۹ جولائی ۱۹۳۵ء کا۔ پہلے ۴ مکاتیب میں سفر افغانستان سے متعلق ہدایات اور باقی میں علمی مسائل و مباحث سے متعلق استفسارات ہیں۔

(مسلسل)

اس قسط میں ۵ خطوط نمبر ۶۶ تا ۷۰ درج ہیں۔ اس میں حضرت عائشہؓ سے منسوب اس قول کی کہ آنحضرت کے بعد بھی نبی کے مبعوث ہونے کا امکان ہے سند مانگی ہے اور اس کی صحت کے سلسلہ میں استفسار کیا ہے اس کے علاوہ حیات و نزول مسیح وغیرہ کے سلسلہ میں بھی استفسار کیا ہے اور بدور البازغہ کا نسخہ منگوایا ہے۔ حاشیہ میں مولانا سلیمان ندوی کے جوابات بھی درج ہیں۔

۶۶۔ ایس ماتھر:

مرزا غالب کا ایک گمنام شاگرد

(آجکل ۵۵ فروری ۱۳-۱۶)

غالب کے شاگرد بابو ہرگوبند سہائے نشاط کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶۷۔ بشیر الحق دسنوی:

آب رواں

(آجکل دہلی ۵۵ جنوری ۶ ۳۶-۳۸)

اکبر الہ آبادی نے انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ سودے کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ ۱۸۹۹ء میں کیا تھا جو روانیٔ آب کے عنوان سے رسالہ معارف جلد ۲ شمارہ ۲ بابت ۱۸۹۹ء میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوا تھا۔ اسی زمانے میں مولوی سید محمد عبد الغفور شہباز نے بھی سودے کی اس نظم کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ جو "آب رواں" کے نام سے شائع ہوا تھا اور ان کے مجموعۂ کلام "خیالات شہباز" میں موجود ہے۔ مضمون میں ان کی زندگی کے مختصر حالات اور تالیفات و تصنیفات کی فہرست پیش کرنے کے بعد نظم مذکور کو بجنسہ پیش کیا ہے۔

۶۸۔ جعفر حسن رحمت اللہ ذوق:

عدن میں اردو

(اردو کراچی ۵۵ جنوری ۵۵-۶۲)

ہندوستانی پہلے پہل ۱۸۳۹ء میں بمبئی سے عدن گئے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور ہندوستانی عدن میں پھیلتے گئے اور اردو کی تعلیم کے مدرسے قائم کرتے گئے ۱۸۷۷ء میں صوبائی اور عربی کے ساتھ ہندستانی یعنی اردو عدالتی کارروائیوں میں برابر کی شریک تھی۔ انجمن ترقی اردو، بزم اردو ادب اور اردو ایجوکیشنل سوسائٹی نے اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ پچھلے سو سال میں اردو عدن کے علاوہ اس کے نواح میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ "ہلال عدن" قلمی پرچے کے بعد "آواز" اور "صدائے صحرا" دو جریدے بھی شائع ہوئے۔ شاعروں اور نثاروں کی خاصی تعداد عدن میں پائی جاتی ہے۔

۶۹۔ جمیل الدین سید:

دستنبو کا ایک خاص نسخہ

(۱)

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ جنوری ۲۱-۲۶)

خطوط غالب کی روشنی میں دستنبو کی غایت تصنیف نفس مضمون اور زبان سے بحث کی گئی ہے اور غالب کے اس ادعا کو جسے غالب کے سوانح نگاروں نے بے چون و چرا تسلیم کیا ہے پیش کیا ہے کہ اس تصنیف میں غالب نے اس کا التزام کیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ آنے پائے۔ (باقی)

۷۰۔ حبیب تنویر:

ڈراما اور تعلیم

(آجکل دہلی ۵۵ فروری ۷ ۳۷-۴۰)

مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کی تعلیم بنیادی طور پر آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہیئے اور چونکہ ڈراما آرٹ کا ایسا شعبہ ہے جس میں سارے فنون لطیفہ کا امتزاج پایا جاتا ہے اس لئے بچوں کے ڈراموں پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔

۷۱۔ حسن عباس فطرت:

اردو ڈرامہ نگاری کا ارتقائی و تاریخی پس منظر

(آجکل دہلی ۵۵ جنوری ۲۰-۲۴)

موجودہ اردو ڈرامہ کی پس ماندگی کا ذکر کرنے کے بعد اس کی عہد بعہد ترقی اور اسٹیج کمپنیوں کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۷۲۔ حسن مثنیٰ ندوی:

اقبال اور شاہ سلیمان پھلواروی

(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۱۹-۳۰)

۲۔ پہلی قسط رسالہ ریاض (جنوری) میں شائع ہوئی

تھی۔ اس قسط میں دکھایا ہے کہ تصوف اور حافظ کے سلسلے میں خواجہ حسن نظامی، اکبر الہ آبادی وغیرہ نے کس طرح اقبال کی مخالفت کی۔ جہاں تک حافظ کا تعلق ہے شاہ سلیمان پھلواروی اقبال سے متفق تھے۔ اور بعد میں اقبال شاہ صاحب کی تشریحات کے سبب وحدۃ الوجود و تصوف وغیرہ کے سلسلے میں شاہ صاحب سے متفق ہو گئے اس قسط میں اقبال، خواجہ حسن نظامی اور اکبر کے خطوط کے اقتباسات اور شاہ صاحب کے خطوط سے اقتباسات کے علاوہ دو مستقل معلوماتی خط نقل کئے ہیں۔

۷۳۔ خاور قریشی:

روشن نگینوی کی غزل

(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۳۱-۴۰)

غزل کی مخالفت کے ماحول میں ۱۹۱۴ء سے قبل روشن نے غزل کہنا شروع کی، تجربوں کی وسعت اور احساس کی شدت نے اس کے کلام میں رچاؤ اور گہرائی پیدا کر کے اسے قادر الکلامی اور فنی پختگی بخشی ہے۔

۷۴۔ رشید احمد ارشد:

عربی کا جدید افسانوی ادب

(اردو کراچی ۵۵ جنوری ۶۳-۸۸)

عربی افسانے کی درجہ بدرجہ ترقی دکھلاتے ہوئے جدید افسانوی ادب (ناول و افسانہ) کے مختلف پہلوؤں اور افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے فن پر تحقیقی تبصرہ کیا ہے۔

۷۵۔ سعید احمد قریشی:

آمد اور آورد کا مسئلہ

(ماہ نو کراچی ۵۵ جنوری ۲۲-۲۷)

تنقید شعر میں آمد اور آورد کی بحث بہت پرانی ہے۔ مگر اس کے متعلق جو تھوڑا بہت لٹریچر ملتا ہے، مقالہ نگار اس میں ہمیشہ سائنٹیفک مباحث کی کمی محسوس کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں تعمیری فکر کے مروجہ نفسیاتی تجزیئے کے پیش نظر آمد پر گفتگو کی اور آمد کو "فکر" کی ایک منزل پر شاعر کی تمام تربیت، تعلیم وغیرہ کے تحت جذبات و خیالات کا اظہار بتایا ہے۔ یہ اظہار جذباتی، تلازمی اور صوتی محرکات کا مرہون منت ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ اظہار ابلاغ ہی کے لئے ہو۔ شعوری کوشش سے شاعری آورد کے ذیل میں آتی ہے۔ اس مقام پر حالی ایلیٹ سے آگے سہی مگر وہ مغالطوں کے شکار ہو گئے ہیں۔

۷۶۔ سعیدہ اختر رضوی تپش:

تذکرۂ میر حسن سے چند یادداشتیں

(آج کل ۵۵ جنوری ۳۹-۴۲)

میر حسن کے تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ شعرائے اردو" میں مذکورہ ۳۰۴ شعرا میں سے چند شعرا سے متعلق تذکرۂ مذکور سے اقتباس پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان شعرا کے دوش بدوش ہندو شعرا بھی اردو کی خدمت میں مصروف تھے جو کسی مخصوص خطے کے باشندے نہیں تھے اس کے علاوہ مضمون میں تذکرہ سے چند لطیفے بھی نقل کئے ہیں اور میر حسن کے اس قیاس کو کہ سعدی دکنی اور سعدی شیرازی ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں غلط قرار دیا ہے۔

۷۷۔ سعیدہ ادا ہمی:

مرزا غالب کی خود نوشت سوانح عمری پر ایک نظر

(آج کل دہلی ۵۵ فروری ۷-۱۳)

"غالب کے خود نوشت حالات" کے زیر عنوان اظہار الحق ملک کا ایک مقالہ "احوال غالب" مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب نے اپنے حالات زندگی تذکرۂ مظہر العجائب کے لئے لکھے تھے مضمون میں اس قیاس کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۷۸۔ شجاعت علی سندیلوی:

اردو شاعری میں حزنیہ عنصر

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۵ فروری ۲۵-۳۲)

اُردو شاعری کے ماحول و اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اردو کے اچھے شاعروں نے جن جذبات رنج و الم کا اظہار کیا ہے ان کے منتخب اشعار مثال کے طور پر لکھے ہیں۔

۷۹۔ شمیم رضوی:

کیا غالب فلسفی تھے؟

(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۱۶-۱۸)

ایک بحث کے بعد جواب اثبات میں دیا ہے۔

۸۰۔ شوکت سبزواری:

اقبال کا نظریۂ شعر

(آج کل دہلی ۵۵ جنوری ۹-۱۳)

اقبال کے اشعار جن میں انھوں نے اپنے نظریۂ شعر کی وضاحت کی ہے اور چند مکتوبات کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال شعر میں طرز اظہار کو ثانوی درجہ دیتے ہیں ان کے نزدیک شعر خیال اور طرز اظہار کے مجموعہ کا نام ہے وہ شاعری کی فنی و ادبی نہیں بلکہ افادی اور عملیاتی خصوصیت کے قائل ہیں۔

۸۱۔ عابد علی عابد:

کلمۂ "آئینہ" کی تحقیق

(ماہ نو کراچی ۵۵ جنوری ۷-۱۰)

فارسی اور اردو ادبیات کی روایت میں آئینہ سکندر سے منسوب ہے اور حسب حکایات مشہورہ وہی اس کا موجد بھی ہے۔ مگر لفظ آئینہ بہت ہی قدیم لفظ ہے۔ یہ لفظ آین ہی سے نہیں بلکہ آئین و آزین و آذین اور آذین سے متعلق ہے ان کے معنی ہی زیب و زینت کے نہیں ہیں بلکہ سب ایک ہی لفظ کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کا اصل ماخذ پہلوی میں ادم دیناک بمعنی محل نظر، محل نگاہ ہے اور وہی آئینہ ہے۔ علاوہ بریں پہلوی میں ایک لفظ آدیناک بھی ہے عربوں نے جیسے مژک کو مژہ اور نیزک کو نیزہ میں تبدیل کر دیا، اسی طرح آئیناک کو آئینہ میں تبدیل کر دیا۔

۸۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر:

غالب اور غم دوراں

(ماہ نو کراچی، ۵۵ فروری ۸-۱۵)

مقالہ نگار کے الفاظ میں: "غالب زندگی کے شیدائی تھے لیکن انھیں زندگی کا غم بھی تھا اور یہ غم ان کی ساری شخصیت پر محیط ہے زندگی کی شیفتگی نے ان کے یہاں مسرتوں کے احساس کو بیدار کیا ہے اور مسرتوں کے احساس نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو دامان باغباں اور کف گل فروش بنا دیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور اس کسک ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ گل نغمہ اور پردۂ ساز ہونے کے بجائے ان کی اپنی شکست کی آواز بن گئی ہے۔

۸۳۔ عبادت بریلوی:

غزل کے نئے میلانات

(ماہ نو کراچی ۵۵ مارچ ۱۶-۲۰)

غزل میں جدید میلانات کی ابتدا غالب کے عہد سے ہوئی جو موجودہ دور میں اپنے شباب پر ہے۔ حالی نے غزل کی دنیا بدل دی اقبال اور چکبست نے اسے نئی دنیاؤں سے روشناس کرایا، حسرت، جگر، اور فراق نے معاملات عشق کو سماجی پس منظر میں پیش کیا خصوصاً فراق نے غزل کو اجتماعی زاویۂ نظر سے روشناس کرایا جسے فیض عابد احسان حفیظ جذبی مجروح اور ناصر کاظمی نے آگے بڑھایا۔

۸۴۔ عبدالعلیم نامی۔ ڈاکٹر:

رونق بنارسی

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ جنوری ۳۰-۴۱)

(مسلسل)، رونق بنارسی کے منظوم ڈراموں کا تعارف

پیش کرنے کے ساتھ ساتھ منظوم ڈراموں کی تاریخ پیش کی ہے۔ اور رونق بنارسی نے اس عہد منظوم میں جو ڈرامہ لکھے ہیں ان کی خصوصیات پیش کی ہیں۔

۸۵۔ عرشی:

سیف الملوک

(فیض الاسلام لاہور ۵۵ جنوری ۵۲ – ۵۶)

۷۔ میاں محمد کی "سیف الملوک" (پنجابی) کا تعارف اور اس کے مضامین پر تشریحی نوٹ مسلسل چھپ رہا ہے۔

۸۶۔ فارغ بخاری:

سرحد میں اردو

(اردو کراچی ۵۵ جنوری ۸۹ – ۱۳۶)

مقالہ نگار نے ۱۹۵۰ء کے سنگ میل میں اس عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں اردو زبان کے سرحد نژاد ہونے پر معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ موجودہ مقالہ زیادہ مدلل اور وضاحت و معلومات کے ساتھ اسی نظریہ کو پیش کرتا ہے یعنی اردو کا تعلق پشتو اور ہندکو سے ہے۔ پنجابی، ہریانی گوجری، دکنی اسی کی شاخیں ہیں۔ لسانی و قومی تصریحات اسی امر کا پتہ دیتی ہیں۔ قوم کے لحاظ سے افغانوں نے اسے نئی شکل دی اور پروان چڑھایا۔ نام اردو انھیں کا دیا ہوا ہے۔ قلی قطب شاہ کے زمانہ میں سرحد میں شعر و ادب پایا جاتا تھا۔ ولی اور میر کے مقابلے میں بلحاظ زبان و بیان سرحد نے بہتر شاعر پیدا کئے۔ اس وقت بھی اچھے ادیب اور شاعر پیدا کئے ہیں مگر تعصب اور عدم تحقیق کے سبب تذکرہ نگار ان کا ذکر نہیں کرتے۔

۸۷۔ فرید شیخ:

ولی برہان پور میں

(آج کل دہلی ۵۵ مارچ ۴۳ – ۴۵)

گلشن گفتار میں ولی کا برہان پور میں ہونا درج ہے اس کے علاوہ دو سرے تذکرے خاموش ہیں۔ کچھ قیاسات ملتے ہیں مگر یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ ولی برہان پور میں کب، اور کیونکر آئے اور کب تک رہے؟ چنانچہ شافی معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ مقالہ بہ طرز استفسار ہے۔

۸۸۔ کشفی ابوالخیر:

اردو ادب میں ناول کا مستقبل

(ماہ نو کراچی ۵۵ جنوری ۱۷ – ۲۰)

نذیر احمد سے لے کر قرۃ العین حیدر تک اردو ناول نے کچھ ایسی ترقی نہیں کی کہ ہم اس پر خوش ہو سکیں پریم چند کے بعد ناول کا کنوئیں مختصر ہو گیا ہے۔ شکستہ ایسی بلندی، ایسی پستی اور ٹیڑھی لکیریں البتہ ... زندگی وسیع ہے لیکن جاندار کردار ہمارے موجودہ ناولوں میں نہیں ہے۔ دراصل ہمارے ناول نگاروں کو زندگی کو بہ تمام وسعت و تنوع دیکھنا اور اپنی دنیا کو تلاش کرنا ہے۔ فرد کے ساتھ ساتھ جماعت کی پیش کی جانے والی حقیقتوں کو دیکھنا ہے اور موزوں انداز بیان اختیار کرنا ہے۔ تب کہیں اردو میں اچھے ناول لکھے جا سکیں گے اس کے لئے ہمارے ناول نگاروں کو زندہ رہنے کا حق سیکھنا چاہیئے اور مطالعہ کے لئے انگریزی ناولوں کے ترجمے ہونے چاہئیں۔

۸۹۔ کشن پرشاد کول:

سرشار

(فروغ اردو ۵۵ مارچ ۸ – ۱۵)

پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو میں فن ناول نگاری کے موجد تھے۔ فسانۂ آزاد ان کا شاہکار ہے اور اس کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی۔ فسانۂ آزاد میں بیجان اور جاندار ٹکڑے دونوں ہیں۔ ان کی ظرافت و شوخی اکثر پھکڑ پن پر اتر آتی ہے۔ تاہم سرشار اپنے عہد کے ظریف نگاروں کے سرتاج ہیں۔ وہ نہ فلاسفر تھے نہ ریفارمر اور نہ مصلح قوم بلکہ وہ صرف شاعر، ادیب اور فن کار تھے سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس شاعر کا دماغ اور مصور کا قلم تھا۔ لکھنؤ کی زندگی کی بڑی پیاری عکاسی کی ہے حقیقت نگاری اگرچہ ان کے ہاں پائی جاتی ہے، مگر بعض موقعوں

پھیکا پن اور تصنع بھی ملتا ہے۔ پلاٹ بہت ڈھیلا ہے ان کے کرداروں بی، نو جی کا کردار ان کا نام ہمیشہ قائم رکھے گا۔

۹۰۔ کلب علی خاں:

اردو شاعری اور سیاست

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ جنوری، ۴۴-۵۴ فروری ۱۲۲-۱۴۱)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو میں سیاسی شاعری کی ابتدا آزاد اور حالی کی نظموں سے ہوئی لیکن اردو کے شعرائے متقدمین و متوسطین نے اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے اپنے دور کے سیاسی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ سیاسی حالات پر رائے زنی کی ہے اور بگڑے ہوئے حالات سے بے اطمینانی اور بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے۔ ثبوت میں آبرو، ناجی، تاباں، یقین، حاتم اور سودا کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

دوسری قسط میں میر تقی میر، شاہ واقف دہلوی، قائم چاند پوری، مرزا جعفر علی حسرت، شاہ محسن فدوی میر حسن، قلندر بخش جرأت، شاہ کمال الدین کمال، اور نواب وزیر علی خاں وزیری کے زمانے کے سیاسی حالات کے ضروری بیان کے ساتھ ان شعراء کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔

۹۱۔ مالک رام:

باغ دو در

(آج کل دہلی ۵۵ مارچ ۲۹)

اپنے غیر مطبوعہ فارسی کلام اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کو، جن کی ترتیب ان کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی، غالب سبد چین کی طبع ثانی کے طور پر باغ دو در کے نام سے چھاپنا چاہتے تھے۔ اس میں سبد چین کے مشمولات کے علاوہ نیا کلام اور خطوط بھی تھے۔ باغ دو در میں جواہر سنگھ جوہر کے والد کی تاریخ وفات (۱۲۷۰ھ) پر ایک قطعہ اور ایک مزید قطعہ ذوق کی تاریخ وفات (۱۲۶۹ھ) سے متعلق ملتا ہے۔ ذوق سے متعلق دوسرے قطعہ کو غالب شاید شائع نہیں کروانا چاہتے۔

۹۲۔ مالک رام:

بابلی زبان اور ادبیات

(اردو کراچی ۵۵ جنوری ۳-۵۴)

بابلی زبان کا سامی الاصل ہی نہیں بلکہ تقابلی مطالعہ الفاظ وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود عربی ہے۔ قدیم عربی۔ ابتداءً جب تک میخی حروف کہ جن کی تختیاں مختلف اوقات میں کلدانی اور یورپی مستشرقین کی، انتھک محنت تدقیق کے بعد پڑھی جاتی رہیں، دریافت نہیں ہو پائے تھے تعلیم و تمدن کی ایک دنیا پوشیدہ تھی۔ لیکن جب ان کا مطالعہ بڑھا اور گرامر وغیرہ مرتب کی گئیں تو بعد میں انسانی فکر و تمدن کا ایک نیا باب کھل گیا مقالہ کے آخر میں بابل کے چند قصوں کا ادبیات کے تحت تذکرہ کیا ہے۔

۹۳۔ مالک رام:

مرزا غالب اور امیر مینائی

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ جنوری ۲۷-۲۱)

اکتوبر ۱۹۵۴ء کے نوائے ادب میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا ایک مضمون مذکورہ بالا عنوان کے تحت شائع ہوا تھا اس میں بقول مقالہ نگار ایک قطعہ غلطی سے امیر مینائی سے منسوب کیا گیا ہے جو در اصل محمد امیر امیر لکھنوی کا ہے۔ اس کے جواز میں دلائل پیش کئے گئے ہیں اس کے علاوہ غالب نے امیر مینائی کا کلام معیار الشعراء میں چھاپنے کی جو سفارش اپنے خط بنام منشی شیو نرائن میں کی تھی اس کی وجہ دوستی نہیں بلکہ زمانہ سازی تھی۔ مصنف نے اس شبہ کی بھی دلیل پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ مضمون میں ان بینہ فرو گذاشتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مولانا موصوف کے مقالہ میں فاضل مضمون نگار کو نظر آئی ہیں۔

۹۴۔ محمد شفیع:

وامق و عذرای عنصری کے متعلق کچھ تحقیقی مواد

(گزشتہ سے پیوستہ)

(ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور ۵۵ فروری ۸۱-۱۲۰)

وامق و عذرا کا قصہ صوفی کشمیری، نامی اور محمد حسین نے بھی بیان کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے قصے کا اجمالی خلاصہ پیش کیا ہے پھر قصے کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے مطالب میں بہت اختلاف ہے ہر قصے میں وامق و عذرا کی زندگیوں کو مختلف موانع اور مصیبتوں اور تلخیوں سے برطاہر کیا گیا ہے یہ پہلو بے شک سب قصوں میں مشترک ہے باقی تمام جزئیات میں فرق ہے تاآنکہ اس میں بھی اتفاق نہیں کہ وامق و عذرا کون تھے اور کہاں کے باشندے تھے۔

۹۵۔ محمد عبدالحمید فاروقی:

امین گجراتی کی یوسف زلیخا

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ جنوری ۷-۲۰)

امین گجراتی مصنف یوسف زلیخا کے ممکن الحصول حالات زندگی، ان کے معاصرین اور مثنوی مذکور کی روشنی میں امین کی شخصیت اور مذہب پر رائے زنی کی گئی ہے۔ (باقی)

۹۶۔ مختارالدین احمد آرزو:

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں

(آج کل دہلی ۵۵ فروری ۳-۶)

صاحب مضمون کو چودھری عبدالغفور سرور کے ایک عزیز سے سرور کا ایک قصیدہ اور آٹھ نو قطعات خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دستیاب ہوئے۔ جن پر غالب کے قلم کی اصلاح اور انھیں صفحات کے ایک گوشے پر غالب کا ایک خط سرور کے نام درج تھا۔ مقالہ میں وہ قصیدہ، قطعات اور غالب کے مذکورہ مکتوب درج ہیں۔

۹۷۔ ممتاز حسن:

ملک الشعرا بہار

(ماہ نو کراچی ۵۵ مارچ ۲۸-۳۰)

ملک الشعرا محمد تقی بہار سے صاحب مضمون نے تین بار ملاقات کی، مضمون میں ان ملاقاتوں کا بیان اور اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۹۸۔ مناظر احسن گیلانی:

اسلامی رواداری اور مساوات اور بے نفسی کا ایک دلآویز مرقع

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ مارچ ۲۹-۳۸)

مولانا حالی کے استاذ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی کے اوصاف حمیدہ کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد اس واقعہ کو سراہا گیا ہے کہ انھوں نے عین غدر کے زمانے میں بہتر انگریز مردوں کو اپنے مدرسہ میں پناہ دی تھی۔ غدر کے اختتام کے بعد جب کمشنر بہادر نے انھیں اس خدمت کے صلہ میں ایک لاکھ روپے سالانہ کی جائداد دینا منظور کیا تو آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۹۹۔ موسیٰ خاں کلیم:

ترجمے کی اہمیت اور دشواریاں

(ماہ نو کراچی ۵۵ فروری ۲۵-۲۶، ۵۳)

ترجمے کے فوائد بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ہر زبان کا اپنا طرز ادا ہوتا ہے۔ مترجم کے لئے دونوں زبانوں کے طرز ادا سے واقف ہونا لازمی ہے جذبات کی ترجمانی کے لئے ضروری ہے کہ مترجم خود ان جذبات کی حرارت محسوس کرے پھر انھیں دوسری زبان میں منتقل کرے اگر ایک زبان بولنے والوں کی ذہنی اور علمی سطح دوسری زبان بولنے والوں کی ذہنی اور علمی سطح سے بہت زیادہ بلند ہوئی تو ایسی صورت میں پہلی زبان کے افکار دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت مترجم کے لئے دشواریوں کا سامنا کرنا ناگزیر ہے۔

۱۰۰۔ نصیر الدین ہاشمی:

حیدر آباد دکن کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ جنوری ۴۲-۴۹)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے حسب ایما حیدر آباد کی اردو قلمی کتابوں کی فہرست کا جو کام ہو رہا ہے مضمون ہذا اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ حیدر آباد میوزیم میں پائی جانے والی مندرجہ ذیل قلمی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا (۱) جواہر اسرار اللہ (۲) نورس اور (۳) گلشن عشق (باقی آئندہ)

۱۰۱۔ وقار عظیم:

منٹو ــــ عظیم فنکار

(ماہ نو کراچی ۵۵ مارچ ۷-۱۳)

منٹو کا ہر افسانہ، چاہے وہ اچھے سے اچھا ہو یا برے سے برا، ابتدائی دور کا ہو یا آخری دور کا، ان سب میں ایک خصوصیت مشترک ہے، اور وہ ہے فنکار کا فنی خلوص مضمون میں منٹو کے افسانوں کے مجموعے "منٹو کے افسانے" سے چار افسانوں نیا قانون، نعرہ، خوشیاں اور بانجھ کی روشنی میں منٹو کی فنکارانہ صلاحیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۰۲۔ ہنس راج رہبر:

پریم چند اور ترقی پسندی

(آج کل دہلی ۵۵ مارچ ۹-۱۸)

اس موضوع پر اگست و اکتوبر ۱۹۵۴ء کے آج کل میں راجندر ناتھ شیدا کے دو مضمون نکل چکے ہیں۔ موجودہ مقالہ انھیں کا جواب ہے اس میں مدلل طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شیدا کے بیانات میں الجھاؤ اور بے منطقی ہے اور یہ کہ پریم چند ترقی پسند تھے۔

۱۰۳۔ یوسف خاں، محمد:

غزل کا ایک پہلو ــ سپردگی

(ادب لطیف، لاہور، ۵۵ فروری ۱۷-۲۵)

غزل میں دردمندی، دل سوزی، برشتگی، تڑپ پاکیزگی، معصومیت، نرمی اور سرشاری جذبۂ سپردگی، کے حسین اور صحیح اظہار سے پیدا ہوئی ہے۔ سپردگی کا تعلق، محبت کے ایک بہت بلند، جامع اور پاکیزہ تصور سے ہے جس طرح انجمن کی رونق شمع سے ہے اسی طرح غزل کی رونق سپردگی سے ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

آرٹ

۱۰۴۔ ادارہ:

بھارتی موسیقی کی نشو و نما اور ارتقا

(آج کل دہلی ۵۵ جنوری ۵۲)

بھارتی موسیقی کی ابتدا ویدک دور ہی میں ہوئی تھی۔ اس کی نوعیت مذہبی اور غیر مذہبی دونوں ہے۔ مضمون میں ہندوستان کے عظیم موسیقاروں، آلات موسیقی مسلم فرمانرواؤں کی حوصلہ افزائی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ عوامی سنگیت فنی موسیقی سے بھی قدیم ہے۔

۱۰۵۔ امین راحت چغتائی:

آرٹ اور جمالیاتی شعور

(ادب لطیف، لاہور، ۵۵ فروری ۹-۱۶)

عمومی زندگی کے موضوعات پر لکھنے کے لئے عمومی زندگی کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ عمومی زندگی کا گہرا مطالعہ فن کار کو عمومی حسن کے تصور سے آشنا کر دے ہر بڑے ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمومی زندگی کا مظہر ہو اور ان قدروں کی ترجمانی کرے جو ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ ایسی قدروں کو فن کار اپنے موڈل میں اسی وقت پیش کر سکتا ہے جب وہ خود صحیح فنی اور جمالیاتی تقاضوں کا ادراک رکھتا ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

۱۰۶۔ قطب الدین احمد:
اسلام کا ذوق جمال
(معارف اعظم گڈھ ۵۵ فروری ۸۵۔۱۱۰)
قرآن مجید، حدیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے ایک عظیم ذوق جمال کی تعلیم دی ہے اور اس تعلیم کا تعلق حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی برابر کا ہے۔

معاشرتی حالات

۱۰۷۔ اظہار حسین کاظمی:
تہذیب کی تشکیل
(ادب لطیف لاہور ۵۵ جنوری ۱۴۔۱۹)
اردو میں کلچر کے معنوں میں تمدن، ثقافت، خود کلچر اور تہذیب کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور استعمال کرنے والوں نے مقصدی طور پر انھیں استعمال کیا ہے تاہم لفظ تہذیب ہی سے کلچر کا مفہوم پورے طور پر ادا ہوتا ہے۔ تہذیب اکتسابی کردار اور کردار کے نتائج کی ایسی ہیئت ترکیبی ہے جس کے ترکیبی اجزا ایک مخصوص معاشرے کے افراد میں موجود ہوں جو ایک نسل یعنی آنے والی پشتوں کو منتقل کر سکتی ہو۔ عمرانیات اور بشریات تہذیب کی تشکیل میں مدد دیتے اور اس کے عروج و زوال کا پتہ چلاتے ہیں۔ تہذیب کا ایک اہم تشکیلی عنصر مادی اور سیاسی تبدیلی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں اگر مادی اور اقتصادی جبر کے سبب تہذیب کی تشکیل میں شعوری کوشش کامیاب نہیں ہوتی، بس تہذیب بن جاتی اور خود رو پودے کی طرح آگے بڑھتی ہے۔

اقتصادیات

۱۰۸۔ بدرالدین درّانی آغا:
معاشیات کیا ہے؟
(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۱۲۔۱۵)
معاشیات کا مفہوم پیش کیا ہے۔

تعلیمات

۱۰۹۔ محمد اسحٰق:
مسلمانان ہند کا نظام تعلیم
(معارف اعظم گڈھ ۵۵ مارچ ۲۱۲۔۲۲۶)
مسلمانوں کی دینی و دنیوی ضروریات کے پیش نظر ان دونوں تعلیمات کے نظام کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔

وفیات

۱۱۰۔ سعید احمد:
پنڈت کشن پرشاد کول
(برہان دہلی ۵۵ فروری ۶۵۔۶۹)
پنڈت کشن پرشاد کول لکھنؤ کے رہنے والے، لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور روایات کی بڑی حسین یادگار، اردو زبان کے نکتہ سنج و نکتہ شناس، بلند پایہ ادیب، صحیح الخیال، نیک دل بزرگ اور اردو کے عاشق تھے۔

۱۱۱۔ سعید احمد:
سرشانتی سروپ بھٹناگر
(برہان دہلی ۵۵ فروری ۶۴۔۶۸)
سرشانتی سروپ بھٹناگر ہندوستان کے نامور سائنس داں اور بین قومی شہرت کے مالک تھے۔ برگوپال تفتہ کے نواسے اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ سائنس اور شاعری کے لطیف امتزاج اور خاندانی روایات کے باعث وہ ہماری گذشتہ تہذیب اور کلچر کے سچے حامی اور علمبردار تھے۔

۱۱۲۔ نصیر احمد کرمانی:

ڈاکٹر سجاد کی وفات

(ریاض کراچی ۵۵ مارچ ۸)

ڈاکٹر سید محمد سجاد دلی کے ایک قدیم خاندان کے رکن تھے۔ آپ نے "ہند آریائی زبانوں" کے موضوع پر انگلستان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہ چکے تھے موصوف کو اصطلاح سازی میں مہارت تھی۔ حیدرآباد میں آپ نہ صرف "مجلہ عثمانیہ" کے نگراں تھے بلکہ بہت سے طلباء نے آپ کی نگرانی میں کام کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لی۔ آپ نے "ہسٹری آف پرشین لٹریچر" (ای، جی، براؤن) کی پہلی جلد کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان (کراچی) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ موصوف کی موت علمی و ادبی حلقوں میں ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔

متفرقات

۱۱۳۔ ابوالحسن علی ندوی سید:
عتیق الرحمٰن۔ مترجم۔

سفر مصر
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ڈائری کے چند اوراق

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ جنوری، ۴۸۔۵۴
فروری ۴۳۔۴۹
مارچ ۳۹۔۴۶)

مصر کے مختلف علمی افراد سے ملاقات کا حال لکھا ہے۔ دوران ملاقات میں جو باتیں ہوئیں وہ درج کی ہیں۔ شہری زندگی اور دیہاتی زندگی کا فرق دکھایا ہے اور دین کی طرف جو التفات اور میلان انھوں نے دیکھا اس سے متعلق اور دوسرے امور سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

دوسری قسط میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سفر مصر کی ڈائری مرتب کی ہے ۱۸ فروری ۱۹۵۱ء کو مشہور مقدمہ اخوان المسلمین کی سماعت کے دوران عدالت میں گئے اور استاد سعید رمضان کی زوردار بحث سنی۔ شیخ حسن البنا کے والد سے ملاقات اور شیخ شہید کے حالات زندگی انھیں کی زبانی سنے۔

قسط ۳ میں مولانا نے شیخ محمد الغزالی سے اپنی ملاقات، جشن ولادت حسین میں اپنی شرکت اور ازہر کے تعلیمی نظام وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۴۔ تمکین کاظمی:

روغن قاز

(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن)، ۵۵ مارچ ۱۰۔۱۵)

خوشامد پسندی انسان کی فطرت ہے۔ اس سلسلہ میں خوشامد پسندی کے متعدد دلچسپ واقعات اور مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۱۵۔ رتن پنڈوروی:

ہندوستان قدیم اور فنون جنگ

(آج کل دہلی ۵۵ مارچ ۳۱۔۳۵)

قدیم ہندوستان کی جنگی ایجادات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے۔ ان ایجادات کے زور و اثر کے سامنے موجودہ دور کی جنگی ایجادیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔

۱۱۶۔ شیلوسکایا رم۔ ویتا:

افاناسی نکیتن کا سفر ہندوستان

(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن)، ۵۵ جنوری ۱۱۔۱۳)

روسی سوداگر افاناسی نکیتن نے اپنے روزنامچے میں سیاحت ہندوستان کا حال لکھا ہے مضمون میں اس یادداشت کی تاریخی

اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

۱۱۷۔ صالحہ عابد حسین:

کچھ دن المانیہ میں

(آج کل دہلی ۵۵ جنوری ۳۰-۳۵)

مضمون نگار خاتون ۷ جون ۱۹۵۳ء کو اپنے شوہر کے ساتھ اطالوی جہاز وکٹوریہ سے جرمنی کے لئے روانہ ہوئی تھیں۔ چند مہینے جرمنی میں رہ کر اور لوگوں سے مل جل کر جو اثر موصوفہ پر پڑا اور اہل جرمن کی سیرت و خیالات سے متعلق جو معلومات انھیں حاصل ہوئیں انھیں مضمون میں پیش کیا ہے۔

تبصرے

۱۱۸۔ عبدالرزاق قریشی:

حیات اجمل

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴ اکتوبر، ۵۱-۵۸)

تبصرہ نگار نے "حیاتِ اجمل" مولفہ قاضی عبدالغفار کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ان مقامات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جہاں، تبصرہ نگار کی دانست میں مولف سے تسامح ہوا ہے۔

۱۱۹۔ ادارہ:

مکتوبات شیخ الاسلام حصہ دوم

(برہان دہلی، ۵۵ مارچ ۱۸۹)

تقطیع کلاں۔ ضخامت ۳۷۸ صفحات، کتابت و طباعت معمولی، قیمت عہ۔ پتہ الجمعیۃ بک ڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔

یہ کتاب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے مکاتیب کی دوسری جلد ہے اس مجموعہ میں جو خطوط شامل ہیں وہ اسارت مالٹا سے لے کر موجودہ حریت و استقلال کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، عبارت میں روبرو گفتگو کی سی بے ساختگی اور بے تکلفی، اردو اور ہندی کے محاوروں اور کہاوتوں کی کثرت۔ موقع بہ موقع۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی اشعار کی زرکاری کہیں کہیں ہلکی ہلکی ظرافت، طنز اشارے کنائے، ان سب چیزوں نے مل کر مکاتیب کے اس مجموعے کو فنی اعتبار سے بھی اردو ادبیات میں ایک ممتاز مقام کا مستحق بنا دیا ہے۔ البتہ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔

۱۲۰۔ ادارہ:

حیات انور

(برہان دہلی ۵۵ مارچ، ۱۹۰-۱۹۱)

تقطیع متوسط۔ ضخامت ۳۵۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ/۔ پتہ:۔ (۱) شاہ منزل دیوبند یوپی (۲) مکتبۂ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

حضرت مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیریؒ ان اکابر علم و دین میں سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں حضرت مرحوم کے صاحبزادے میاں سید محمد ازہر شاہ قیصر نے حضرت کے متوسلین میں سے بعض ارباب علم سے حضرت الاستاذ کی زندگی اور کمالات و فضائل کے مختلف گوشوں پر چند مقالات الگ الگ لکھوا کر یکجا طور پر شائع کئے ہیں اس مجموعہ میں جو مقالات درج ہیں ان سے اس کا ایک اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس صدی میں بلاشبہ اللہ کی طرف سے عالم کے لئے اسلام کی ایک حجت قاطع بن کر تشریف لائے تھے۔ افسوس کہ اس کتاب میں کتابت کی نہایت فاحش اور بڑی افسوسناک غلطیاں ایک دو نہیں بلکہ بہت زیادہ رہ گئی ہیں۔

۱۲۱۔ ادارہ:

مینا بازار

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ جنوری ۷۹)

مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی۔ تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۱ صفحات کاغذ طباعت و کتابت بہتر قیمت ۸/

پتہ منیجر اسرار کریمی پریس الہ آباد۔

مینا بازار جو عام طور سے ظہوری کی جانب منسوب ہے اور جس کے مصنف کی تحقیق کے بارے میں دو فاضلوں کے درمیان مباحثہ چل رہا ہے۔ قدیم فارسی درسیات کی مشہور کتاب ہے۔ مقدمہ میں مینا بازار پر مختصر تبصرہ اور اس کے مصنف کی تحقیق کی گئی ہے اس کے بعد اصل کتاب ہے اور آخر میں اس کا ترجمہ حل لغات اور تشریح ہے۔

۱۲۲۔ ادارہ:

شیخ نیازی

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ جنوری ۸۰)

از جناب رشید احمد صدیقی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۲۸ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت عہ پتہ:۔ سرسید بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ پرانا اور نہایت دلچسپ افسانہ ہے، جس میں شیخ نیازی کے بچپن کے واقعات کو بڑے دلکش پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ شیخ نیازی کے پردہ میں بچپن کی معصوم زندگی کی بڑی دلکش مصوری کی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بچوں بلکہ بوڑھوں کے لئے بھی دلچسپ ہے۔

۱۲۳۔ ادارہ:

میر تقی میر

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ مارچ ۲۳۵-۲۳۶)

از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۳۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد عـــہ، پتہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

میر پر ان کے مرتبہ شاعری کے لحاظ سے کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہیں تھی۔ لائق مصنف نے میر تقی میر لکھ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف میر کے سوانح کی حیثیت سے بلکہ علمی و ادبی حیثیت معلومات کے تنوع، و کثرت، اور تنقید و تحقیق کے لحاظ سے اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب میر کے حالات اور ان کی شاعری کی انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت دلکش و ادیبانہ اور متین و سنجیدہ ہے یہ کتاب ہر حیثیت سے اردو ادب میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔

۱۲۴۔ ادارہ:

خطوط غالب (حصہ اول دوم)

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ مارچ ۲۳۹)

مرتبہ غلام رسول مہر۔ تقطیع بڑی ضخامت علی الترتیب ۴۰۸-۴۳۶ صفحات۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت ہر دو جلد عـــہ/۔ پتہ:۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔ مرزا غالب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں کوئی بھی جامع و مکمل نہیں ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جامع مجموعہ مولوی مہیش پرشاد کا مرتب کردہ تھا۔ مگر اس کی ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی۔ غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت کے لحاظ سے ان کے ایک مکمل مجموعہ کی ضرورت تھی۔ یہ اہم کام غلام رسول صاحب مہر مصنف غالب کے ہاتھوں انجام پایا۔ یہ مجموعہ ان تمام مجموعوں سے جو اب تک شائع ہوئے ہیں ہر حیثیت سے مکمل ہے۔

۱۲۵۔ ادارہ:

وجیہ الدین وجدی

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ مارچ ۲۴۰)

مولفہ جناب محمد عمر ایم۔ اے تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۶ صفحات، کاغذ کتابت، و طباعت معمولی، قیمت عـــہ پتہ:۔ کتاب خانہ عابد روڈ، حیدر آباد (دکن)، وجیہ الدین وجدی۔ بارھویں صدی ہجری کا دکھنی زبان کا ممتاز اور قادر الکلام شاعر ہے اس نامور شاعر کے حالات بہت کم معلوم ہیں مصنف نے اپنے ایم اے کے امتحان کے مقالہ کیلئے وجدی کا انتخاب کیا تھا، بڑی تلاش و جستجو سے اس کے حالات و سوانح کے ساتھ اسکی تینوں مثنویوں پنچھی باچھا، تحفۂ عاشقاں، مخزن عشق اور اس کے کلام کی خصوصیات پر مفصل نقد و تبصرہ ہے۔ یہ کتاب اردو شعر و ادب کی تاریخ میں مفید اضافہ ہے۔

پرنٹر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی ــــــــ مطبوعہ اجمل پریس بمبئی ۳

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی، ایچ، ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور انھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔ جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

. اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

اکتوبر ۱۹۵۵ء

جلد ۶ نمبر ۴

چندہ سالانہ .... تین روپے
" ششماہی .... دو روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ

نمائندہ خصوصی
و
ترسیل زر کا پتہ

راءٹرس امپوریم لمیٹڈ

پیلس بلڈنگ، سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

فہرست مضامین

شذرات

ہندوستان میں بعض متعصب اور تنگ نظر اردو زبان کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن جب ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان سے کالے کوسوں دور روس کے دورہ پر جاتے ہیں تو ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر ان کی خدمت میں اردو میں سپاس نامہ پیش کیا جاتا ہے اور وہ خود بھی مجمع کو اردو میں مخاطب کرتے ہیں۔ کانگریس کی آواز کو بلند کرنے والے ملک میں بہت سے انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود کانگریسی حلقہ نے ایک اچھے اردو روزنامہ کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ دہلی سے ایک روزنامہ سنسار کا ابھی حال ہی میں اجرا ہوا ہے جس کے افتتاحی جلسہ میں خود ہوم منسٹر آنرایبل پنڈت گووند ولبھ پنت نے شرکت کرکے اردو زبان کے وجود کو تسلیم کیا۔ اردو اخبارات کے سلسلہ میں ایک نئے ہفتہ وار اخبار آئینہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یہ بھی چند مہینوں سے دہلی سے شائع ہونا شروع ہو رہا ہے۔ اس کی ظاہری و معنوی خوبیاں اس لائق ہیں کہ اس پر اردو کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں نہ صرف اردو کے وجود کا بلکہ اس کی مقبولیت کا بھی ثبوت ہیں۔ لیکن ہمیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے کیا وہ واقعی ہو رہا ہے؟ کیا اردو کے دامن میں ہر قسم کے موتی پائے جاتے ہیں؟ کیا محض شعری و افسانوی ادب کسی زبان کی بقا کا ضامن ہو سکتا ہے؟ خود افسانہ کی دوسری شاخ ناول کو لیجئے، اردو کے پاس کیا ہے؟ پروپگنڈہ سے متأثر نہ ہونا چاہئے۔ سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اردو کے پاس کتنے ایسے ناول ہیں جو فرانسیسی، انگریزی یا روسی ناولوں کے مقابل میں پیش کئے جا سکتے ہیں؟ اردو ناول نے آج تک ہم کو کتنے یادگار کیرکٹر دئے؟

ڈرامہ میں اردو کی تہی مائگی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ آج سے تیس چالیس سال اُدھر اردو اسٹیج بہت مقبول تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا ڈرامائی ادب ہمیں کچھ

نہ دے سکا۔ آغا حشر، احسن لکھنوی، طالب بنارسی، بیتاب دہلوی اپنے دور کے مقبول ترین ڈرامہ نویس تھے لیکن ان کی کوششوں سے اردو ادب میں سوائے چند تشبیہوں، استعاروں اور پرشکوہ جملوں کے علاوہ اور کوئی اضافہ نہ ہوسکا۔ آج بھی جب "لائٹ لٹریچر" کا شوق دن پر دن بڑھتا جارہا ہے ڈرامہ کی دنیا ویسی ہی غیر آباد نظر آرہی ہے۔ ریڈیائی ڈرامے بہت بڑی تعداد میں وجود میں آئے لیکن ان کی حیثیت محض تفریحی ہے۔ ادبی حیثیت سے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

یہی تہی مائگی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں بھی نظر آرہی ہے۔ تاریخ میں ہمارے پاس کیا ہے؟ آج تک ہندوستان کی کوئی مفصل تاریخ اردو زبان میں نہ لکھی جاسکی۔ ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ پاکستان میں اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں کام شروع ہوچکا ہے اور چند ایک کتابیں شائع بھی ہوچکی ہیں۔ دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ کوششیں اسلامی تاریخ تک محدود ہیں۔ عمومی تاریخ کے سلسلہ میں ہمیں کام کرنا ہے اور کرنا چاہیئے۔

سیرت و سوانح میں سیرۃ النبی، حیات جاوید، حیات شبلی، خیام، الفاروق، سیرت عائشہؓ نظام الملک طوسی، اعمال نامہ (رضا علی کی خود نوشت سوانح عمری) کو نکال دینے کے بعد ہمارے پاس کچھ نہیں رہ جاتا۔ ہمارے ادیبوں اور مصنفوں کو اس شعبۂ ادب میں خصوصیت کے ساتھ بہت کچھ کرنا ہے۔ اسلاف کے کارنامے، آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ ان کے غلط اقدامات سے ہم اپنے حال کو خطرات سے محفوظ رکھ سکتے اور اپنے مستقبل کو خوش گوار بنا سکتے ہیں۔

ہمارے ادب میں فلسفہ، معاشیات، تعلیم اور فن تعلیم پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حالانکہ آج کل فلسفہ معاشیات اور تعلیم ہماری تہذیب کے نہایت اہم عناصر ہیں۔ ہندوستان میں جامعہ ملیہ، مسلم یونی ورسٹی، اور انجمن ترقیٔ اردو کو خصوصاً اس طرف توجہ کرنا چاہیئے۔

ہماری زبان میں تنقیدی سرمایہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری

احتشام حسین، ڈاکٹر زور وغیرہ کی ادبی تنقیدیں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں لیکن آج تک اصول تنقید پر ایک کتاب بھی شائع نہ ہوئی۔ ہمارے ادبی نقادوں کو اس طرف ضرور توجہ کرنا چاہیئے۔

تحقیق کا کام بھی جو سرگرمی اور باقاعدگی چاہتا ہے وہ ہمارے یہاں مفقود ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی کوششوں سے متعدد قدیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ابھی سیکڑوں مخطوطے ایسے ہیں جنھیں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ قدیم اساتذہ میں بھی ابھی اکثر و بیشتر کے حالات تاریکی میں ہیں۔ خود اردو زبان کی کوئی مفصل و مستند تاریخ موجود نہیں۔ ان حالات میں ہمارے محققوں، اداروں اور یونی ورسٹیوں کو ایک منظم پروگرام کے تحت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دارالترجمۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد نے اپنے تراجم کے ذریعہ اردو ادب میں بہت کافی اضافہ کیا ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ اگست کے آخری ہفتہ میں اس کی عمارت کو آگ لگ گئی اور اردو تراجم کا قیمتی ذخیرہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ عمارتوں کی تخریب و تعمیر کوئی نئی بات نہیں۔ شہر کے شہر برباد ہو گئے اور پھر چند ہی دنوں بعد وہی لق و دق اور وہی ہنگامۂ ہاو ہو۔ دارالترجمہ کی عمارت بھی پھر بن جائے گی لیکن کتابوں کا جو نقصان ہوا ہے وہ قطعی ناقابل تلافی ہے۔

علی گڑھ میگزین پچھلے چند برسوں سے ہر سال ایک خصوصی نمبر نکالتا ہے۔ اس سال اس نے علی گڑھ نمبر نکالا ہے۔ پرچہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "علی گڑھ تحریک کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ علی گڑھ میگزین نے یہ نمبر نکال کر تاریخ و ادب کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بہت کم مضامین ایسے ہیں جو پڑھنے والے کو دعوتِ فکر دیتے ہوں۔ شخصیات کا جائزہ خصوصاً بہت ہلکا ہے۔ اور ایسے کئی اہم فرزندانِ علی گڑھ کے نام اس میں نظر نہیں آرہے ہیں جن پر علی گڑھ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

شغل طوبے

(جناب ضیاء الدین ڈیسائی - نئی دہلی)

اگرچہ آٹھویں صدی کے اول ہی سے سرزمین گجرات کے فارسی زبان سے سروکار کی ابتدا ہوئی اور اس کا یہ علاقہ قریب قریب، پانچ سو سال تک بدستور قائم رہا تاہم آج اگر ہم یہاں کے فارسی ادب کا جائزہ لینا چاہیں تو سوائے چند تاریخی کتابوں کے کوئی اہم ادبی کارنامہ زمانہ کی زد سے محفوظ نہیں پائیں گے۔ تلاش و جستجو سے کچھ ایسی کتابیں البتہ مل جاتی ہیں جن کا موضوع مذہب اور تصوف سے تعلق رکھتا ہے یا جو مشہور عربی اور فارسی تصانیف کی شرحیں ہیں خالص ادبی کتابوں کا بہت کم ذکر ملتا ہے چہ جائیکہ ان کے وجود کا پتہ چلے، شغل طوبے جس کا گجرات میں اردو کی ترویج کے سلسلے میں اس مختصر مضمون میں تذکرہ کیا جا رہا ہے مذہب اور تصوف سے متعلق ایک فارسی کتاب ہے جو گیارہویں صدی کی ابتدا میں تصنیف ہوئی ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس کتاب کا صرف واحد نسخہ وجود میں ہے جو احمد آباد کے کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ میں نہایت اچھی حالت میں محفوظ ہے (فن ۸ نمبر ۹۹) نسخہ خوشخط نستعلیق میں تحریر ہوا ہے کتاب میں نہ تو سن تصنیف کا کوئی ذکر ہے نہ کہیں اس کا سن کتابت درج ہے، ترقیمہ بھی غائب ہے لیکن خوش قسمتی سے کتاب کی تمہید میں مصنف نے اپنا پورا نام بتایا ہے جس سے کتاب کے سن تصنیف کے تعین میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے، اس بیان کے مطابق مصنف کا نام خان محمد اور ان کے والد کا نام ولی محمد ہے، مزید یہ کہ وہ شاہ غزنے منجھن شاہی متوفی کے نبیرہ ہیں[1]، یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کتنی پشت سے شاہ غزنے کے نبیرہ ہوتے ہیں[2]، مصنف نے اثنائے کتاب میں بھی اپنے زمانۂ حیات کی طرف صریحاً یا کنایتاً کوئی اشارہ نہیں کیا، کچھ تلاش اور تحقیق کے بعد ایک اعراس نامہ میں ایک شیخ خان محمد کے سن وفات کا ذکر اس طرح ملا ہے[3]: شیخ خان محمد بن شیخ ولی محمد بن شیخ خان محمد جانشین حضرت سلطان غزنین شاہی قدس سرہم و شیخ خان محمد بن ولے محمد شب سیوم یک گھڑی از پہر اول شب باقی بود برحمت حق پیوست تاریخہ ذکر حق، اس تاریخ سے سن وفات ۱۰۲۸ھ نکلتا ہے

[1] چنین گوید...... خان محمد بن ولے محمد نبیرۂ شاہ غزنے منجھن شاہی... ص ۱

[2] شاہ غزنے کے حالات مرآۃ احمدی کے خاتمہ میں درج ہیں۔

[3] یہ اعراس نامہ میرے دوست قاضی ضیاء الحق صاحب کے کتب خانے میں ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے یہ شیخ خان محمد اور شغل طوبے کے مصنف ایک ہیں اس بناء پر وہ شاہ محب محمد چشتی مصنف خوب ترنگ کے ہمعصر ہیں، اعراس نامہ کے اس ذکر سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی معزز اور محترم ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے، شغل طوبے میں مصنف اپنی تصنیف کو "گفتۂ پیر" بتاتے ہیں[۵۱] جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اسے تالیف کیا تھا اس بناء پر اگر ہم قیاس کریں کہ شغل طوبے گیارھویں صدی ہجری کے ربع اول سے تعلق رکھتی ہے تو غالباً غلط نہ ہوگا، مصنف کے ایک اور بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب تصانیف تھے اگرچہ ان کی کسی اور تصنیف سے ہم روشناس نہیں ہیں[۵۲]۔

اپنی کتاب کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں ہمیشہ خدا سے یہ دعا مانگتا رہتا تھا کہ یارب ایک شغل ایسا ہو جو تیرے بندوں کے لئے سہل ترین اور تیرے نزدیک از روی ثواب افضل ہو، جو تیرے کلام اور احادیث نبوی سے مطابقت رکھتا ہو جو ہر انسان کو کام آنے اور بآسانی انھیں مہیا ہو سکے جس کی مدد سے وہ بغیر ترک دنیا و اسباب ظاہری تیرے وصل میں کامیاب ہوں، چنانچہ خدا نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جو تو چاہتا ہے اس کا حصول "ہفت تصور" پر منحصر ہے اس الہام غیبی کے زیر اثر مولف نے ان تصورات کے تفصیلی بیان کی غرض سے ایک کتاب تصنیف کی جس کو انھوں نے "شغل طوبے" کے نام سے موسوم کیا، اس نام کے جواز میں فرماتے ہیں کہ جس طرح درخت طوبے سب پھلوں کا جامع ہے اور اس کی شاخیں ساکن اہل بہشت پر سایہ گستر ہیں اسی طرح یہ شغل طوبے بھی جامع فواید ہے اور اس کی فروعات سارے دینی اشغال پر محیط ہیں۔

'ہفت تصور' یہ ہیں:

نیت و موت و ذکر در تصویر		نظر و قرب با ارادت گیر
ہم حساب عمل نہ نیک و بد		یاد دارش کہ ہست گفتۂ پیر

پہلے ان تصورات کا اجمالی اور پھر تفصیلی بیان کیا ہے، جس طریقے سے ان کی ماہیت اور کیفیت بیان کی گئی ہے اور جس ڈھنگ سے ان اشغال کے طریقۂ عمل کو واضح کیا گیا ہے وہ وہ نہایت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے لیکن اس کی تفصیل کی نہ اس مختصر مضمون میں گنجایش ہے نہ اس کا جواز، مختصر یہ کہ ہر تصور کی تشریح کے دوران میں حسب ضرورت و موقعہ اپنے

---

۵۱ دیکھئے آیندہ سطور ۵۲ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں: در طعام خوردن ہشتاد و چہار چیز از آداب است خلاصہ نام از تالیفات فقیر نسخہ ایست از ان حاصل کنند۔

بیان کی تائید یا وضاحت میں مصنف نہ صرف آیات قرآنی احادیث نبوی اقوال بزرگان اور ملفوظات اولیائے کرام سے کام لیتے ہیں بلکہ جا بجا وہ عربی فارسی اور ہندی اشعار کو بھی بروئے کار لاتے ہیں، دوسری چیزوں سے قطع نظر ہم یہاں صرف ان کے منقول ہندی اشعار کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں، پوری کتاب میں ہندی کے ۷ اشعار پائے جاتے ہیں جن میں سوائے ایک کے سب کو دوہرے کے نام سے یاد کیا ہے باقی ایک کو ہندی کے عنوان سے معنون کیا ہے، مصنف نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ اشعار کس کے زور طبع کا نتیجہ ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ان کے قلم سے نکلے ہوں ان اشعار کی بحیثیت مجموعی یہ کیفیت ہے کہ ان میں فارسی عربی کے الفاظ کا استعمال قدرے کم ہے اور دوہروں کا یہی انداز ہے، تاہم ان کی زبان شاہ علی جیو گام دھنی مصنف جواہر اسرار اللہ اور دیگر صوفیائے کرام کے کلام کے مقابلہ میں زیادہ صاف اور سلیس ہے، اشعار خواہ کسی کے ہوں یہ ہمیں گجرات میں گیارھویں صدی کے ربع اول کی مروجہ زبان کی تعیین میں ایک اہم کڑی مہیا کرتے ہیں، ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقامی زبان اس یا اس کے قریب قریب شکل میں نہ صرف عوام کے روزمرہ میں استعمال ہوتی تھی بلکہ مذہب یا تصوف وغیرہ کے دقیق مسئلوں اور نکتوں کی تشریح و تفہیم میں اس کا ذریعہ کافی اہم بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا، شعر نمبر (۷) اس قسم سے تعلق رکھتا ہے جس کو لسانیات کے ماہر ریختہ کے نام سے مخصوص کرتے ہیں، اس قسم کے اشعار دور متقدمین کے اردو شعراء کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں باقی اشعار میں کچھ ایسے ہیں جن کی زبان کو خوب ترنگ کے اشعار کی زبان سے بآسانی تمیز نہیں کیا جا سکتا، ان میں گجراتی کا اثر نمایاں ہے۔

اب ہم ان اشعار کو یہاں درج کرتے ہیں:

(۱) یہار نکلتا لا سوں تا نو　　الا اللہ سوں بھیتر آ تو
جی دم شہ بن خالی جاوے　　اپنیں ہاتھوں گھر لٹاویں

---

(۲) یہ سب چھند تمہارے منہر دوس ہموں سر دیتا
ترن نہالی باج تمھون پیو نام ہمارا کیتا

---

(۳) جی کچھ عقبا کاج نہ آوے　　دنیا نام اسہی کہاوے
جس تھیں تجھ پیو بسرے سہی　　دنیا نام اسہی کون کہے

---

(۴) جاگورے جگ جاتا جانوں　　مرن درن کون من ین آنوں
گور اندھاری دیکھ سارے　　جسکون دھوکھا اتنا ہوے
تنگر بھیر تھان ہے بسنان　　دو نان کھے کہ جاوے ہسنان

---

(۵) چنتا آنون پنتھکی لوھو ھوا سو جیو
تان جانون کس پنتھ میں مجھے چلاوے پیو

---

(۶) جس گھر دھن نپائی ھیا نہ بندھین نت
جیون پردیسی پاھنان رہین اُچاٹ چست
اس محل کو دیکھ ولی کو دئی ؟) ادبھا ہووے
جسکون مرنا ہووے سہی وی سکہ کیون سویے

---

(۷) دلا غافل چہ می خسپی کہ اتنی نیند کیوں کر کر سیئے
کہ وقت مرگ در پیش است کہ اپنی میت سوں ڈریئے

---

(۸) جس سوئین شہ مکھ جوئے　　تس سونان بہتین سوئے

---

(۹) جب تیرا آوی پیو کا تب کوی ناوے ساتھ
دی پرکھی نا تھین ایک تل تو چھوڑ تلے سب آتھ

---

(۱۰) بہت کیا ہب تھوڑا رہیا سو بہی گھٹتا جایے
یہ بھی کر سائین کارن تھین تریہ پچھتا ی

---

(۱۱) کھا کیھ ہم ای کیے کھا تھین کے جای
ایکو کام نکرکے بہلے بکو چی آ بی

---

(۱۲) جی دم لیا سو کم ہو یا چھوڑنی سو بھی جایے
کھوٹ مندانے دھون پرون مورکہ مرم نیایے

---

(۱۳) جس نام لیین سکھ ایتا وہ ملے تو تن سکھ کیتا
جس گھٹ میں پیو نا نہ بسیرا اس جیون تھیں مرن بھلیرا
پہت پڑیا یہ جیویا سہی جس جیون میں پیو نا ہی

---

(۱۴) جانو نسدن اونتا کدھیں نہ وی سکھ پائین
بہلے بچارے بہلو لرے تنکو سکہ دن جائین

---

(۱۵) کال کرنتا آج کر آج کری سو ایتال
مورکہ مہلت کے کھیڑی جیسی کے موت خیال

---

(۱۶) کال کئی سو نیکیین رہے سو سکھ میں کال
دو کالون بچہ آج ہے مورکھ آپ سمھال

سجنان کیسو پیارا لگانوں سو ہردی سو نہین
ھونتو جیری تمہار پرلٹ کینہ دکھاؤ ہو

ذیل میں ہم اشعار ہذا کے ان چند الفاظ کی فہرست پیش کرتے ہیں جو گجراتی کے اثر کو ظاہر کرتے ہیں یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی دوسری مقامی زبانوں کی طرح گجراتی بھی سنسکرت کے چشمہ سے سیراب ہوئی ہے اس لئے اس میں کئی الفاظ ایسے بھی ملیں گے جو دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً گھڑی، مورکہ، چیلی، سکھ، نسدن لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ اکثر الفاظ گجراتی میں آکر ایک مخصوص شکل اختیار کر چکے ہیں اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ ان میں سے کئی الفاظ ایسے ہیں جو اپنی موجودہ شکل میں صرف گجراتی میں آج بھی زبان زد عام و خاص ہیں۔ مثلاً رھیا ماضی غائب واحد، تانو صیغۂ امر، آنو، تیڑا، جی، تھین (گجراتی میں بغیر نون غنہ تھی) ہسب (گجراتی ہوئے. پہرے. ہیے. ہب اور موجودہ اردو کا اب) ادبھا نہیں

تر، گئی کال، ہوں (ضمیر واحد متکلم)

لفظ	گجراتی	معنی
رہیا	रहा	رہا
کارن	कारण	سبب
نہیں تر	नहीं तर	ورنہ
کھوٹ	खोट	خسارہ نقصان
منڈانے	मंडा णी ?	لاحق ہوئی۔ اصل: بنیاد پڑی
مرم	मरम	بھید، ستر
گھٹ	घट	بدن، جسد، مجاز
جیون	जीवन	زندگی
بھلیرا	भलेरा	بہتر
پریا	पड़्या?	پڑے
کدھیں	कधी (कद्दी)	کبھی ہرگز
کال	काल	کل
کرنتا	करंता	کرتے
نس دن	निशदिन	دن رات
کال گئی	काल गई	گذشتہ کل
ہردی	हृदय	دل
ہوں	हूं	میں
تانو	ताणो	صیغۂ امر کھینچو
آنو	आणो	" لاؤ، لے آؤ
جی	जो	جو
چھند	छंद	عادت خصلت
منہر	मनहर	دلربا
دوس	दोष	خطا

لفظ	گجراتی	معنی
کاج	काज	کے لئے
تھیں	थी	سے
سہی	सही	سکھی، سہیلی
اندھاری	अंधारी	تاریک
دھوکہا	धोखा	فریب، دھوکہ
سنکر	सांकड़ ؟	تنگ
بھیر	भीड़ ؟	ہجوم
تھاں	त्यां	وہاں
چنتا	चिंता	فکر
جیو	जीव	جان
ناں	ना	نہ
ھیا	हैया	دل
پاہنان	परोणा گجراتی ، पाहुणा مرہٹی	مہمان
اچاءچت	अन्या चित	غیر مطمئن دل
اوبھا	ऊभा	کھڑا
تیڑا	तेड़ा	بلاوا
ہب	हवे	اب
سمھال	संभाळ	سنبھال
کینہ	कोने ؟	کسکو

کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ قدس سرہٗ

(از جناب شیخ فریدالدین برہانپوری)

کتب خانوں نے علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں۔ محتاج بیان نہیں ان کی تباہی کی داستان بھی بڑی دردناک ہے۔

زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے ہمارے اسلاف کے ادبی کارناموں کو برباد کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ حکومتوں کے انقلابات اور فاتحین کے وحشیانہ طرز عمل سے اکثر کتب خانے تباہ و برباد ہو گئے۔ ان میں سے کچھ کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ زیادہ تر نذرِ آتش ہوئے بعض خانگی کتب خانے اپنے مہتمموں کی غفلت کا شکار بن کر رہ گئے۔

اب بھی ہندوستان میں بے شمار ادبی جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں کچھ ایسے لوگوں کے پاس ہیں جو ان کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ کچھ ایسے مقامات پر محفوظ ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں۔ عبرت کا مقام ہے کہ ان ادبی شاہ کاروں کو ہماری مجرمانہ غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے چوہے اور دیمک چاٹ رہے ہیں۔

پروفیسر صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم نے اوپرہ (پانڈلی۔ راجپوتانہ) کے ایک قدیم کتب خانہ کا ذکر کرتے ہوئے ماہنامہ عکاس دلاہور میں لکھا ہے کہ "یہاں عربی۔ فارسی اور اُردو کے نادر قلمی نسخے ہیں۔ ان تک رسائی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گذشتہ پانچ سو چھبیس ۵۲۶ برس سے کسی غیر شخص نے اس کتب خانہ کی شکل نہیں دیکھی۔ ...... مالک کتب خانہ کا روزانہ مشغلہ کرم خوردہ کتابوں کے سوراخ گنتے رہنا ہے"

اگر اسے مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے تو یہ بات ماننے میں تامل نہیں کہ ان ذخائر کا دیکھنا یا حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔

زمانہ کی دستبرد سے جو کچھ ادبی ذخیرہ بچ گیا ہے۔ وہ چند کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کے کتب خانوں کی یاد میں حضرت مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کا ایک فاضلانہ اور محققانہ مقالہ معارف میں شائع ہو چکا ہے[1]۔ مولانائے موصوف نے ماضی و حال کے تقریباً تمام ہندوستانی کتب خانوں کا تاریخی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں

---

[1] معارف جلد ۶۳ نمبر ۲ - ۳ - ۴ - ۵

ضمناً بعض نوادر کا ذکر بھی شامل ہے۔

احمد آباد کے کتب خانوں میں درگاہ حضرت پیر محمد شاہ قدس سرہٗ کے کتب خانہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اس میں مختلف کتب خانوں کے نوادر جمع کر دئے گئے ہیں۔ مدرسہ ہدایت اللہ اور مدرسہ ولی اللہ کے کتب خانوں کے بیش بہا نایاب مخطوطات یہاں محفوظ ہیں۔

اس کتب خانہ میں عربی۔ فارسی اور اردو کتب کا ذخیرہ کافی ہے مخطوطات اور مطبوعات کی جدا جدا فہرستیں ہیں۔ کچھ گجراتی اور انگریزی کی بھی کتابیں ہیں۔

تجوید۔ تفسیر۔ حدیث۔ اصول حدیث۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ عقاید۔ فن کلام۔ تصوف۔ مواعظ و پند۔ اخلاق و ادب۔ لغت۔ صرف و نحو۔ منطق و ہئیت۔ طب حساب۔ مناظرہ۔ سیاست۔ فلکیات وغیرہ فنون کے تحت کتابوں کی فہرستیں تیار کی گئی ہیں۔

فاضل فہرست نگار نے مصنف کا نام سن تصنیف و کتابت۔ اور فن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بعض اشارات نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ اپنے دامن میں غلطیاں بھی لیے ہوئے ہیں۔

ان مخطوطات کی باقاعدہ اور علمی اصولوں پر نہایت صحت کے ساتھ فہرستیں تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ تمام ذخائر سے لوگوں کو واقفیت حاصل ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے رسایل اور اگر ممکن ہو سکے تو ضخیم کتابوں کی صورت میں ان کی فہرستیں تیار کرنی چاہئیں۔ بعض نوادر کی فوٹو کے ذریعہ نقل لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ دور دراز حصوں کے صاحب ذوق حضرات بھی اُن سے مستفیض ہو سکیں نایاب اور قلمی کتابوں کو ترتیب دے کر شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

مخطوطات کی تقسیم ذیل کے لحاظ سے بھی ہونی چاہیئے۔

(۱) مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے۔
(۲) بعض وجوہ سے قابلِ قدر مخطوطات۔
(۳) فن کے لحاظ سے نادر کتابیں۔
(۴) کتابت کے لحاظ سے پُرانی کتابیں۔
(۵) گجرات و دکن کے مصنفین کی تصانیف۔
(۶) ہندو مصنفین کی تصانیف۔
(۷) غیر اسلامی مذہبی ادب۔

ذیل کے نسخے ہماری خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

(ا) مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے

(۱) بدیع التفسیر کامل
(۲) رسالہ مولوی سلیمان
(۳) تفسیر غرائب القرآن
(۴) رسالہ مقدمۂ تفسیر (محمد بن جعفر بن بدر عالم)
(۵) شرح عمدۃ الاحکام جلد ثانی سخاوی
(۶) اسماءِ اہلِ بدر (شیخ ابوبکر محمد شاہ)
(۷) شمائل ترمذی
(۸) الضوء اللامع لاہل قرن التاسع (شمس الدین محمد بن عبد الرحمان سخاوی)
(۹) شرح الارشاد
(۱۰) اسماء الرجال (ملّا قاری)
(۱۱) کتاب العارفین (علّامہ سیّد محمود مدنی القادری)
(۱۲) تفسیر مسمیٰ بابستان (مصنفہ اسماعیل بن سید احمد)

(ب) حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی اور ان کے تلامذہ کی تصانیف۔
(ج) خوب محمد چشتی کی تصانیف۔
(د) علی متقی کی تصانیف۔
(ہ) رسالۂ وجودیہ خیام۔
(و) راگ درپن۔
(ز) مفتاح الحساب (دلپت رائے)
(ح) رسالہ تحقیقاتِ عشق۔
(ط) کلامِ اقدس۔
(ی) رسایل قاضی عیسیٰ احمد آبادی۔
(ک) شیخ برہان کی مثنویات۔

قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے سطورِ ذیل میں چند نادر اور اہم مخطوطات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

---

(۱) مَصَاحِف پاک :-

کتب خانے میں قرآنِ پاک کے کئی مُطلّا و مذّہب نسخے ہیں۔

خطِ نسخ میں ایک مصحفِ پاک ہے جس کے آخر میں تاریخ اس طرح درج ہے۔

"وقتِ عصر یوم شنبہ ۱۹ جمادی الآخر ۵۵ھ"

کتابت کے لحاظ سے مخطوطہ آٹھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔

ایک حمائل خطِ کوفی میں لکھا ہوا ہے۔ ۶۷۸ھ کا مرقومہ ہے۔ خط پاکیزہ اور خوش نما ہے۔

قرآنِ حکیم کا ایک گیارہ سطری نسخہ خطِ کوفی میں ہے۔ ۸۹۵ھ میں لکھا گیا ہے۔ ہر سورت کا سرنامہ مطلّا ہے۔ آیات گول اور مطلّا ہیں۔ حروف متن سیاہ، ترجمہ شنگرفی ہے۔

ایک ۲ ½ × ۹ لمبے فیتے پر ½ کے قط میں سورۂ فاتحہ لکھی ہوئی ہے۔ اِس کے بیچ میں پورا قرآن نقل ہے۔ آیاتِ ربّانی میں مختلف اشکال سے وقفہ ظاہر کیا گیا ہے خط شکستہ ہے اور مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔

پاکیزہ خط میں قرآن کریم کا ایک اور مذّہب و میناکار نسخہ ہے۔ جس کے آخر میں سید وجیہ الدین ابن شاہ عبد اللہ گجراتی کی ۱۱۲۸ھ کی مہر ہے۔

---

(۲) دلائل الخیرات :-

دلائل الخیرات کا ایک خوب صورت منقش نسخہ ۶ × ۴ سائز کا یہاں محفوظ ہے۔

ابو عبد اللہ سلیمان الجزولی متوفی ۸۷۵ھ / ۱۴۶۵ء کی تصنیف ہے۔

زمین مطلّا ہے اور حروف سیاہ۔ حاشیہ پر نیلے رنگ کی بیل ہے۔ عربی متن کے ساتھ فارسی ترجمہ بھی ہے۔

مؤلف نے غرضِ تصنیف یوں بیان کی ہے :-

"وهذا فالغرض فى هذا الكتاب ذكر الصلوة على النبى صلى الله عليه وسلم و فضائلها نذكرها محذوفة الاسانيد ليسهل حفظها على القاری

وھی من اھم المھمات لمن یرید القرب من رب الارباب
وسمیتہ بکتاب دلائل الخیرات وشوارق الانوار"

فارسی ترجمہ:-

" ازان مقصود است درین کتاب یاد کردنِ درود بر پیغمبر۔ و درودِ خدا باد بروے و سلام و فضیلتہائے آن۔ یاد آن درحالتے کہ انداختہ شد اسنادہا۔ تاکہ آسان شود یاد کردن آن برقاری۔ و آن درود از جملہ مقصود ترین۔ ہرکہ خواہد قرب از درگاہِ خدا و نام نہادہ شد" دلائل الخیرات و شوارق الانوار"

دلائل الخیرات کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اِس کے اردو۔ فارسی اور عربی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

مجتبائی پریس سے ۱۳۱۵ھ میں یہ کتاب معہ اُردو ترجمہ کے شائع ہو چکی ہے۔

محمد فاضل بن محمد عارف دہلوی نے دلائل الخیرات کی شرح لکھی ہے۔ نسخۂ مذکور موسوم بہ "شرح دلائل الخیرات" رائل ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔

مولوی سید احکام اللہ صاحب بخاری پیش امام جامع مسجد برہان پور کے ذاتی کتب خانے میں شرح مذکور کا ایک نسخہ راقم السطور کی نظر سے گذرا۔

شارح نے دیباچے میں لکھا ہے کہ دلائل الخیرات سرورِ کائنات کی جناب میں بہت مقبول ہوئی۔ اِس مقبولیت کی علامت کثرتِ تلاوت ہے۔ حرمین شریفین اور سید الکونین کے روضۂ منورہ کے قرب وجوار میں صرف درود شریف کے الفاظ کا پڑھنا اجرِ عظیم کا سبب اور قربتِ رسولِ کریم کا واسطہ ہے۔ اگر معانی کو سمجھ کر مطالعہ کیا جائے تو بے حد لذّت آمیز اور شوق انگیز ہے۔ اِس لئے اِس کمترین" خدّام مشتاقانِ درود نبوی" (محمد فاضل بن محمد عارف سعیدی دہلوی مدنی) نے صلوٰۃ مذکور کی عربی میں شرح لکھی۔ مگر بعض دوستوں کی درخواست پر اس کی شرح فارسی زبان میں لکھی۔

بعض کتب معتبرہ[۱] سے سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سیر و شمائل کا اقتباس لیا گیا ہے۔ اور

---

[۱] تفسیر بحر المواج۔ شرح مشکواۃ۔ جذب القلوب۔ تفسیر حسینی معالم۔ احیاء العلوم مطالع مرأت۔ بحر الحقائق۔ کشاف۔ روضۃ الاحباب۔ بیضاوی۔

اسے "مزرع الحسنات کے نام سے موسوم کیا گیا۔

"این مجموعہ خزینہ ایست از خزائن نبوی مملو بجواہر آبدار احادیث و اخبار و مائدہ ایست از موائد احمدی پُر از فواکہ و ثمرات مثل مطاعم جنّات۔ لہذا نامیدہ شد "بمزرع الحسنات"

۔ دیباچہ کے آخر میں مؤلفِ دلائل الخیرت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے[۵]

"ابو عبداللہ سلیمان الجزولی نے علوم و کمالات کی تحصیل فارس میں کی۔ اور اس شہر کے اکابر علمائے کرام میں شمار کئے جانے لگے۔"

دلائل الخیرات آپ کی تالیف ہے۔ آپ سے کئی خوارقِ عادات و کرامات ظاہر ہوئیں اور عوام کو "ابوابِ معارفِ حقیقت کے کشود" اور "سلوکِ طریقت" کی رُشد و ہدایت کرتے رہے۔ کسی دشمن نے آپ کو زہر دے دیا۔ اور ۱۶ ربیع الاوّل ۸۷۰ھ کو نمازِ فجر کے وقت انتقال ہو گیا۔ اور شہر سوس میں دفن کئے گئے۔

سنتر سال بعد آپ کی نعش مراکش لے گئے اور ریاض الفردوس میں سپرد خاک کی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب قبر سے نعش نکالی گئی تو مشک کی بو آ رہی تھی۔

زیر نظر نسخہ کے آخر میں سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم الی یوم القیام کے حضور میں ایک سلام پیش کیا ہے یہ سلام چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔

ابتدائی اشعار ہیں۔

السّلام اے صاحبِ خُلقِ عظیم　　السّلام اے معدنِ لطفِ عمیم
السّلام اے سرورِ عالی جناب　　السّلام اے شافعِ یوم الحساب
السلام اے مقتدائے مرسلین　　السّلام اے رحمۃ للعالمین
السّلام اے پیشوائے انبیاء　　السّلام اے پس روئی تو اولیاء

سرورِ کائنات کی جناب میں آخری اشعار میں زیارتِ جمالِ مبارک سے شرفیابی کی یوں دعا مانگی ہے۔

صد سلام از ما بہر دم صبح و شام　　بر تو ہم بر آل و اصحابت تمام
بر امیدے آنکہ اے عالی جناب　　از لبِ شیریں تو آید جواب
درد مندم ای طبیبِ غیب داں　　رنج ما دریابد از نبضِ تپاں

---

۵ آزاد اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

از علاج ما تو نیستکو آگہی   داروئی درد دلم ہم تو دہی
ہست داروئے دل بیمار من   شربتِ وصل تو اے دلدار من
پس چشان یک جرعہ از جام وصال   بیش ازیں مگذار مارا در ملال

مزرع الحسنات کا مذکورہ بالا نسخہ پیوند کار ہے ۱۸۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت مکہ معظمہ میں ہوئی ہے۔

دلائل الخیرات کا ایک اور اُردو ترجمہ مطبع کریمی سے شائع ہو چکا ہے جس کے مترجم قاضی نور محمد صاحب (بی اے ایل ایل بی) برہان پوری کے ذاتی کتب خانے کی ایک بیاض میں یہ سلام پورا نقل ہے۔ اسے مظہر الحق اکبر آبادی کی تصنیف بتلایا ہے۔

(۳) تفسیر غرائب القرآن:-

تفسیر کا یہ مخطوطہ مؤلف کے ہاتھ لکھا ہوا ہے۔ تقطیع ۹ × ۱۱ ہے۔ ایک صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں سن تالیف ۸۰۲ھ ہے۔

یہ تفسیر دولت آباد دکن میں لکھی گئی ہے مؤلف تفسیر مذکور علامہ حسن بن محمد حسین مشہور بہ نظام نیشا پوری ایک مشہور مفسر گذرے ہیں۔ وہ بڑے پایہ کے عالم تھے۔

کتاب زیادہ تر "تفسیر کبیر" (مصنفہ امام رازی) سے ماخوذ ہے۔ اسے تفسیر کبیر کا خلاصہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ تفسیر کشاف سے بھی بعض مطالب اخذ کئے گئے ہیں۔

غرائب۔ لطائف و نکاتِ قرآنِ حکیم کا حل آسان زبان میں کیا گیا ہے۔

علامہ موصوف کی دوسری قلمی یادگار شرحِ شافیہ ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی بغیۃ الوعاۃ میں لکھتے ہیں۔

الحسن بن محمد النیشا پوری کہ تفسیر علی القرآن سماہ غرائب القرآن و غائب الفرقان وھو صن ثم کذا ذکر فی خطبۃ تفسیرہ المشہور بالنظام الاعرج۔ صاحب شرح شافیہ فی التصریف وھو مشہور و متداول "[1]

(۴) فنِ تجوید پر کئی رسائل ہیں۔ ان میں ۹۰ اشعار پر مشتمل ایک رسالہ قرأتِ منظوم ہے جس کا کاتب عبد اللطیف امان اللہ ہے۔

---

[1] بحوالہ فہرست کتب خانہ رام پور۔

(۵) کلام اقدس:-

کتب خانہ میں حضرت پیر محمد شاہ کے دیوان کا مکمل نسخہ موجود ہے۔ ایک ناقص مخطوطہ سورت کے کتب خانہ میں ہے۔ مولانا سیّد ابوظفر صاحب ندوی نے لکھا ہے کہ "معتقدین اس کو آنکھوں سے لگاتے ہیں"۔ حضرت شاہ موصوف کے حالات کے لئے مولانا مذکور کا "تذکرہ اقدس" ملاحظہ فرمایئے۔

سیّد پیر محمد شاہ کا تخلّص "اقدس" ہے۔

کہتا ہے سیّد قادری پیر محمد خاص و عام
اقدس با لہام خدا۔ اس کا تخلّص در کلام

آپ کا وطنِ مالوف بیجاپور ہے۔

سُن حضرتِ عم شریف میرے ہیں پیر دستگیر
ہیں شہر بیجاپور میں کہ ملکِ دکن میں شہیر

یہی وہ شہر ہے جس کی ظہوری نے یوں تعریف کی ہے ؎

گر اکسیر سرور و سور سازند
ز خاکِ پاک بیجاپور سازند

بیجاپور کی مردم خیز خاک سے یہ مردِ عارف اٹھا۔ اور زین البلاد احمد آباد کی دامن گیر خاک میں ابدی آرام پا رہا ہے۔

آپ نے اپنے عم بزرگوار سیّد عبدالرحمٰن سے علم روحانی کی تعلیم حاصل کی۔

اُس پیر سیّد کا سنو کہ عبدالرحمٰن نام ہے
سیّد علی سے بھی وہی مشہور خاص و عام ہے

ہیں پیر سیّد قادری کہ عبدالرحمٰنِ علی
میرے اوپر اسرارِ حق۔ حق سے دائم جلی

ہندی زبان (اُردو) میں اسرارِ انوارِ خدا بیان کئے ہیں۔ بقا باللہ کے مقام تک پہنچنے کے لئے سالک کو دس سبق دئے ہیں۔ اس کا نام "عشق اللہ" ہے۔

ہاتف طفلِ پیر کے مجھ کو کیا ایسی ندا
ہندی زبان میں کر بیان۔ اسرارِ انوارِ خدا

مجھ کو بفضلِ دستگیر الہام سے بولا خدا
سُن نام اسرار کا عشق اللہ ہے گا اے گدا

"عشق اللہ" میں کل ابیات ۳۰۴ ہیں۔ ۱۱۴۶ھ میں بقا باللہ میں سالک کے لئے دس اسباق منظوم کرنا شروع کئے۔

سُن چار صد سی بیت ہیں۔ اقدس نے عشق اللہ کو
بولا ہے۔ دیکھو بس عجب قطرہ میں بحراللہ کو

الف صد و چل و ششم تھا سالِ ہجری بیگماں
اقدس نے عشق اللہ کو بولا ہی بے شک ای جوان

اقدس با لہام خدا بولا ہے عشق اللہ میں
دس ہیں سبق سالک کے سن۔ کامل ہیں بقا باللہ میں

سالک کو ہدایت کی ہے کہ سنگ ریزہ خاک۔ آب۔ آتش۔ باد۔ صفا اور جلا وغیرہ سے سبق لے کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

کلام پر مفصل تبصرہ "تذکرۂ اقدس" میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۶) احمد شاہ کھٹو۔

قطب المشائخ شیخ احمد کھٹو المعروف بہ گنج داتا بخش کی تاریخ میں ایک کتاب۔ "الرسالہ الاحمد فی مناقب المشائخ المقربیہ" ہے۔ جو سلطان احمد بن محمد بن مظفر شاہ کے عہد میں لکھی گئی ہے[۵۱]

آپ نے ۱۱۱ (ایک سو گیارہ) سال کی عمر میں ۸۴۹ھ میں وفات پائی۔ سلطان محمد زر بخش نے آپ کے مقبرے کی تعمیر شروع کی۔ مگر سلطان کے عہد میں مقبرہ کی عمارت نا تمام رہی۔ سلطان قطب الدین نے مقبرہ کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور سلطان محمود بیگڑہ کے عہد میں عمارت مکمل ہوئی[۵۲]

(۷) شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ [۵۳] (متوفی ۹۹۸ھ)

شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ اپنے وقت کے مالک اور علم و تعلّم کے بادشاہ تھے[۵۴] تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ کلام۔ منطق۔ فلسفہ۔ بیان و معانی پر جس قدر مشہور و متداول کتابیں تھیں اُن سب پر آپ نے حواشی لکھے ہیں[۵۵]

شاہ موصوف کی حسبِ ذیل کتابیں یہاں ہیں:-

(۱) حاشیہ شرح وقایہ

(۲) حاشیہ علی التلویح ــــ مرقومہ ۱۱۱۶ھ

"یہ نسخہ مصنف کے اصل نسخے سے منقول ہے"

(۳) حاشیہ علی شرح مواقف

(۴) حاشیہ بر عضدی ـــــ مرقومہ ۱۰۱۰ھ

"کبیر محمد بن شاہ محمد بن شاہ وجیہ الدین کے خط میں ہے۔"

(۵) حاشیہ علی شرح مختصر

---

[۵۱] خزینۃ الاصفیاء ص ۲۹۱ [۵۲] مرقاۃ الوصول معارف اجلد ۶۰ [۵۳] حالات کے لئے ملاحظہ ہو خزینۃ الاولیاء ص ۴۳۶ [۵۴] تذکرۂ آزاد ص ۲۵۹ ، [۵۵] اردوئے قدیم ص ۲۲

(۶) شرح جام جہاں نما

(۷) شرح البسیط

(۸) رسالہ مسلمات بالا انکوریہ پر بحث ما انا قلت۔

امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "شیخ وجیہ الدین گجراتی کی شرح اصول بزدوی عرصہ تک دیارِ دکن و گجرات میں متداول رہی۔"[۵]

اخبار الاخیار میں حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدّث دہلوی نے آپ سے اپنے ذاتی تعلقات اور استفادات کا حال لکھا ہے۔ آپ اپنے پیر سید غوث محمد گوالیاری کی طرح قادریہ اذکار کی طرف مائل رہتے تھے۔

آپ کے مریدوں نے آپ کے ملفوظات "بحر الحقایق" کے نام سے کتابی صورت میں جمع کیے ہیں۔ ملفوظات سے چند مقامات جن میں ہندی اقوال و کلمات پائے جاتے ہیں۔ تاریخ اردوئے قدیم میں منقول ہیں۔ اُن سے اُردو زبان کی ابتداء و ارتقاء پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

استاذِ محترم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب نے آپ کے ایک اور ملفوظ کا معارف جون ۱۹۳۸ء میں ذکر کیا ہے۔ اُس میں آپ کے وہ ہندی کلمات اور اقوال پائے جاتے ہیں۔ جو بحر الحقائق میں تھے

(۸) شرح الارشاد مسمّٰی بہ حواشی الرشاد۔

ملک احمد بن ملک پیر محمد تلمیذ حضرت شاہ وجیہ الدین کی تصنیف ہے۔

یہ کتاب مصنف کا اصل مسودہ ہے جس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کی وفات کے ۱۶ برس بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی۔

---

(۹) یہاں حضرت شاہ موصوف کے ایک اور تلمیذ حسن فراغی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ "آداب الحنفیہ شرحِ آدابِ عضویہ" عقائد میں ہے۔

---

(۱۰) بحر الحیٰوۃ

سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد میں ایک صوفی نے جو آسام میں رہتے تھے۔ "امرت کنڈ" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جو سنسکرت کے جیّد عالم کا ماپنڈت کی تصنیف ہے۔

حسین گوالیاری بن محمد سارنی نے دوستوں کے اصرار پر اسے سلیس فارسی کا جامہ پہنایا۔ فاضل

---

[۵] تذکرہ ص ۲۹۳

فہرست نگار نے لکھا ہے کہ حسین گوالیاری نے عربی سے ترجمہ کیا کہ اصل سنسکرت میں تھی۔
لہذا پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی صاحب کے بیان کے مطابق اس کا دو مرتبہ فارسی میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب شائع ہو گئی ہے[۵۱]

---

(۱۱) ایک اور اہم مخطوطہ کتاب المسلسلات سعید محمد بن مسعود گاذرونی کی تصنیف ہے۔
فاضل فہرست نگار نے لکھا ہے کہ پہلا صفحہ مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ باقی کتاب مصنف کے تلمیذ محمد بن ابو بکر بن عبد الرحمن نے نقل کی ہے۔
شیخ موصوف نے مشارق الانوار کی بھی شرح لکھی ہے جس کا نام "المطالع المصطفویہ" ہے انھوں نے ہر باب کے آخر میں احادیث کو لکھ کر کتاب کے آخر میں ۲۲۴۶ ثبت فرما دیا ہے۔ موجودہ متداول نسخۂ مشارق پر اُن ہی کے شمار کردہ اعداد ثبت ہیں[۵۲]
مشارق الانوار کا ایک نسخہ بہ ذیل ۲۱۲ کتب خانے کی زینت ہے۔ فاضل مرتب حدیث نے اُسے قاضی ابو الفضل کی تصنیف بتلایا ہے مگر یہ امام حسن صغانی لاہوری کی تصنیف ہے۔
مشارق الانوار کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے۔ جس کا ایک قدیم الخط نسخہ بنام "مدارج الاخبار و معارج الآثار من مشارق الانوار" کتب خانۂ ٹونک میں محفوظ ہے[۵۳]
(۱۲) دیوانِ ولی کا ایک نسخہ جو ۱۱۹۷ھ کا مرقومہ ہے کتب خانے میں محفوظ ہے۔
نزاکتِ تشبیہ و استعارہ کی ایک عمدہ مثال پر ہی اکتفا جاتا ہے۔

صنم کے لعل پر وقتِ تکلم رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

ولی کی زندگی کے حالات۔ اور کلام پر تبصرہ کے لئے ملاحظہ کیجئے۔

کلیات ولی (احسن مارہروی)
نذرِ ولی
یادگارِ ولی
ولی گجراتی[۵۴] (ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی)

رسالہ مصنف علی گڑھ میں ولی پر حضرت قاضی اختر میاں صاحب جوناگڈھی کا ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔

---

[۵۱] سنسکرت کا فارسی ترجمہ صلا کرسینٹ سنہ ۱۹۵۱ء [۵۲] معارف مئی جلد ۲ [۵۳] معارف نومبر ۱۹۲۸ء
[۵۴] معارف فروری ۱۹۴۸ء [۵۵] یہ کتاب ۱۹۵۱ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

ولی نے ایک عرصہ تک برہان پور میں قیام کیا ہے۔ اور یہاں کے شعراء پر اس کے کلام کا گہرا اثر پڑا ہے۔

راقم السطور کے استفسار پر ولی کے قیام برہان پور کے متعلق قاضی صاحب موصوف نے اپنے کرم نامہ جون ۵۸ء میں تحریر فرمایا ہے کہ

"ولی کے خاندان کے بزرگ ولی سے تقریباً سو سال پہلے احمد آباد سے برہان پور اور وہاں سے بیجاپور جا کر سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے برادر حقیقی حضرت شاہ برہان الدین بھی برہان پور میں مقیم تھے۔ اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔

خود حضرت شاہ وجیہ الدین کے فرزندوں میں سے بعض نے آپ کی زندگی میں سلاطین فاروقی کے عہد میں برہان پور میں اور بعض نے خاندیس میں سکونت اختیار کی تھی۔ خود ولی کے رشتہ دار چچازاد بھائیوں کا خاندیس اور برہان پور میں بود و باش رکھنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض کی شادیاں سلاطینِ فاروقی کے خاندان میں ہوئیں"

"ولی کے استاد سعد اللہ گلشن بھی گجراتی الاصل تھے۔ اور ان کے اجداد میں سے کوئی بزرگ سلاطینِ گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ شاہ صاحب کا آبائی وطن احمد آباد گجرات تھا اس لئے وہ بھی احمد آباد میں رہا کرتے اور دہلی میں مقیم ہونے کے بعد وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ برہان پور میں بھی ان کا قیام رہا ہے (ریاض الشعراء قلمی ص۲)

غالباً احمد آباد اور برہان پور کے زمانۂ قیام میں ولی سے ان کے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے"۔

ولی کے قیام برہان پور کے زمانہ کی تعیین مشکل ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری معلومات کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ گلشنِ گفتار ص۲۸ پر صرف اس قدر لکھا ہے:-

"در بلدۂ دار السرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت"

ولی برہان پور کب آئے؟ اور یہاں کتنے عرصہ تک رہے؟ اور شاہ گلشن سے ان کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ولی کا قیامِ برہان پور زیادہ تر اپنے اعزہ کی وجہ سے تھا۔

غالباً برہان پور ہی میں ولی کی ملاقات ناصر علی سرہندی سے ہوئی تھی اور وہیں انھوں نے اس کے متعلق شعر لکھا تھا ؎

اچھل کر گر پڑے جوں مصرعہ برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

اور آخر الذکر نے اس کا یہ جواب دیا تھا۔

باعجازِ سخن گر اڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کون

مگر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ یہ شعر عزیز دکنی کے دیوان میں بھی موجود ہے۔ اور غالباً اُسی نے ناصر علی کی طرف سے یہ جواب دیا ہے۔ جو ناصر علی کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

(۱۳) تور پشتی:۔

علامہ شہاب الدین بن فضل اللہ بن حسین التور پشتی کی ایک کتاب "السیر شرح مصابیح السنہ" کتب خانے کی زینت ہے۔ خط نستعلیق۔ کاغذ کشمیری ہے۔ سنِ کتابت ۱۱۲۳ھ ہے، کاتب کا نام علی بن حسین الکرمانی ہے۔

علامہ موصوف کے مختصر "حدائق الحنفیہ" میں درج ہیں۔ امام موصوف اپنے زمانے کے بزرگ محقق اور جید فقیہ تھے۔

ان کی دوسری کتابیں عقائد تور پشتی اور "مطلب الناسک فی علم المناسک" ہیں۔ کثیر تصانیف کے مالک ہیں۔ افسوس کہ اکثر کا پتہ نہ چل سکا۔

عقائد تور پشتی کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ سعد بن زنگی کے دربار سے وابستہ تھے۔[۱]

امام مذکور نے ۶۶۱ھ میں وفات پائی۔ "محدث زیب ملک" تاریخ وفات ہے۔

(۱۴) خوب محمد چشتی:۔

کتب خانہ میں خوب محمد چشتی کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) خوب ترنگ[۲]
(۲) شرح خوب ترنگ
(۳) خلاصۂ موجودات
(۴) رسالہ صلح کل
(۵) عقیدہ صوفیہ
(۶) حفظ مراتب

شیخ گجرات کے رہنے والے تھے۔ ۹۸۶ھ میں مثنوی "خوب ترنگ" تصنیف کی اور ۱۰۰۳ھ میں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے راقم السطور کا مضمون معارف ۱۹۴۹ء [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ استاذِ محترم پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب کا مقالہ "شاہ خوب محمد اور خوب ترنگ" معارف اپریل ۱۹۳۲ء خوب محمد چشتی کی ایک اور تصنیف چھند چھندان ہے۔ جو ہندی فارسی عروض سے تعلق رکھتی ہے (اردو اکتوبر ۱۹۳۲ء)

اس کی طرح فارسی زبان میں لکھی۔ جس کا نام "امواجِ خوبی" ہے۔ اُردو شہ پارے (ص ۱۵) اور ہندوستانی لسانیات" (ص ۱۰۸) پر مثنوی کا سنِ تصنیف ۹۷۸ھ (مطابق ۱۵۷۸ء) درج ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب نے ایشیاٹک جرنل ۱۹۳۳ء (پیرس) میں فرانسیسی زبان میں ایک فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ اور ترجمہ کے ساتھ "خوب ترنگ" کے دل چسپ قصّوں کو شائع کرایا ہے۔ اِس میں مثنوی کا سنِ تصنیف ۹۸۶ھ بتلایا گیا ہے۔

خوب محمد نے مثنوی کی تاریخ یوں نظم کی ہے۔

نسخہ کن تاریخ س مانہ[۵۱]　　پائے بمدد ہر مصرے ماشہ
خوب محمد کنی بچار　　چودہ گھانت اوس برس ہزار
دوجہ چاند جو تھا شعبان　　ویس دوشنبہ کیا بیان

مصرعہ ۳ اور ۴ سے الگ الگ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ بلکہ چوتھے مصرعہ سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں۔[۵۲]

شرح کی تاریخ ذیل کے شعر سے نکلتی ہے۔

عدد شمار ز تاریخ شرح نعت محمد　　ہزار سال مکمل ز فکرِ خوب محمد
　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۰۰۰

خوب محمد نے خوب ترنگ خوب کہی ہے

خوب کہے گا خوب ترنگ　　سنتیں پچھو نہ کچھو ننگ

آگے چل کر لکھا ہے کہ میں نے عرب و عجم کی بات کو گجرات کی بولی بیان کیا ہے

جیوں دل عرب عجم کی بات　　سن لوبی لوبی گجرات

خوب ترنگ کی زبان عربی و فارسی آمیز گجراتی ہے۔ دراصل وہ اردو ہی ہے۔ جس میں گجراتی زبان کا غالب اثر پایا جاتا ہے۔

اردو کی گجراتی شکل پر خوب ترنگ میں کافی مواد موجود ہے۔ صوتی شکل کی تبدیلیوں کو سمجھنے میں یہ کتاب کافی دل چسپ ہے[۵۳]

حرف جار تے　　دکھنی سے پہلے کی تمام تحریروں میں تے اور بعد کی تحریروں میں تھے

---

۵۱ "پنجاب اردو" میں پہلا مصرعہ یوں ہے "نسخے کی تاریخ اس تھانہ" ۵۲ پنجاب میں اُردو ص ۲۲۵
۵۳ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے پیرس کے زمانۂ قیام میں خوب ترنگ کا لسانیاتی تجزیہ کیا ہے۔ جو پیرس کے لسانیاتی مجلس کے جریدہ میں شائع ہو چکا ہے (ہندوستانی لسانیات ص ۱۰۱)

کی شکل میں ملتا ہے۔ اِس طویل نظم میں تھیں کے روپ میں پایا جاتا ہے۔

(۱) غیرت تھیں سب کیا قبول
(۲) دیکھوں جس تھیں اے گل زار
(۳) جیون عالم تھیں ہوئے نیاں

عام طور پر ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ جن میں حروفِ جار کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔
ہماری مندرجۂ بالا لسانیاتی معلومات کا مآخذ "ہندوستانی لسانیات" ہے۔

(۱۵) یوسفی:۔

حکیم محمد بن یوسف کی انشاء کی مشہور کتاب کے دو مخطوطے بنام "انشائے یوسفی" اور "بدائع الانشاء" کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

فاضل فہرست نگار نے دونوں کا مختلف فنون کے تحت ذکر کرتے ہوئے اوّل الذکر کو رفیع الدین کی تصنیف بتلایا ہے۔ سرورق کی تحریر سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی۔

دیباچہ سے اس امر کی صراحت ہوتی ہے کہ یہ حکیم یوسفی کی تصنیف ہے۔ اِس میں فنِ انشاء سے بحث کی گئی ہے۔ حکیم موصوف نے اپنے نورِ نظر رفیع الدین اور دیگر طلباء کے لئے کتاب تصنیف کی۔

"این رسالہ ایست مسمّٰی بہ بدائع الانشاء" مشتمل بر محاوراتِ خطابی وجوابی کہ جہتِ فرزندِ عزیز قرۃ العین رفیع الدین حسین طال عمرہٗ و سائر طالبانِ این فن را در قیدِ کتابت وحیزِ عبارت می آید۔"

این نامہ کزو است فنِ انشاء بہ نظام — کردہ خردش بہ بدائع الانشاء نام
تکرار کنی چو نام او یک بار — شک نیست کہ رہبری بہ ضالِ تمام

یوسفی بابر کا طبیب خاص تھا۔ ہمایوں کے عہد میں طبابت کے علاوہ دبیری کے فرائض بھی اُس کو تفویض کیئے گئے۔ طب میں اس کی کئی تصانیف ہیں[۵۱]۔

ریاض الادویہ۔ جامع الفوائد (طب یوسفی)۔ قصیدہ فی حفظِ صحت۔ دلائل البول و دلائل النبض۔ علاج الامراض۔ فوائد الاخبار۔ ستّہ ضروریہ۔ رسالہ ماکول و مشروب۔ طب یوسفی کا ایک نسخہ (مطبوعہ ۱۳۰۲ھ کانپور) کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

ریاض الادویہ میں بے شمار مترادف ہندی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح خاموشی سے کثیر تعداد میں فارسی زبان میں داخل ہو رہے تھے۔ ان ہندی الفاظ کی فہرست "پنجاب میں اردو ص ۲۸۸" پر درج ہے۔
حکیم یوسفی کا ایک اور قصیدہ موسوم بہ "قصیدہ در لغاتِ ہندی" ہے۔ اس قصیدہ میں کل ابیات ۱۴ ہیں جن میں اکثر الفاظ پنجابی لہجہ میں ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ راقم السطور کا مضمون معارف جولائی ۱۹۴۶ء ۵۲ اُردو کے منظوم لغات "خیابان" لکھنؤ جنوری ۱۹۶۲ء بحوالہ "پنجاب میں اردو" ص ۱۳۳

عارف باللہ قاضی سید محمود بحری قدس سرہٗ

اور ان کی تصنیفات

جناب سخاوت مرزا بی، اے - ال، ال، بی (عثمانیہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

نیز بحری نے عروس عرفان میں دوسرے ایک مجذوب بہلول نامی، متوطن گوگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ مجذوب صاحبؒ کی یہ حالت تھی کہ دو تین وقت خوب پیٹ بھر کر کھاتے اور ہاتھ میں پیسے اور کمر میں ہمیانی رہتی جہاں کہیں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں گذر ہوتا تو فرماتے "ہموں کوں روٹی اور پیسا دیو، لوگ اس سے تنگ آگئے تھے کسی نے شاہ باقرؒ سے کہا کہ کیا فقیر بھی روٹی اور پیسہ پر اس قدر جان دیتے ہیں، فرمایا کہ مجذوب در اصل اپنا حال نہیں کہتا بلکہ حریص بخیل اور سرمایہ داروں کی حالت کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بھی ایک پکچر آیا تھا جس میں سرمایہ داروں کا خاکہ اڑایا ہے، اور معصوم بچہ کی زبان سے کہلوادیا ہے "بابا روٹی دو"

مخدوم عبدالحق ساوی:۔

بیجاپور کے مشہور بزرگ محقق اور سیاح، مولانا شیخ عبدالحق[1] مخدوم ساوی عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری (وفات ۱۱۶۵ھ)۔ جو مدراس میں پیشوائے محققین اور مجدد وقت کہلاتے ہیں آپ کے معاصر تھے مگر ملاقات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ البتہ بحری نے ان کے سلسلہ کی اصطلاحات تصوف عینیت غیریت ہر ایک جا) بنگاب نامہ میں منظوم کیا ہے۔ ان کا اور ان کے متبعین میں، مولانا قربی ویلوری، شاہ عبداللطیف ذوقی، فرزند قربی، اور سید غلام محی الدین ویلوری کا سنہ وفات ۱۲۸۹ھ ہے (قطب ویلور) شاہ میر راسے چوٹی، اور شاہ کمالؒ وغیرہ نے قال صحیح پر بہت زور دیا ہے۔ جس کی تعریف بحری نے فرمائی ہے۔ بلکہ شجروں میں بھی قال صحیح کا ذکر ہے۔ مثلاً قطب ویلور ذوقی لکھتے ہیں:۔

اے عزیز فضیلت مراتب علمی موقوف بر قال صحیح مرشد کامل است چنانکہ مراتب علمی کہ در ذات این فقیر ضعیف غلام محی الدین سید عبداللطیف بود بقال صحیح والا او

---

[1] مشکوٰۃ نبوت قلمی و رسالہ اردو ۱۹۴۲ء مضمون احقر ۵۲ لطایف اللطیف ذوقی قلمی آصفیہ

و مرشد او شاہ ابی الحسن قادری بالفعل شدہ .... تا مراتب علمی او بقال صحیح سید ابوصالح نصر رضؓ [۱]

قاضی ابوالحسن مورخ :-

بحری کے معاصرین میں ایک مشہور مورخ قاضی ابوالحسن ابن قاضی عبدالعزیز مولف وقایع سلاطین بیجاپور بھی ہیں جو سکندر عادل شاہ کے زمانہ تک بقید حیات تھے، اور بحری کے وطن گوگی سے متصل شاہ پور میں رہتے تھے جن کی ایک مسجد شاہ پور میں موجود ہے جس پر ۱۰۸۲ھ کا کتبہ [۲] بعنوان "بعہد سلطنت سلطان علی عادل شاہ ثانی .... ملکتہ شیخ ابوالحسن ابن قاضی عبدالعزیز کندہ ہے جن کے متعلق زبیری نے بساتین میں لکھا ہے۔

"فضیلت مآب شیخ ابوالحسن ولد قاضی عبدالعزیز در صدد ضبط و شرح سوانح و حالات عادل شاہیان فقرات زمان اسکندری کہ ختم طبقہ عادل شاہیہ است در آمدہ مدت ہا دوران تحقیق سعیہا بکار بردہ در اواخر مایہ تالیفے مشتمل جمیع سوانح و حالات و فتوحات عادل شاہیان پرداختہ است الخ"

ممکن ہے کہ شاید ان کی تاریخ میں ہوں، مگر ہندوستان میں اس تاریخ کا وجود نہیں، البتہ برٹش میوزیم کی زینت بنی ہوئی ہے۔ دیگر مشاہیر ہند میں بحریؒ کے معاصرین، شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ وفات ۱۱۴۴ھ۔ شاہ نور محمد حموی (۱۱۰۲ھ) علامہ جمال الدین جمن گجراتیؒ (وفات ۱۱۴۴ھ)۔ علامہ شاہ عنایت اللہ بالاپوری (وفات ۱۱۱۷ھ) شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی مصنف پریم لوکا ہندی، اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (وفات ۱۱۴۲ھ) وغیرہ ہیں۔

معاصر سلاطین و امراء :-

سلطان سکندر عادل شاہ و ابوالحسن تانا شاہ کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ عالمگیر [۳] سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی ہے، بعض اشرار نے عالمگیر سے شکایت کی کہ بحری بھنگ پیتے ہیں بحری نے قصداً بھنگ کا پیالہ منگوایا تو وہ دودھ تھا، کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے ایک کونہ میں آپ کی گدڑی کو لرزتا ہوا دیکھا۔ تو جواب دیا کہ رعب شاہی کو میں نے گدڑی کے حوالہ کر دیا ہے۔ غرض عالمگیر نے باوجود اس سخت اور بے باکانہ جواب کے کچھ تعرض نہ کیا، بلکہ خوش ہوا بڑا فقیر شناس تھا، کھرے کھوٹے کو خوب سمجھتا تھا، بہت خوش ہوا۔

---

[۱] بساتین السلاطین زبیری قلمی [۲] اپی گرافا انڈو مسلمیکا مرتبہ یزدانی ۱۹۳۳ء-۱۹۳۴ء صفحہ ۵۳
[۳] تذکرۂ جلالی مطبوعہ صفحہ ۴۸ ۔

بحریؒ نے عالمگیر کی من لگن میں بہت مدح کی ہے۔ بلکہ عروس عرفان میں عالمگیرؒ کی ایک فارسی رُباعی کی شرح بھی خوب لکھی ہے۔ چونکہ یہ نایاب ہے اس لئے یہاں درج کی جاتی ہے:۔

رُباعی عالمگیر

سلطنت را عزلتے در عالم فانی کجاست ماگدایا نیم ما را عیش سلطانی کجاست
ایں دل دیوانہ را گفتم کہ عاقل شو نشد آرے آرے طفل را میل سبق خوانی کجاست

"ذکر مصرع نخستین آنست کہ سلطان اورنگ زیب غازی خلد اللہ ملکہ کہ صاحب ایں رباعی است سلطنت را در اصطلاح خود درویشی قرار دادہ چنانچہ ؎

گدا بادشاہ است و نامش گدا است

والحق درویش چون بکمال خود رسد سلطان غیب و شہادت می شود واز جزو کل مطیع و منقاد او گردد، و ایں سلطان و سلطنت را در عالم فانی یقین است کہ عزت نباشد و ہر کس حقیرش می شمرد،

ماگدایا نیم ما را عیش سلطانی کجاست

ماکہ بادشاہ نیم فی الحقیقت گدایا نیم پس مارا عیش ایں سلطانی کہ مراد از درویشی باشد کجاست۔ مصرع

این دل دیوانہ را گفتم کہ عاقل شو نشد"

سلطان مشارٌ الیہ پیش از جلوس تخت مایل بدرویشی بود، می گوید ایں دل دیوانۂ خود را گفتم کہ خبردار شو یعنی سر بادشاہی از سر بدر کن و ایں درویشی را از دست مدہ نہ شنید و بہان طرف ملتفت گردید، دید کہ میل بدنیا نمود از راہ ندامت گفت

آرے آرے طفل را میل سبق خوانی کجاست

یعنی طفل دل را طلب ایں سبق خوانی کہ کنایت از فقر است کجاست و مقرر است کہ سبق خوانی اگرچہ سرمایۂ زندگانی است اما طفل مرتکب لہو و لعب است از ان گریزان باشد، آفرین باد کہ بادشاہ دین پناہ عذر کردار بدرگاہ پوزش پذیر حضرت پروردگار بطریق احسن پیش آور د بلکہ گوی قبولیت بوسیلہ ہمیں عذر ...... برد خدا ئے تعالیٰ ہمہ حالش حافظ باد و ناصر ؎

بحریؔ بدعائے داور از دوست درعواہ بر تو ہم حق او ست

خندان بز مینش میکنی خواب — شا دانش ز جوئے میخوری آب
اے تشنہ جوئے گفتگوئی — این راہ دراز چند پوئی
جز دوست مشو بدیگرے بند — بر دادۂ دوست باش خورسند

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ، اور قاضی حبیب اللہ قاضی لشکر۔

قاضی بحریؒ خان فیروز جنگ کی شخصی طور پر غالباً ملاقات نہیں ہوئی، البتہ خان صاحب معز آپ سے واقف ضرور تھے، معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ واکن گیرہ کی تسخیر کے وقت جو شوراپور کے بیڈر راجہ ناؔیک[1] کے قبضہ میں تھا، شاہ عالمگیر سے کسی نے بحریؒ کی شکایت کر دی، شاید سبب یہ ہو کہ راجہ

---

[1] یہ بیڈر قوم کا ایک راجہ ہے۔ دکن کی بیڈر قوم بڑی بہادر اور جفاکش ہے۔ علاقہ کرناٹک میں وجیانگر، سگر، شاہ پور، شوراپور وغیرہ (بیڈر) میں آباد ہے۔ عادل شاہی اور شیواجی کی فوج میں بھی کثرت سے ملازم رہے۔ اچت رایا ۱۵۳۰ء/۱۵۴۲ء راجہ وجیانگر کے طلائی سکوں (دیگوڈے) پر "گنڈ بھیرنڈا" مضروب ہے (اپی گرافا مسلیمکا از غلام یزدانی ۱۹۱۵ء/۱۹۱۶ء) پڈ نایک ولد پام نایک اول کے قبضہ میں واکن گیرہ کا قلعہ تھا۔ ایک مرتبہ علی عادل شاہ ثانی اور مغلوں کی فوج سے پڈ نایک کا مقابلہ ہوا۔ مغلوں کے سردار راجہ رام بخش کو شکست دی اور علی عادل ثانی نے مصلحتاً صلح کر لی۔ مگر پڈ نایک کے قتل کا بہانہ ڈھونڈھتا رہا۔ اور ایک مست ہاتھی کو زیر کرنے والے کو نولاکھ کی جاگیر دینے کا اعلان کیا۔ بڑے بڑے بہادروں کے مقابلہ میں پڈ نایک نے بیڑا اٹھایا۔ اور کامیاب رہا۔ علی عادل شاہ نے ایک گرز ڈھائی من وزنی دیا تھا جس پر قدیم لقب کے ساتھ یہ الفاظ کندہ تھے "گنج گنڈ ابھرنڈا پڈ نایک بلونت بحری بہادر" اور نو تعلقے جاگیر دئے جس میں وڈگرہ۔ اندولہ، مدرکی شامل تھے۔ عالمگیر نے بالآخر اس کو مطیع کیا۔ فرمان ۴۱ سنہ جلوس م ۱۱۱۵ھ میں پڈ نایک اس طرح مخاطب کی ہے۔ زبدۃ الامثال والاقران لایق عنایت والاحسان پڈ نایک بعنایت پادشاہانہ مفخر و مباہی بودہ بداند کہ درین ولا از پیش گاہ خلافت و جہانبانی از فضل و کرم تقصیرات آں زبدۃ الامثال والاقران عفو شد و سر دیسکھی نصرت آباد وغیرہ بدستور شد،…… پام نایک پسر خود را بہ طمانیت خاطر بہ رکاب ظفر انتساب بفرستد کہ بنوازشات پادشاہانہ و عطائے منصب سربلندی یابد، چہارم شہر رمضان المبارک سنہ احد جلوس والا قلمی گشت"۔ واکن گیرہ میں پڈ نایک نے ایک دربار ہال ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں بنایا اور ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۲ء میں فوت ہوا۔ حضرت بحریؒ کا اشارہ اسی پڈ نایک وارث واکن گیرہ کی طرف ہے۔ اور یہ واقعہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء سنہ ۱ جلوس کا ہے۔ جبکہ اس علاقہ پر مغلوں کی شہنشاہیت مسلم ہو چکی تھی۔ تسخیر بیجاپور ۱۰۹۷ھ کے بہت بعد واکن گیرہ کو بھی عالمگیر نے ۱۱۱۶ھ میں راجہ پام نایک تینی پڈ نایک سے چھین لیا اور جس پر عالمگیری کتبہ "باہتمام عاقبت محمود حافظ مسعود غرہ رجب سنہ ۴۹ جلوس والا عالمگیر م ۱۱۱۷ھ تعمیر یافت" کندہ ہے۔ اس مہم میں نواب غازی الدین خاں، نواب منصور خاں ذوالفقار خاں وغیرہ شریک تھے، غرض بحریؒ راجہ پڈ نایک اور پام نایک کے معاصر تھے۔
(دیکھئے واقعات مملکت بیجاپور ص ۲۹۲/۳۷۴ اور راجگان شوراپور (انگریزی) مولفہ فرامرز جنگ ص ۵۶)

پیڈنایک آپ کا معتقد ہو۔ تو خان صاحب ممدوح نے قاضی شکر شیخ حبیب اللہ کو معہ خدم و حشم بحری صاحبؒ کی تادیب کے لئے بھیجا، غرض قاضی صاحب موصوف آئے۔ ملاقات کی مگر کچھ تعرض نہ کیا اور واپس چلے گئے۔ بحری لکھتے ہیں کہ میں نے اس وقت دل میں ٹھان لی تھی کہ قاضی صاحب سے بس یہی کہوں گا کہ جو کچھ میرا جی چاہا میں کرگزرا اب آپ جو چاہے کیجئے۔ مگر آپ کا تصرف دیکھئے کہ قاضی صاحب بہت کچھ منصوبہ سے آئے تھے، لیکن کچھ نہ کرسکے، ملاقات کی اور واپس ہوگئے۔ بحریؒ کے الفاظ یہ ہیں :-

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ بر حکم بادشاہ عالمگیر خلد ملکہٗ بر پیڈنایک وارث واکن گیرہ با فوج بیکران رسیدہ بود، شخصے از مقربان نواب پیش نواب از فقیر گلہ کرد، نواب مشارٌالیہ قاضی حبیب اللہ قاضی شکر را کہ دران روزہا درویشی را بہ سبب گفتگوئے خلاف شرع شریعت بجان گشتہ بود طلب کرد و گفت کہ بہ تکیہ فلاں فقیر کے درگوگی است شما خود بروید و ببنید چنانچہ گویند اگر ہمچنان ست بنوعے تنبیہہ نمایند کہ عبرت بدیگراں رسد، غرض بہ تکیہ فقیر با حشام و اخدام خود رسید و بعد سلام بہ نشست بدل خود تجویز کردم کہ اگر چیزے بہ پرسد ہمیں باید گفت کہ اے مقوی اسلام ہر چہ بمن خوش آمد، من کردہ ام و انچہ بہ شما بہتر نماید شما بکنند، گفتگوئے دراز از بہر چیست، خدائے تعالیٰ خیرش دہد کہ ہیچ نہ پرسید و رفت " (عروس عرفان قلمی)

غرض بیڈر راجہ پیڈنایک المخاطب بہ " گجگنڈا بھیرنڈا گنڈ و پیڈنایک بلونت بحری بہادر جو سگر، شاہ پور وغیرہ اس علاقہ کا ایک مشہور زبردست راجہ تھا جس نے سلطان عادل شاہ ثانی (۱۰۸۳ھ) اور شہنشاہ عالمگیر کو ناک چنے چبوادئے تھے، بحری کے تعلقات تھے اور بڑی خوش حالی کا زمانہ تھا، غالباً بحری نے پیڈنایک کو بھی یاد کیا ہے اور شاہ عالمگیر کی تعریف کی ہے جو اس وقت بقید حیات تھا۔ چنانچہ اس کی وفات ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۴ء کے بعد اس کے فرزند " پام نایک[۵۱] " کے دور حکومت سے خوش نہ تھے چنانچہ ایک غزل میں پام نایک کی ہجو اور شکایت کی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ سید نے کلیات بحری میں " پام نایک " کو ایک فرضی نام سے تصور کیا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ دراصل شاہ صاحب پام نایک کے زمانہ کی

---

۵۱ " شوراپور " از فرامرز جنگ ص۵۶ پام نایک ۱۱۰۴ھ/۱۱۰۸ھ عالمگیر نے اپنے پہلے فرمان موسومہ پیڈنایک بسلسلہ جلوس ۱۰۷۸ھ میں پام نایک کو دہلی طلب کیا تھا تاکہ اس کو منصب اور خطاب سے سرفراز کیا جائے۔

ناگفتہ بہ حالت کا ایک غزل میں اس طرح خاکہ کھینچتے ہیں ؎

گیا یوں منج کوں سٹ دو شاہ والا　　　کہ جانو پھول بن کوں برشگالا
چمن مانند میں کیوں سک نہ جاتا　　　جو ہووے باغ سٹ مالی نرالا
جلگ تیرا قدم تب لگ ہے گوگی　　　وگر نین پام نایک کا ہے پالا
نہ بستی میں ملے دانا نہ پانی　　　نہ جنگل میں ملے آلا نہ پالا
لگایا باد پھکنے آدمی کون　　　دیا گھوڑے کوں جنگل کا حوالا
جو تھے کپڑے سو سارے پھاٹ کر کے　　　ہوا ہے منج کون غم ہور دکھ دوشالا
نہ بحری چھوڑ سے شہ کے قدم کون　　　ہے جب لگ جگ میں سورج کا اجالا

خواجہ عبدالحکیم :-

خواجہ عبدالحکیم[۵۱] داروغہ، قلعہ سگر (ساغر) "نصرت آباد" ایک مرتبہ بحری کی دعوت کی تھی، اور داروغہ صاحب کا پیشکار "اچپت رایا" سے بھی ملاقات ہوئی۔ بیدر قوم میں بھی فارسی کے اچھے اچھے فاضل موجود تھے۔ چنانچہ اچپت رایا نے بحری کو دیوان خواجہ حافظ شیرازیؒ سے فارسی غزلیں سنائیں، تو بحری نے کچھ امتحاناً "رایا" سے معنی و مطالب پوچھے اور رفتہ رفتہ حافظ کے اصطلاحات بادہ و جام کی بحث چھڑ گئی۔ بحری فرماتے ہیں۔

روزے مہمان بخانۂ خواجہ عبدالحکیم داروغہ توپخانہ قلعہ سگر بودہ شد، بعد فراغ طعام "اچپت رایا" پیش دست خواجہ مشارٌ الیہ رسید، دیوان حافظ کہ بعبارت مغلق معروف است درمیان نہادہ بود برگرفت ویک دو غزل برخواندہ درست بخاطر رسید کہ معنی یک دو بیت ہم بہ پرسیدم تا چہ می گوید، بہ پرسیدم چنانچہ دل میخواست ادا کرد الخ۔" (عروس عرفان)

نیز آپ کے تعلقات بعض کائستھوں سے بھی تھے جن میں نرنجن داس، اور مسہود راے تھے نواب[۵۲] دلاور خاں (محمد نعیم نصرت) قلعدار رائے چور بزمانہ امیر الامرا حسین علی خاں جنھوں نے بحریؒ کے وصال کے نو سال بعد (۱۱۳۹ھ) میں وفات پائی، بحری کے معاصر تھے، مگر ملاقات کا حال نہیں معلوم ہوا، البتہ نواب صاحب مرحوم کے معتقد ایک درویش شاہ صدر الدینؒ جو شاید ۱۱۶۴ھ تک زندہ تھے، اپنی ایک تصنیف دکھنی اردو علم مہوسی[۵۳] (کیمیا گری) میں جو نواب صاحب

---

۵۱ عروس عرفان قلمی آصفیہ صفحہ ۲۵۹　۵۲ تذکرۂ شعراء دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری مطبوعہ۔ جلد ۲
۵۳ رسالہ علم مہوسی کتب خانہ آصفیہ قلمی و غازی اعظم مولف ادیب میسوری مطبوعہ۔

مذکور کے ایما سے لکھی تھی، گوگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس طلاء معرفت کو جو میں نے تیار کی ہے گوگی میں جا کر بیچ آ، یہاں اس کے خریدار اور قدر دان بہت ہیں ؎

اگن میں عشق کے دے تاویک آن ہوے بیشک زر خالص و دحلان
بیچ آ بازار گنگی لے تو سودا نفع پاوے گا لے ہے آزمودا

وفات:۔

قاضی محمود بحریؒ نے سو سال سے زاید عمر پائی، اور بڑے انقلابات دیکھے، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا عروج و زوال ان کی نظر سے گذرا۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا لڑکپن ابراہیم عادل شاہ جگت گرو $\frac{۹۹۸}{۱۰۳۷}$ھ میں گذرا ہے۔ محمد عادل شاہ (وفات ۱۰۶۷ھ) کے زمانہ علی عادل ثانی (۱۰۸۳ھ) میں جوان تھے۔ سکندر عادل شاہ (۱۱۰۹ھ) کے زمانہ میں شہرت ہوئی۔ عالمگیر کے زمانہ میں بوڑھے ہو چکے تھے غرض زمانہ کے بہت سے سرد و گرم سہے، تانا شاہ کی تانا شاہی ضرب المثل ہو کر رہ گئی، مگر قدم استقلال نہ ڈگمگائے۔ اور آخر کار ۱۱۳۰ھ میں بقول خود" پیرپائے من شکستہ" آستانہ درگاہ پیر پر بیٹھ گئے۔ اور آخری زمانہ میں باوجود پچاس ہزار بیت کا انمول سرمایہ کھو جانے کے من لگن اور عروس عرفان جیسی بیش بہا تصانیف چھوڑیں جو معرفت کا خزانہ ہے۔ اور ۱۰ ر شوال ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۷ء میں واصل بحق ہوئے۔ اور اپنے مرشد کے پہلو میں بمقام جدید گوگی آسودہ ہیں، کسی بزرگ نے تاریخی قطعہ[۵۱] کیا خوب کہا ہے ؎

بحری با کمال حق آگاہ شیخ محمود عارف باللہ
بود در عہد پادشاہ زمن ختم شاہان سکندر عادل شاہ
دستگاہش بہ علم حق بہ چناں کہ تواں یافت علم و دانش راہ
سیر او در ہوائے عالم قدس گھیر او در ہوائے عشق اللہ
گوش کردم ندائے رحلت او داخل مجلس رسول اللہ

۱۱۳۰ھ

کتاب الاعراس مطبوعہ نولکشور و قلمی[۵۲] مولفہ محمد نجیب ناگوری میں جو ۱۱۵۶ھ کی تالیف ہے، بحری کی تاریخ وفات ۱۱۷۹ھ لکھی ہے۔ اور اسی کے ایک قلمی نسخہ میں ۱۱۳۰ھ درج ہے۔ اور مولف مذکور نے لکھا ہے کہ میں نے یہ تاریخ بحری کے ہمشیر زادہ و خلیفہ سید احمد راکی زبانی سن کر لکھی ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں تو سہو کتابت معلوم ہوتا ہے اور ۱۱۲۹ھ بھی کچھ زیادہ معتبر نہیں، جبکہ قطعہ تاریخ موجود ہے۔ مگر شاعر کا تخلص و نام

---

[۵۱] تذکرۂ جلالی مطبوعہ حیدرآباد، [۵۲] اعراس نامہ ۱۱۵۹ھ قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔

کا پتہ نہیں چلا۔

خلفاء :-

بحریؒ کے خلفاء کا حال معلوم نہ ہوا صرف تین خلفاء کا پتہ چلا ہے۔ ایک تو آپ کے صاحبزادے شاہ حسین[51] بحری سجادہ نشین، اور خلیفہ ہوئے ہیں دوسرے آپ کے ہمشیر زادہ سید[52] احمد کا ذکر مولف کتاب الاعراس نے کیا ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور بحریؒ کے مختصر حالات معلوم ہوئے تھے، سید صاحبؒ شاہ باقرؒ کے مرید تھے اور خلافت بحری سے پائی تھی۔ تیسرے بزرگ شاہ فضل اللہ بیان کئے جاتے ہیں، جو مدراس میں بحریؒ سے ایک عیسائی پادری سے مباحثہ کے وقت موجود تھے، اور پادری صاحب نے اپنے مذہب کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا تھا، سطح سمندر پر مصلےٰ بچھادو، اور نماز پڑھی تھی، اور پادری صاحب دنگ رہ گئے تھے۔ (انوار جلالیہ مطبوعہ ص۴۸)

شاید یہ بزرگ شاہ فضل اللہ[53] مدراس میں رشد و ہدایت کے لئے مامور ہوں۔

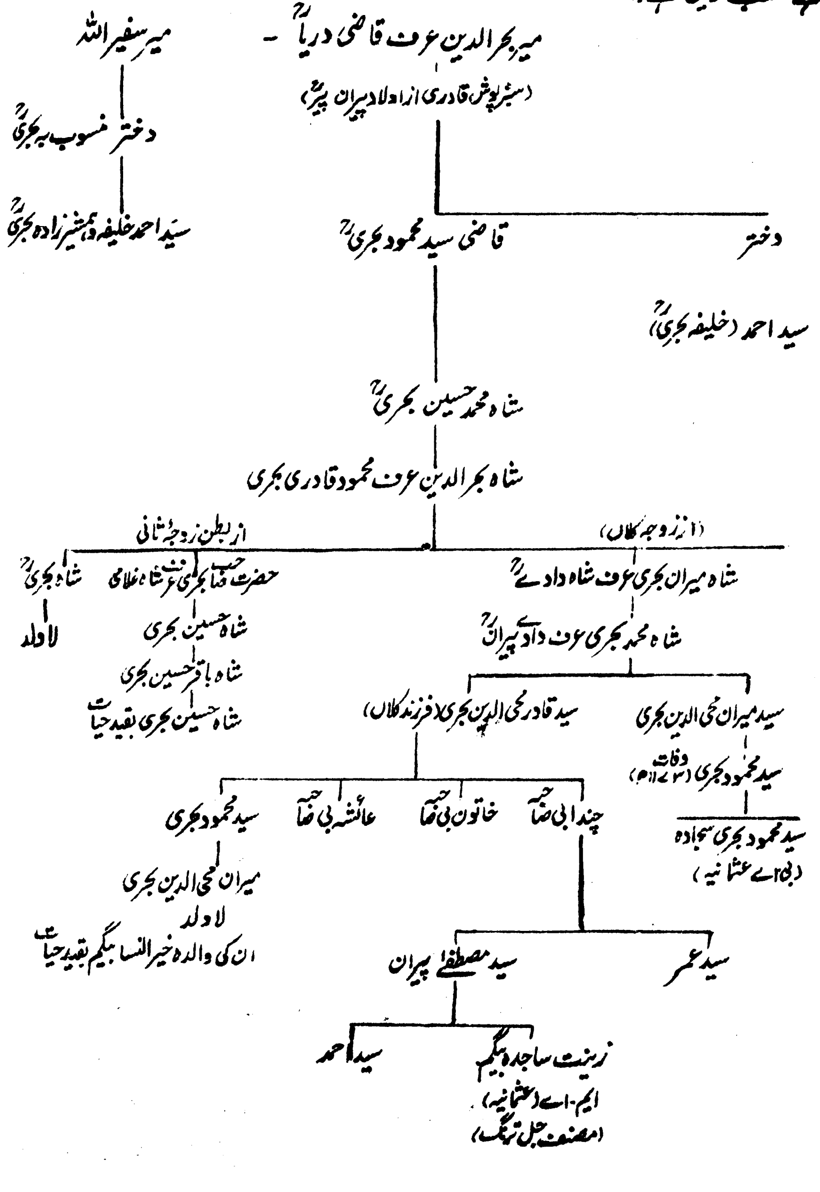
اولاد :-

شجرۂ خاندانی تو دستیاب نہیں ہوا، البتہ شجرۂ خلافت میں جو اخلاف کے نام درج ہیں اُس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے صرف ایک صاحبزادے شاہ محمد حسین بحریؒ تھے جو بعد وصال آپ کے جانشین ہوئے۔ مؤلف کتاب الاعراس نے آپ کے ہمشیر زادہ سید احمد کا ذکر کیا ہے۔ اوپر کے اجداد کا حال معلوم نہ ہو سکا، شجرۂ خاندانی اور بیش قیمت کتب وغیرہ پولس ایکشن کی تباہی و غارتگری کی نذر ہو گئیں۔ اور اس خاندان کے بعض شیوخ نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر دئے گئے بغرض

---

[51] شجرۂ خاندانی قلمی [52] کتاب الاعراس مطبوعہ ص۱۲۸ [53] غالباً یہ بزرگ وہی "فضل اللہ" ابن شمس الدین اکبرآبادی معلوم ہوتے ہیں جو عالمگیر کے زمانہ میں اکبرآباد سے بنگالہ آئے اور وہاں سے دکن کے شہروں کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے ترچناپلی میں ایک بہت بڑی خانقاہ بنوائی۔ اور مستقل قیام فرمایا آپ کا دسترخوان بہت وسیع تھا مگر وفات سے ایک سال قبل وطن واپس ہوئے اور آگرہ میں واصل بحق ہوئے (تذکرۂ اولیاء دکن مولفۂ عبدالجبار خاں جلد دوم مطبوعہ ص۱۰۴۷) معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنگال سے براہ دریا مدراس آئے اور دکن کے اولیاء اللہ سے بھی ملاقات کی، بحریؒ نے ایک جگہ عروس عرفان میں اس طرح اشارہ کیا ہے "عزیزے از ہندوستان زاد از فقیر سوال کرد کہ می گویند ولی چو بمیرد ولا تیغ چہل سال باشد و بعد ازاں مسلوب شود..... گفتم الا ان اولیاء اللہ لا یموتون، بسیار خوش وقت گردید" (عروس عرفان) شمالی ہند کے محققین، تلاش حق میں دکن میں آتے رہے ہیں، چنانچہ ایک عالم و فاضل بزرگ مولوی جان محمد دہلوی کرپہ آئے تھے اور سید محمد شاہ میرؒ رائے چوٹی کے والد بزرگوار شاہ جمال الدین بخاریؒ سے استفادہ حاصل کیا تھا، اور خلافت بھی جس کا ذکر ہم نے اپنے مضمون "شاہ میرؒ" نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۴ء میں کیا ہے۔

موجودہ شجرۂ خاندانی جس میں ہم نے خفیف سی ترمیم، عروس عرفان اور کتاب الاعراس کے لحاظ سے کی ہے حسب ذیل ہے:۔



تصانیف بحریؒ:۔

ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے لکھا ہے[۵۱] کہ "بحری نے اپنی تین تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ایک دیوان غزلیات دوسری مثنوی من لگن، تیسری بنگاب نامہ، جو مجموعہ مملوکہ سید یوسف علی خطیب شولاپور میں شامل ہیں۔ اس کے سوا کسی اور فارسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نیز، کلیات بحری کی ترتیب کے وقت، من لگن کا ایک نسخہ عطیہ عبدالحق مکتوبہ ۱۲۵۰ھ دوسرا عطیہ خطیب صاحب مذکور اور تیسرا مطبوعہ نسخہ من لگن ــــ ناقص الاول مطبوعہ مدراس ۱۲۷۱ھ پیش نظر رہا ہے۔ ان کے سوا کسی اور نسخے کا ذکر نہیں ہے اور نہ من لگن کے اشعار کی تعداد درج ہے اور مطبوعہ نسخہ[۵۲] کے صفحات ۲۲۳ اور مسطر ۱۷ لکھنے کی وجہ سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے مولوی صغیر احمد صاحب مولف تنویر ادب[۵۳] نے من لگن کے اشعار کی تعداد ۷۰۹ ۳ سے زائد بیان کی ہے۔ حالانکہ اس مثنوی کے اشعار، اٹھارہ سو سے کچھ زائد ہیں۔ مثنوی کے ابواب یعنی عنوانات میں بھی بہت اختلاف ہے، جس کا ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی ذکر کیا ہے۔ من لگن کے بعض قدیم نسخے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ و کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں، اور اس کے تقریباً دس مطبوعہ اڈیشن بھی ہیں، یہ مثنوی دکن میں اس قدر مقبول رہی ہے کہ دیوان ولی کو ایسی مقبولیت نہیں رہی جس کے صرف چند ہی اڈیشن ہیں۔ دیوان ولی کو سب سے پہلے گارساں دتاسی نے ۱۸۳۳ء میں فرانس میں چھپوایا اور اس کے چند ہی سال بعد مثنوی من لگن مدراس میں پہلی مرتبہ ۱۲۷۱ھ میں چھپی تھی۔

فارسی تصنیفات میں بحری کی عروس عرفان نثر میں بہت مشہور رہے۔ اس کے سوا، ایک فارسی مثنوی، دستور العمل کا ذکر ہرمن ایتھے نے فہرست مخطوطات، فارسی انڈیا آفس میں کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی فارسی مثنویاں، بہت سی، مجموعہ من لگن جامعہ عثمانیہ میں شامل تھیں جو اب ناپید ہے جس کی تفصیل فہرست مخطوطات اردو مرتبہ مولوی عبدالقادر سروری میں موجود ہے۔ ہم یہاں جملہ تصانیف اور نسخہ جات من لگن مطبوعہ و غیر مطبوعہ کی ایک مختصر توضیح درج ذیل کرتے ہیں:۔

نسخہ جات من لگن کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد:

(۱) مثنوی من لگن، مکتوبہ ۱۱۲۷ھ۔ کاتب: این کتاب من لگن بہ ید فقیر حقیر غلام حسین بتاریخ شانزدہم شہر ربیع الثانی در بینیٹ کپل بوقت بعد ظہر ۱۱۲۷ھ ہجری مرتب شد۔

کاتب قصبہ کپل، مضافات کرنول (علاقہ نظام) جاگیر علاقہ نواب سالار جنگ بہادر کا باشندہ ہے۔ جس نے کپل میں لکھا۔

---

[۵۱] کلیات بحری ص۶۴ مطبوعہ نولکشور [۵۲] کلیات بحری مطبوعہ ص۶۵

[۵۳] تنویر ادب مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۷ء۔

اوراق (۴۰) مسطر ۱۳-۱۶-۱۷ کوئی تعین نہیں ۱۵۰۸۳ کتب خانہ آصفیہ اشعار (۱۸۲۶)
یہ نسخہ مولوی احمد اللہ قادری فرزند حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم مولف اردوئے قدیم کتب خانہ آصفیہ میں فروخت کیا تھا، جس پر سنہ کتابت شاید اس طرح درج تھا ۱۱۲۰ھ یا ۱۱۲۷ھ ۲ کا شوشہ یا نکتہ، مٹا دینے کی وجہ سے مشکوک ہوگیا ہے۔ مگر بلحاظ کاغذ وکتابت قدیم ہے ـــ اور مصنف کی زندگی میں لکھا گیا ہے۔ یہ نسبت اور نسخوں کے صحیح ہے اور زبان بحری کے زمانہ کی ہے گر خط معمولی ہے۔ بعض اشعار میں الفاظ متروک ہیں۔ نام کاتب درج نہیں ـــ البتہ لکھا ہے رسالہ من لگن من تصنیف قاضی محمود بحری نور اللہ مضجعہ ساکن گوگی روز دوشنبہ۔
(۲) نسخہ ۲ من لگن۔ مکتوبہ بتاریخ چہاردھم ۱۴ رجب ۱۱۵۱ھ " درزمان نفعت توامان دین پرور و یافت گستر سلطان ابوالمغازی سلطان محمد شاہ بادشاہ الغازی سنہ ۲ جلوس والا آرائش نگارش یافت۔
یہ نسخہ وفات سے ۲۱ سال بعد کا ہے ۱۵۸۱، صفحات ۱۴۵ مسطر ۱۲-۱۳، تعداد ابیات (۱۸۴۱)
(۳) نسخہ ۳ من لگن، ۱۳۷۳۔ مکتوبہ ۱۲۶۵ھ معہ فرہنگ، کاتب شیخ احمد عرف محمد صاحب بعض آخری اوراق پر کبت وغیرہ ہیں۔
(۴) نسخہ ۴ من لگن ناقص، صرف ۱۴ ورق، مسطر ۱۵۔ کاغذ واٹر مارک (۸۹۸ کتب خانہ آصفیہ)
خاتمہ:۔ انصاف ہے صاف گدگرد ظلم الخ
سنہ کتابت ونام کاتب ندارد دیگر ورق ۱۵ پر غوثی تخلص شاعر کے ۳۴ بیت ہیں کچھ عربی اور کچھ اردو، غالباً یہ غوثی آرکاٹی مصنف ریاض مسعود (قصص الانبیا دکھنی) یا غوثی بیجاپوری ابن افصحی مصنف مثنوی ریاض غوثیہ کے مطالعہ میں رہا ہے۔ جن پر ہمارا ایک علیحدہ مضمون زیر طبع ہے۔
(۵) نسخہ ۵ من لگن (معہ بنگاب نامہ) ناقص الآخر، صفحات ۴۴۔ تقطیع متوسط۔
خاتمہ:۔ کہتے جو فقیر یک کنول من الخ اس جھوٹ کے جن پڑے نہ نیڑے
کتابت ۱۵ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ۔ کاتب روح اللہ بادشاہ قادری جیلی۔
(۶) نسخہ من لگن مملوکہ میر احمد حسین وانمباڑی (مدراس) المخاطب بہ نواب امین جنگ بہادر مرحوم کے پاس ایک خاص نسخہ تھا! جو اب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں ہے۔ نواب صاحب کا بیان تھا کہ " میرے والد نے اپنے ایک بیٹے کو اپنی جائداد سے ایک لاکھ دئے اور مجھ کو صرف " مثنوی من لگن " جس پر مجھ کو ناز ہے جس کی ایک نقل مولوی عبید اللہ نیرنگ آنجہانی پوری کے پاس ہے۔
(۷) ۷ من لگن قلمی مکتوبہ ۱۲۵۲ھ کتب خانہ پٹنہ (رسالہ معاصر پٹنہ جلد ۲ ۱۹۵۴ء)

ترجمہ من لگن قلمی۔ مملوکہ مسٹر سدرشن، ساکن کوہیر (بیدر) جس کو موصوف نے، آل انڈیا اردو کانگریس۔ منعقدہ حیدرآباد ۱۹۴۴ء / ۱۳۵۳ف کی نمائش میں پیش کیا تھا۔

نسخہ (ب) من لگن نمبر ۲۹۷۶۶۳ م م ا۔ ق۔ جامعہ عثمانیہ۔ کاتب محمد مرتضیٰ مقام رانی پیٹ واقع آرکاٹ۔ سنہ کتابت ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء ۲۷ اوراق۔ مگر دراصل ایک ورق کم ہے یعنی ورق ۲۰ (احقر) مسطر ۱۳۔ کاغذ بادامی۔ خط نستعلیق معمولی۔ کاتب نے اس کے اوراق "شصت وہشت" (۶۸) لکھا ہے۔ جا بجا پنسل سے بین السطور بعض الفاظ کے معنی درج ہیں، جو زمانہ مابعد کے ہیں۔

نسخہ (ج) جامعہ عثمانیہ ۲۹۷۶۶۳ م م اوراق ۶۳۔ سطر ۱۵۔ بخط نسخ معمولی۔ کاغذ پتلا جدید۔ کاتب۔ شاہ محمد اسداللہ چشتی مرید۔ سید شاہ محمد افتخار علی مدنی عرف غریب الوطن، متوطن حیدرآباد (دکن) کتابت۔ یازدہم ماہ رجب المرجب روز دوشنبہ بوقت سہ پہر ۱۲۹۹ھ۔

نسخہ جات من لگن، کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد:۔ چار نسخے حسب ذیل:۔

(۱) مثنوی من لگن ۶۴۷، کتابت، سنہ ۱۱۹۰ھ کاتب قادر محی الدین۔ مقام و سکونت ندارد
(۲) " " ۱۹۴ " ۱۲۵۵ھ " غالب علی شاہ " "
(۳) " " ۸۰ " ۱۲۷۹ھ " حسین " "
(۴) " " ۳۹ " سنہ کتابت و نام کاتب درج نہیں۔

تعداد اوراق اور سطور کا حوالہ درج نہیں۔ (از یادداشت مکرمی مولوی نصیر الدین ہاشمی حیدرآبادی)

نسخہ من لگن۔ کتب خانہ مولوی خلیل اللہ صاحب نائطی حیدرآباد (از یادداشت مکرمی مولوی نصیر الدین ہاشمی حیدرآبادی۔ مکتوبہ ۱۲۴۵ھ)

کتب خانہ مکرمی مولوی محمد عمر یافعی حیدرآبادی:۔

مثنوی من لگن۔ مکتوبہ ۱۲۷۵ھ۔ کاتب سید احمد حسینی متوطن گوگی۔ مملوکہ غفور خاں نیازی۔

بحری کے دو مطلعے سرورق:۔

یاد کر اس جان کے تئیں جنے جان سون جان گلاوت ہے
پھول کے پات میں باس رچے جنے پھل میں سواد چکاوت ہے
سرگ کے سروتے نیر منے جنے بھان کی نان پکاوت ہے
رات کے کاگ کے پیٹ میں سے جنے اپس بگولہ اڑاوت ہے

(از یادداشت عمر یافعی صاحب)

نسخہ جات من لگن مطبوعہ:۔

(۱) مثنوی من لگن مطبوعہ بحاشیہ پر منطق الطیر چھپی ہے۔ مطبوعہ مطبع عظیم الاخبار مدراس ۱۲۷۲ھ۔

کتب خانہ آصفیہ میں مکمل نسخہ موجود ہے۔

(۲) من لگن۔ مطبوعہ مدراس ۱۲۷۸ھ } بحوالہ مولف اردوئے قدیم
(۳) " " " ۱۳۱۰ھ
(۴) " " مطبع محمدی مدراس ۱۳۵۳ھ۔ معہ شرح و فرہنگ مرتبہ سید عبد الغفار حسینی مسکین خلیفہ شاہ سید غلام محی الدین ویلوری۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مولوی عمر یافعی صاحب حیدر آباد اور دوسرا نسخہ مولوی سید قادر علی بادشاہ صاحب کڑپوی کے پاس ہے۔
(۵) نسخہ من لگن مطبوعہ۔ ۱۲۹۸ھ۔ مطبع فردوسی بنگلور معہ فرہنگ۔ کتب خانہ مولوی ظہور میاں حیدر آبادی۔ (مہر عبد اللطیف جنیدی قادری ۱۲۸۶ھ۔ ادھونی)
(۶) نسخہ من لگن مطبوعہ۔ ۱۳۱۰ھ۔ مطبوعہ بنگلور } حسب بیان مولف اردوے قدیم
(۷) " " " ۱۳۳۵ھ " " } مطبع شوکت الاسلام بنگلور۔
(۸) " " " ۱۳۲۹ھ " " } کتب خانہ مہاراجہ سرکشن بہادر شاد
(۹) " " ـــــ مطبوعہ بمبئی۔ کتب خانہ باز خاں۔ حیدر آباد
(۱۰) " معہ ترجمہ مطبوعہ حیدر آباد (عزیز دکن) از مولوی محمد معصوم علی خاں مدرس شاہ پور۔ طبع اول $\frac{۱۳۲۸}{۱۳۲۹}$ھ۔ حسب ایماء امام الدین ساہو و لا محمد میران ساکن گوگی شریف باہتمام محمد عبد العزیز پٹیل۔

یوں تو قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے ساتھ فرہنگ بھی شریک ہے مگر خاص طور پر اس فرہنگ کے علیحدہ نسخے بھی ہیں۔

فرہنگ من لگن:-

الموسوم بہ ارت من لگن مرتبہ سید شاہ اسمٰعیل بن سید شاہ احمد القادری الملتانی بن سید محمد بن سید نور الحسن الباقری الورنگلی۔ بایماء نواب شہامت جنگ بہادر۔

فرہنگ من لگن کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ کے ۲۸۹ پر موجود ہے۔ مکتوبہ ۱۳۰۰ھ۔ کاتب کا نام نہیں مگر خود کو عبد اللطیف قبلہ کا مرید و شاگرد لکھا ہے۔

یہ کون سی فرہنگ ہے تحقیق طلب۔

شروح من لگن:-

من لگن کی حسب ذیل شرحوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) شرح من لگن ـــ معہ من لگن مطبوعہ مطبع محمدی مدراس۔ حاشیہ پر مولوی شاہ

عبدالغفار[۵۱] مسکینؒ خلیفہ قطب ویلوری نے لکھی ہے اور ان کا بیان ہو کہ میں نے اس نسخہ کو موفونگ ۱۲۳۲ھ میں مرتب کیا، جو ۱۳۵۳ھ میں طبع ہوئی یہ ایک اچھی شرح ہے۔ اور نسخہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے۔ مگر اس میں بعض جدید الفاظ آگئے ہیں، جس کی مطابقت ۱۱۲۷ھ کے قلمی نسخہ آصفیہ سے نہیں ہوتی۔ مولوی عبدالسلام صاحب نظامی مرحوم المعروف بہ عینی شاہؒ خلیفہ شاہ مسکین نے حیات المسکین[۵۲] میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ مسکین شاہؒ نے افتخار علی شاہ وطن حیدر آباد کے نسخہ من لگن کو سامنے رکھ کر مرتب کیا تھا۔

(۲) شرح من لگن، مرتبۂ مولوی غلام جعفر صاحب مرحوم مشہور ستار نواز حیدر آباد ساکن ڈیوڑھی نواب عالم خاں بہادر جس کو حسب روایت مولوی محمد عمر یافعی صاحب، حیدر آباد کے مشہور شاعر میر بہبود علی صفی اورنگ آبادی نے خوشخط نقل کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ علامہ مرزا قاسم علی بیگ اخگر حیدر آبادی کے پاس بھی تھا مگر اب ناپید ہے۔

(۳) شرح من لگن۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ۱۲۶۸ء۔ سب سے بہترین شرح مروجہ اردو میں ہے۔ شارح کا نام نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دقت ہوئی۔ بدقت تمام شرح کے بعض حوالوں سے بہ تلاش بسیار پتہ چلا کہ یہ شرح مدراس کے ایک مشہور عالم و صوفی مولانا شاہ حسین محرم نیلوری نے لکھی۔ جو آرکاٹ کے مشہور عالم صوفی مولانا شاہ حسین محرم نیلوری وفات ——— (۱۲۵۰ھ) کے پوتے اور نواب غلام غوث خاں اعظم کے مجلس مشاعرہ کے ایک رکن عظیم تھے۔ شارح من لگن مولوی عبدالرحمٰن شاطر مدراسی کے پیر طریقت تھے۔ جنھوں نے "اعجاز عشق" مصنفۂ شاطر پر اپنی رائے ظاہر کی تھی اور ۱۹۰۷ء میں ترپاتور مدراس میں مقیم تھے۔ اور شاطر نے لکھا ہے کہ آپ نے شرح من لگن لکھی تھی اور کتاب کی داخلی شہادتوں سے تصدیق ہوتی ہو کہ یہ شرح شاہ صاحب ہی کی ہے۔ کتابت ۱۳۲۷ھ۔ شاید یہ مصنف ہی کا اصل قلمی مسودہ ہو اس لئے نایاب معلوم ہوتا ہے۔

بنگاب نامہ بحریؒ

(۱) بنگاب نامہ کا ایک نسخہ ڈاکٹر حفیظ سید صاحب کو مولوی یوسف خطیب شولاپور کے مجموعہ من لگن میں دستیاب ہوا تھا، جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یہ واحد نسخہ ہے مگر مسٹر

---

[۵۱] سید شاہ محی الدین عبدالغفار حسینی ۱۱۵۱ھ ۱۲۲۲ھ، تخلص مسکین تلمیذ فیض حیدر آبادی از اولاد سید ناصرالدین راجو حسینی ابن شاہ عالم بخاری گجراتی، مرید و خلیفہ سید غلام محی الدین ویلوری (۱۲۸۹ھ) وفات ۱۳۲۶ھ مدفن پائین شیخ عبدالحق مخدوم ساویؒ میلاپور (مدراس)۔ تصانیف عیون المظاہر مطبوعہ۔ کعبہ مرغوب مسلم معہ شرح من لگن حاشیہ بر معہ متن مطبوعہ، دیوان مسکین۔ معاصر شاہ افتخار علی وطن۔ آغا داؤد۔ سید محمد بخاری حیدر آبادی ساکن درگاہ اجالے شاہ آپ کے خلفاء سید برہان الدین کڑپوی۔ خواجہ رحیم اللہ سکندر آبادی اور عینی شاہ نظامی تھے۔

[۵۲] حیات المسکین مطبوعہ حیدر آباد۔

گراہام بیلی نے اپنی تالیف ہسٹری آف اُردو لٹریچر ۱۹۳۲ء۔ (۲) میں بنگاب نامہ کے ایک نسخہ کا حوالہ دیا ہے پر کس کتب خانہ میں ہے۔ کوئی حوالہ موجود نہیں ہے، تعجب ہے کہ ڈاکٹر بیلی کی کتاب میں حوالے ہی مفقود ہیں، جس کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ نے بھی سخت ریمارک کیا تھا۔

(۳) بنگاب نامہ کا تیسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کے ۲۶۰ پر موجود ہے جو من لگن کے ایک ناقص نسخے کے حاشیہ پر لکھا ہوا ہے۔

ترقیمہ۔ تمت تمام گردید بنگاب نامہ حضرت محمود بحری واقف اسرار خفی و جلی دوازدہ جام بخط ناتمام سید روح اللہ پادشاہ قادری الجیلی بتاریخ بست دہم شہر جمادی الاول ۱۲۵۴ھ۔

(۴) بنگاب نامہ، (کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد) ۱۵ صفحہ مکتوبہ ۱۲۷۹ھ۔

(۵) بنگاب نامہ (ناقص) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (مجموعہ من لگن و دیگر مثنویات فارسی مصنفۂ بحری) (مکتوبہ ۱۱۲۱ھ)۔ کاتب غلام احمد ولد غلام محمد حسین ۲۱ سنہ ہجری (غالباً ۱۱۲۱ھ سروری) ۔ جو اب کتب خانہ مذکور میں موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر حفیظ سید نے بنگاب نامہ کے ابواب کی تفصیل[1] نہیں دی ہے۔ بنگاب نامہ کے بارہ جام (ابواب) کا خلاصہ درج کیا ہے مگر کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ میں ہر باب کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

(۱)	جام	اول	دربیان	ظہور ذات و صفات
(۲)	"	دوم	"	وحدت و کثرت
(۳)	"	سوم	"	کشف الٰہی موقوف بر فضل الٰہی
(۴)	"	چہارم	"	نزول و عروج
(۵)	"	پنجم	"	غیب ہویت
(۶)	"	ششم	"	عینیت و غیریت
(۷)	"	ہفتم	"	ہر شئے مظہر اتم
(۸)	"	ہشتم	"	در سلوک
(۹)	"	نہم	"	در صورت مرشد کامل
(۱۰)	"	دہم	"	قال صحیح یافتم از مرشد درویش
(۱۱)	"	یازدہم	"	تعریف ذرات ہوا
(۱۲)	"	دوازدہم	"	تعریف مرشد

---

[1] ملاحظہ ہو کلیات بحری مطبوعہ۔

خاتمہ:۔

شیخ محمد جو او باقر ہیں خاص　　ملک معانی کے مسافر ہیں خاص
ہوش سوں بیگانگی مدہوش اچھہ　　ختم کر اس بات کوں خاموش اچھہ

فاضل پروفیسر حفیظ صاحب نے اور نہ مسٹر بیلی نے بنگاب نامہ کے اشعار کی تعداد درج کی ہے مگر اس نسخہ کے اشعار کی تعداد (۱۴۴) ہے۔

لفظ بنگ کی وجہ تسمیہ پروفیسر حفیظ صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ بحری، شیو بھگتیوں سے ربط وضبط کی وجہ سے جو بھنگ پینے کے عادی اور اس کو مقدس سمجھتے ہیں لفظ بھنگ استعمال کیا ہے۔ "حافظ شیرازی رح کی شراب کا نعواہ کچھ بھی مطلب ہو، لیکن بحری کی بنگ روحانیت سے خالی نہیں، تو کیا حافظ کی شراب کچھ اور تھی؟ جو بقول حافظ "گل آدم بسرشتند و پیمانہ زدند" یہ شراب عشق کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ شراب سے کنایہ خاص کیفیت و مستی کی طرف ہے۔ نہ کہ اوس کی خباثت، جس طرح شراب حرام ہے۔ اُسی طرح تمام نشی اشیاء۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ صوفیاء نے، اس کو علماء ظاہری اور علماء باطنی یعنی صوفیاء کرام کے باہمی عقاید میں تضاد اور جنگ کی وجہ سے، اور علماء ظاہر کو مشتعل کرنے کے لئے علانیہ شراب اور بنگ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، تیسری یہ کہ ممکن ہے کہ شیوجی کے بھگتیوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا ہو۔ روایت یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بحری کو بدنام کر دیا تھا کہ وہ بھنگ پیتے ہیں، اور عالمگیر کے کانوں تک یہ بات پہنچی، اور جب عالمگیر ملنے آیا تو اس کی کوئی تصدیق نہ ہو سکی۔

دیوان بحری:۔

ڈاکٹر حفیظ سید صاحب کو ایک قلمی نسخہ من لگن و بنگاب نامہ کے ساتھ مولوی سید یوسف علی صاحب خطیب جامع مسجد سے بھولاپور میں ملا تھا۔ خطیب صاحب مولوی شاہ مسعود بحری سجادہ درگاہ بحری رح ساکن حیدر آباد کے خسر ہوتے ہیں، جن کے ذریعہ ہم نے خطیب صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نسخہ اب اُن کے پاس نہیں ہے۔ شاید یہی وہ نسخہ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کے پاس ہو۔ ڈاکٹر حفیظ صاحب کا بیان ہے کہ غزلیات وغیرہ کے اعتبار سے گویا یہ مجموعہ ایک واحد نسخہ ہے۔ اس پر سنہ کتابت درج نہیں۔ بحری کے دیوان میں کل ایک سو تیرہ غزلیں ہیں۔ جن کے منجملہ ایک سو دس غزلیں کلیات میں طبع ہوئی ہیں، اس کے سوا ۵ مرثیے۔ ۲ مختصر نظمیں ا قصیدہ۔ ۴ مختصر مثنویاں، ایک مربع۔ ۵ قطعات، منقبت شاہ چند ا رح۔ مخمس کے دو بند،

وغیرہ ہیں۔ تین غزلیں شائع نہیں ہوئیں۔ اور مندرجہ مرثیے وغیرہ آیا اسی دیوان سے متعلق ہیں یا کیا۔ کچھ ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گراہام بیلی نے اپنے تذکرۂ تاریخ ادب اُردو (انگریزی) میں جو کلیات بحری مولفۂ ڈاکٹر حفیظ سید صاحب مطبوعہ ۱۹۳۹ء سے ۷ سال قبل طبع و شائع ہو چکی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ HE LEFT ALSO. FOURTEEN. LOVE POEMS, FOUR ELEGIES, TOW ODES, AND AMYSTICAL ODE CALLED BANGABNAMA.

یعنی من لگن کے علاوہ بحری کی چودہ غزلیں، چار مرثیے، دو قصاید، اور ایک بنگاب نامہ بھی ہے۔ مگر افسوس ہے مسٹر بیلی نے اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ غزلیات وغیرہ کس کتب خانہ میں محفوظ ہیں اور کون سی ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ سید نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ مختصر کلام لندن ہی کے کسی کتب خانہ میں ہوگا۔

بحری کی بعض غزلیں، قصیدے۔ اور متفرق اشعار، قلمی نسخہ جات من لگن کے آخری اوراق میں کاتبوں نے نقل کر دئے ہیں، مثلاً نسخہ من لگن قلمی مکتوبہ ۱۱۲۷ھ میں۔ جا بجا نقل ہیں۔ جو لایق التفات نہیں۔

بحری نے کبت اور دوہرے بھی کہے ہیں، عروس عرفان میں ایک دوہرہ ہے جو غالباً انھیں کا ہے

کر سنگار پیا تین چلے دیو نہ کاجر نین
آنکہ موچ پیا سین ملے کارن کون حسین　　(نزیور ۱۲۶ عروس)

عروس عرفان:۔

عروس عرفان کے متعلق مولوی عبدالقادر سرفراز مرحوم۔ حکیم شمس اللہ القادری، ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ یہ من لگن کا ترجمہ ہے۔ اور ڈاکٹر حفیظ سید نے اس کو من لگن کے خاص خاص حصوں کا ترجمہ بیان کیا ہے۔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے تو اس کو منظوم ترجمہ اور اس کا سنہ تصنیف ۱۱۱۵ھ بیان کیا ہے جو صحیح نہیں (دیکھو اردو مثنوی کا ارتقا از سروری ص۸۳) اور خود مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے اس کو بعض دوستوں کے اصرار سے فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ من لگن کا لغوی اور لفظی باب واری ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ من لگن کے جملہ ابواب کے مضامین کو معہ مزید حوالہ جات و تشریحات و تلمیحات۔ بحری نے منتقل کر دیا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کی شرح من لگن ہے عروس عرفان کا سب سے قدیم نسخہ ہمارے علم کی حد تک کتب خانہ آصفیہ کا ہے جس کا سنہ ۱۱۱۵ھ ہے۔ عروس عرفان کا سنہ تصنیف حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے ۱۱۱۶ھ لکھا ہے۔ جس کی تتبع میں ڈاکٹر زور قادری و مولوی نصیر الدین ہاشمی، حتی کہ ڈاکٹر حفیظ سید نے وہی ۱۱۱۶ھ بیان کیا ہے

اور پروفیسر عبدالقادر سرفراز مرحوم اور مسٹر اداںونے اس کا سنہ ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵ء لکھا ہے۔ چنانچہ اس کے تاریخی مادہ "کامیاب عروس عرفان شو" سے بھی ۱۱۱۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ دراصل اس کی ابتدا ۱۱۱۱ھ میں اور اختتام ۱۱۱۷ھ میں ہوا ہے۔ چنانچہ عروس عرفان میں سنہ آغاز کا اس طرح ذکر موجود ہے "سنہ یک ہزار و یک صد و شانزدہ ہجری"

عروس عرفان کے دو ناقص نسخے کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ میں محفوظ ہیں جو علی الترتیب بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے مکتوبہ ہیں۔ اور بحری کے مختصر حالات میں لکھے ہیں مگر بحری کی ولدیت اور لقب غلط لکھا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

IT WAS COMPOSED IN 1117/1705 (CHRONOGRAM (کامیاب عروس عرفان شو) BY MAHMUD B. BAQUIR MUHAMMED. PISHAQI QADIRI...—

بحری کے والد کا نام دراصل بحرالدین تھا۔ مسٹر اداںو کو غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے مصنف کا نام و ولدیت اور لقب بحری کے ایک تاریخی مادّہ سے اخذ کیا ہے۔

"محمود بحری بندۂ باقر محمد بے شکے"

ان میں منجملہ دو سو زیورات یعنی "ملفوظات" ۱۱۱۶ھ کے صرف دس ہی زیور ہیں۔ مگر دو سو زیورات کا تصور بھی غالباً غلط ہے۔ شاید بحری کی مراد اس سے دو سو نکات ہوں۔ جو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں اُن میں ۱۰۷ زیورات سے زاید نہیں ملے۔ اور یورپ میں تو اس کا کوئی نسخہ نہیں۔ فرانس کے مستشرق لوی ماسوفان نے بھی کلکتہ کے ناقص نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

اس کا بہترین یا صرہ نواز نسخہ سجادہ صاحب گوگی کے پاس تھا۔ جو مولوی سید علی اصغر بلگرامی اور مولوی تمکین کاظمی صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اس کے اور مکمل نسخے حسب ذیل کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

(۱) نسخہ عروس عرفان قلمی ۲۵۹ اوراق ۱۶۲۔ مکتوبہ ۱۱۵۳ھ (کتب خانہ آصفیہ)

(۲) عروس عرفان:- صفحات ۲۰۳۔ مسطر ۱۷۔ کتابت ۵ ذی الحجہ ۱۲۲۲ھ کاتب ابراہیم صاحب قادری مقام شاہ پور تکیہ گلزار شاہ۔

(۳) عروس عرفان ۲۰۷، کتابت ۱۲۳۵ھ۔ کاتب غلام حسین ساکن قصبہ ڈنڈوتی در نوکری شاہ ید اللہ حسینیؒ سجادہ نشین۔ این نقل خاص از کتاب محمود بحری قدس سرہٗ کہ مصنف اند، (کتب خانہ آصفیہ)

(۴) نسخہ عروس عرفان ۴۹۸ فن تصوف فارسی قلمی (آصفیہ)۔ صفحات ۴۷۶-۴۳ سطر ۱۱-۱۳ بخط معمولی نستعلیق۔

این نقل خاص از کتاب محمود بحریؒ کہ مصنف اند مقابل شد، ۱۲۹۰ھ

(۵) کتب خانہ ادبیات اردو حیدرآباد۔ عروس عرفان ۱/۳۶۱ کاتب حافظ محمد حسین ساکن حیدرآباد سنہ کتابت نہم رجب ۱۲۸۳ھ مگر سنہ تصنیف ۱۱۱۶ھ غلط لکھا ہے۔ جو بقول ڈاکٹر زور صاحب اتنا متبرک اور صحیح سمجھا جاتا رہا کہ اس کی نقل نواب اقبال یار جنگ کے پاس یکم ذیحجہ کو ۱۳۱۸ھ میں پیش کی۔

(۶) نسخہ عروس عرفان ۱۵۷/۲ کاغذ و سائز تقریباً فلسکیپ۔ سنہ اور نام کاتب مٹا دیا گیا البتہ مقام کتابت قصبہ ونکٹ گیری (علاقہ مدراس)

کتب خانہ جامعہ بمبئی ۱/۱۸ عروس عرفان (۲۰۰ نریور)۔ تاریخ کتابت ندارد۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یورپ میں اس کے نسخے نایاب ہیں۔ "APPEARS TO BE RARE IN EUROPE"

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ۔ نسخہ عروس عرفان ۲۹۷۶/۱ ۔ بخط نسخ معمولی۔ اوراق ۱۷۳۔ سطر ۱۳۔ کاغذ انگریزی ساخت مگر سنہ تصنیف مرتب فہرست نے ۱۱۱۶ھ لکھی ہے؛ سنہ کتابت ندارد۔ یہ جامعہ عثمانیہ کا خاص نسخہ ہے جس کی ترتیب بھی خاص ہے جو کسی اور نسخہ میں نہیں وہ یہ کہ عروس عرفان کی نثر کے ساتھ ساتھ من لگن کے اشعار بھی جگہ جگہ نقل کیے ہیں۔

نیز اس کے نسخے از مولوی محمد عمر یافعی صاحب و علامہ مرزا قاسم علی بیگ اخگر حیدرآبادی وغیرہ کے کتب خانوں میں بھی ہیں۔

بحری کی ایک خاص تصنیف دستور العمل فارسی بھی ہے جس کے دو نسخے کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں اور ایک نسخہ انڈیا آفس کی فہرست مرتبہ ایچ ایتھے جلد اول مطبوعہ ۱۹۰۳ء ہے ابتداء حق مطلق عز اسمہ کہ مہمات کلیات و جزویات عالم معقول و محسوس بہ قبضۂ ارادت ۱/۲ اوراق ۳۲/۳۹ ، نستعلیق، تقطیع ۳/۴ ۴ × ۹ - کتابت ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۱-۴۲ء (نسخہ فورٹ ولیم کالج۔ ۱۸۲۵ء ۲۲۸۵) نام اور موضوع کے متعلق لکھا ہے :-

DASTUR-AL-AMAL- دستور العمل

A SHORT SUFIC TRACT BY MAHMUD BAHRI-(SEE FOLIO

سلہ کتب خانہ مولوی محمد اشرف صاحب انجینیر حیدرآباد (دکن)

33a, 1, 2.) GATHERED. FROM THE LIPS OF RENOWONED SHAIKS AND NOTED DOWN FOR THE BENEFIT OF HIS FRIENDS AND CO-TRAVELLERS. ON THE MYSTIC ROAD"

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ دستور العمل میں بحری نے اپنے معاصر، صوفیاء کرام کے مقولے جو انھوں نے سنے تھے، اپنے برادران راہِ طریقت کے استفادہ کے لئے اس میں جمع کئے ہیں۔ اور مسٹر ایتھے نے زمانۂ حال کے تذکرہ نویسوں سے بہت قبل ۱۹۰۳ء میں من لگن اور عروس عرفان سے پہلے بحری کی دستور العمل سے روشناس کرایا ہے۔

کلیات فارسی بحری :-

فارسی زبان میں آپ کا بہت سا مجموعہ کلام تھا جو سفر حیدرآباد میں تلف ہو گیا۔ خاتمہ عروس عرفان میں بحری نے اشارہ کیا ہے کہ آپ نے فارسی دکھنی زبان میں "مثنویات و غزلیات و رباعیات و قصاید وغیرہ خاصہ در معارف، بہنگامۂ ہنگام گرم جوانی..... کم و بیش پنجاہ(۵۰) ہزار بیت" الخ جس کے اس وقت دو چار جز و بھی محفوظ نہیں۔ نسخۂ من لگن جامعۂ عثمانیہ کے ساتھ جو کچھ تبرک موجود تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ البتہ عروس عرفان میں آپ کی بعض غزلیں قصاید، رباعیات اور قطعات، فرد، محفوظ ہیں۔ ہم نے سرسری طور پر ایک یادداشت مرتب کی تھی جس کی تفصیل یہ ہے:-

مثنوی در حمد ۷۰ بیت، دستور العمل ۴۶ بیت، مختصر مثنوی ۱۹ بیت، غزلیات ۱۲ قطعات تقریباً ۳۹، رباعیات ۳، قصیدہ ۱، نثر بے نقط ۱۰ سطر،

اور انوار جلالیہ مطبوعہ میں:-

نسل نامہ چندا شاہؒ منظوم ۵۳ بیت معہ حالات حضرت چندا شاہ ۴۶ بیت منظوم۔ نوددنہ نام حضرت چندا شاہؒ ڈیڑھ صفحہ (مقفع و مسجع)

مختصر فارسی مثنویات جو نسخہ من لگن جامعہ عثمانیہ میں شامل تھیں یہ ہیں جن کا ذکر پروفیسر عبدالقادر سروری کی مرتبہ فہرست میں موجود ہے:-

(۱) فارسی مثنوی، تقریباً ۶ صفحہ: واقعہ جانکاہ سید محمد وارث سرمست جنھوں نے قلعہ سگر سے گر کر جان دی۔

(نوٹ) اس کو بحری نے دکھنی زبان میں بھی منظوم کیا ہے (کلیات بحری)

(۲) مثنوی نسبت افلاس۔ بنام سلطان سکندر عادل شاہ بیجاپور ۱۲ صفحہ۔

(۳) نسل نامہ حاجی نبی آدم حضرت شاہ جند اور شاہ نور عالم رح طویل فارسی نظم (جس کا ذکر ہم نے سطور بالا میں کیا ہے۔ انوار جلالیہ مطبوعہ میں موجود ہے۔

(۴) نسل نامہ صوفی سرمست قدس سرہٗ۔ تقریباً دو صفحہ۔

(۵) فارسی مثنوی بعنوان، این نامہ بطریق مثنوی در جواب نرنجن داس۔

اس مثنوی میں بحریؒ نے امارت پناہ مغی خان ؟ کی شکایت کی ہے کہ وہ درویشوں کی قدر کرتا ہے مگر میری نہیں کرتا، اس لئے مجھے سخت تکلیف ہے۔

(۶) فارسی مثنوی۔ تقریباً ۶ صفحہ۔ در شکایت ملک سگر و قحط سالی، و گنبد عادل شاہ کلاں و مسجد جامع وغیرہ ـــــ یہ سفر بیجاپور کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

(۷) فارسی نظمیں اور غزلیں۔ ۱۵—۱۶ ورق۔

(۸) متفرق فارسی تحریرات، ایک بے نقط فارسی خط بنام ملا داؤد۔ مکتوب مسہود رائے در تعزیت والدۂ رائے بوجہ وفات از اسقاط حمل۔

(۹) فارسی نظم و نثر میں ایک رسالہ بعنوان، مبارکح المصنوعات، برگ تمباکو و گند راج۔

(۱۰) روح نامیہ کے خواص میں۔

(۱۱) قصیدہ فارسی در نصایح۔ خدا کرے کہ یہ مجموعہ دستیاب ہو جائے جو غالباً کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ذخیرہ کتب میں مخلوط ہو گیا ہے۔

از انشاء چمنستان سخن مولفۂ عطارد رقم خان :۔

طویل مکتوب بحری بعنوان "ہدایت نویسی رقعہ مقبول باری شیخ محمود بحریؒ" (کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے)

نمونۂ کلام فارسی قاضی بحریؒ :۔

غزل در عقل کل :۔ این غزل در باب عقل کل وقتے از خاطر فاتر این دیوانہ دل مرادست دادہ سر بر شدہ ناچار نوشتہ شدہ اما عاقل قبول نخواہد کرد مگر مجنون ؎

از گلستان معانی عقل کل اول کل است — عقل کل حسن گل آمد بلکہ عشق بلبل است

گر عقول جملہ عالم جمع شد آن عقل کل — در ہزاران ؟ گر وید آن یک کا کل است

عقل کل تخم است مرکشت جہان را بیگماں — عقل کل را قدرت و حکمت ہمہ در چنگل است

بود مخفی گنج چون بینا و عقل کل چون مے — جوش زد بر وقت خود وان حرف کن چون قلقل است

عقل چون شمع است لامع گشتہ در ایوان روح — عقل کل شیر خدا او دل دریا چون دلدل است

گشت الحق از بہائے عقل کل این کارگاہ
جل بے اشہب بود لے اشہب از بہر جل است
زبدۂ خاص صفات ذاتی آمد عقل کل
این ہمہ ہمچوں صراحی ہا و عقل کل مل است
عقل کل نور احد یا نور احمد بحریا
نے بیابان و نہ باغ و نے گل و نے بلبل است

غزل در دانش و بینش ؎

تا یقین در جان نگردد جلوہ گر جانش مخوان
تا گمان دمساز عرفان است عرفانش مخوان
نیست عرفان تا نباشد پائے بر جائے عزیز
تا نگردد مطمئن بر تخت سلطانش مخوان
با لیقیں گر طفت باشد گرددش ماہ تمام
بے یقین صحنک بود خورشید تابانش مخوان
آنکہ باشد چون کمان مردود اند مصر یقین
در حقیقت گرگ باشد ماہ کنعانش مخوان
ہر کہ از راہ یقین برگشتہ باشد بحریا
با لیقیں کافر بود ہرگز مسلمانش مخوان

غزل:-

گشت ظاہر ذات او در من، صفاتش در ہمہ
زر، اگر گردد ہمہ، معذور، نے زرگر ہمہ
چون دلم را دیدیہے است دانائے دو کون
خود نہ یک نیشست بروے بلکہ با لشکر ہمہ
صورت احمد معنی حق را کہ آن علمے است پاک
اے عزیز انسان کامل این، نہ کور و کر ہمہ
روح ماپے مصلحت با روح قدسی شد بدل
ز انکہ ہست آن شاہد زیبا، و این زیور ہمہ
آبم از من جملہ سر بر کرد یکسر ہمچو خاک
آتشم از من بر آمد ہمچو خاکستر ہمہ
تائے وحدت را نوا سازم چسان دم در کشم
گر بگر دانم بتد بیر؟ نائے گلو خنجر ہمہ
حاصل از حرف جہان خواہی کہ گردد روشنت
بحریا از کلک یکتائی رقم زن بر ہمہ

؎ چہ بدن چہ دل چہ جان چہ جان جان چہ ما وارش
بحری این جملہ نثار یار جانی می کند،

قطعات:-

ذات این آدمی ست مظہر ذات
آدمی جامع جمیع صفات
بتمام جہان چہ خلق و چہ امر
کس چو او نیست عالی الدرجات
آدمی قدر آدمی داند
ورنہ این دل کجا بہ حیوانات
کہ نویسد درین جہان امروز
بحریا جز تو ہمچو نغز نکات

قطعہ، حال و قال۔

قال را دانند مردم بہ زقال
لاکنم در دل چنیں سرزد خیال
حال بس مفت است نزد عارفان
قال را صد مایہ باشد اے جوان

نبوت و ولایت ؎

جہاں چو منقل پر آتش و ولایت، باد | چو باد رفت چسان ماند آتش اے استاد

رویت محمدؐ صلعم ؎

حق چو گل احمد شکر، بر بود گل شکر | گل شکرت کافی است آن دو درین یک بنتر
ہر چہ بود در جہاں آں ہمہ در پردہ دان | گر تو نباشی چنین، باش بکار دگر

عشق مجازی۔ رباعی ؎

این درد بجز عشق مجازی نبود | سرباز برین نرد کہ بازی نبود
ہر دل کہ ازیں درد بود روگردان | در مشرب عشاق نمازی نبود

راگ اور شیرینی دونوں ایک ہیں" ہر کرا این سرود گریبان گیر جان نہ شود نہ انسان است بلکہ حیوان بل مشتے بے مغز استخوان"

رباعی ؎

عمریست کہ بدکارم و بد کردارم | یعنی ؟ و مطرب ہوش یارم
خواہم کہ ازیں ہر دو نشینم یکسو | اما چہ کنم خانہ بگوگی دارم

بقول حافظ رح؟۔

مے دو سالہ و محبوب چار دو سالہ | ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

موت کی حقیقت :۔

موت محض کرم حق است الحق | در حقیقت زحیات ابدی شد مطلق

تنزیہ التنزیہ ؎

حال سیمرغ چسان است بگوائے بحری
او بکہ قاف و تو در کوہ سگرمی جوئی

من لگن بحری کی تتبع :-

(۱) "من موہن آزاد"

جس طرح فارسی شعراء نے سکندر نامہ نظامی گنجوریؒ، یوسف زلیخا جامی، و سبحۃ الاحرار جامی وغیرہ کی تتبع میں مثنویاں کہی ہیں، اسی طرح اردو شعراء نے بہت کچھ سعی کی ہے۔ چنانچہ مثنوی سحرالبیان مصنفۂ میرحسن کے جواب میں، دیا شنکر نسیم، سعادت یار خاں رنگین وغیرہ بہت سے شعراء نے زور مارے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا جواب نہ لکھ سکے،

بحری کی مثنوی من لگن کی تتبع میں بعض دکھنی شعراء نے مثنویاں کہی ہیں، اور اسی کی بحر استعمال کی ہے۔ اب تک کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے ہم یہاں مختصراً ذکر کرتے ہیں۔ من لگن کے جواب میں ایک مثنوی من موہن، مصنفۂ آزاد ہے۔ اور یہ آزاد فقیر اللہ آزاد نہیں جن کا ذکر تذکرۂ میرحسن میں بھی ہے۔ ان کا نام عین الحق یا عارف الحق آزاد بیان کیا جاتا ہے، جن کا سلسلہ فقیری، حیدرآباد کے ایک مشہور بزرگ حضرت[۵۱] شاہ جلال اللہ المشہور بہ پاؤ بلدارؒ کے صاحبزادے شاہ روشن دلؒ سے ملتا ہے۔ مگر خود آزاد اپنی مثنوی 'من موہن' میں لکھتے ہیں کہ میرے پیر و مرشد پنجاب سے حیدرآباد آئے تھے، علوم ظاہری میں بڑے کامل تھے، نمود و نمائش نام کو نہ تھی، گوشہ نشینی کو زیادہ پسند کرتے تھے، جن کے حیدرآباد میں ہزارہا مرید تھے، حضرت روشن دلؒ کے جد اعلیٰ شاہ نعمت اللہ برہانپوری ہیں۔ ممکن ہے کہ آزاد کو اس سلسلے سے بھی فیض حاصل ہوا ہو۔

آزاد کی ایک دکھنی نثر الموسوم بہ "پچپن مسایل" تصوف میں ہے جو ۱۲۵۱ھ کی تصنیف ہے یہ بزرگ آخر تیرھویں صدی ہجری تک زندہ تھے، روایت ہے کہ ان کا وطن رائے ویلور مدراس تھا۔ ان کی اولاد حیدرآباد میں موجود ہے۔ آزاد نے بحری کا ذکر کیا ہے اور اپنے عجز کا اعتراف بھی۔ اس مثنوی[۵۲] کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے

الحمد کو منھ سے کھولتا ہے	تعریف تری تو بولتا ہے
....	....
بحری جو ہے فقیر یکتا	کوئی اس کے نہ معرفت کے ہمتا
ہر بول میں جس کے معرفت ہے	عرفان کے سوا بھی اور گت ہے
یک روز یہ خاکسار آزاد	پایا سبھی من لگن سے ارشاد
جب اس کے کلام بیچ گھوما	آنکھوں کو لگایا اور چوما

۵۱ تزک محبوبیہ مولفہ غلام صمدانی گوہر حیدرآبادی مطبوعہ ۵۲ مثنوی من موہن قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد

پر مجکو کہاں دماغ ایسا		بحری کے جو یعنی من لگن سا
بولوں تو زیادہ اور گلہ ہے		ناقص یہ جو میرا حوصلہ ہے
بحری کا سخن تو من لگن ہے		مجہ من کا رسالہ "من موہن" ہے
اور نام بھی یہ ہمارے بھیا		یہ من ہنون کو من بسیا

(۲) مثنوی "من لگن" :-

دوسری مثنوی "من لگن" مصنفہ مولانا شاہ صدر الدینؒ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ترپاتور مدراس کے رہنے والے تھے۔ مولوی ابوالحسن مولف غازی اعظم نے لکھا ہے کہ "من لگن" شاہ صدر الدین نلونگلی (علاقہ میسور) کی تصنیف ہے۔ شاہ صدر الدینؒ کی دکھنی زبان میں بہت سی مثنویاں ہیں، ایک تو "من درپن" رموز الکاسبین، کسب عروج، کسب نزول، مصباح النور، رسالہ کیمیا گری، وغیرہ کسی اور موقعہ پر ان کے متعلق بحث کی جائے گی، ڈاکٹر زور قادری کی تحقیق میں شاہ صاحب مذکور سے مراد حضرت خواجۂ بندہ نوازؒ ہیں مگر ہماری رائے میں دراصل یہ بزرگ حضرت بحریؒ کے معاصر تھے، اور نواب دلاور خاں نصرت فوجدار قلعدار رائچور کے مرشد تھے؟

من لگن کا کوئی نسخہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔

(۳) من جیون از آگاہ :-

غالباً مدراس کے مشہور علامہ اور دکھنی پرگو شاعر مولانا باقر آگاہ نے بھی اپنی ضخیم مثنوی مجموعہ ہشت بہشت کی بعض مثنویوں میں من لگن کی تتبع کی ہے۔ خصوصاً 'من جیون' دو شعر اس کے یہ ہیں :-

آگاہ ؎	سن شوق سوں بھائی جان میرے		حق بخشے گناہ میرے تیرے
	جب ایہ سے اُس کے ہیں اوداسی		اس فیض سے بھی نہوں نراسی
بحری ؎	اس سوں سوں جب بھے اوداسی		جا کر بھے سو کشم کے باسی

(۴) مثنوی من ہرن آگاہ ؎

توڑنا جوڑنا ہے کین تیرا		جوڑنا توڑنا ہے کین تیرا

من لگن بحری ؎

گر یوں نہ یو جوڑ توڑ ہے رے		وحدت میں تمام کہوڑ ہے رے

جوڑ توڑ کا محاورہ بحری نے آگاہ سے سو سال قبل استعمال کیا ہے۔

آگاہ ؎ نام رکھا ہوں میں اسے "من ہرن" ہے او سب عشاق کے تئیں من لگن

(۵) جامع المظاہر:-

مصنفہ شاہ محمد عبداللہ مشتاق قادری خلیفہ علامہ شاہ سید عبداللطیف محی الدین قادری ویلوریؒ نے اپنے مرشد کی مشہور معرکتہ الآرا فارسی تصنیف جواہرالحقایق کا خلاصہ اس اُردو مثنوی میں کیا ہے۔ بحر، اور طرز من لگن کا ہے۔ جس کا اشارہ بھی کیا گیا ہے:-

مرشد پہ تصدق اپنے ہوں میں — کیا اس کی فضیلتیں کھوں میں
بندہ بندہ، خدا خدا ہے — ہے ایک کبھی، کبھی جدا ہے
تھا پیروں کا پیر، پیر میرا — شہ محی دین دستگیر میرا
ہے جس سے جواہر الحقایق — حقانی معارف الدقایق
ہر مبتدی جس سے منتہی ہو — بھی جذبۂ حق ہو سالیوں کو
یہ نسخہ ہے مہرۂ جواھر — موسوم بہ جامع المظاہر
ہندی ہے اگرچہ نظم میری — معلوم نہ ہو بقول بحری

یہ شعر بحری کا ہے:-

کیوں کلاپے کتاب پڑھت آوے — جب تک نہ بزرگ کوئی بتاوے

پس علم تصوف اصل دیں ہے — جس کے لئے فرض سفر چین ہے

اے بھائی سمجھ اگر سمجھ ہے — اس رمز کو بوجنا سہج ہے
کیا خوب ہے یہ خدائی کا ٹھاٹ — کل کون ہیں جس کے بیس پر آٹ

نہایت جامع کتاب تصوف کی اردو میں لکھی ہے۔ جو مشہور کتاب "جام جہاں نما" کی تفسیر ہے۔ جملہ ابیات تقریباً (۱۳۶۰) یہ مثنوی طبع ہو چکی ہے۔

(۶) مثنوی وحدت الوصول (اردو)

مصنفہ شاہ غلام جیلانی بادشاہ قادری المتخلص بہ تسلیم وفات ۱۳۰۸ھ (تعلقہ ضیان ٹیکمال حیدر آباد) بھی من لگن کی بحر اور طرز میں ہے۔

(۷) تجلیات دل

نواب لقمان الدولہ دل، حیدر آبادی تلمیذ داغ نے لوایح جامی کا ترجمہ اُردو میں تجلیات دل کے نام سے بحری کی من لگن کی بحر اور طرز میں کیا ہے جس کا اشارہ بھی ہے "ہے بحر میں من لگن کے وہ بھی" جو ۱۳۳۱ھ میں حیدر آباد

میں طبع ہو چکی ہے۔

اُردو شاعری میں تصوف :۔

مولوی عبدالسلام ندوی شعر الہند حصۂ دوم صفحہ ۲۰۵ پر صوفیانہ شاعری کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "بحری نے تصوف میں ایک مستقل مثنوی لکھی جس کا نام من لگن رکھا"۔۔۔۔۔ اس کے بعد صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوئی اور متعدد شعراء نے اس کو گویا اپنا موضوع سخن بنا لیا۔ مثلاً خواجہ حسن المتخلص بہ حسن، مسئلہ وحدۃ الوجود کو بہ دلالت قرآن و حدیث اردو نظم میں لائے۔ چنانچہ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"اکثر مسایل صوفیہ را کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلالت و براہین چنانکہ شیوۂ صوفیان با فضل و کمال است از روئے نص و حدیث بہ اثبات رسانیدہ در ریختہ موزون ساختہ"

ایک اور شاعر کلیم نے فصوص کا ترجمہ اردو نظم میں کیا (تذکرۂ مصحفی)۔ میر فضل علی شاہ دانا (از خاندان شاہ برہان الدین، تلمیذ مضمون نے صوفیانہ شاعری کو اپنا خاص فن بنا لیا، (تاریخ شعرائے اُردو) شیخ فرحت اللہ فرحت نے بھی قدماء کے طرز پر صوفیانہ مضامین لکھے (تذکرۂ میر حسن)۔ میر ولایت اللہ خاں نے جو کچھ لکھا تصوف توحید میں لکھا، راسخ عظیم آبادی نے ترجمہ سمتہ الابرار الموسوم بہ نور الانظار لکھی، لیکن جس زمانہ میں اردو شاعری ہوئی، خواجہ دردؔ نے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا"

ندوی صاحب نے قدیم دکھنی شعراء اور تصوف کے باب کو نظر انداز کر دیا ہے، مگر مولوی سید اعجاز حسین ایم۔اے تلمیذ مولوی ضامن علی صاحب پروفیسر شعبۂ اردو الہ آباد نے اپنی کتاب آئینہ معرفت (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں، فارسی کے صوفی شعراء ابو سعید ابوالخیر، سنائی حضرت عطار، رومی۔ عراقی۔ سعدی۔ حافظ کے ساتھ ساتھ۔ میران جی شمس العشاق شاہ برہان بیجاپوری۔ قلی قطب شہ، شاہ علی گام دھنی، محمود بحری، اور شمس الدین ولی وجدی کرنولی کے اشعار کے حوالے دیئے ہیں۔ اس سے بہت زمانہ قبل، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ نے اپنی ایک خاص تصنیف "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ غرض شعر الہند میں تو بحری کی مثنوی کو بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اور شمالی ہند کے چند صوفی شعراء کے نام گنوائے ہیں۔ آئینہ معرفت مولفۂ پروفیسر اعجاز میں بھی بہت سے اہم دکھنی صوفی شعراء کا ذکر ہے۔ جن کا ذکر یہاں بے محل

نہ ہوگا۔ بحریؒ سے پہلے شاہ سلطان ثانی گولکنڈوی کا ضخیم دیوان تصوف سے مملو ہے۔ مسئلہ "ہمہ اوست" میں فرماتے ہیں ؎

غرب میں جاوے وہی شرق میں آوے وہی
خوب سمجھ جگ میں کیوں آے دگر آفتاب

بقول اقبال ع　ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

شاہ طاہر کا نصاب جہاں قدیم اُردو میں ابو نصر فراہی کا جواب ہے اور بیسیوں صوفی شعراء مثلاً خاکی۔ شاہ صادق اورنگ آبادی، شاہ معظم بیجاپوری، شاہ فی الحال کرنولی، حسینی، شاہ علیم اللہ شاہ الااللہ شطاری وغیرہ آخر بارھویں صدی ہجری میں، اور متاخرین میں میر شمس الدین فیض حیدرآبادی میر افتخار علی وطنؒ۔ منشی امداد علی علویؒ، سجاد علی سیکشؒ کے سینکڑوں تلامذہ تھے۔ مولف "آئینہ ادب" نے صرف فیض کا تعجب ہے کہ ایک ہی شعر لکھا ہے۔ ان کے سینکڑوں بامحاورہ اشعار نزاکت صوری و معنوی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں نمونتہً چند شعر لکھتے ہیں۔

فیض ؎

موقوف غیب پر نہ شہادت پہ منحصر　　　پھرتے ہیں اپنے گھیرے میں آپ
آتا ہے کس کو روپ بدلنا حضور کا　　　سو سو تماشے کرتے ہیں اک اک ادا میں آپ
اک بینی و دو گوش نہیں معنی انسان　　　انسان جنھیں کہتے ہیں وہ لوگ جدا ہیں

وطن حیدرآبادی ؎

مظہر حسن ازل عشق ابد ہے انساں　　　کوئی پایا نہ وطن اپنی حقیقت اب تک
ہے محویت مقام، چلن اُن کا دید حق　　　رہتے ہیں دو جہاں سے پرے رہروان دل
پس گئی کس ماہ کے پیروں میں آکر چاندنی　　　آسیا کی شکل جو پھرتی ہے گھر گھر چاندنی

وطن کا یہ شعر تو ضرب المثل ہوگیا ہے ؎

معنوی ایک نہیں عارف لفظی ہیں بہت　　　قال کرتے ہیں مگر حال نہیں دم بھر کا

برہان علی شاہ مخمور تلمیذ داغ ؎

تجھ کو اے شمس جو ہے زعم کہ تاباں ہوں میں　　　دیکھیں کرلے تو بھلا جانب رخسار ابرو

بحریؒ کے متاخرین شعراء دکن میں، سید محمد شاہ میرا سے چوٹی دکڑپہ) اور خصوصاً اُن کے برادر خورد شاہ کمالؒ معاصر مصحفی، و خواجہ حسن نے تصوف میں (۸ ہزار) بیت کا دیوان اور ایک کتاب حسن السوال و حسن الجواب (اُردو قدیم) لکھی جس کے مجموعی ابیات تقریباً چھ ہزار ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے اور ادق سے ادق مسایل تصوف نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں، جس میں علم عقائد،

علم کلام، فلسفہ، تصوف، نفسیات وغیرہ کوئی علم و فن نہیں چھوڑا، اور ہزاروں نئے نئے فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں سے زبان اُردو کو مالا مال کیا۔ جن پر ہم تفصیلی مضامین رسالہ جات اردو[۵۱]، انجمن ترقی اردو ہندوستانی ادب[۵۲] حیدر آباد، نوائے ادب[۵۳] بمبئی وغیرہ میں لکھ چکے ہیں۔ شاہ کمالؒ کے دو ایک شعر سن لیجئے۔ روشنی، نور، رنگ، کے مسئلہ کو اُردو میں کس خوبی اور زور سے کہا ہے ؎

زورِ کلام ؎

ملحدان ماہیت و مبداء و نور دلوں میں — فرق نا کر سکے یک کہتے ہیں سب کو بخبر
ماہیت کو ماہیت، مبداء کو مبداء نور کو — نور جانے لون کو لون وہ جو ہے کامل بصر

نفسیات نظر و ذوق نظر ؎

حسن منظور سے کب ہووے نظر میں تاثیر — قوتِ ذوق نظر فوت نظر سے ہو اگر
لمس ؟ ہے بکلیت خود از گلشن — جز خبر و جز اثر و جز نظر و ذوق نظر

جبر و قدر ؎ جبر افراط اور قدر تفریط — مذہب معتدل تسنن ہے

شعراء معاصرین بحریؒ:۔

ڈاکٹر حفیظ سید نے، کلیات بحری میں بحری کے معاصرین شعراء کے باب میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ بحری نے بہت طویل عُمر پائی ہے۔ اور بلحاظ زبان و اسلوب بیان، ان کے معاصرین، نصرتی، غواصی، نوری۔ فایز، عشرتی، ضعیفی، ایاغی، مختار، صنعتی بیجاپوری، شاہ حسین ذوقی معظم، فراقی، ولی اورنگ آبادی۔ شاہ میر، میر، محمد علی عاجز، ولی ویلوری وغیرہ ہیں۔ فاضل پروفیسر صاحب مذکور نے سراج ۱۱۲ھ / ۱۱۱۷ کو بھی معاصرین میں شامل کیا ہے۔ مگر سراج، بحری کی وفات کے وقت تین چار سال کے تھے۔ جب بحری بیجاپور اور حیدر آباد آئے تو ان میں سے اکثر شعراء بقیدِ حیات تھے۔ مگر ان سے باہمی ربط ضبط یا ملاقات کا ان کی تصانیف میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ مگر بعض قراین ایسے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بحری کے کلام سے بعض شعراء روشناس تھے، اور بعض زمینوں میں غزلیں ملتی ہیں۔ مسٹر گراہام بیلی[۵۴] کا بیان ہے کہ خود ولی اورنگ آبادی نے ان دکھنی شعراء کی تتبع کی ہوگی جو ولی سے پہلے گزرے ہیں جن کی تعداد تقریباً سو ہے اور ان کے کلام سے ولی روشناس ہوں گے۔ ولی کی غزلوں کی زبان کو مسٹر بیلی تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، (۱) ٹھیٹ دکھنی (۲) دکھنی اردو آمیز، (۳) اُردو۔ جو بہت صحیح رائے معلوم ہوتی ہے۔ مولف جلوۂ خضر کا بھی یہی خیال ہے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

---

۵۱ رسالہ اُردو انجمن ترقی اردو دہلی بابت اپریل ۱۹۳۹ء ۵۲ ہندستانی ادب حیدر آباد جنوری، و مئی ۱۹۵۴ء۔
۵۳ نوائے ادب بمبئی اپریل و جولائی ۱۹۵۳ء ۵۴ ہسٹری آف اردو لٹریچر مولفہ گراہام بیلی مطبوعہ لندن۔

تبصرہ کلیاتِ[۵۰] بحری کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ بحری کا زمانہ ولی کے بعد کا ہے۔ پھر بھی جو روانی، صفائی، چستی، اور سلاست ولی کے ہاں ہے۔ وہ بحری کے ہاں مفقود ہے۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ بحری کا زمانہ ولی کے بعد کا نہیں۔ بلکہ وہ حقیقی معنوں میں ولی کے معاصر ہیں۔ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں اور بحری نے ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی ہے۔ ولی نے اپنے متقدمین دکھنی شعراء کی تتبع کی اور بحری نے بھی، اگرچہ مسٹر بیلی نے اور صفیر بلگرامی نے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے مگر ولی نے اپنے ایک شعر میں حسن شوقی بیجاپوری کے مقابلہ میں اس طرح تعلی کی ہے ؎

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے ڈُجے بارا
رکھ شوق میرے شعر کا شوقی حسن آوے

آیاغی بیجاپوری کا ہم مضمون شعر:۔

آیاغی ؎ پارسائی تمام گئی میری | جب تے دیکھا ہوں او جمال انکھیاں
ولی ؎ تیری انکھیاں کی مستی دیکھنے میں | گئی ہے پارسا کی پارسائی

مگر ولی کی دو غزلیں، شاہ سلطان ثانی گولکنڈوی معاصر عبداللہ قطب شاہ وفات ۱۰۸۳ھ کی زمین میں موجود ہیں بلکہ غواصی کی زمین میں بھی:۔

شاہ سلطان ثانی ؎

جو کوئی اپنے گمان میں ہے اوسے ہر جا گمان دستا | جو کوئی اپنے نشان میں ہے اوسے ہر جا نشان دستا

ولی اورنگ آبادی ؎

پو تل تجہ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا | زنخداں میں تیرے مجہ چاہ زمزم کا اثر دستا

مطلع قصیدہ غواصی ؎

دریا میں تے جو نکلے بہار اے نگار موتی | سکھ پائے دیکھ تیرا مکھ آبدار موتی

مطلع غزل ولی ؎

تجہ گوش میں کیا ہے جب سوں مکان موتی | اس روز سوں ہوا ہے صافی کی کان موتی

بحری نے بھی اپنے معاصر غواصی کی تتبع کی ہے۔ بعض غزلیں موجود ہیں۔ چنانچہ غواصی کہتا ہے ؎

غواصی ؎ اے چھبیلی آج تیری چھند ہور چھب کوں سلام
تج گلابی گال کوں ہور اس میٹھے لب کوں سلام

بحری ؎ چال کر آئی چنچل اس چال ہور چھب کوں سلام
بیٹ بٹاتے لب کوں ہور اس لب کے مطلب کوں سلام

---

[۵۰] علی گڑھ میگزین دسمبر ۱۹۳۹ء۔

غواصی کا ایک لاجواب قصیدہ عبداللہ قطب شہ کی مدح میں ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

سرجیا[۱] ازل کے دیس جیوں آہنگر آرسی		جھلکیا سورج ہو عکس ترا جا در آرسی

بحری کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

صورت چندر بدن کی بسی آرسی منے		سو دیکھ سب کہے کہ کسی آرسی منے

بحری کی زبان غواصی سے ملتی جلتی ہے۔ مثلاً کرسے۔ سسکے، چھوڑے وغیرہ:-

غواصی ؎	بڑا چنچل دو ہے نقطے نمن چپکے سنپڑے نا
	اگر چہ ندھیریں اس کی ایس پر کا رنا کرسوں

بحری ؎	مت چلا ناوک پلک منجہ سار ہر دل سخت پر
	تیر جتنا تیز اچھو اما پھتر نا پھوٹر سے

بحری جب حیدر آباد (بھاگ نگر) تشریف لائے تو سلطان ابوالحسن تانا شاہ سریر آرا تھا، اور شاید غواصی کی وفات کو چند سال گذرے ہوں گے، غرض بحری نے غواصی کی اس زمین میں بھی غزل کہی ہے:-

غواصی:-

دیدا ہوا سب تن دیکھ جل مشکل پرم کی باٹ ہے		بٹ پارواں کا جا بجا اس باٹ سے کھنڈلاٹ ہے
باٹاں ہیں سیدی باٹ سو ہے باٹ میرے لال کی		جے دل یہاں ثابت نہیں وو دل سو بارا باٹ ہے

بحری مطلع ؎

اب جاوں کاں پوچھوں کسے منج پر کیل پھاٹ ہے		یک باٹ گئے ہوں گے سجن پن جیو بارا باٹ ہے

بحری مقطع ؎	بحری بھوت سنبال توں اپنا پرانا پیرہن
	لینی گلی یو برہ کی بھو لوگ ڈاٹا ڈاٹ ہے

شاید ابوالحسن تانا شاہ نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہو، مگر بحری کا مطلع غلط طور پر تانا شاہ سے منسوب ہو گیا ہے۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

غواصی اور بحری کی یہ غزلیں ایسی مقبول ہوئیں کہ متاخرین بحری کے کلام میں بھی ایک شاعر فی الحال شاہ کرنولی وفات (۱۲۱۲ھ) کی بھی ایک غزل اسی زمین میں ہے ؎

شاہ فی الحال[۲] ؎	صاحب خبر سو باخبر دیدار سوں ہوں بانصیب
	مغرور کا دو نو جہاں میں کام بارا باٹ ہے

بحری کے ایک معاصر شاہ حسین ذوقی نے بھی لفظ "باٹ" میں معنی آفرینی اس طرح کی ہے ؎

---

[۱] دیوان غواصی قلمی (کتب خانۂ آصفیہ)، [۲] دیوان شاہ فی الحال قلمی جامعہ عثمانیہ۔

ذوقی کے شاید مخمس کا یہ ایک بند ہے ؎

حرص[۵۱] و خودی میں ہے پہلے اوسے چھانٹ جا — عشق کیل ہے کیل اس کی نکو بانٹ جا
عشق کا بنڈا ہے دولسے سیدی باٹ جا — راہ کا توشہ ہے یو دل کو نکو بانٹ جا

میر حسن لکھنوی نے اپنے تذکرہ[۵۲] میں ایک دکھنی شاعر خوشنود کے متعلق لکھا ہے ۔

"خوشنود تخلص مرد دکنی بود، احوالش معلوم نیست" اور ایک یہ شعر درج ہے ؎

خوشنود ؎ سب رین جاگی سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ ہیں درشن کو دکھلایا نہیں

بحری کے اوسی مطلع کا ہم مضمون ہے ع جاون کھاں پوچھوں کسے مجہ ہر کیل بچھراٹ ہے ۔
اور یہ خوشنود غالباً ملک خوشنود بیجاپوری مصنف مثنوی ہشت کنشت ہے ۔

ملک الشعرا نصرتی کے بھی تذکروں میں چند بیت ملتے ہیں، تذکرۂ گلشن گفتار مولفۂ حمید خاں اورنگ آبادی میں ایک غزل کے بعض بیت بحری کے کلام سے ملتے جلتے ہیں ایک نئی بات یہ ہے کہ نصرتی بیجاپور کے مشہور بزرگ اور جگت استاد میراں سید محمد مدرس[۵۳] بیجاپوری کا مرید بھی تھا ۔ اور حسب ایماء شاہ صاحب منقبت گیسو دراز (گلبرگوی) لکھا کرتا تھا ۔ غرض نصرتی کے اشعار یہ ہیں :-

جب سے چھپایا تونے تری زلف کی کڑی — تب سین تولی کی یک منی اتنی رہی پڑی
دوتا تیان کا ھار نہ تھا ناف کے اوپر — زمزم کی جیبون کوئے لگی تھی رہٹ کھڑی

بحری ؎

دھن دل میرا لیے او سرنگی تیرے ادھر — کی چپ لگیا ہے آنکھ میں ہور زلف میں اری
سوکیاں سون مل نین کی ڈھلک دھن تیرے منجے — یوں خوش لگی ہیں آج جو بالک کون بھر بھری

بحری کی غزلیں، گولکنڈہ کے شعراء کلام سے ملتی جلتی ہیں، جس کے نمونے میر حسن مغفور نے اپنے تذکرہ میں دئے ہیں مثلاً سید شجاع الدین نوری گجراتی، گولکنڈوی، معاصر بحری ؎

نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کھہ تہا — حاصل بھلا اس سے دوانے جو تھا سو تھا

شاہی (شاہ قلی خان) ؎

ملنا تمن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مجھ کہے
کس کس کا منھ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

---

[۵۱] بیاض ادبیات اردو حیدرآباد قلمی مندرجہ فہرست مطبوعہ [۵۲] تذکرۂ میر حسن مطبوعہ علی گڈھ ۔
[۵۳] ترجمۂ روضۂ اولیاء بیجاپور از روشن علی رائے چوری مطبوعہ ۔

بحری کے دیوان میں شاہ سلطان ثانی گولکنڈوی کے طرز کی بھی ایک غزل ہے مثلاً :-

شاہ سلطان ؎ مجنین کے درپن منے مکھ دیکھ کر جھک جھک جھکے
سکتی ہوں نت ات عشق سوں لائیں ٹک ٹک ٹکٹکے

بحری ؎

زلف اندھیارے میں رخ جوں بیجلی یک سو کیا یک پل میں لک لک لک لکے
باس ترے بر کی دھن کیا یک دکھن بل مدینے ہور مکے لگ کمکے

بحری اور ولی :-

بحری، ولی کے معاصر ہیں، مگر ملاقات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اور نہ کسی شعر میں اس کا ذکر ہے۔ جیساکہ ولی نے اپنے بعض معاصرین کے بعض اشعار میں گرہ لگائی ہے مثلاً فقیر اللہ آزاد، اشرف، شاہ آبرو دہلوی۔ ڈاکٹر حفیظ کا خیال ہے کہ بحری زیادہ تر ایک باکمال صوفی کی حیثیت سے مشہور رہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بحری ایک تو گوشہ نشین بزرگ تھے۔ دوسرے یہ کہ ولی کے زمانے میں سینکڑوں دکھنی شاعر بیجاپور میں موجود تھے، ولی نے بعض خاص شاعروں کا اشارہ کیا ہے۔ جن سے شاید روابط ہوں، مثلاً آزاد جو دہلی بھی ہو آئے تھے۔ البتہ ولی نے بیجاپور کے ایک مشہور خوش گو شاعر حسن شوقی وفات قبل ۱۰۷۶ھ کا اشارہ کیا ہے۔

بحریؒ ۱۰۹۸ھ سے قبل دکھنی و فارسی پچاس ہزار اشعار کہہ چکے تھے۔ جب کہ ولی کا دیوان منظر عام پر نہ آیا تھا، دہلی کی آمد و رفت کی وجہ سے ولی کی بہت شہرت ہوئی۔ نیز یہ کہ ولی نے اپنا طرز بیان اور زبان میں بھی حسب رائے سعد اللہ گلشن بدل دی،

غزل کی زبان :-

بحری کا طرز بیان قدیم اور زبان بھی وہی پرانی تھی۔ تاہم بحری کا کلام نہ صرف صوفیاء میں بلکہ عوام میں مقبول تھا۔ چنانچہ کڑپہ جیسے دور دراز مقام میں، سید محمد حسینی شاہ میرؒ رائے چوٹی (وفات ۱۱۸۶ھ) نے بحری کی غزل کا ایک شعر توکل کے بیان میں سنداً نقل کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع بھی بلحاظ زبان صاف اور بعض محاورے نہایت خوبی سے باندھے ہیں مطلع یہ ہے ؎

دکھ دل کے دھرتا ہوں سو اے مخلص جانی آرام کہانی ہے نہ یو رام کہانی
(دھراتا)

شاہ میر صاحبؒ نے جو شعر نقل کیا ہے وہ یہ ہے ؎

گر نین ہے موحد متوکل تو بی کچھ بین توحید کے ملکڑے پہ توکل سوں ہے پانی

منھ پر پانی ہونا کیا اچھا محاورہ ہے!

دوسری غزل جو بحری ؒ کی بہت مقبول ہوئی وہ یہ ہے اور غواصی کی زمین میں ہے۔ مگر بحری نے زبان ذرا بدل دی ہے۔

غواصی ؎ سہیلی تجہ پری نا کون تو کیا کون
چھبیلی چھند بھری نا کون تو کیا کون

بحری ؎

جانے دیا نہ دھن لگ اس ہٹ نہ کیں تو کیا کیں ایسے رقیب اوپر جھپٹ جھٹ نہ کیں تو کیا کیں

زبان کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ شاہ میر صاحب ؒ نے غواصی کی اسی زمین و قافیہ میں غزل کہی۔

مطلع ؎ عکس مہ سا کون مہ مہ نہ کون تو کیا کون
اللہ کے ظل کے کون اللہ اللہ نہ کون تو کیا کون

ولی نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے جس کا ایک مطلع کلیات ولی طبع سوم (کراچی، ۱۹۵۴ء) کے ضمیمہ میں موجود ہے۔ ولی ؎

دلبر ادھر کون تیرے کوثر نہ کون تو کیا کون میٹھے ترے لبان کون شکر نہ کون تو کیا کون

بلکہ اشرف تلمیذ ولی نے ایک غزل کہی۔ اشرف ؎

تو شاہ ہے سب شہوں کا بندے ترے ہیں سب شاہ میں بھی ایس کا بندہ تیرا نہ کھوں تو کیا کھوں

غریب ایک دکھنی شاعر کہتا ہے ؎

روشن تری جبیں کون چندر نہ کون تو کیا کون بانکے ترے بھوان کون خنجر نہ کھوں تو کیا کھوں

دوسرا شاعر اللہ اللہ شطاری ؒ جس نے اپنا دیوان (۱۲۳۰ھ) میں ترتیب دیا ہے۔ ان کا مطلع یہ ہے ؎

اور امر رب کو یاران گوھر نہ کون تو کیا کون گوھر کے جوہری کون جوہر نہ کون تو کیا کون

شاہ کمال ؒ برادر شاہ میر ؒ کہتے ہیں ؎

حق کے ظہور کو میں حق حق نہ کون تو کیا کون قایل کو ما و حق کے احمق نہ کون تو کیا کون

مگر بحری کے الفاظ "نہ کھیں تو کیا کھیں" ہندستانی زبان کے الفاظ ہیں جو قابل نوٹ ہیں۔

میاں ولی کی شراب پرتگالی ہے تو بحری کا سانولا ہندی محبوب پرتگالی کو بھی مات کرتا ہے سنیئے۔ ولی ؎

ولی تجہ شعر کون سنتے ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں ترے شراب پرتگالی کا

بحری ؎ نہ چھپ کا چار کر پوچھوں تمن تجہ مکھ کی لالی کون
ہوا ترکی تمن ہندی جو ماریا پر لگا لی کون

قلندری :-

ولی ؎ ہر اک سوں مل متواضع ہو سروری یو ہے
سنبھال کشتیٔ دل کون قلندری یہ ہے

بحری ؎
نہ چھوڑ شیخ کے کہنے اپر شراب کے تئیں قلندری کی نکو توڑ سٹ طناب کے تئیں

اور سنیئے، بحری اور ولی کی بعض غزلیں معلوم ہوتا ہے کہ بوجہ مقبولیت مخلوط ہوگئی ہیں۔ ضمیمۂ کلیات ولی طبع سوم میں ایک غزل ہے جو ولی سے منسوب ہے جس کے صرف چار بیت ہیں، اور یہی غزل دیوان بحری میں بھی ہے جو پانچ بیت کی ہے۔

ولی ؎	بحری ؎
۱۔ جاناں جفا کرے تو کھو کس سین بولنا نا دوستی دھرے تو کھو کس سین بولنا	۱۔ دھن وند گر کرے تو کھو کس سوں بولنا نین دوستی دھرے تو کھو کس سوں بولنا
۲۔ پیتا ہے مل شراب رقیبوں سین رات دن گر محتسب ڈرے تو کہو کس سین بولنا	۲۔ پیتا ہے مل شراب رقیباں سوں رات دن گر محتسب دھرے تو کھو کس سوں بولنا
۳۔ یک دو گھڑی جو ہم سیں ملے تو عجب نہیں سب عمر یوں بسر کرے تو کھو کس سیں بولنا	۳۔ یک دو گھڑی جو کو ب کیا کچھ عجب نہیں سب عمر یوں سری تو کہو کس سوں بولنا
۴۔ سن کیا کھا ہے بن میں ولی کو ملیوں نے کوک الفاظ سین پھرے تو کھو کس سیں بولنا	۴۔ ہے شکر سو ہزار جو چک سوں چلیا ہے نیر لہو کی لگے جھڑی تو کھو کس سوں بولنا
	۵۔ اس عشق کے دکاں میں بحری اپس کے دو کھ انصاف سوں مرے تو کھو کس سوں بولنا

اب سوال یہ ہے کہ یہ غزل دراصل ولی کی ہے یا بحری کی؟ یا ولی نے کیا بحری کے مقطع پر گرہ لگائی تھی؟ توارد تو ہو نہیں سکتا۔ مگر یہ غزل دیوان ولی کے کسی قریب ترین زمانہ کے نسخوں میں ہے۔ ولی ۱۱۱۲ھ میں دہلی گئے اور اس وقت بحری اپنی من لگن لکھ رہے تھے۔ تحقیق طلب ہے۔

ولی اور بحری کے ہم مضمون اشعار :-

ولی ؎ جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

بحریؔ ؎ آج کی دلبری بی کاری تھی جیو پر بیدلاں کے بھاری تھی
چھب تھی گویا رکت بھری تروار شاید اول بی کس کوں ماری تھی

بحری کی دوسری غزل جو مقبول ہوئی وہ یہ ہے جو غالباً غواصی کے ایک قافیہ عجیب تر پر مبنی ہے غواصی کا مطلع یہ ہے۔

غواصی ؎ اے شوخ عجب یے جو توں ہے سب تے عجب تر
چالی تہے نیناں کی ترے چھب تے عجب تر

بحری ۔مطلع ؎

یار اب ہے سو کچھ عجب ہے رے اب جو سب ہے سو کچھ عجب ہے رے

بحری ۔مقطع ؎

بحریا بے ادب ہے بے ایمان کہ ادب ہے سو کچھ عجب ہے رے

شاہ کمال گرم کنڈوی ؎

عبد رب ہے سو کچھ عجب ہے رے ایک سب ہے سو کچھ عجب ہے رے

ولی نے قافیہ بدل کے کہا ؎

مل کے رہنا سجن عجب کچھ ہے ہنس کے کہنا بچن عجب کچھ ہے

بحری ؒ نے ایک غزل صنعت مہملہ میں یعنی بے انقط الفاظ میں کہی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر حفیظ کا خیال ہے کہ بحری ؒ ہی نے سب سے پہلے اس صنعت میں طبع آزمائی ہے مگر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں ایک رُباعی اس صنعت مہملہ میں موجود ہے۔ ولی اورنگ آبادی کا ایک قصیدہ فارسی اس صنعت میں ہے۔ متاخرین بھی اور دکھنی شعراء اس صنعت میں قاصر نہیں رہے۔

بحری کے ایک اور معاصر شاہ معظم بیجاپوری کے تصوف میں متعدد رسالے ہیں، اور ایک دیوان مکتوبہ ۱۱۱۰ھ بھی کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ میں محفوظ ہے۔ معظم کی ایک غزل ہے جس کی بحر ہندی ہے :۔

شاہ معظم ؎ الف احد میں مخفی تھا سو شوقوں باہر آیا
حرف حرف میں روپ بدل کر میم کا گھونگٹ لایا

بحری ؎

وحدت بیچ جو تھا سو آیا کثرت میں سرکاڑ بیچ ٹل اپنے بیچ سے سوں دس کر آیا جھاڑ
آپی گاوے آپی بجاوے آپس آپ نچائے تال متا ان لوگن کے سر کیسے دکھے دکھائے

بحری کے کلام میں ان کے معاصرین شعرائے بیجاپوری شاہ امین الدین بیجاپوری اوران کے بعض خلفا کا رنگ بھی ہے۔ بحری کی یہ نظم ۳۱ بیت کی ہے ۔

جن مطلق عاشق حق   جن عاشق حق مطلق
جن سر بھریا سدور   جن نور نگر معمور

جعفر معاصر بحری:۔
میر تقی میر نے اپنے تذکرۂ شعرائیں [1] ایک دکھنی شاعر جعفر کا ایک شعر درج کیا ہے وہ یوں ہے ۔

غمزاں سوں دیکھو شوخ مجھے مار کر چلے   مجروح تس پہ راہ نین ٹھار کر چلے

اور پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون "بعض جدید دریافت ریختے" میں ایک شاعر جعفر کا ذکر کیا ہے اور حضرت امیر خسرو کی جو غزل ریختہ مشہور ہے اوس کے متعلق لکھا ہے کہ وہی غزل ریختہ کہ ایک شخص جیسے مل تھارنے اپنی بیاض مرتبۂ رام پرتاب ۱۱۳۹ھ جلوس محمد شاہی میں جعفر کی طرف منسوب کی ہے۔ جو اردو تذکرہ نویسوں سے ستر سال قبل کی ہے۔ اور بلحاظ قدامت معتبر ہے۔" چونکہ نسخہ عروس عرفان مصنفۂ بحری مکتوبہ ۱۱۳۳ھ کے آخری ورق پر جعفر نامی شاعر کی ایک نظم "مثنوائے طوطی" درج ہے جس کے بعض اشعار فارسی آمیز ریختہ ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جعفر وہی ہے جس کا ذکر محمود شیرانی مرحوم نے کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ جعفر، بحری کے معاصر اور دکھن کے باشندے تھے۔ طوطی کی نظم عارفانہ اور زبان شیریں ہندی آمیز ہے۔ جس کے چند شعر یہ ہیں، شاعر بڑا خوش گو اور عارف کامل معلوم ہوتا ہے ۔

جعفر ۔

نہ تو رہ سے نہ یو پنجرا رہے گا   بلا کر لال تجکوں کیا کہے گا
بآب و دانہ ات مت کھول طوطی   بخوش الحان خود مت بھول طوطی
سجن سوں آج توں رلیاں منالے   رنگیلے سیج پر کلیاں بچھالے
بیا جعفر توکل پر قدم رکھ   خدا کوں یاد دل میں دمبدم رکھ

جعفر کی غزلیں ایک اور بیاض میں بھی میری نظر سے گذری تھیں۔

بحری نے اپنی زبان کے متعلق یہ لکھا ہے "ہندی تو زبان ہے ہماری" الخ ہندی سے مراد بھاکا نہیں بلکہ قدیم اردو ہے مگر من لگن میں سینکڑوں الفاظ ہندی کے موجود ہیں۔ شاید اسی کا یہ اثر تھا کہ متاخرین بحری نے بھی اس طرف توجہ کی اور ایک خاص بحر جس کو الکفا، تخیل و صوت، النا قوس میں جس کا

---

[1] تذکرۂ نکات الشعرا میر تقی میر، مطبوعہ ۲۲ء اورنیٹل کالج میگزین لاہور۔

وزن قصیدہ کا ہوتا ہے۔ بقول علامہ[۵۱] باقر آگاہ (مدراسی) دکھنی شعراء برھنی اور درسنی کہا کرتے تھے۔ محمود شیرانی مرحوم نے مثنوی فیض عام (تصنیف ۱۱۴۴ھ) کے چند بند نقل کئے ہیں جس کا ایک بند یہ ہے ؎

اس لٹ کے اوپر واری رے   اس غمزے کے بلہاری رے
دل برد بیک رفتار کہ خوش   ناگاہ متاع ہوش و خرد
وابستہ بدان دستار کہ خوش
اس لٹ کے اوپر واری رے   اس غمزے کے بلہاری رے

دوسرا ایک نامعلوم دکھنی شاعر اسی کی تتبع میں کہتا ہے ؎

دن رین پیا بن سوتی ہوں   دو نین انجھو بھر روتی ہوں
مکھ لال رکت سوں دھوتی ہوں   نت رونا مجہ، دستور کروں الخ

حیرت[۵۲] دکھنی کہتا ہے ؎

میں بیم بھکارن ہوتی ہوں   لے راکھ بھبھوت مکھ دھوتی ہوں
جب بیم پیارے آویں گے   مجہ چین امن سب بھاویں گے

مکھن، غالباً مکھن لال کا یہ شعر ؎

اے ہد ہد جارے پیہہ کنے   سد تن کی لیجا جیو کنے

غالباً اس شاعر کے بعض مرثیے اڈنبرا کی بیاض میں بھی ہیں۔ اور علامہ باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ/۱۲۲۰ھ، نے ایک دکھنی صوفی شاعر شاہ اعظمؒ کی برہنی نقل کی ہے جو یہ ہے ؎

شاہ اعظم ؎ رنگ رانی جگ گلفام ہوئی   مدماتی ہے آشام ہوئی
گل نرگس رنگیں جام ہوئی   من جیون کو آرام ہوئی
یک درسن میں کئی کام ہوئے
اس صورت کی بلہاری ہوں   جس دیکھت بد بل ہاری ہوں

علامہ ابوالحسن قربی ۱۱۱۶ھ/۱۱۸۳ نے بھی ایک برہنی اور ایک درسنی کہی تھی جس کا ایک شعر ان کے شاگرد علامہ آگاہ نے لکھا ہے ؎

میں پیو میں اپس کون فنا کری   میر مرنے کے آگیچ مری

علامہ آگاہ نے بھی دوہے کبت اور درسنی بھی کہی ہے۔

---

۵۱ رسالہ اُردو انجمن ترقی اُردو دہلی ۱۹۲۹ء (علامہ باقر آگاہ از مولوی عبد القادر سروری) ۵۲ فہرست مخطوطات، ادارۂ

بحری کی دکھنی غزلوں میں حسن و عشق کی جھلک بوجہ اتم موجود ہے۔ جو غزل کا حقیقی جزو ہے اور اپنے دیوان کو تبلیغ عرفان کا جزو اعظم نہیں بنایا ہے۔ البتہ فارسی غزلیں جو دستیاب ہوئی ہیں، اسرار معرفت پر مبنی ہیں، بات یہ ہے کہ بحری فطری طور پر لڑکپن سے حسن پرست تھے اور عشق و محبت کی آگ ان کے سینہ میں بھڑک رہی تھی۔ اور نو دس سال کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا چنانچہ من لگن اور عروس عرفان میں اپنے حسن و عشق کے قصے بیان کئے ہیں اور یہ کوئی تعجب اور نئی چیز نہیں ہے۔

غرض اکابر اولیاء، بلکہ علماء و فضلا، اور شعراء نے جب تک اس وادی میں قدم نہ رکھا کامل نہ ہو سکے، جس سے کتابیں بھری پڑی ہیں، مومن خاں مومن اور علامہ شبلی کی عشق کی کہانی خواجہ علاء الدین انصاری الندی (دکن)۔ خواجہ مخدوم عبدالحق ساویؒ کا عشق، وغیرہ بقول حضرت گیسو دراز (حکیم گوی)[۵]

پیمبر عشق، دین عشق و خدا عشق زتحت الارض تا فوق السماء عشق

بحری نے بقول خود پچاس ہزار بیت کہے جو بھاگ نگر میں ۱۰۹۸ھ سے قبل قزاقوں کے نذر ہو گئے، ایسی صورت میں ان کی بلند پروازی اور نازک خیالی کا صحیح طور پر، غیر منتخب مختصر دیوان سے کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب کہ مرزا غالب جیسے شاعر کا بھی منتخب دیوان ہے۔ اور سینکڑوں مغلق اشعار چھانٹ دئے گئے ہیں تاہم بحریؒ کی زبان، غواصی اور نصرتی کی ہے۔ اور طرز قدیم ہے۔ اکثر اشعار کی بندش چست اور نازک خیالی سے خالی نہیں، ولی، کا کلام شگفتہ اور طرز ادا خاص ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی نے خاص طور پر زبان اور اسلوب بیان کی طرف توجہ کی ہے۔ بحریؒ کو اس کا موقعہ نہیں ملا، بحری، بیجاپوری ممتاز شعراء کے ایک رکن ہیں، اور ولی اورنگ آبادی نے بھی ابتدا میں انھیں شعرا کی تتبع کی ہے۔ چنانچہ ولی حسن شوقی بیجاپوری کو خوش کلامی میں استاد مانتا ہے، جس کا انتقال بقول ابن نشاطی ۱۰۶۶ھ سے قبل ہو چکا تھا جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ باوجود اس کے کہ بحری کی زبان دکھنی اور ہندی الفاظ کثرت سے ہیں، تاہم اکثر صاف اور شیریں بھی ہیں۔

ہم یہاں اپنی نظر انتخاب سے کچھ شعر نقل کرتے ہیں اگرچہ کلیات بحری مطبوعہ اغلاط سے مملو ہے۔

بحری ۔ بچن بحری کے سن سندھر کھی کین دل دیا ہوگا
جو نین تو کان کے پونرل خیالان اس خیالی کون

بحری نے بڑھاپے میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہنا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس طرح اشارہ کیا ہے۔

۵۔ مخطوطہ عروس عرفان (زیور ۱۱۶) کتب خانہ آصفیہ ۱۷۰۸ھ

بحری ؎

بحری او خوش قماش بچن بولنا گیا
یو بڈ پنا نے طبع کیا مضمحل میرا

بقول غالب دہلوی ؎

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

بحری ؎

بول بانکا ہے گرچہ بحری کا پن او سیدا ہے اے سجن تجہ سات
دھن مکہ ہے ترا مطلع الانوار تے نزل پھور زلف ترا سجنۃ الابرار تے نازک
منجہ گل میں تو کس وقت سٹے گی سون جانوں ہیہات جو ہے بات ترا ہار تے نازک

پھولبن یو بلا کی انکھیاں تے دیکھ بس، نین کتا، ترا او جمال
جیون ہلالی کرے غزل خوانی تجہ بھوان کی صفت میں جم یو ہلال
لٹ تری کجلیع تو کھب ہے گھنور چک تری ات اچک تو چھب تتیال

معنیٰ آفرینی ؎

نیر کے ٹھارہے اگن جو روان سو او کیا جو یبار جنتر کا

شوخی ؎

لڑنا تو ہیں تمیں اکیلے لیا زلف کون مون پہ پاڑنا؎، نا

محاورہ توڑ جوڑ ؎

تری خوشی منجہ سون توڑ جوڑ بحری سون تو تون بگاڑ نا، نا

ہاتھ سے چلا جانا ؎

کیا کروں کس سون جاکھون یو بات میں مرے ہاتھ سون گیا ہیہات

ہندی تشبیہات ؎

گر سنے گا جو عشق کا مہاراج ڈال گھانے منے نکالے تیل

کھلاڑی اور کھیل ؎

ہات سون جاوے نے ندسے بار نے اے کھلاڑی یہاں سمجھ کر کھیل

؎ پاڑنا، ڈالنا، یعنی زلف کو چہرہ پرسے تو پہلے ہٹالو، معشوق سے مکالمہ اور تغزل کی شان نمایاں ہے۔

کیا صاف شعر ہے ؎

معرفت کے نگر کے صرافاں   اس میں کھوٹا کھرا پرکھتے ہیں

یہ شعر بھی صوفیاء دکن میں بہت مشہور ہے۔ حضرت شاہ کمال اللہؒ حیدر آبادی وفات ۱۱۷۱ھ اس کا دوسرا مصرعہ اس طرح پڑھا کرتے تھے ؎

معرفت کے نگر کے صرافاں   پل میں کھوٹا کھرا پرکھتے ہیں

اور ولی کا بھی ایک شعر صوفیاء میں مشہور ہے ؎

ہاتھ میں میرے نہ سمجھو تم بیاض   شوخ کے ملنے کی دستاویز ہے

شاہ کمال حیدر آبادی شعر مذکور اس طرح پڑھا کرتے تھے ؎

ہاتھ میں میرے نہیں ہے یہ کتاب   یار کے ملنے کی دستاویز ہے

شاہ صاحبؒ کو دکھنی شعرا کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے۔

(باقی آئندہ)

(وفیات)

خواجہ حسن نظامی

اُردو ادب کے پُرانے معمار ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں ہمیں صفی لکھنوی، حسرت موہانی، سلطان حیدر جوش، پنڈت کشن پرشاد کول، آرزو لکھنوی، علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ جیسے معماران ادب کا ماتم کرنا پڑا۔ افسوس کہ اگست میں خواجہ حسن نظامی بھی ۷۸ سال کی عمر میں ہم سے الگ ہو گئے۔ قدیم دہلی کی ایک اور شمع بجھ گئی۔ اُردو کا ایک اور روشن ستارہ ڈوب گیا۔

خواجہ حسن نظامی کی ذات میں بیک وقت مختلف خوبیاں جمع تھیں۔ وہ ایک ادیب و انشا پرداز تھے۔ لیڈر اور اخبار نویس تھے۔ صاحب نسبت صوفی تھے۔ مبلّغ تھے۔ تاجر تھے۔ ان کی زندگی جدوجہد اور استقلال کا ایک نہایت عُمدہ نمونہ تھی۔ انھوں نے اپنی کوشش و محنت اور فہم و فراست سے جو ترقی کی اس کی نظیریں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی عسرت کی حالت میں گذری لیکن انھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا خود داری اور وقار کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اپنی ذہانت، جفاکشی اور استقلال کی بدولت انھوں نے لاکھوں رُپے کمائے لیکن وہ اپنے پُرانے دنوں کو نہ بھولے اور نہ ان پر کبھی شرمائے۔ بلکہ ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح وہ نہایت فخر سے کہا کرتے کہ میں اپنے بازوؤں کی طاقت سے اور اپنے بل بوتے پر پستی سے بلندی پر پہنچا ہوں۔ ان کا جسم نحیف و لاغر تھا لیکن دماغ توانا و تندرست تھا۔

ابتدائی زمانہ میں انھوں نے اخبارات میں، درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح کا علم بلند کیا۔ درگاہی و خانقاہی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ان کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ لیکن انھوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔

خواجہ حسن نظامی نے نصف صدی سے کچھ اوپر اردو زبان کی خدمت کی۔ ان کا پہلا مضمون ۱۸۹۶ء میں انڈیا گزٹ میں شائع ہوا اور ان کی پہلی تصنیف مفلسی کا مجرب علاج ہے۔ اسی کتاب سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ لیکن قبول عام کی سند انھیں اس وقت ملی جب ان کی ایک کتاب غدر دہلی سے متعلق شائع ہوئی۔ آگے چل کر انھوں نے غدر دہلی سے متعلق متعدد افسانے لکھے جو کئی جلدوں میں شائع ہوئے اور یہی افسانے ان کی تصنیفات میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اردو دوستی اور ان کی ادبیت و انشا پردازی کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پانچ سو تک پہنچتی ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ مذہب، تصوف، سیاست پر مضامین لکھے سفرنامہ ترتیب دیا۔ اپنی آپ بیتی سنائی۔ غدر دہلی سے متعلق افسانے لکھے۔ مچھر، دیا سلائی، دھوبی، پیاری ڈکار جیسے غیر اہم موضوعات پر نہایت دلچسپ مضامین لکھے۔ موضوع کا اتنا تنوع اردو

سے کسی مصنف میں نہیں پایا جاتا۔ منادی میں ان کا روزنامچہ بڑی دلچسپی کی چیز تھا۔ اسی روزنامچہ کے لئے لوگ منادی کا بےچینی سے انتظار کرتے۔ انھوں نے تنہا اُردو زبان کی وہ خدمت انجام دی جو بہت سے ادارے انجام نہ دے سکے۔

مرحوم ایک صاحب طرز ادیب و انشاپرداز تھے۔ ان کی عبارت بڑی سادہ مگر بڑی دلکش ہوتی تھی۔ حسرت مرحوم انھیں نثر کا شاعر کہا کرتے تھے۔

مجھے مرحوم کی خدمت میں ۱۹۲۶ء سے نیاز حاصل تھا۔ میں اپنے چھوٹے مرحوم بھائی علی اشرف کو علاج کی غرض سے دہلی لے گیا تھا۔ سلاطین دہلی کی یادگاروں کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ موجودہ دہلی کی جیتی جاگتی تصویروں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک دن میں مرحوم کے یہاں بھی پہنچا ملازم نے نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ خواجہ صاحب سے کہہ دو کہ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ اگر اس شرط پر وہ مجھے باریابی دینا چاہتے ہوں تو بہتر ہے ورنہ میں واپس جاتا ہوں۔ فوراً بلوالیا اور بڑی محبت سے باتیں کیں۔ دورانِ گفتگو میں پوچھا کہ آپ کو اپنا نام بتانے میں کیا عذر ہے؟ میں نے جواب دیا کہ عام طور پر لوگ آپ سے ملنے اس لئے آتے ہیں کہ ان کا نام منادی میں چھپے۔ میں اس غرض سے حاضر خدمت نہیں ہوا ہوں۔ میرا مقصد محض آپ سے نیاز حاصل کرنا تھا۔ میں آپ کو اپنا نام اس شرط پر بتا سکتا ہوں کہ منادی میں میرا قطعی ذکر نہ آنے پائے۔ خواجہ صاحب نے وعدہ کیا اور میں نے انھیں اپنا نام اور پتہ بتا دیا۔

اس کے بعد پھر بارہا مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ خط و کتابت بھی رہی۔ جب میں بمبئی آگیا تو وہ جب کبھی بمبئی آتے مجھے اپنے آنے کی اطلاع ضرور دیتے اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آخری ملاقات مرحوم سے دہلی میں ایک کانفرنس میں ہوئی۔ میں نے سلام کیا ضعف کی وجہ سے پہچان نہ سکے۔ کہنے لگے میں نے آپ کو نہیں پہچانا میں نے کہا جناب خواجہ صاحب، جب دُنیا ہی میں یہ حال ہے تو عاقبت میں آپ سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ بڑے زور سے ہنسے اور فرمایا اچھا نجیب اشرف صاحب ہیں۔ مقدمۂ رقعات عالمگیر میں اورنگ زیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا جو عکس ہے وہ مرحوم ہی کی عنایت سے مجھے حاصل ہوا۔

خواجہ صاحب کو دلی سے عشق تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب دہلی میں شورش بہت زیادہ بڑھی تو وہ حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن وہاں جی نہ لگا اور دوستوں کے منع کرنے اور خطرات کے باوجود وہ دہلی واپس آگئے اور یہیں ان کی ابدی آرام گاہ بنی۔ مرحوم تقریباً دو سال سے بیمار تھے اور آخر پچھلی عیدالضحیٰ کی شام کو وہ وقت آپہنچا جس سے کسی ذی حیات کو چھٹکارا نہیں۔ اردو دنیا کے لئے عیدالضحیٰ کی شام بھی شام ماتم بن گئی۔

خواجہ حسن نظامی اس تہذیب کی یادگار تھے جو اب تقریباً مٹ چکی ہے لیکن جبتک اردو زبان زندہ ہے خواجہ حسن نظامی زندہ

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

(از عبدالرزاق قریشی)

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی وفات ہندوپاک کی علمی و ادبی دنیا کا ایک بڑا سانحہ ہے۔ ان کی موت علم و ادب کے ایک محقق اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے ایک ماہر کی موت ہے۔

قاضی صاحب مرحوم ریاست جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) کے جاگیردار تھے۔ ان کے آبا و اجداد تقریباً تین صدی پہلے سندھ سے جوناگڑھ آکر آباد ہوئے۔ قاضی صاحب کی تعلیم بہادر خان مدرسہ جوناگڑھ اسلامیہ ہائی اسکول اور اناوہ میں ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی و عربی کی اعلا تعلیم دہلی و لکھنؤ کے بعض علماء و فضلا سے بھی حاصل کی۔

قاضی صاحب عموماً اردو، انگریزی اور گجراتی میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ چند مضامین عربی میں بھی لکھے۔ ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور وہ دارالمصنّفین کے سلسلۂ اشاعت میں داخل ہے۔ مرحوم نے صرف ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ نہایت مفید حواشی بھی لکھے۔ ایک بار اس کتاب کا ذکر آیا تو مرحوم نے محض اظہار واقعہ کے طور پر مجھ سے فرمایا کہ "کتاب کی اشاعت میں ادارۂ مذکور کی طرف سے کسی قدر تاخیر ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں کسی نے مجھے اطلاع دی کہ جامعۂ ملیہ کے کوئی پروفیسر اس کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ میں نے مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ کتاب جلد سے جلد شائع کی جائے ورنہ شاید میری محنت اکارت جائے۔ علامہ مرحوم نے مجھے جواب میں لکھا کہ آپ اطمینان رکھیں اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان میں کوئی نہیں کر سکتا۔" زمانے نے سید مرحوم کے قول کو صحیح ثابت کر دکھایا اور قاضی صاحب مرحوم کی عربی دانی اور فضل و کمال کے لئے ایک سند بن گیا۔

مرحوم کے دس انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ اسلامک اینڈ اورنٹیل اسٹڈیز کے نام سے ۱۹۴۹ء میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کا مقدمہ پرنسپل محمد شفیع نے لکھا ہے۔ اردو کے علمی و تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ خود مرحوم نے تقسیم ہند سے بہت پہلے مرتب کر لیا تھا اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ اس مجموعہ پر علامہ سید سلیمان ندوی مقدمہ لکھیں اور کتاب کی طباعت بھی معارف پریس میں ہو لیکن ان کی یہ خواہش عملی جامہ نہ پہن سکی، البتہ ان کی ایک کتاب اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ابھی حال ہی میں پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ لمعات اختر اور غزلوں کا مجموعہ سیپارۂ دل کے نام سے بہت عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلوں میں لطافت خیال اور ندرت بیان پائی جاتی ہے۔ نظموں میں محاکاتی

شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے متعدد چھوٹے چھوٹے علمی و ادبی رسالے بھی اردو اور گجراتی میں لکھے ہیں۔ غالباً انھوں نے حیات ولی بھی مرتب کرلی تھی۔

اردو زبان و ادب کی خدمت کی غرض سے مرحوم نے جوناگڑھ سے ایک ماہانہ رسالہ شہاب بھی نکالا تھا۔ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ان کے رفیق کار تھے۔ افسوس کہ جوناگڑھ کی سنگلاخ زمین رسالہ کو راس نہ آئی اور سال بھر کے اندر اندر اسے بند کردینا پڑا۔

قاضی صاحب مرحوم صاحب علم و فن ہونے کے ساتھ ایک خوشحال خاندان کے رکن اعظم بھی تھے، جوناگڑھ میں ان کا دولت کدہ اہل علم و فضل کا مرکز تھا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد ریاست جوناگڑھ میں جو سیاسی انقلاب آیا اس کی زد میں مرحوم بھی آگئے اور انھیں اپنی بھاری جائداد اور اثاثہ چھوڑ کر ترک وطن کرنا پڑا۔ وہ کراچی گئے اور کئی مہینوں کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان کے سکریٹری مقرر ہوئے اور پھر آگے چل کر سندھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ہو گئے۔ یہ سندھ یونی ورسٹی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے قاضی صاحب جیسے صاحب علم و کمال کی خدمات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

دولت و علم کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے لیکن جب ہوتا ہے تو اس کے نتائج بڑے خوش گوار ہوتے ہیں۔ مرحوم قاضی صاحب کی ذات گرامی بھی اس اجتماع ضدین کا ایک عمدہ نمونہ تھی۔ انھوں نے ہزاروں رُپے کتابوں کی فراہمی پر صرف کیے۔ عربی، فارسی، اردو کی سیکڑوں نادر کتابیں ان کے کتب خانہ میں تھیں۔ ترک وطن کے وقت انھیں اپنی جاگیر چھوڑنے کا شاید اتنا رنج نہ ہوا ہوگا جتنا اس کتب خانہ کو چھوڑنے کا۔

قاضی صاحب کی شخصیت میں بڑی دل کشی تھی۔ ان کی ہر بات میں نفاست پسندی تھی۔ ان کا لباس ان کی باتیں، ان کا مذاق، ہر چیز میں ستھراپن پایا جاتا تھا۔ خوش طبعی اور سنجیدگی کا اتنا اچھا امتزاج میں نے کم دیکھا ہے۔ وہ بے حد شریف، متواضع مگر رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ مذہب کے قائل اور اس پر عامل مگر مذہبی تقشف سے بے زار اور دور رہتے تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کبھی کسی کو برا کہتے نہیں سنا۔ حالانکہ اختلاف رائے کے اظہار میں انھیں کبھی تامل نہیں ہوا۔ ایک بار اپنے ایک مضمون میں میں نے غالب کی زمانہ سازی پر کچھ سخت جملے لکھ دیے تھے۔ مرحوم نے مجھے ٹوکا لیکن جس متبسم انداز اور شفقت بھرے لہجہ میں ٹوکا وہ آج تک میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم نوجوان ادیبوں اور محققوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے۔ ان کی رہنمائی فرماتے کتابوں سے اقتباسات نقل کرکے بھیجتے بلکہ عاریۃً کتابیں دینے میں بھی انھیں کوئی عذر نہ ہوتا۔ جن دنوں مرحوم کی خدمت میں مجھے پہلے پہل نیاز حاصل ہوا ہے وہ آثر جہانگیری کو ایڈٹ کرنے کی تیاری کر رہے

تھے۔ لیکن انھیں معلوم ہوا کہ ایک نوجوان پروفیسر اسے ایڈٹ کرانے کی خواہش رکھتے ہیں تو انھوں نے فوراً اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ افسوس کہ ان پروفیسر صاحب کی خواہش شرمندۂ عمل نہ ہو سکی اور اس طرح ایک مفید تاریخی کتاب کی اشاعت نہ ہو پائی۔

مرحوم سے جب کبھی کسی اچھے موضوع کا ذکر کیا جاتا تو فوراً کہتے ارے بھائی یہ تو بحر ذخار ہے اور پھر ایک قہقہہ لگاتے۔ اس کے بعد اس موضوع کے مواد کے لئے بیسیوں کتابوں کے نام گنا جاتے۔ غضب کا حافظہ پایا تھا۔ جس چیز کو پڑھ لیتے وہ ہمیشہ ان کے ذہن میں محفوظ رہتی۔ جب کبھی کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو فرماتے اس موضوع پر ایک مضمون فلاں رسالہ میں فلاں سال میں اور غالباً فلاں مہینہ میں شائع ہوا تھا۔ اسلامی تہذیب و ثقافت، عربی و فارسی و اردو ادب تو ان کے پسندیدہ موضوع تھے ہی وہ سائنس جغرافیہ وغیرہ سے متعلق موضوعات پر بھی بہت کافی مواد بہم پہنچا سکتے تھے۔ اختر العادی نے انھیں بجا طور پر مستند متحرک انسائیکلو پیڈیا کہا ہے۔ میرے عزیز دوست سید شہاب الدین دسنوی جابر بن حیان پر ایک مضمون لکھنا چاہتے تھے اور کافی مواد جمع کر چکے تھے جب اس کا ذکر مرحوم سے ہوا تو انھوں نے اس موضوع پر کتابوں اور رسالوں کے حوالوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا اور میرے دوست کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا انھوں نے ان حوالوں کی روشنی میں اس موضوع پر بہت کم پڑھا ہے۔ قاضی صاحب انھیں مختلف کتب فروشوں کے پاس بھی لے گئے اور وہاں اس موضوع پر جتنی کتابیں مل سکتی تھیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ افسوس کہ اس طرح کی عملی ہمدردی اور ہمت افزائی کرنے والے بزرگ اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

مرحوم بمبئی آتے تو مجھے فوراً مطلع کرتے۔ ایک بار ایک مجبوری کی وجہ سے مجھے حاضر ہونے میں دیر ہوگئی۔ مرحوم خود تشریف لائے۔ میں نے معذرت کی تو فرمایا مقصد تو ملاقات ہے، یہاں ہو چاہے میرے یہاں ہو۔ استاذ محترم پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی سے مرحوم کو بڑی محبت تھی انھیں ہمیشہ حبیب لبیب کے لقب سے یاد کرتے۔ آتے تو ان کے یہاں ضرور جاتے، حالانکہ وہ شہر سے باہر رہتے ہیں، اور ان کے یہاں جانے کے لئے ہم بمبئی والوں کو بھی خاص طور پر ارادہ کرنا پڑتا ہے۔ میرے مخدوم مولانا شہاب صاحب مالیر کوٹلوی سے بھی انھیں بڑا انس تھا اور مولانا تو ان پر قربان ہوتے۔ معلوم نہیں مرحوم کی وفات کی خبر سن کر ان پر کیا گذری ہوگی۔

میں مرحوم کی خوش اخلاقی، تواضع اور خلوص و محبت کو یاد کرتا ہوں تو دل بے ساختہ بھر آتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے شاعر نے کہا ہے کہ

تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو ۔۔۔ تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

نقد و تبصرہ

حیات میر تقی میر

(از جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی)

ہندوستان نے ہزاروں سال میں سینکڑوں "جینیس" پیدا کئے۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ ان میں سے ایک تھے۔ یہ گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ ان کا زمانہ شورشوں اور انقلابوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ میر اس سیاسی و سماجی انحطاط کے ڈرامہ کے ایک اہم اداکار بھی تھے اور تماشبین بھی تھے میر پر اپنے زمانہ و ماحول کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جب وہ اپنے تاثرات کو شعر کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں تو ان کی اور ان کے زمانہ کی درد بھری کہانی ہزاروں رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اس اعتبار سے میر کا کلام ان کے صفات، و کمالات اور تعمیری عناصر کے اتحاد کا ایک مجموعہ ہے جس کو سمجھنے اور میر کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے میر کے عہد کی تہذیب و تمدن کی تاریخ اور ان کے سوانح حیات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے انھیں حالات و واقعات کا تجزیہ و تشریح کرکے میر کی سچی تصویر پیش کی ہے اور میر کے کاروان حیات کو اُس سیل حوادث سے منزل بہ منزل گذرتے ہوے دکھلایا ہے ایک طرف ان کا عظیم الشان مرتبہ اور دوسری طرف ان کے کلام کا درجہ متعین کیا ہے۔ اس مشکل کام کو خواجہ صاحب نے جس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے وہ حیات میر کے مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

حیات میر ۲۳۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو تین بڑے حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مختصر دیباچہ کے بعد ۳۲ صفحے کا ایک جامع مقدمہ ہے یہ پوری کتاب کا چھوٹا نقشہ ہے۔ مقدمہ اگر ایک طرف حیات میر کی مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف قاری خواجہ صاحب کے نقطۂ نظر طرز فکر و استدلال سے بہ بخوبی واقف ہو کر آگے بڑھتا ہے۔

حصّہ اول میر کے خاندان ولادت وفات اور ان کے عہد کے تاریخی پس منظر پر مشتمل ہے میر کو میدان عمل میں اس خوبی سے بر سر کار پیش کیا ہے کہ پورے ڈرامے میں میر ہی میر پائے جاتے ہیں اسی حصّہ میں میر کی شخصیت کی تعمیر دکھلائی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بڑی خوبی سے تاریخی حقیقتوں کے ثبوت کے لئے میر کے کلام و بیان سے سندیں پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح تاریخ کی تصدیق میر کے بیان سے اور میر کے بیان کی تصدیق تاریخ سے کی گئی ہے۔ شخصیت کی تعمیر کے بعد دوسرے باب میں اس کے نتائج کو میر کی سیرت اور تصورات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں میر کی شاعری کے اہم ترین پہلو غم جاناں و غم دوراں کے اتحاد پر نہایت جچی تلی رائے پیش کی گئی ہے۔ اسی حصّہ میں میر کی طبیعت کے تضاد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حصّہ دوم تصانیف نظم سے متعلق ہے اس میں میر کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور میر کے تصوّرات اور ان کے آرٹ کو ان کے کلام کی روشنی میں دکھلایا گیا ہے غزل کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی میر کے کارناموں کی طبع آزمائی پر حسب ضرورت معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس باب کے آخر میں میر کی ادبی خدمات اور دوسروں پر میر کے اثر کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ حصّہ خواجہ صاحب کی تنقیدی صلاحیتوں کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

حصّہ سوم میں میر کے نثری کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حصّہ کے آخر میں میر کے عہد کی ادبی محفلوں اور ہندو مسلمانوں کے تمدنی تعلقات دکھلائے گئے ہیں۔ حصّہ سوم کے دوسرے باب میں مختلف تذکروں سے میر کے ترجموں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ اور شخصیت کی تعمیر کے پیش نظر میر کا مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

کتاب میں ایک ضمیمہ بھی ہے۔ یہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس میں ان مخطوطوں کے اقتباسات درج ہیں جو کم یاب ہیں۔ اس سے خواجہ صاحب کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے آخر میں مآخذ کی ایک طویل فہرست ہے جو خواجہ صاحب کی محنت کی غماز ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے برسوں اپنے موضوع پر صرف کئے ہیں اور اس پر مکمل طور پر حاوی ہو جانے کے بعد نہایت ذمہ داری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ میر کے صد سالہ دورِ خلفشار و تنزل نے "اس پیر صد سالہ" کے سفر حیات میں جو گتھیاں ڈالیں اور ان کے مزاج کا جو خمیر تیار کیا ان کا کامیاب سائنٹیفک تجزیہ بہت ہی مشکل کام ہے لیکن خواجہ صاحب نے اس سلسلہ میں اپنی صلاحیت کا اچھا ثبوت پیش کیا ہے۔

جہاں خواجہ صاحب نے مواد کو ترتیب دے کر نتیجے اخذ کئے ہیں وہاں قاری کو بھی مواد کی فراہمی سے سوچنے کا موقع دیا ہے۔ میر کی سوانح حیات میں بعض مختلف فیہ مسائل جیسے خان آرزو سے میر کے تعلقات۔ ان کے والد کا نام، ان کی بدمزاجی و نازک مزاجی وغیرہ آتے ہیں لیکن خواجہ صاحب نے ان پر نہایت جچی تلی رائے پیش کی ہے بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں میر کا پہلو دبتا ہے لیکن خواجہ صاحب نے اپنے ہیرو کے کمزور پہلو کو بھی واضح کر دیا ہے مثلاً "میر صاحب سخت متکبر تو تھے ہی لیکن عقل معاش سے عاری بھی نہ تھے۔ اس امر میں خواجہ صاحب کی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن میر سے متعلق ایک نئی بات سامنے آجاتی ہے۔ بعض لوگوں کو خواجہ صاحب کی رائے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ کئی مقامات ایسے آتے ہیں جہاں واقعات کا اعادہ پایا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو نتیجے اخذ کرنے کے لئے یہ اعادہ ناگزیر تھا۔

خواجہ صاحب کی یہ تصنیف میر کے شایان شان اور اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کا حکم رکھتی ہے۔ اس میں تحقیق و تنقید کے علاوہ خواجہ صاحب کا اندازِ بیان قابل ستائش ہے۔ کتاب میں ایک طرف میر کی عظمت کا صحیح اندازہ بیان کیا گیا ہے اور دوسری طرف اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی ثبوت دے دیا ہے۔

تبصرے

(تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے)

عروسِ نیل

مصنفہ سلطانہ فیضی۔ (مکتبہ جامعہ دہلی) مجلد، قیمت عہ/

ایک سفیر کی بیوی کے لئے اپنا سفرنامہ مرتب کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ سفارت خانہ کی سہولتیں، اور اعلیٰ ترین طبقے سے ملاقات کے مواقع، کتاب کے لئے کافی مواد مہیا کر سکتے ہیں لیکن "عروس نیل" کے مطالعہ کے دوران میں یہ بات ذہن سے دور جا پہونچتی ہے کہ سلطانہ فیضی، ہندوستان کے سفیر مصر کی حیثیت سے مصر میں مقیم ہیں۔ کتاب کے دو سو صفحات میں شاہی ضیافتوں اور اکابر اور مدبرین کی ملاقاتوں کے ذکر کے بجائے، مصری کسان، ان کے پست مکان، ان کی گھریلو زندگی، عام مصری گھرانوں کی تقریبات اور رسوم ایسے سیدھے سادے انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ ایک طرف مصنفہ کی طرز تحریر کی داد دینی پڑتی ہے تو دوسری طرف ان کے شوق مشاہدہ کی۔

موجودہ ادب میں "اُن" اور "وہ" کے قدرداں کم رہ گئے ہیں لیکن جو "عریاں ان کے لئے لگاتے جائیں" کی داد دے سکتے ہیں وہ یقیناً اس اندازِ تخاطب کی بھی حلاوت محسوس کریں گے۔

جابجا سلطانہ فیضی اپنے مشاہدات ہی نہیں بلکہ اپنے تاثرات بھی بڑی کامیابی سے بیان کرتی ہیں، مثلاً "معصوم بچے ...... بلبلا بلبلا کر اب صبر بھی کر چکے ہیں۔ ظالم مکھیاں پھر بھی غربت کی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں"۔

بعض اچھوتی ترکیبیں ملاحظہ ہوں:

"دریا کے دونوں کناروں پر تماشائیوں کا ہجوم دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بے شمار چیونٹے شیرے کے کنارے جمع ہو گئے ہوں"۔

"موٹر کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہر منظر نگاہوں کے سامنے آ کر اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کوئی کتاب بار بار کھل کر بند ہو رہی ہو"۔

"صحرا کی دھوپ اور خشکی نے ان کے رنگ کو سونلایا نہیں"۔

زبان کی چند فروگذاشتوں سے قطع نظر، مجموعی حیثیت سے کتاب شروع سے اخیر تک بے حد دلچسپ اور لطیف پیرایہ میں لکھی گئی۔ اس میں مصر سے متعلق آٹھ عکسی تصاویر بھی درج ہیں۔

سلطانہ فیضی کی غالباً یہ پہلی تصنیف ہے اور اس پر وہ مبارکباد دئے جانے کے قابل ہیں۔ (ش ۔ ح)

مقالہ در مسئلۂ وحدت الوجود مرتبۂ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، تقطیع ۵ × ۷ صفحات ۳۲ کاغذ طباعت وکتابت عمدہ، ملنے کا پتہ:- مصنف اور منیجر اسرار کریمی پریس الہ آباد۔ قیمت ۴ؔ

فاضل مرتب کو ایک نا تمام اور ناقص فارسی قلمی رسالہ ملا۔ دیباچہ سے مصنف کا نام صرف "الشیخ الملکی" ظاہر ہوتا ہے اور زمانہ سلطان سلیم خان بن بایزید خان بن محمد کا ہے جو تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل گزرا ہے۔ اسی کے حکم سے یہ رسالہ تالیف ہوا ہے۔ مصنف نے اس رسالہ میں مسئلۂ وحدت الوجود پر بحث کی ہے۔ شیخ محی الدین بن العربی پر معترضین نے جو اعتراضات کئے ہیں۔ اس رسالہ میں نہایت معقولیت سے ان کا جواب دیا گیا ہے۔

مرتب نے اس ناقص نسخہ کا صرف وہ حصہ مرتب کرکے شائع کیا ہے جس میں وحدت الوجود جیسے نازک مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس رسالہ کے شروع میں مرتب نے مختصر سے مقدمہ میں مسئلہ وحدت الوجود کے سلسلہ میں حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات کا اقتباس پیش کیا ہے جس سے نفس مسئلہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ آخر میں اصل فارسی رسالہ کے بعض مقامات کی تشریح بھی مرتب کے قلم سے ہے، وحدت الوجود کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس مختصر سے رسالہ میں سامان غور وفکر ہے۔

مینا بازار مصنف ملاّ نورالدین محمد ظہوری ترشیزی۔ مرتب ومصحح ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، استاد عربی وفارسی الہ آباد یونی ورسٹی۔ تقطیع ۶" × ۹½"، صفحات ۱۳۲۔ کاغذ، طباعت، وکتابت بہتر، قیمت ؏۔ مندرجہ بالا پتہ سے یہ کتاب بھی مل سکتی ہے۔

مینا بازار ادبیات فارسی کی ایک اہم درسی کتاب رہی ہے اس کے باوجود اس بات کا آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کا اصلی مصنف کون ہے، لائق مرتب اس کو ظہوری کی تصنیف بتاتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس کی نہیں۔

مغل شہنشاہوں کی جدت پسند طبیعتوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو نئی نئی جدتیں کی ہیں انھیں میں سے ایک زنانہ بازار یا مینا بازار ہے۔ اس بازار میں عورتیں ہی دکاندار اور عورتیں خریدار ہوتی تھیں مغلیہ حرم کی بیگمات اس طرح اپنے ذوق خرید وفروخت کو تسکین دیا کرتی تھیں۔ بادشاہ چونکہ رعایا کا باپ ہوتا ہے اس لئے وہ اور شاہی خاندان کے افراد بھی اس بازار صنف لطیف کے محرم تھے۔ اسی مینا بازار کی تصویر کشی ملاّ نورالدین ظہوری کے قلم نے کی ہے۔ ایک فصل بازار کی تعریف میں ہے اور دس فصلیں مختلف دکانوں کی تعریف وتوصیف میں ہیں۔

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے اس کتاب کو مرتب کرکے اور ایک فاضلانہ مقدمہ اور شرح لکھ کر شائع

کیا ہے ۔ فارسی ادبیات سے ذوق رکھنے والوں کے لئے کارآمد اور مفید ہے ۔

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کی تحقیق اور کاوش قابل ستائش ہے انھوں نے نہایت محنت اور تلاش و جستجو سے کتاب کو مفید اور کارآمد بنا دیا ہے داخلی اور خارجی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ "مینا بازار" ظہوری صاحب "سہ نثر ظہوری" ہی کی تصنیف لطیف ہے ۔

حیات ز۔خ۔ش　مولفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ ۔ تقطیع ۸ × ۵ صفحات ۲۲۶ کاغذ، طباعت و کتابت عمدہ ، قیمت تین روپئے ۔

ملنے کا پتہ :- مہتمم مطبوعات ، مسعود منزل ۔ حمایت نگر ۔ حیدرآباد (دکن)

یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات ہے جس نے گھر کی چار دیواری سے کبھی قدم نہیں نکالا ۔ کالج دیونی ورسٹی کی تعلیم سے بے بہرہ رہی ، قدیم مشرقی تہذیب و تمدن کے گہوارہ میں آنکھیں کھولیں ، ان کے والد علی گڑھ کے مشہور شروانی خاندان کی ایک عظیم المرتبت شخصیت نواب سر محمد مزمل اللہ خاں تھے ۔ گھر ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی ۔ قدرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لے کر زاہدہ خاتون المعروف بہ ز ۔ خ ش پیدا ہوئی تھی ۔ سخت پردہ میں رہتے ہوے بھی ز ۔ خ ۔ ش نے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں ۔

اس کتاب میں مرحومہ کی شاعری اور ان کے حالات زندگی انھیں کی رشتہ دار انیسہ خاتون شروانیہ نے بیان کئے ہیں ، مصنفہ خود ایک اچھی ادیبہ ہیں ۔

کتاب کا مقدمہ مصنفہ کے شوہر ہارون خاں شروانی سابق پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونی ورسٹی نے لکھا ہے جس میں شروانی خاندان کی تاریخ ہندوستان میں اس کی آمد اور شروانیوں کے کارنامے بیان کئے ہیں ۔ اُردو میں خواتین کی سوانح عمریاں بہت کم ہیں ۔ محترمہ انیسہ شروانیہ نے اس کتاب کو مرتب کر کے اپنے خاندان ہی کی نہیں خدمت کی ہے بلکہ ہندوستان کے مظلوم طبقۂ نسواں کی بھی خدمت کی ہے ۔ اس کتاب سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ پردہ میں رہنے والیوں کو اگر اچھی تعلیم ، اطمینان اور فراغت نصیب ہو تو وہ بے پردہ تعلیم یافتہ عورتوں سے پیچھے نہیں رہ سکتیں ۔ سید سجاد حیدر یلدرم نے مرحومہ کے بارے میں کہا تھا " وہ حرم میں پیدا ہوئی ۔ حرم میں ہوش سنبھالا ۔ اور وہیں اس کے نغمے ختم ہو گئے ، مگر شاعرہ کے اپنے تخیل نے ایک ایسی شمع جہاں تاب روشن کی جس کی ضیا سے کائنات منور ہو گئی ، اور وہ " شمع تخیل " تھی ۔

آرٹ اِن اُردو پوئٹری　مصنفہ جناب شہاب الدین رحمت اللہ کمشنر راج شاہی ڈیویژن (مشرقی پاکستان) صفحات ۱۲+۱۲۰ قیمت عہ

ہمارے برصغیر میں یہ شکایت آج سے نہیں بلکہ تقریباً ایک صدی سے عام ہو گئی ہے اور روزانہ

اس کی کمی بڑھتی جا رہی ہے اتنا ہی نہیں کہ اس ملک میں اردو جس درجہ ، عزت ، مقام ، اور محبت کی مستحق تھی وہ اس سے محروم کی جا رہی ہے بلکہ اکثر مقامات پر تو اس کا وجود ہی خطرہ میں آ گیا ہے لیکن ہم نے کسی وقت بھی ٹھنڈے دل سے یہ سوچا کہ آخر ایسا کیوں ہے ، اس میں "بےگانوں" کا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ جو کچھ کیا ہوا وہ خود "آشنا" کا ہے۔

دنیا میں ایک چیز کی مقبولیت اور اس کے نتیجہ کے طور اس کا ارتقاء اس بات پر موقوف ہے کہ اس کے محاسن اور اس کی ہمہ گیر افادیت کا زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یقین دلایا جائے ، لیکن کیا اردو کے سلسلہ میں ہم نے اس طرف کوئی قدم اٹھایا ؟ کیا ہم نے اردو زبان کی حقیقت اس کی ساخت اس کی ترقی ، اس کی وسعت اور اس کی تعمیر میں ہندوستان کے ہر گوشہ اور اس کے باشندوں کے ہر طبقہ کی متحدہ کوشش کا ذکر ، غیر اردو داں اصحاب کے سامنے کیا ، کیا ہندوستانی کی ۱۲، ۱۴ زبانوں میں سے کسی ایک میں بھی ہم نے امور بالا کے متعلق کبھی بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی ، ان زبانوں کو جانے دیجئے کیا ہم نے انگریزی زبان اور اس کی عمومیت سے فائدہ اٹھا کر ملک کے اندر یا باہر اردو سے لوگوں کو روشناس کرنے کی طرف قدم اٹھایا اگر جواب نفی میں ہے تو ہم کو شرمندگی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گا کہ

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

انگریزی میں اس وقت تک اردو زبان کی تاریخ سے متعلق صرف ۲ یا ۳ کتابیں شائع ہوئی ہیں اور اگر ہندوستان میں آنے والے یوروپینوں کو ضرورت نہ ہوتی تو انگریزی کے متعدد لغت اور بہت سی قواعد کی کتابیں عالم وجود میں نہ آتیں۔ ہمارے مفکر ، شاعر ، ادیب اور صناع مصنف کی اردو سے بے پناہ محبت اور اس کے اظہار کے حسین و صناعانہ طریقہ ہی سے پتہ چلتا ہے جو انھوں نے اردو کی ترقی کا اس کے ہر دلعزیز بنانے اور اس سے متعلق موثر و مفید جذبات پیدا کرنے کے لئے اپنی حسین ، فکر زا ، دلکش اور انبساط بخش تصنیف کی شکل میں پیش کی ہے۔ کتاب دراصل شاعری کے اصناف اور ان میں جو ممتاز خصوصیتیں ہیں ان کی ایک دلکش و جاذب توجہ مجموعہ ہی نہیں ہے ، بلکہ مصنف نے اردو اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ کر کے اور تقریباً دو درجن کیف پرور اشعار کو پیکر تصویر بنا کر اس مجموعہ کو ایک بیش بہا مرقع بنا دیا ہے۔ اردو میں اس وقت تک اشعار کو تصویرانے کی بہت کم کوشش کی گئی ، بے چغتائی کے شہ کاروں اور بعض مصوروں کی کوششوں کے علاوہ اردو میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا گیا ! لیکن اس مرقع کی بڑی خصوصیت ان تصاویر کے علاوہ اشعار کے شعری ترجمے ہیں ، کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے ، پہلا حصہ اردو زبان

کی ابتدا و ارتقاء اور اس کے نظم سے متعلق ہے، دوسرے حصہ میں مختلف عہد کے ممتاز و منتخب شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب ہے، یہ انتخاب بجائے خود مصنف کے ذوق سلیم کی شہادت ہے،

مصنف ہمارے لئے نئے نہیں ہیں انھوں نے تقریباً ۲۰، ۲۱ سال پہلے ہی اس طرف توجہ کی تھی، اور اسی زمانہ میں ڈاکٹر سپرو مرحوم وغیرہ نے ہمت افزا داد دی تھی۔

ہم کو کتاب کے بعض بیانات سے ممکن ہے اختلاف ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے اردو زبان، اس کی تاریخ اس کی شاعری، اس کے حسین ترجمہ اور اس کی مصورانہ تشکیل و فن کارانہ تجسیم کے ذریعہ جو اہم خدمت انجام دی ہے وہ لائق صد تحسین و ہزار آفرین ہے، ہم کو یقین کامل ہے کہ اہل ذوق اس سے پوری طرح مستفید و محظوظ ہوں گے۔ بلکہ اس کتاب نے اردو سے متعلق متعدد ممکنات کے دروازے کھول دیئے ہیں، ہندوستان میں یہ کتاب رائیٹرس امپوریم لمیٹڈ پیلس بلڈنگ فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ملے کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

"ن۔ ا۔ ن"

آج کل کشمیر نمبر

شائع کردہ:۔ پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند دہلی۔
سالانہ چندہ چھ ۶ روپئے۔ فی پرچہ ۸ر

رسالہ آج کل اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور بلند پایہ رسالوں کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہترین سامان مطالعہ ہے۔ اردو رسائل میں رسالہ آج کل نے ایک خاص مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس رسالہ کے سال میں دو تین خاص نمبر نکلتے ہیں۔ زیر نظر شمارہ کشمیر نمبر ہے۔ اس خاص نمبر میں کشمیری تہذیب، کشمیریوں کی زندگی، رسم و رواج، کشمیر کی مشہور تفریح گاہیں اور ان سے متعلق متعدد نظمیں، ملک کے اچھے اور مشہور اہل قلم کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ متعدد تصاویر نے رسالہ کی زینت کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔

"ف"

خط و کتابت

کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایئے۔

ضمیمۂ

مقالہ نما

مرتبین

عالی جعفری — فضل اللہ فاروقی — عصمت جاوید — سیّد جمیل الدین

ضروری نوٹ :- مقالہ نما میں شامل شدہ مضامین کی نقل حسب طلب (خط شکستہ میں) دو آنے فی صفحہ کی اُجرت پر مہیا کی جا سکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرستِ عُنوانات

مذہبیات

۱۔ احمد امین ڈاکٹر: مترجم سعید الرحمٰن۔

مصنوعی دین

(فاران کراچی ۵۵ مئی ۹-۱۱)

مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر احمد امین کے مضمون الدین الصناعی کا ترجمہ مضمون میں اصلی اور مصنوعی دین کا فرق بتایا گیا ہے اور مصنوعی دین کو، جو کہ روح سے عاری محض لفظوں کا دین ہے مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ ادارہ:

فرمان رسولؐ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۱۱-۱۴)

نام موتی کے تحت متعدد احادیث، ان کا ترجمہ اور تشریح پیش کی گئی ہے۔

۳۔ اسماعیل شہیدؒ:

تقریر دل پذیر

جامع مسجد دہلی میں مولانا اسماعیل شہیدؒ کا پہلا وعظ

(ریاض کراچی۔ اپریل مئی ۵۵ ، ۲۵-۲۹)

پہلے مسلمانوں کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یاد دلایا کہ آپ کس لئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کا پیغام کیا تھا، پھر ہندی مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ کلمہ پڑھتے ہو، سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو لیکن مرادیں مانگتے ہو قبروں پر جاکر، منتیں مانگتے ہو پیروں اور شہیدوں کی قبروں سے، تم کبھی سرخرو اور معزز نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اللہ پر بھروسہ نہ کروگے اور اسی کو اپنا خالق نہ مانوگے۔

۴۔ افتخار احمد بلخی:

فتنۂ انکار حدیث

(فاران کراچی ۵۵ جون ۹-۱۸)

اس مقالہ میں بتایا ہے کہ لوگوں نے حدیث سے کب اور کیوں کر انکار کیا۔

۵۔ بھگوان داس ڈاکٹر:

کتابوں کے شبدوں میں نہ الجھو، اصل مطلب کی طرف جاؤ

(نیا ہند، الہ آباد ۵۵، اپریل ۲۱۷-۲۲۰)

قرآن، گیتا، اپنشد، بھاگوت، مہا بھارت کے ارشادات اور منوسمرتی، مولانا روم اور صوفیوں کے اقوال کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سب مذاہب کی حقیقت ایک ہے اور سب مذہبی صحیفوں کی روح ایک ہے۔ صرف الفاظ کے پھیر پھار سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ جعفر شاہ:

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

خیر و شر

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵، اپریل ۱۱-۱۳)

ایک حدیث کی تشریح۔ ماحصل یہ کہ ہر شئی میں سے اپنے لئے روشن پہلو نکالو تاکہ زندگی کا رخ صحیح اور ارتقا کی طرف رہے۔

۷۔ جعفر شاہ:

فرمان رسولؐ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ جون ۱۳-۱۵)

حدیث ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی...الخ کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد وضاحت کی ہے کہ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہی حقیقت کہ حضور نے اپنی پوزیشن بالکل واضح کردی دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور کی خدمات یا پوزیشن بس اتنی ہی رہ جاتی ہے جتنی پوری عمارت میں ایک اینٹ ہو۔ انھیں دونوں نکتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور شبہ کا ازالہ۔

+ + +

۸- ضیا احمد بدایونی:

فوق البشر کا تصوّر اور اسلام

(فاران کراچی ۵۵، اپریل ۱۷-۲۴)

مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں فوق البشر کا تصوّر سرے سے ہے ہی نہیں اس سلسلہ میں قرآن پاک کی شہادت سب سے بڑی ہے اس نے رسول پاکؐ کی زبان سے کہلا دیا کہ "میں تو تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں" اسلام میں بڑائی اور عظمت اسے ہے جو متقی ہو۔ مضمون میں تقویٰ سے متعلق، قرآنی آیات، احادیث، علماء اور بزرگوں کے خیالات و افکار سے جا بجا وضاحت کی گئی ہے کہ انسان کی عظمت و بزرگی صرف تقویٰ سے ہے اس کے سوا اسلام کا اور کوئی تصوّر نہیں۔

۹- غلام السیّدین خواجہ:

اسلام کا نظریہ اجتماع اقبال کی نظر میں

(فاران کراچی ۵۵ مئی، ۱۲-۲۳)

تعلیمات اسلام اقبال کے فکری محرکات کا سرچشمہ ہیں۔ اقبال کے اقوال و اشعار کی روشنی میں اسلام کے نظام اجتماعی کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اقبال فرد کی نشو و نما کو جماعت کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں۔

۱۰- فضل قدیر:

استقامت

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ اپریل ۷-۱۰)

سورہ حٰمٓ السجدہ کے تیسرے رکوع کی آخری تین آیتوں کی تفسیر جن میں اللہ کو رب ماننے اور اس پر ثابت قدم رہنے والوں کو جنّت اور جنّت کی نعمتوں کی بشارت دی گئی ہے۔

۱۱- فضل قدیر:

تفسیر

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۷-۹)

مومن آل فرعون کے تحت چند قرآنی آیتوں کی تفسیر۔

۱۲- فضل قدیر:

تفسیر — داعی اللہ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ جون ۹-۱۲)

ومن احسن قولا ممن دعی الی اللہ...الخ کا ترجمہ و تفسیر اور اسی کے ساتھ اور بھی کئی آیتوں کی تفسیر پیش کی گئی ہے کہ اللہ کی طرف کون لوگ بلاتے ہیں اور ان کے اخلاق کیسے ہوتے ہیں۔

۱۳- قطب سید:

مترجم۔ رضوان ندوی۔

رواداری اور اسلام

(فاران، کراچی ۵۵، اپریل ۳۵-۳۸)

مصر کے مشہور مصنف سید قطب کی کتاب "اسلام اور امن عالم" ایک فصل کا ترجمہ ہے جس میں مصنف نے اسلامی رواداری، تعلیمات کی متعدد تاریخی مثالیں پیش کی ہیں جب کہ مسلمانوں نے مختلف ملکوں کو فتح کر کے اپنی رواداری کا ثبوت دیا تھا۔

۱۴- مجیب اللہ ندوی۔

قرآن مجید میں آیت رجم

(معارف اعظم گڑھ، ۵۵، اپریل۔ ۲۴۵-۲۵۸)

اس موضوع کی دوسری اور آخری قسط درج ہے۔

۱۵- مجیب رضوی:

خیرات (دان) کے بارے میں محمد صاحبؐ کی کچھ حدیثیں

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ مئی ۳۲۹-۳۳۳)

خیرات سے متعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ مضمون میں، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور احادیث کی دوسری کتابوں سے ایسی احادیث کے ترجمے اور مطلب بیان کئے ہیں جو خیرات سے متعلق ہیں۔

۱۶۔ محمد احمد صدیقی۔ ڈاکٹر:

خواجہ عطار اور وحدت الوجود

(معارف اعظم گڑھ ۵۵، اپریل ۲۹۷-۳۰۸)

مسئلہ وحدت الوجود کوئی مسئلہ نہیں بلکہ جذب و احساس کی بات ہے اور اس کی حدیں بہت نازک ہیں۔ اکابر صوفیہ ان حدوں کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس نظریہ کے سب سے بڑے مبلغ شیخ محی الدین ابن العربی ہیں دوسرے دو بڑے مبلغ خواجہ عطار اور مولانا رومی ہیں ان امور کے تذکرہ کے ساتھ مقالہ نگار نے خواجہ کے کلام نظم و نثر سے ان کا نظریۂ وحدت الوجود بیان کیا ہے۔

۱۷۔ محمد منظور نعمانی۔

معارف الحدیث

توکل اور رضا بالقضا

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ اپریل مئی، ۲۰-۳۰)

توکل و رضا سے متعلق احادیث مع ترجمہ و تشریح۔

۱۸۔ محمد منظور نعمانی:

قرآنی دعوت (۱۹)

تقویٰ (۳)

(الفرقان لکھنؤ ۵۵، اپریل مئی ۱۴-۱۹)

اُردو ترجمہ اور مختصر تشریح کے ساتھ قرآن مجید کی چند وہ آیات درج کی گئی ہیں جن میں اہل تقویٰ کے اوصاف اور نشانیاں بتائی گئی ہیں۔

۱۹۔ مناظر احسن گیلانی۔ سید:

کائنات سے استفادہ کے حدود

(برہان دہلی ۵۵ اپریل ۵-۱۶)

گذشتہ پرچوں میں "کس لئے؟" کے عنوان سے انسانی زندگی کے دونوں خود ساختہ رخ مادیت، اور روحانیت کے غیر عقلی نظریات کے مقابلہ میں "قدرتی اس حیات" کو پیش کیا گیا ہے اسی کی تعبیر اسلامیت کے لفظ سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ شکوک و شبہات کی آسودگیوں سے پاک و صاف ہو کر اپنی مکمل ترین شکل میں "الاسلام" کے نام سے ہی قدرتی "اس حیات" ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ انبیا و رسل کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری پیغام اور ان کی ہمہ گیر ہمہ جہتی زندگی ہے۔ مضمون میں انہیں خیالات و اشارات کو متعدد عنوانات دے کر مفصل بحث کی ہے۔

(۲)

(برہان دہلی۔ مئی ۵۵، ۵-۱۶)

اس قسط میں قرآن کی ان آیتوں کو پیش کر کے جن میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی مخلوقات سے استفادہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے استفادے کے لئے ہے اگر انسان غور و فکر سے کام لے۔

۲۰۔ مودودی ابوالاعلیٰ:

تفہیم القرآن

(ترجمان القرآن اچھرہ لاہور ۵۵ مئی ۷۱-۱۱۹)

سورۂ طٰہٰ اور سورۂ انبیاء کے ساتویں رکوع تک کی تفسیر۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۱۔ امیر احمد خاں:

شہنشاہِ موسیقی
استاد رجب علی خاں صاحب

(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۲۲-۲۴)

استاد رجب علی خاں کے مختصر حالات زندگی اور کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۲۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۱۹-۲۲)

حضرت عبداللہ ابن عباس کے حالات مختصراً لکھے گئے ہیں۔

۲۳۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ جون ۲۔۲۳)

حضرت عبد اللہ بن مسعود کے حالات زندگی۔

۲۴۔ ادارہ:

حضرت زید بن حارثہ رض

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵، اپریل ۱۹۔۲۱)

حضرت زید بن حارثہؓ کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

۲۵۔ جعفر شاہ:

ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاؒ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵، اپریل ۱۵۔۱۸)

حضرت نظام الدین اولیا سے متعلق لکھا ہے: "یہ ایک ایسا درویش ہے جس نے فقر میں جان ڈالی، ایسا بوریا نشین ہے جس نے تخت نشین سلاطین میں فقر کی چاشنی پیدا کر دی اور ایک ایسا مرد قلندر ہے جس کی نگاہوں نے خشک اہل علم میں درویشی کی روح سمو دی" پھر ان کے ملفوظات کے مختلف مجموعوں کا ذکر کر کے ان کے بعض اقوال نقل کیے ہیں۔

۲۶۔ جمال الدین ملک:

اقبال بارگاہ رسالت میں
ایک مقدس خواب

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ جون ۲۹۔۳۲)

ابتدا میں خواب سے متعلق مختصر تمہید بیان کرنے کے بعد شیخ کرم الٰہی صاحب سے اس خواب کا تذکرہ ہے جو انھوں نے سفر حجاز میں دیکھا کہ نبی اکرم صلعم ایک ہال میں تشریف فرما ہیں۔ شیخ صاحب بھی موجود ہیں حضور کے سامنے چاء کی ٹرے ہے۔ عقبی دروازہ سے علامہ اقبال داخل ہوتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو چاء پیش کرکے فرماتے ہیں "لو ڈاکٹر صاحب چاء پیو"

۲۷۔ حبیب اللہ مشیر پیرزادہ:

انسان کامل کا ظہور

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵۔ جون۔ ۲۵)

سیرت پاک۔

۲۸۔ رضی الدین صدیقی:

مترجم۔ جمیل نقوی۔

آئین سٹائن

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۵۳۔۵۵)

ریڈیائی تقریر جس میں آئین سٹائن کے مختصر حالات زندگی پیش کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے بے دینی کی بے پناہ یلغار کو روک دیا اور مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پیچھے ہٹا دیا۔

۲۹۔ زینت ساجدہ:

میرا بائی

(آجکل ۵۵ فروری، مارچ ۴۸۔۶۰)

مشہور کرشن بھگت میرا بائی کے مختصر حالات زندگی پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے بھجن اور گیتوں میں رچے ہوئے بھاؤ کو سمجھنے کے لئے اس کے زمانے کا تاریخی پس منظر بھی پیش کیا ہے اور اس کے کچھ پد بھی درج کئے ہیں۔

۳۰۔ شاد عظیم آبادی:

مولانا شاد عظیم آبادی کا ایک مکتوب
نواب عماد الملک بلگرامی کے نام

(نگار، لکھنؤ، ۵۵ جون ۲۵۔۲۷)

اس خط (نوشتہ ۲۱ اپریل ۲۲ء) میں شاد عظیم آبادی نے اپنا حال لکھا ہے، اپنے خاندان پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی تصانیف کی فہرست درج کی ہے۔

۳۱۔ صادق الخیری:

شاہد احمد — ایک انجمن

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۱۷-۳۲)

شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۲۔ صلاح الدین احمد ندوی:

آخری دیدار

(ریاض کراچی ۵۵۔ اپریل مئی ۳۷-۳۹)

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم سے اپنی آخری ملاقات وفات اور تجہیز و تکفین کا حال۔

۳۳۔ ضیاء الحسن فاروقی:

مولانا اسلم جیراج پوری

(آج کل، دہلی ۵۵ مئی ۳-۵)

"تاریخ الامت" کے مصنف مولانا اسلم جیراجپوری کے مختصر حالات زندگی اور ان سے متعلق مقالہ نگار کے تاثرات درج ہیں۔ مولانا نہ صرف تاریخ اسلام کے اچھے عالم ہیں بلکہ اُردو اور فارسی کے شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نقاد بھی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین نہ صرف بے باکی اور متوازن رائے کے حامل بلکہ انشا پردازی کے اچھے نمونے ہوتے ہیں۔

۳۴۔ ظ۔ انصاری:

پنڈت رتن ناتھ سرشار

(ہندستانی ادب حیدر آباد دکن ۵۵ جون ۹-۱۲)

سرشار کے دور میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں سے ایک جماعت انگریزی آداب سیکھنے اور نئے با اقتدار حلقے سے واسطہ بڑھانے کی دلدادہ تھی دوسری جماعت انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب سے متنفر تھی سرشار تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو دونوں کے بین بین تھا ان کی طرز ادا ان کے گہرے مشاہدہ کا نتیجہ تھی اور ان کی ظرافت ایک باشعور آدمی کی طنز۔ انھوں نے جن کرداروں سے ہمیں اپنے "فسانہ آزاد" میں ملایا ہے وہ اس عہد کے جیتے جاگتے مجسمے ہی نہیں تھے بلکہ نمائندہ کیرکٹر تھے جن کی ذات میں ہم اس عہد کی معاشرت کو اور اس دور کی مختلف زندگیوں کو پا سکتے ہیں قریب سے مل سکتے ہیں اور ان کی ذہنی تہوں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

۳۵۔ عبدالحمید عدم:

یہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟

(مشرب کراچی ۵۵ مئی ۴۱-۴۳)

مضمون نگار اپنے دو دوستوں کا ذکر کرتا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں۔ ان میں سے ایک کو ایک باغ سے غیر معمولی محبت تھی لیکن یہ بات کھلتی تھی کہ اس باغ میں چنار کا درخت نہیں۔ مضمون نگار کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ مرا نہیں چنار کا درخت لانے گیا ہے۔ دوسرے کے بارے میں خیال ہوتا ہے کہ زندگی کو چھوڑ کر بھلا وہ کہاں جائے گا۔ یہیں کہیں بیٹھا کسی افسانے کو نوک پلک سے درست کر رہا ہوگا۔ ان میں سے پہلا اختر شیرانی ہے اور دوسرا منٹو۔

۳۶۔ عبداللہ سید ڈاکٹر:

تذکرہ مردم دیدہ

(اورینٹل کالج میگزین ۵۵ فروری ۱-۳)

اس نمبر سے حاکم لاہوری کے تذکرہ مردم دیدہ کی اشاعت شروع ہوتی ہے۔ فی الحال صرف ابتدائیہ چھپا ہے۔

۳۷۔ "عرشی صاحب":

رنگا رنگ یادیں

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۴۵-۵۶)

امرت سر کے رہنے والے خواجہ غلام محقق سے متعلق چند واقعات اور ان کی عملی زندگی پر ہلکے اشارے۔

۳۸۔ عرشی صاحب:
رنگا رنگ یادیں
(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۵۵ جون ۴۷-۵۱)
گوتم بدھ، مسیح، امام ابن تیمیہ، امام حسن، اور سر سید سے متعلق مختلف نصائح اور سبق آموز واقعات پیش کئے ہیں۔

۳۹۔ عرشی صاحب:
رنگا رنگ یادیں
(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵، اپریل ۵۲-۵۵)
آغا حشر سے دو بار ملنے کا اتفاق ہوا آغا صاحب نے اپنی کثرت مے نوشی اور اس کے برے نتائج کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کے دوست حکیم فقیر محمد چشتی نے انھیں آگاہ کردیا تھا کہ عنقریب ان کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۴۰۔ عقیل احمد جعفری:
یاد خیر آباد
(ریاض۔ کراچی، ۵۵، اپریل مئی ۱۲-۵۵)
مضمون نگار نے خیر آباد کی چند ہستیوں سید نجم الحسن سید افراز الحسن، حکیم احمد علی وغیرہ اور اس زمانہ کی سیاست، اور اپنے دور جیرمنی کے واقعات و حالات قلم بند کئے ہیں۔

۴۱۔ علی عباس حسینی سید:
آنند نرائن ملا
(فروغ اردو لکھنؤ ۵۵ اپریل ۶۵-۷۱)
سلسلہ بنام "لکھنؤ کے موجودہ ادیب" کی کڑی اس میں آنند نرائن ملا کے حالات زندگی اور ذاتی خصوصیات کا مختصر ذکر کرنے کے بعد ان کے کلام کی خصوصیات یعنی ان کے خلوص، فنون لطیفہ کے پاکیزہ ذوق، میانہ روی، اخوت و مساوات کی تبلیغ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں نمونۂ کلام دیا ہے۔

۴۲۔ فرمان فتح پوری:
شاعر سندھ
(مشرب۔ کراچی ۵۵ مئی ۵۲-۵۵)
قابل اجمیری (جنھیں بقول مضمون نگار حال ہی میں حکومت سندھ نے "شاعر سندھ" کے خطاب سے نوازا ہے") کا حال، لکھا ہے اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری:
علمائے اسلام کے القاب و خطابات تاریخ کی روشنی میں
(البلاغ بمبئی ۵۵، اپریل ۱۷-۳۸)
ان القاب و خطابات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بالفاظ مقالہ نگار "صدر اسلام سے لے کر آج تک علمائے دین کے لئے مختلف طریقوں اور مختلف معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں" ان میں سے چند یہ ہیں: امام معلم، قاری، علامہ، کاتب، منشی، مولانا، مولوی، ملا استاذ، شیخ الاسلام، قطب الدین، جناب، صاحب واعظ، محتسب، خطیب۔ وغیرہ۔

۴۴۔ لطیف حسین:
مولانا حسن بریلوی بحیثیت نعت گو
(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون ۱۰۵-۱۱۲)
مولانا حسن بریلوی کے حالات، ابتدا میں ان کی شاعری کے چند پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے بعد ان کی نعت گوئی سے متعلق ان کی نعتوں سے متعدد اقتباس پیش کئے ہیں۔

۴۵۔ "م"
بزرگان دین
سلطان ابراہیم ادہم قدس سرہٗ
(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۱۵-۱۸)
سلطان ابراہیم ادہمؒ کے حالات اور ان کی درویشانہ زندگی پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

۴۶۔ "م"

بزرگان دین

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ء جون ۷-۱)

حضرت معروف کرخیؒ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۴۷۔ محمد آصف قدوائی:

پیغمبر اسلام اور تلوار

(دوسری قسط)

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ء اپریل مئی ۳۱-۳۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اہم فرض کی بجا آوری ہی کے لئے تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے، لیکن سراپا عدل و رحم بن کر۔ آپؐ نے جو بنے انسانیت نواز قوانین جنگ نافذ کئے اور اسیران جنگ کے ساتھ جس نرمی اور رحم دلی کا سلوک کیا وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ غزوات نبوی میں مخالفین کی کل اتنی تعداد کام آئی کہ اسے دیکھتے ہوئے یہ کسی طرح صحیح نہیں سمجھا جا سکتا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔

۴۸۔ محمد ابراہیم قاضی:

سلاطین مغلیہ کی حیات معاشقہ

(برہان دہلی ۵۵ء جون ۱۳-۳۲)

بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۹۔ محمد اشرف حسین:

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر

(۲)

(برہان دہلی ۵۵ء اپریل ۵۴-۶۹)

مضمون کی دوسری قسط میں خسرو کی ۱۲ تصانیف کے نام پیش کئے ہیں۔ اور امیر خسرو کی برج بھاشا میں شاعری کی چند مثالیں۔ قوالی کی ایجاد، اور آپ کے فقر و تصوف اور اخلاق و آداب پر روشنی ڈالی ہے۔

۵۰۔ محمد ایوب قادری:

مجاہد جلیل مفتی محمد عیوضؒ

(العلم کراچی ۵۵ء جنوری تا جون ۳۵-۴۹)

۱۸۱۶ء میں انگریزی حکومت نے بریلی میں ہاؤس ٹیکس نافذ کیا۔ جس سے عوام میں بے چینی پھیلی۔ انگریزی حکومت سے جنگ کی نوبت آئی جس کی رہنمائی مفتی محمد عیوض نے کی۔ مفتی محمد عیوض کی مجاہدانہ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے علمی اور خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۵۱۔ محمد جہانگیر خاں ڈاکٹر:

شیخ العالم میاں شیخ درویش

(اورینٹل کالج میگزین ۵۵ء فروری ۴۷-۶۲)

میاں شیخ اور ان کے خاندان کے حالات رسالہ تذکرۃ الانصار میں درج ہیں۔ یہ رسالہ علی محمد ولد گل محمد انصاری المعروف بہ دانشمن نے رمضان ۱۱۸۱ھ میں لکھا تھا۔ میاں شیخ نے ۱۰۸۲ھ میں وفات پائی۔ موجودہ مقالہ میں اس رسالہ کا ملخص درج ہے۔ خاندان تیمور کے زمانہ کی تاریخی معلومات بھی اس میں ملتی ہیں۔

۵۲۔ محمد ظہیر الدین مفتاحی:

تاریخی حقائق
حضرت مولانا کشمیریؒ کے فضل و کمال کے بعض گوشے

(برہان دہلی ۵۵ء جون ۳۳-۴۸)

دارالعلوم دیوبند کے مشہور عالم و مدرس مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کے حالات "حیات انور" سے چند ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو بالفاظ مضمون نگار آج کل کے مدرسین کے لئے راہبر کا کام دیں گے۔

۵۳۔ نیاز فتح پوری:

ہندوستان کے مسلم دور حکومت کی چند نامور خواتین

(نگار لکھنؤ، ۵۵ء جون ۴۵-۴۹)

عہد مغلیہ اور بعض دوسرے عہد کی ان ۱۸ خواتین کے

تام جن کے تفصیلی حالات توپل نے اپنی بیاگرفکل ڈکشنری میں درج نہیں کئے لیکن ایک ہلکی سی روشنی ان کی شخصیت پر ضرور ڈالی ہے۔

۵۴۔ ہاشمی نصیر الدین:

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں شعراء اورنگ آباد کی اُردو قلمی کتابیں

(برہان دہلی ۵۵ جون ۴۹-۵۶)

مندرجہ ذیل ابو شعرائے اورنگ آباد کی ان اُردو قلمی کتابوں کا تذکرہ جو حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

(۱) ایجاد (۲) افضل بیگ خاں (۳) اشرف
(۴) اسد علی خاں تمنا (۵) تجلی (۶) داور
(۷) درگاہ قلی خاں (۸) ذرہ (۹) سراج الدین سراج
(۱۰) لالہ لچھمی نرائن شفیق (۱۱) نوازش علی خاں شیدا۔
(۱۲) شوق (۱۳) شہید (۱۴) عبدالولی عزلت۔
(۱۵) عاجز (۱۶) غضنفر (۱۷) فرحت (۱۸) فراقی
(۱۹) شاہ قاسم (۲۰) ولی (۲۱) ہمرنگ شاہ۔

تاریخ و سیاسیات

۵۵۔ ابوالحسن علی ندوی سید:

مترجم عتیق الرحمٰن

سفرِ مصر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ڈائری کے چند اوراق

(الفرقان لکھنؤ ۵۵ اپریل، مئی ۵۸-۶۴)

قاہرہ کا قلعہ، قلعہ کا کتب خانہ، حضرت عمرو بن العاص کی مسجد امام شافعیؒ کی قبر اور دوسری مساجد و مقابر کا حال لکھا ہے اور اپنے تاثر کا اظہار کیا ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر محمد احمد الغمراوی سے ملاقات کا بیان ہے جن سے یہ گفتگو رہی کہ مصر کے بعض ادباء اور مصنفین کے قلم سے ایسی تصنیفات نکلنے کی کیا وجہ ہے جن میں اسلام پر جرح و تنقید ہوتی ہے؟ دوران گفتگو میں ازہر کو دینی نقطۂ نظر سے زیادہ مفید بنانے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔

۵۶۔ امین زبیری:

سرسید کی مذہبی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی خدمات

(العلم کراچی، جنوری تا جون ۵۵، ۹-۱۷)

سرسید کی ابتدائی زندگی سے لے کر آخر تک ان کے کارناموں کا مختصر طور سے بیان۔

۵۷۔ بشیر الدین قاری پنڈت:

رزم بزم
برصغیر پاک و ہند میں آلات حرب کی ایجاد

(العلم کراچی، ۵۵ جنوری تا جون ۲۲-۳۴)

مقالہ نگار نے یہ مقالہ خیرپور ہسٹاریکل کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ میں ہندوستان میں آلات حرب کی ایجاد کی تاریخ، کون کون سے آلات حرب کس کس زمانہ میں ایجاد ہوئے۔ ان کے نام اور ان کا عمل بجا بجا تاریخی حوالے اور شہادتیں دی گئی ہیں۔

۵۸۔ بھگوان داس ڈاکٹر:

امن اور پریم کا ایک ہی راستہ

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ مئی ۲۹۳-۲۹۹)

دھرم یا مذہب کی ایک ہی غرض ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اور اللہ کے ساتھ ملایا جائے۔ دھرم کا کمال یعنی پوراپن اس بات کے سمجھ لینے میں ہے کہ ایک ہی آتما سب کے اندر ہے اور وہی اللہ ہے اور اسی لئے سب کی سیوا ہی اللہ کی عبادت ہے اپنے اس خیال کے ثبوت میں انجیل، احادیث، اپنشد،

اور ۳۰-۳۵ سال قبل کی شاعری کی ایک ایسی نظم کا اقتباس پیش کیا ہے جس میں ہندوؤں مسلمانوں اور سب کو متحد کرنے کا پیغام دیا ہے۔

۵۹۔ بھوپندر ناتھ دت۔ ڈاکٹر:

ہندوستان کے باشندوں کا افلاس

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ اپریل ۵۵ ۲۰۲-۲۰۷)

مضمون میں بالتفصیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وسطی ایشیا ہی انڈو یوروپین زبانوں یا آریہ زبان بولنے والی قوموں کا قدیمی مسکن ہے یہیں سے پیدا ہو کر یہ لوگ سب ملکوں میں پھیلے مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ ہندوستان کے راجپوت گوجر اور جاٹ وسطی ایشیا سے آئے ہیں ماہرین عمرانیات کے خیال کے مطابق غلط ہے۔

۶۰۔ بھوپندر ناتھ دت۔ ڈاکٹر:

راج پوتوں کا دور

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ مئی ۲۸۱-۲۹۳)

مضمون نگار نے لفظ "راج پوت" کے ادب میں استعمال کا زمانہ، پھر ہرش وردھن کی موت کے بعد سے محمد بن غوری کے زمانہ ۱۱۹۲ء تک راجپوتی دور سے متعلق تاریخی حقائق کی روشنی میں بحث کی ہے۔

۶۱۔ پربھا پرشاد۔

چین میں پنڈت نہرو

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ جون ۴۰۲-۴۰۹)

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پنڈت نہرو کے دورۂ چین کے سلسلہ میں پیکنگ میں ان کے ورود ان کا شاندار استقبال چینی عوام میں پنڈت جی اور ہندوستان کی بے پناہ محبت کے جذبات۔ چینی بڑے بڑے لیڈروں کا پہلی بار سوائے دو مخصوص تاریخوں کے اس طرح آنا اور دوسری باتیں۔ پیکنگ یونیورسٹی کی ہندی کی پروفیسر صاحبہ نے اپنے خط میں پیش کی ہیں۔

۶۲۔ تمکین کاظمی:

عبداللہ ابن المقفع

(ہندوستانی ادب حیدرآباد دکن، ۵۵ اپریل ۱۲-۱۹)

ا۔ یہ مضمون "تاریخ و سیاسیات" کراچی، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپ چکا ہے۔ یہاں ہندستانی ادب میں، بالاقتباط چھپ رہا ہے۔ یہ پہلی قسط ہے۔

(باقی)

۶۳۔ خورشید احمد فارق ڈاکٹر:

قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج

(برہان دہلی ۵۵ مئی ۱۷-۳۲)

قاضی ابو یوسف ہارون الرشید کے چیف جسٹس تھے۔ خلیفہ نے قاضی صاحب سے بہت سے سوالات کئے تھے یہ کتاب انھیں سوالات کا جواب ہے۔ کتاب کا موضوع وہ معاملات ہیں جو حکومت اور رعایا کے مابین رونما ہوتے ہیں یا جن کا حکومت کے انتظام اور پالیسی سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً بندوبست اراضی، نظام آب پاشی، محصولات قوانین جرائم غیر مسلموں کے ساتھ پالیسی۔ کتاب اور قاضی ابو یوسفؒ کا تعارف کراتے ہوئے کتاب سے بہت سے اقتباسات دئیے ہیں جن میں خراج کی وصولی۔ محصلوں کی تقرری ان پر کڑی نگرانی ذمیوں سے خراج کی وصولی میں بے انصافی نہ کرنا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر مصنف نے خلیفہ کو توجہ دلائی ہے۔

(۲)

(برہان دہلی ۵۵ جون ۵-۱۲)

اس قسط میں کتاب کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے کہ ۳۳۶ صحابہ اور تابعین کی جو روایتیں اس میں بیان ہوئی ہیں، دوسری خصوصیتوں سے قطع نظر ان میں ایسا تاریخی مواد خاص طور پر حضرت عمرؓ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت علیؓ کی سیاست

وانتظام سے متعلق موجود ہے جو مطبوعہ تاریخی و ادبی
کتابوں میں مفقود ہے اور جس سے ان حضرات کی حاکمانہ
زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

۶۴۔ شہاب الدین یداللّٰہی:
سندھ کی زمین۔ تہذیب کی امین
(ریاض کراچی اپریل مئی ۵۵ء، ۱۶-۱۸)

سرزمین سندھ، اس کی قدیم تاریخ طرز معاشرت،
رسم و رواج پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے وضاحت
کی ہے کہ سندھی اپنے قدیم رسم و رواج اور طرز معاشرت
کے سختی سے پابند ہیں ان پر غیروں کا اثر بہت کم پڑا ہے۔

۶۵۔ طٰہٰ حسین:
مترجم۔ عبدالحمید نعمانی۔
عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں
عہد فاروقیؓ کے عمال اور حضرت عثمانؓ
(برہان دہلی ۵۵ اپریل)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق
حضرت عثمانؓ نے دور فاروقیؓ کے عمال کو ان کی جگہوں پر
باقی رکھا اور کوئی تغیر و تبدل ایک سال تک نہیں کیا،
لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے
وظائف میں یکایک زبردست اضافہ کر دیا۔ ان کا طریقہ
سلوک میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے
مال میں لوگوں کے لئے حرص و طمع کی راہ نکلتی تھی حضرت عثمانؓ
نے جلیل القدر صحابہ کو بڑے بڑے انعامات دئے اور
انھیں مدینہ سے باہر جانے کی اجازت دے دی، حالانکہ
حضرت عمرؓ نے ان کو شرکت جہاد میں اصرار کے باوجود
مدینہ میں روک رکھا تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ قریش کے
کیرکٹر سے اچھی طرح واقف تھے۔ آخر میں مضمون نگار
نے قریش کے کیرکٹر سے بحث کی ہے۔

۶۶۔ عبدالحمید صدیقی:
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
(ترجمان القرآن اچھرہ لاہور ۵۵ء مئی ۱۲۱-۱۳۲)

موجودہ دور کی لادینی تہذیب، ہوس ملک گیری،
اضطراب و بے چینی سے متعلق مغربی مدبرین و مصنفین کے
اقوال نقل کرنے کے بعد بتایا ہے کہ دنیا کا امن و سکون
راحت و اطمینان، انسانیت کی فلاح و بہبود سنت
اللہ اور قوانین الٰہیہ کے بروئے کار لانے ہی میں ہے۔
جاہلی تہذیب کو ختم کرنے ہی میں صحیح انسانی خدمت ہے اور
نظام صحیح کے قیام ہی میں دنیا کو راحت و چین مل سکتا ہے
اور اس خدمت کو اسلامی نظام ہی انجام دے سکتا ہے۔

۶۷۔ غلام حیدر خاں چودھری:
مجاہدانہ زندگی
(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ء جون ۳۷)

اپریل ۵۴ء کے فیض الاسلام میں ادارہ کی طرف سے
"تاثرات" کے عنوان سے اسلامی جرائد کے بارے میں
لکھا گیا تھا، اس میں "سرسید کا تہذیب الاخلاق مولانا
ابوالکلام آزاد کا الہلال اور البلاغ، مولانا محمد علی کا کامریڈ
اور ہمدرد اور ایک حد تک، مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار
بھی اپنی پالیسی کے خاص نمائندے تھے" مضمون نگار نے
زمیندار اور دوسرے اخبارات کا موازنہ کرتے ہوئے
بتایا ہے کہ سب سے زیادہ انگریزوں کا معتوب زمیندار
رہا ہے اور اسی نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔
"اور ایک حد تک زمیندار....." کہنا مناسب نہیں۔

۶۸۔ کماریپا۔ جے۔ سی۔ ڈاکٹر:
ڈر کی چھایا اور آشا کی کرن
(نیا ہند الہ آباد ۵۵ مئی ۳۰۰-۳۰۴)

امریکہ، روس اور برطانیہ کی جنگی تیاریوں، مہلک
ہتھیاروں کی زیادہ سے زیادہ تخلیق، اور ایک دوسرے پر
بے اعتمادی سے ساری دنیا پر خوف اور دہشت طاری

ہے۔ یہ خوف اور دہشت کس طرح دور ہو سکتا ہے؟
مضمون نگار نے سرمایہ داری اور کمیونزم طرز حکومت پر
بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ دُنیا کا امن گاندھی جی کی تعلیم سرودے
کا راستہ ہے لیکن یہ آپ سے آپ نہیں ملے گا۔ ہمارا دیش خود
اس پر عمل کرے تب ہی ہم دنیا کو یہ راستہ دکھا سکتے ہیں۔ کیا ہم
بھارت میں ایسا نہیں کر سکتے؟

۶۹۔ کو۔مو۔جو:
مترجم ادارہ۔

ایشیا کی سمسیا

(نیا ہند۔ الہ آباد ۵۵ جون، ۳۵۵-۳۶۲)

چین کے وائس چیرمین شری کو۔مو۔جو چینی ڈیلیگیشن
کے صدر ہو کر دلی ایشیائی کانفرنس میں آئے تھے۔ کانفرنس
میں انھوں نے تقریر کی تھی ایشیا کے اتحاد، امریکہ کی جارحانہ
پالیسی۔ جزیرۂ فارموسا پر غاصبانہ قبضہ، اور دوسرے
ملکوں کی مدافعت کی امریکی پالیسی، سوب وچین کے قدیم
تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۰۔ محبوب عالم عکس:

رام پور — عہد بعہد کی ایک جھلک

(العلم کراچی، ۵۵ جنوری تا جون ۸۶-۹۴)

روہیلہ خاندان کی ابتدا، اس کی حکومت کا قیام۔ رامپور
نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کو ریاست کا صدر مقام بنانے
کا واقعہ۔ پھر رام پور کی ۱۷۷۴ء سے ۱۹۳۰ء تک کی
سیاسی، علمی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر۔ مشاہیر
علم و فن اور شعراء کا مختصر تذکرہ۔

۷۱۔ محمد رحیم دہلوی:

سلطان احمد تنبل

(دوسری قسط)

(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون　　　)

پہلی قسط العلم بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی
تھی۔ اس قسط میں بابر اور سلطان احمد تنبل کی معرکہ
آرائی۔ بابر کا مجبوراً [illegible] دینا۔ سمرقند پر بابر کی چڑھائی
کامیابی لیکن تنبل کا پھر سمرقند پر قبضہ اور دوسرے واقعات
پیش کئے ہیں۔

۷۲۔ محمد سلیمان:

بدایوں کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء

(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون ۱۱۳-۱۱۷)

ابتدا میں شہر بدایوں کی مختصر تاریخ، بیان کرتے ہوئے
۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف اہل بدایوں نے کیا
حصہ لیا اور انھوں نے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل
کرنے کی کس طرح کوشش کی۔ (باقی)

۷۳۔ محمد ناظم ڈاکٹر:

تاریخ اور تاریخ اسلام

(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون ۵۰-۵۶)

ڈاکٹر محمد ناظم کا یہ خطبہ صدارت شعبہ تاریخ اسلام
پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس منعقدہ ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء
بمقام خیر پور پڑھا گیا۔ اس مقالہ میں فن تاریخ کی اہمیت
و افادیت ظاہر کرتے ہوئے مسلمانوں کو علم تاریخ سے
دلچسپی خصوصاً اسلامی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے
کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

۷۴۔ محی الدین منیری:

اسلامی علوم اور مسلمانوں کے کارنامے

(البلاغ بمبئی ۵۵ اپریل ۷-۱۲)

مسلمانوں کو علوم و فنون سے بڑا شغف رہا ہے
اور انھوں نے علوم و فنون کو ترقی دینے اور پھیلانے
میں بڑا کام کیا ہے۔

۷۵۔ معصومی، ابو محفوظ الکریم:

البیرونی اور اصفہبند جیلیان مرزبان بن رستم

(۲)

(برہان دہلی ۵۵ اپریل ۱۷-۳۲)

نسب نامہ مرزبان، رستم شروین بد مرزبان،

مرزبان بن رستم کی اصفہبدیت۔ مرزبان خال مجدالدولہ؛ مندرجہ بالا متعدد عنوانات کے تحت تاریخ کی روشنی میں مرزبان بن رستم کے متعلق تحقیق کی ہے۔

قسط (۳)

(برزبان دہلی ۵۵ مئی ۳۳-۵۲)

اس قسط میں مرزبان اور خاندان کا کویہ قائمۂ آل باوند، باوندی سپہبدوں کی فہرست اسماء۔ بحث کا خلاصہ شکل مغنی کے قصہ میں دیباچہ کا ماحصل عربی متن کے ساتھ۔ اور آخر میں بحث کا خلاصہ دیا ہے۔

۷۶۔ منتری ادم پرکاش:

پنچ شیل اور ایشیا

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ جون ۲۴ ۳-۳۸۴)

ایشیا کی سرزمین پر ایک سمجھا تہ جنیس اور پھلی پھولیں۔ اس نے دنیا کو رام، کرشن، زرتشت، مہاتما بدھ، کنفیوشس، عیسیٰ اور محمدؐ دئے اس کا ستارا ہزاروں برس پہلے چمک چکا ہے پھر ایشیا سوگیا، اس کی قسمت سوگئی، اس نے اپنے پرائے کا فرق بھلادیا۔ پر آج ایشیا پھر سے جاگ رہا ہے۔ صدیوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔ شانتی کے دشمن طرح طرح کے جال لے کر دوڑ رہے ہیں۔ ایشیا اب سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے شتروؤں کو چیتاونی دی ہے یہی چیتاونی پنچ شیل ہے۔ اس کے بعد پنچ شیل اور اس کے اصول، پنچ شیل اور بھارت، چینو اکا نفرنس بھارت میں جاؤ۔ ان۔ لائی، ایشیا کی ایکتا، سامراجیوں کی ذہنی گٹھ بندیاں، پنچ شیل پر دنیا کی رائے، دلی کی ایشیائی کانفرنس۔ بانڈونگ ایشیائی افریقی کانفرنس اور آخر میں پنچ شیل اور دنیا کا امن کی متعدد سرخیاں قائم کرکے تفصیلی بحث کی ہے۔

تنقید، ادب، لسانیات

۷۷۔ آقای مقتدری:

فرہنگ مقتدری

(اورینٹل کالج میگزین ۵۵ فروری ۱-۲۹)

ایک مختصر فرہنگ فارسی، افغانی، فارسی ایرانی اور انگریزی کی مرتب کی ہے۔

۷۸۔ ابن انشا:

اُردو ادبی رسائل کے پچیس سال

(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۱۲۹-۱۳۳)

اُردو ادبی رسائل کے پچیس سال کا جائزہ۔

۷۹۔ اجمل خٹک:

پشتو ادب کے پچیس سال

(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۲۰۳-۲۳۶)

پشتو ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۸۰۔ احتشام حسین:

روسی ادب کے پچیس سال

(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۲۵۹-۲۶۳)

روسی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۸۱۔ احتشام حسین:

اُردو تنقید اور جدید ذہن

(ادب لطیف لاہور ۵۵ اپریل مئی ۴-۱۱)

تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ، نہ سیاست ہے نہ سائنس۔ لیکن یہ علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے، اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز بنتے ہیں اس کی جستجو ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ ان علوم میں اور ان کے ہمراہ ذہن انسانی میں ترمیم و تبدیلی اور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے۔ ادب چونکہ ثقافت کا جز رہا ہے۔ اس لئے ان علوم کی تبدیلی و وسعت کا اثر اس پر اور پھر ادبی تنقید پر بھی پڑا ہے۔ ہمارا ادب اور تنقید اس کی مثال ہے۔ تذکرتی تنقید کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں داخلی، نفسیاتی، تاریخی اور جمالیاتی تنقیدیں بھی ملتی ہیں۔ اختر رائے پوری کے مضمون "ادب اور زندگی" کے بعد ہی کسی شعوری تنقید شروع ہوا اور پھر ترقی کر گیا۔ لیکن دوسرے مکاتیب خیال بھی باقی

رہے اور ہیں۔ تاہم اُردو کے موجودہ رجحانات کے سبب اُردو تنقید ایک روشن اور واضح مستقبل رکھتی ہے۔

۸۲۔ احسان جعفری:
جوش ملیح آبادی اور خلیل الرحمن اعظمی
(شاعر بمبئی۔ ۵۵ جون ۱۹-۲۲)

نگار مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں خلیل الرحمن اعظمی کے مضمون "جوش ملیح آبادی" ایک طویل مضمون کا خلاصہ شائع ہوا ہے خلیل الرحمن اعظمی نے جوش پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جوش کی شاعری فرسودہ، بیمار اور کھوکھلی ہے۔ ہر جوش اپنی زندگی ہی میں اپنی شاعری کا علم بکھرتے اور اپنی انقلابیت کی دھجیاں ہوا میں آوارہ دیکھ رہے ہیں مضمون نگار نے ان کو جانبدار کہا ہے، انھوں نے تنقید کو جانبدارانہ اور جوش کی فنی خوبیوں اور دیگر خصوصیات کو دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ مضمون نگار نے جوش کے خیالات اور ان کی شاعری سے مواد دے کر خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید کو ناروا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۸۳۔ احمد شمیم:
غزل کا مستقبل
(ادب لطیف لاہور ۵۵ اپریل مئی ۲۰-۲۷)

غزل سامنتی اور جاگیردارانہ دور کی یادگار رہی لیکن اس نے سماجی عوامل کے ساتھ بدل کر اپنے قالب میں زندگی اور اس کی حقیقتوں کو سمو لیا ہے۔ اب وہ محض گل و رخسار تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے اگرچہ ہمارے دور میں اس کے وجود اور مستقبل کے بارے میں خطرات کی حامل باتیں کی جا رہی ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ غزل باقی رہے گی۔ زندگی کے عکاس کی حیثیت سے۔

۸۴۔ ارشد کاکوی:
شیفتہ کی اُردو شاعری
(نگار لکھنؤ، ۵۵ جون ۱۲-۱۸)

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا فن یکسر اکتسابی ہے۔ ان کے یہاں سر تا سر آورد ہے۔ ان کا کلام اول سے لے کر آخر تک ایک کاوش ہے اور کاوش بھی ایسی جو ہر جگہ نمایاں ہے۔ جہاں تک ان کے رنگ سخن کا تعلق ہے وہ لکھنوی زیادہ ہے اور دہلوی کم۔

۸۵۔ الیاس احمد مجیبی:
بچوں کے ادب کے پچیس سال
(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۱۶۱-۱۶۸)

اُردو میں "بچوں کے ادب" کے پچیس سال کا جائزہ۔

۸۶۔ الیاس عشقی:
فارسی ادب کے پچیس سال
(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۳۰۵-۳۵۰)

فارسی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۸۷۔ ایساندرو بوزانی:
دانتے اور اقبال
(ماہ نو کراچی ۵۵ اپریل ۱۳-۱۷، ۵۷)

بعد زمان و مکان کے باوجود دانتے کی ڈیوائن کومیڈی اور اقبال کے جاوید نامے میں چند ایک اختلافات کے ساتھ کئی امور مشترک ملتے ہیں۔

۸۸۔ ابواللیث صدیقی ڈاکٹر:
اُردو شاعری کے پچیس سال
(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۱۰۹-۱۲۷)

اردو شاعری کے پچیس سال کا جائزہ۔

۸۹۔ تمکین کاظمی:
عبداللہ ابن المقفع
(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۵ جون ۱۶-۲۲)

کلیلہ دمنہ کے تعارف کے بعد اس کے پہلوی عربی اور سریانی ترجموں سے متعلق محققین کی مختلف رائیں پیش کی ہیں اس کتاب میں جو اضافے کئے گئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اس امر سے بحث کی ہے کہ آیا یہ صحیح

ہے کہ عبداللہ المقفع نے یہ کتاب اس کے پہلوی ترجمہ سے
عربی میں منتقل کی ہے۔ ضمناً عبداللہ المقفع کی اعلیٰ استعداد علمی پر
بھی روشنی پڑتی ہے۔

۹۰۔ توفیق خاطر:

گجراتی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۲۴۳-۲۵۰)

گجراتی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۹۱۔ پاشان۔ رام کشور۔

پریم چند کی بھاشا

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ مئی ۹ ۳۳۹-۳۴۳)

پریم چند کی کہانیوں اور قصوں سے مثالیں دیکر
وضاحت کی ہے کہ پریم چند ایسی زبان استعمال کرتے
تھے کہ جسے کم پڑھے لکھے آدمی بھی سمجھ سکتے تھے۔ پریم چند
کا یہ مقصد تھا کہ اُردو ہندی کے آسان لفظوں کو ملا کر
ہندستانی بولی کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیں۔

۹۲۔ جمیل الدین سید:

"دستنبو" کا ایک خاص نسخہ

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ اپریل ۳۰-۴۷)

(مسلسل) غالب کے سوانح نگاروں میں سب
سے پہلے مولانا حالی نے اس کتاب کی زبان معرض بحث
میں لے آئے مگر غالب کے اس دعوے کہ "دستنبو" میں
کوئی عربی لفظ نہیں ہے کی تکذیب نہیں کی بلکہ تائید کی
کی ہے۔ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس انداز کا ذمہ دار ان
کا طرز سوانح نگاری ہے۔

۹۳۔ خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر:

اُردو خطوط نویسی کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۱۳۴-۱۳۶)

اُردو خطوط نویسی کے پچیس سال کا جائزہ۔

۹۴۔ خواجہ احمد فاروقی:

ادب میں اختلاف مذاق

(مشرب کراچی ۵۵ مئی ۷-۸)

ایسی مثالیں پیش کرکے جن میں ایک ہی چیز کی ایک
نقاد تعریف کرتا ہے اور دوسرا مذمت لکھتا ہے کہ کسی
کی تعریف یا برائی سے ادیب یا شاعر کی عزت مستقلاً
نہ کم ہو سکتی ہے اور نہ زیادہ۔ تخلیقی کارناموں کو اس
نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ صحت مند اقدار کے پیدا
کرنے میں مدد دیتے ہیں یا نہیں اور انھوں نے سماجی
ضرورتوں کے پورا کرنے میں جمالیاتی پہلوؤں کا لحاظ رکھا
ہے یا نہیں۔ یہ تجزیہ اور تعبیر اگر پوری آگہی کے ساتھ
ہوگی تو اس کا وزن ہر حال میں ظاہر ہو جائے گا۔

۹۵۔ خلیفہ شجاع الدین ڈاکٹر:

خطبۂ صدارت

(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۵۵ مئی)

اورینٹل کالج کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مارچ ۵۵ء
میں پڑھا گیا۔ صدر نے اورینٹل کالج کی علمی خدمات۔
تحقیقی کاموں کو سراہتے ہوئے آئندہ اسی راہ پر
گامزن رہنے کا مشورہ دیا ہے۔

۹۶۔ حامد حسین:

ذوق کی قصیدہ نگاری کے فکری عناصر

(شاعر بمبئی ۵۵ جون ۲۸-۳۱)

ذوق کی قصیدہ نگاری سے متعلق بحث کرتے ہوئے اور
موازنہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ ذوق کی
کاوش، معنی آفرینی اور علمیت کے باوجود روح شاعری اس کے
ہاں مفقود ہے اس کے باوجود ذوق قصیدہ کے فن میں ایک بلند
مقام رکھتا ہے۔

۹۷۔ دل شاہجہانپوری:

ہماری شاعری

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۵ مئی ۴۷-۴۸)

اردو شاعری کے ابتدائی دور سے آخر تک مختصر

تنقید، میر نے مشاہدات فطرت کو لطافت الفاظ اور تناسب کلمات سہل ممتنع پرواز سے خیر کافی نقشہ کھینچا۔ سودا نے بلند خیالی اور شکوہ الفاظ کے ساتھ ندرت بیان اور نزاکت مضمون پیش کئے۔ ان کے بعد لکھنؤ میں ناسخ، آتش، انیس اور دہلی میں غالب، مومن، ذوق کی شاعری کا دور شروع ہوا۔ زباندانی۔ قوت ادراک، رنگین نوائی اور نزاکت معنوی کے جوہر نظر آتے ہیں۔ مذاق شعر کی اصلاح ایشیائی رنگ میں آگئی، تیسرے دور میں لکھنؤ میں امیر مینائی، دہلی میں داغ، بزم سخن کے چراغ تسلیم ہوئے، داغ نے شوخی الفاظ و رعنائی زبان کی دلکشی میں خوب رنگ آمیزی کی حضرت امیر نے شکوہ انداز کے ساتھ شاداب خیال حسن ترکیب و لطافت زبان کے نئے نئے نقشے کھینچے۔ مگر مذاق شعر کا انداز گذشتہ دور کے دوش بدوش رہا۔ انقلاب عظیم کے بعد بھی اردو شاعری کی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ گزشتہ ادوار پر نظر ڈالتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں باستثنائے چند نقص پایا جاتا ہے۔

آخر میں لکھا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے کہ ہمارے شاعر صرف مناظر قدرت کی دلکش تصاویر کھینچیں گے عارفانہ اور فلسفیانہ رنگ مرغوب طبائع ہوگا۔ اظہار تعشق میں مادیت قطعی فنا ہوجائے گی۔

۹۸۔ رازق الخیری دہلوی:

عورتوں کے ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۱۴۳-۱۶۰)

اردو میں "عورتوں کے ادب" کے پچیس سال کا جائزہ۔

۹۹۔ رشید احمد ارشد:

جاحظ اور اس کے ادبی و علمی کارنامے

(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون ۷۵-۱۴۳)

عرب کے قدیم نثر نگاروں میں جاحظ بہترین نثر نگار تھا۔ اس نے اپنے افکار و خیالات کی نئی راہ نکالی، وہ صرف انشاء پرداز ہی نہیں تھا۔ وہ ایک عالم، ایک فلسفی اور زبردست مفکر تھا۔ آخر میں اس کے علمی کارناموں اور تصانیف پر مختصر اشارے ہے۔

۱۰۰۔ رفیع اللہ خاں عنایتی:

اقبال کے نظریہ فن کا مارکسی تجزیہ

(شاہراہ دہلی ۵۵ جون ۳-۱۲)

پس منظر پیش کرنے کے بعد اقبال کے نظریہ فن پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اقبال کے ہاں طبقاتی کشمکش پر زور نہیں ملتا۔ وہ فرد اور اس کی خودی پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک افراد کے باہمی تعلق کا سوال ہے وہ اس کو حل کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

۱۰۱۔ رئیس احمد جعفری:

عربی ادب کا لعل شب چراغ

(ریاض کراچی ۵۵، اپریل مئی ۳۰-۴۳)

ابتدا میں عربی زبان کی خصوصیت، اس کی وسعت دوسری زبانوں کے الفاظ لینے کی صلاحیت بیان کرنے کے بعد ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کی عربی ادب میں اہمیت و وقعت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ابو الفرج کی دوسری تصانیف کی فہرست بھی دی ہے۔

۱۰۲۔ رضا ہمدانی:

پشتو کے قدیم و جدید ادب کا سرسری جائزہ

(اردو کراچی ۵۵ اپریل ۱۸۷-۲۰۵)

پشتو کے قدیم و جدید ادب میں ایک قاری کو عظیم ادب اور ادب عالیہ کے تمام عناصر مل جاتے ہیں۔ اس میں حیات اجتماعی، انفرادی زندگی، قنوطی فضا، رجائی ماحول، ایمانی ذوق، خانقاہی مزاج، باغیانہ تیور، معتدل اظہار بیان، سوز و ساز غرض سبھی کچھ ملتا ہے۔ اور اس میں وہ تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کے باعث اسے دنیا کے زندہ ادب میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۳۔ رضی الدین احمد:

جعفر زٹلی کی شاعری کا پس منظر

(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۸ - ۱۲)

اورنگ زیب کے عہد میں دو متضاد دھارائیں بہہ رہی تھیں ایک طرف دبا دبا سا اجتماعی شعور اور انسانیت دوستی تھی اور دوسری طرف طاقت روایتی مذہب، عمیق پسندی اور کٹر مذہبیت تھی۔ جعفر زٹلی نے اس روایت پرستی، اقتدار پسندی کا مذاق بظاہر غیر سنجیدہ غیر مہذب کھردری مگر پامار آواز میں اڑایا اور اپنے عہد کے زوال آمادہ نظام کے تضاد کو شدت تاثر سے بیان کیا۔

۱۰۴۔ سعید احمد رفیق:

غزل کی ہیئت

(ادب لطیف لاہور ۵۵ جون ۱۶-۲۲)

غزل کے سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مضامین میں ہیئت وغیرہ کے الفاظ صاف اور واضح طور پر استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم سمجھاتے ہوئے غزل کی ہیئت بیان کی ہے اور اس سے مراد فارم لیا ہے۔

۱۰۵۔ سید سلیمان ندوی:

مکتوب سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڈھ ۵۵، اپریل ۳۰۹-۳۱۱)

سید عبدالحکیم دسنوی کے نام ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء کا خط درج ہے۔ اس میں اس وفد کا تذکرہ ہے جو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات اور مطالبات پیش کرنے کے لئے وائسرائے سے ملا تھا۔

۱۰۶۔ سجاد باقر رضوی:

امریکی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۲۲-۲۴۳)

امریکی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۰۷۔ سجاد ظہیر:

ایک ادبی خط - رضیہ سجاد ظہیر کے نام

(نگار ۵۵ فروری، مارچ ۱۷-۲۰)

سجاد ظہیر کا وہ خط جو انھوں نے اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کے نام ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ سے تاریخ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو لکھا۔ اس میں اپنے جیل کے تجربے، اپنی بیوی کے افسانے سے متعلق کچھ باتیں اور بقول خود بزنس کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس میں درمیانہ طبقے کے افراد میں جو ترک لذات کا رجحان پایا جاتا ہے اس کی مذمت کی گئی ہے اور ادب میں عیش، حسن پرستی اور جنسی لذت کی خواہش کو بشرطیکہ وہ فحاشی اور بد اخلاقی کی شکل اختیار نہ کرے جائز قرار دیا ہے۔

۱۰۸۔ سری کمار بنرجی ڈاکٹر:

بنگالی ادب (دور قدیم)

(ہندستانی ادب حیدر آباد دکن ۵۵ جون ۱۳-۱۵)

"چریاپد" اور وشنو ادب کے ذکر کے بعد بتایا ہے کہ "قرون وسطیٰ کے ادب اور زندگی کے لحاظ سے ۱۴۸۶ء میں سری چے تنیہ کا قلم ایک اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بنگال میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ملتا جو عوام کی زندگی اور جذبات پر سری چے تنیہ کے برابر اثر انداز ہوا ہو۔" پھر "منگل کا دیا" پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ بھارت چندر کے ساتھ قرون وسطیٰ کے بنگالی ادب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

۱۰۹۔ سنتی کمار چیٹر جی - ڈاکٹر:

ہندستانی ادب

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۵ اپریل ۵ - ۱۱)

قبل مسیح سے لے کر موجودہ زمانے تک ہندستان میں پیدا ہونے والے ادب کا بہت ہی مختصر تذکرہ درج ہے۔

۱۱۰- شری پاد جوشی:

جدید مراٹھی ادب

(آج کل دہلی ۵۵ جون ۴۳-۴۶)

جدید مراٹھی ادب کے رجحانات اور خصوصیات کا جائزہ مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت لیا گیا ہے۔ (۱) ناول اور مختصر افسانے (۲) نظم (۳) ڈرامہ (۴) مزاح (۵) متفرق (جس میں سوانح عمریاں تنقید مکاتیب تحقیق وغیرہ شامل ہیں) مراٹھی ادب میں انگریزی، فرانسیسی جرمن، پرتگالی، روسی بنگالی ہندی اور اردو زبان کے تراجم بھی ملتے ہیں۔

۱۱۱- شمیم سیفی:

شہنشاہ حبشہ

(شاعر بمبئی ۵۵ جون ۲۴-۲۷)

اختر اورینوی کے ڈرامہ شہنشاہ حبشہ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے فن ڈرامہ کی تکنیک پر مختصر اشارے کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ اختر صاحب کا یہ ڈرامہ ان کے اپنے خیالات اور رجحانات کو ظاہر کرنے میں کامیاب ضرور ہے لیکن پڑھنے کے بعد کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جو اسے اعلیٰ ادب کی صف میں شامل کر سکے۔

۱۱۲- شوکت سبزواری ڈاکٹر:

اردو زبان کے پچیس سال

(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۳۳-۳۷)

اردو زبان کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۱۳- طفیل دارا:

اقبال اور عورت

(ہمایوں لاہور ۵۵ اپریل ۱۱۷-۱۲۲)

اقبال کے کلام میں عورت کے موضوع اور اس کی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ اول تو اقبال نے عورت کا ذکر ہی بہت کم کیا ہے اور اگر کیا بھی ہے تو یوں ہی سرسری طور پر۔ اور ان کے فلسفہ سے جہاں مرد کو اتنا زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے اور ایک شاندار نظام حیات اس کے ہاتھ آگیا ہے وہاں عورت اس سے بالکل محروم رہ گئی ہے۔ حالانکہ اقبال پر معاشرہ کے مرد و زن دونوں کا یکساں حق تھا!

۱۱۴- ضیاء الحسن موسوی:

عربی ادب کے پچیس سال

(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۲۷-۳۴)

عربی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۱۵- عالم خوندمیری:

اردو ادب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۴ء تک

(نگار ۵۵ فروری، مارچ ۱۲-۲۷، ۷۴)

اس مقالہ میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۴ء تک صرف ناول، افسانہ اور شاعری نے جو ترقی کی ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس "دور" کے غالب رجحانات کا جائزہ اس وقت کے سیاسی و معاشرتی حالات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

۱۱۶- عبادت بریلوی ڈاکٹر:

اقبال کی شاعری کا انسانی پہلو

(ماہ نو کراچی ۵۵ اپریل ۱۸-۲۴)

انسانیت اور انسان دوستی کے صحیح تصور کے ساتھ ہی اقبال کو سمجھا جا سکتا ہے اس لئے کہ اسی محور کے گرد ان کے افکار و خیالات گھومتے ہیں۔ گویا اقبال نے انسان دوستی کے شدید جذبہ کے ماتحت اپنے فکر و فن میں انسانی پہلو کو مختلف زاویوں سے نمایاں کیا ہے۔ اور یہ پہلو اس حد تک ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے پہلو بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔

عبادت بریلوی ڈاکٹر:

اردو تنقید کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۸۱-۱۰۸)

اردو تنقید کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۱۸۔ عبدالسلام:

خواجہ میر درد

(اُردو کراچی ۵۵ اپریل ۲۰۶-۲۱۶)

میر درد کی بیشتر تصانیف فارسی میں ہیں۔ ان کا موضوع تصوف ہے۔ اُردو میں ایک مختصر دیوان ہے۔ یوں تو تذکرہ نگاروں نے متفقہ طور پر درد کو سراہا ہے مگر زور ان کی شاعری سے زیادہ تصوف پر رہا حالانکہ اسلامی تصوف کی تبلیغ کرنے کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ درد بڑے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔

۱۱۹۔ عبدالقوی دریابادی:

مجذوب کے ساٹھ منتخب اشعار

(فروغ اُردو لکھنؤ ۵۵ اپریل ۱۴-۱۸)

خواجہ عزیزالحسن مجذوب کا مختصر تعارف اور ان کے مطبوعہ منتخب کلام کشکول کی غزلیات سے ساٹھ چیدہ چیدہ اشعار درج کئے گئے ہیں۔ تاکہ ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی پڑے۔ مضمون میں اس پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کا مکمل مجموعہ کلام اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔

۱۲۰۔ عبدالمجید سالک:

اُردو صحافت کے پچیس سال

(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۳۸-۳۹)

اُردو صحافت کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۲۱۔ عبداللہ سید ڈاکٹر:

مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام

(ماہ نو کراچی ۵۵ اپریل ۷-۱۱)

مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبال کو بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ اس اہمیت اور اقبال و رومی دونوں کے تقابلی مقام کو سمجھنے کے لئے اس مضمون میں مطالعۂ رومی کی تحریک کا عہد بہ عہد مگر مختصر جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مختلف ادوار میں رومی کے اثرات و فیوض جاری و ساری رہے۔ اقبال نے رومی کے افکار عالیہ کو بڑی عزت و شان سے دنیا میں متعارف کرایا اور مثنوی کو ایک زندہ فکر اور مثبت و پائدار اقدار زندگی کا حامل ثابت کیا ہے۔

۱۲۲۔ عبداللہ سید:

کالج کی سالانہ رپورٹ ۵۵-۱۹۵۴ء

(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۵۵ مئی ۱-۲۷)

پرنسپل سید عبداللہ نے اورینٹل کالج کی رپورٹ بابت ۵۵-۱۹۵۴ء پیش کی ہے۔ جس میں کالج کے اہم اور دوسرے امور پیش کئے ہیں مختلف شعبوں کے اساتذہ ان کے نام اور ان کی علمی خدمات بھی بیان کی ہیں۔

۱۲۳۔ عشرت رحمانی:

اُردو ڈرامے کے پچیس سال

(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۴۷-۵۳)

اُردو ڈرامے کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۲۴۔ غلام عباس:

اُردو کا ایک غیر معروف ناول۔ افتاد جوانی

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۷-۱۱)

اردو ناول نگاری کی مختصر تاریخ کے بعد حکیم سید علی حسین خاں عرف بن صاحب کے ناول افتاد جوانی کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس کا قصہ مصنف کی زبان میں مختصراً پیش کیا گیا ہے (باقی)

۱۲۵۔ غلام مصطفےٰ خاں:

حالی کی اُردو غزل

(اُردو کراچی ۵۵ اپریل ۲۱۷-۲۳۸)

جدید اُردو شاعری کے لئے مولانا حالی کی شخصیت ایک انقلابی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف میں تجدید و تخلیق سے کام لیا ہے۔ موجودہ مقالہ میں بہ تعاقب عنوان حالی کی اُردو غزل کے تقلیدی اور تخلیقی عناصر

کا جائزہ لیتے ہوئے بالتفصیل بتایا ہے کہ ان کا ارتقا کیونکر ہوا۔

۱۲۶۔ غضنفر:
ہندی ادب

(اُردو کراچی ۵۵ اپریل ۱۴۵-۱۸۶)
ممالک آگرہ و اودھ پر ہی خاص طور سے ہندستان کا اطلاق ہوتا ہے اور یہیں کی زبان کو ہندی زبان کہتے ہیں۔ ہندی کا تعلق اگرچہ پراکرت سے ہے مگر اس کے حروف تہجی سنسکرت ہی کے ہیں۔ عربی کے مخصوص حروف کو نقطہ دار حروف سے ظاہر کرتے ہیں سب مل کر ۴۷ حروف ہیں۔ ہندی کا عروض سنسکرت سے متفرع ہے۔ ہرش کے زمانہ سے موجودہ دور تک ہندی ادب کو چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے زمانہ کی تاریخی، سیاسی اور معاشرتی کیفیات کا آئینہ ہے اس مقالہ میں سورداس تک کے ادب کا جائزہ ملتا ہے (مسلسل)

۱۲۷۔ قاسم علی سجن لال:
دلی کا نوابی مشاعرہ اور مولانا حالی

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ اپریل ۳۳)
اخبار نظام الملک، مراد آباد (نمبر ۶ جلد اوّل مورخہ ۲۸ جون ۱۸۸۴ء) کے تیسرے صفحے پر دلی کا نوابی مشاعرہ اور مولانا حالیؒ کی سرخی کے ساتھ نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے منعقدہ ایک مشاعرہ کا حال درج ہے۔ اس روئداد کو ضروری حاشیوں کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اور بعد میں ان تعزیت ناموں کی نقلیں ہیں جو نواب لوہارو کے انتقال پر لکھے گئے تھے۔

۱۲۸۔ قاضی عبد الغفار:
مدراس میں اُردو

دکن (؟) ۵۵ فروری، مارچ ۷-۱۶)
خطبہ صدارت جو ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء کو مدراس اردو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ اس میں مدراس میں نظم و نثر اور صحافت کی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد اہل مدراس کو چند اہم مشورے دئے گئے ہیں جن پر عمل کر کے وہ اردو زبان کی تحریک کو آگے بڑھا سکتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی ترقی و تحفظ کے لئے انجمن ترقی اُردو نے جو مطالبات پیش کئے ہیں ان کی مختصر فہرست بھی دی ہے۔

۱۲۹۔ کلب علی خاں:
شیخ علی بخش بیمار

(معارف اعظم گڑھ ۵۵ اپریل ۲۸۵-۲۹۶)
ان کے والد کا نام شیخ غلام علی اور وطن شہر بانس بریلی تھا۔ جس قدر ان کے کلام کو ناگوں کو شہرت حاصل ہوئی اتنی ہی انھیں گمنامی ملی۔ تذکرے تفصیلی واقعات نہیں پیش کرتے۔ تاہم ان کے کلام کے سبھی معترف ہیں۔ مصحفی کے شاگرد ہونے کا امکان ہے ویسے وہ اخوند زادہ احمد خاں غفلت (رام پور) کے شاگرد تھے۔ اور ہر صنف سخن پر قادر۔ ان کے اکثر شاگرد بڑے نامور شاعر گذرے ہیں۔

۱۳۰۔ کلیم سہسرامی:
انڈونیشیائی شاعری میں آزادی کا تصور

(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۳۹-۴۲)
انڈونیشیا کی سیاسی اور سماجی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد انڈونیشیا کے حریت پسند شاعروں مثلاً سانوجہ انور، عبد الرداق کا کلام پیش کر کے ان شعرا کے تصور آزادی کا تجزیہ پیش کیا ہے اور آخر میں وہاں کا قومی ترانہ بھی نقل کیا ہے۔

۱۳۱۔ گوپی چند نارنگ:
اُردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ اپریل ۱۸-۳۴)
ہندوستانی تہذیب و تمدن کی طرح اُردو ادب کا

کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات اور ان کے اثرات کا حامل نہ ہو۔

۱۳۲۔ لطف اللہ بدوی:

سندھی ادب کے پچیس سال

(ساقی کراچی، ۵۵ جوبلی نمبر ۱۹۲ – ۲۰۲)

سندھی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۳۳۔ محمد احمد صدیقی ڈاکٹر:

مثنوی رومی میں بے جا تصرف

(برہان دہلی ۵۵ اپریل ۴۵ – ۵۳)

مولانا روم کی طرف بعض ایسے اشعار کی نسبت دی جاتی ہے جو کسی طرح بھی اسلام اور عقائد صحیحہ کے مطابق نہیں کہے جا سکتے۔ مولانا روم کی طرف منسوب ایسے ہی اشعار کو یکجا کر کے ان پر نقد و جرح کی ہے۔

۱۳۴۔ محمد احمد صدیقی ڈاکٹر:

شبنم شاداب
نشر دادۂ مکتبستان الہ آباد پر ایک نظر

(برہان دہلی ۵۵ مئی ۵۳ – ۵۹)

شبنم شاداب (مصنفہ ظہیرائے تغرشی) فارسی نثر کی ایک بہترین کتاب ہے اس پر پروفیسر نعیم الرحمن مرحوم نے حواشی لکھے ہیں انھیں حواشی میں سے بعض سے متعلق مضمون نگار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ بعض جگہ متن کو سمجھنے میں ڈاکٹر نعیم الرحمن مرحوم سے سہو ہوا ہے۔

۱۳۵۔ محمد احسن فاروقی ڈاکٹر:

اُردو ناول کے پچیس سال

(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۴۱ – ۴۶)

اُردو ناول کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۳۶۔ محمد عبدالحمید فاروقی ڈاکٹر:

امین گجراتی کی "یوسف زلیخا"

(نوائے ادب بمبئی ۵۵ اپریل ۷ – ۱۷، ۳۲)

امین گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کے تعارف کی یہ دوسری قسط ہے۔ حمد و مناجات، نعت و معراج، صفت خلفائے اربعہ و حسنین و امام اعظم و پیر محی الدین جیلانی، عشق حقیقی و تعریف سخن، اصل قصہ و خاتمہ اس مثنوی کے تکنیکی حصے ہیں۔ ہر عنوان کی ابتدا ساقی نامے سے ہوتی ہے۔ اور اس میں تصوف، اخلاقیات پند و نصائح وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے اور بہت ہی مؤثر انداز میں۔ ساقی ناموں میں خود امین کی شخصیت نمایاں ہے۔ یہ سادہ انداز بیان کی مثنوی حسن ترتیب کے ساتھ اپنے عمدہ کردار اور جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے قابل یادگار ہے۔

۱۳۷۔ محمد عظیم:

کلیم اور اُردو تنقید

(شاہراہ دہلی ۵۵ جون ۱۳ – ۱۹)

مضمون نگار نے "اُردو تنقید پر ایک نظر" کا جائزہ لیا ہے اور اس کتاب کے مصنف اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی کچھ خامیاں اور کچھ خوبیاں گنائی ہیں۔

۱۳۸۔ محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری:

اعجاز مسیحائی

(اردو کراچی ۵۵ اپریل ۲۳۹ – ۲۶۲)

اعجاز مسیحائی یعنی معمیت عین المعانی مع شرح پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ حضرت شیخ عیسیٰ جند اللہ سندھی کی تصنیف ہے آپ کثیر التصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ عین المعانی موضوع کے اعتبار سے علمائے روحانیت اور صوفیوں کے مسلک کی مخصوص کتاب ہے کہ اس میں اسمائے الٰہی کی سیر حاصل شرح کے ساتھ اوراد و وظائف اعمال وغیرہ کے بیانات اور تعلیمات ہیں۔ مصنف نے اپنے علمی فضائل و کمالات سے ان خشک مضامین کو شعر و ادب اور حسن بیان سے ادبی چیز بنا دیا ہے۔

۱۳۹۔ محمد یونس احمر:

بنگالی ادب کے پچیس سال

(ساقی کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۲۵۱ – ۲۶۶)

بنگالی ادب کے پچیس سال کا جائزہ

۱۴۷۰۔ مخمور اکبر آبادی:

چند لسانیاتی نکتے

(العلم کراچی ۵۵ جنوری تا جون ۴۷ - ۸۵)

انیسویں صدی کے آخر تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے جو سرمایۂ ادب پیدا کیا اس کا محرک ان کا تفنن طبع تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ تفنن تخلیق ادب کی اہم اگر غالباً اولین غائت ہے مگر ادب کا کام یہیں نہیں ختم ہو جاتا قدماء نے اول تو یہ کام یہیں ختم کر دیا دوسرے ان کا عمل شعوری نہیں غیر شعوری تھا۔ آگے مفصل طور سے متعدد سرخیاں قائم کر کے مثلاً ادبی نقطۂ نظر دیانت اور فراخ حوصلگی، تلفظ کی صحت، غیر مانوس الفاظ، مختصر عربی والی معنی کا تنوع۔ احتساب۔ محاورہ۔ املا۔ انشا۔ اردو دوستی وغیرہ کے عنوان قائم کر کے ادیبوں اور اردو کے پریمیوں سے درخواست کی ہے کہ ہمیں اردو لکھتے اور بولتے وقت ان تمام باتوں پر دھیان رکھنا چاہیئے جس سے صحیح شگفتہ اور دل کش زبان پیدا ہو اور ترقی کرے۔

۱۴۷۱۔ مدن گوپال:

شمیم احمد مترجم۔

ہندی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۶۹ - ۱۷۲)

ہندی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۴۷۲۔ مشری لعل جین:

راشٹر بھاشا کا سروپ

(نیا ہند، الہ آباد ۵۵ مئی ۳۰۵ - ۳۲۳)

مضمون نگار نے راشٹر بھاشا سے متعلق بحث کرتے ہوئے متعدد ذیلی سرخیاں قائم کرتے ہوئے۔ مثلاً راشٹر بھاشا کا سروپ کیا تھا (۲) راشٹر بھاشا سروپ اور لکھاوٹ (۳) راشٹر بھاشا کا سروپ کیسا ہے اور کیسا ہو بڑی سنجیدگی سے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے نیتاجی کی آزاد ہند فوج میں دیش بھر کے آدمی تھے۔ ان کا کام اگر ہندستانی سے چل گیا تو ہمارا کیوں نہیں چل سکتا۔

۱۴۷۳۔ مسیح الزماں پروفیسر:

شبلی کا موازنہ

(فروغ اردو لکھنؤ ۵۵ اپریل ۶ - ۱۳)

شبلی کی موازنہ انیس و دبیر پر تبصرہ۔ مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موازنہ میں جو مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس میں بہت سی کمزوریاں اور تحقیق کی غلطیاں ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا دبیر میر اور انیس کے جو سرقے سے متعلق اشعار درج ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ مزید برآں موازنہ میں دبیر کو ایک مختلف طرز فکر و سخن کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں جانچا گیا ہے۔

۱۴۷۴۔ موہن سنگھ دیوانہ ڈاکٹر:

پنجابی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۱۷۱ - ۱۹۱)

پنجابی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۴۷۵۔ ایم۔ وی۔ راج ڈھبا نسیا۔ اسلم فرخی مترجم۔

مراٹھی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۲۷۲ - ۲۷۶)

مراٹھی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۴۷۶۔ نجم الدین احمد:

اردو ہندی کو کیا کچھ دے سکتی ہے

(نیا ہند، الہ آباد ۵۵ مئی ۳۲۴ - ۳۲۸)

مضمون نگار نے اردو کی کچھ خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ زبان کس طرح بنتی ہے۔ اردو زبان کی پیدائش ہندستان کی تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ پھر اردو زبان میں فارسی عربی لفظوں کی ملاوٹ اور دوسری زبانوں کے الفاظ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ بدیشی نہیں رہ گئے۔ اردو سے متعلق فراق کے خیالات کے اقتباسات دیئے ہیں اور آخر میں اردو شاعری کے ایسے نمونے دیئے ہیں جن میں ملکی رسم و رواج اور زندگی کی

بنیادی قدروں کو بڑی خوبصورتی سے اور آسان لفظوں میں شعراء نے پیش کیا ہے۔

۱۴۷۔ نجمہ سمیع:

کرشن چندر

(نگار ۵۵ فروری مارچ ۶۱-۷۲)

رومانیت کرشن چندر کے افسانوں کا بنیادی عنصر ہے۔ ان کے افسانوں میں پیٹ کی بھوک اور جنسی بھوک کے علاوہ روح کی بھوک بھی ملتی ہے ان کے دوسرے دور کے افسانوں میں بھی رومانیت کا رنگ اتنا شوخ نہیں لیکن پھر بھی فطرت کے مناظر سے دلچسپی نئی تشبیہوں نئے استعاروں اور نئی کتابوں میں فطرت کے رومان اور ان میں لپٹے ہوئے دکھ درد کا بیان ہیں ان کے دوسرے دور کے افسانوں اور ناول میں ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زندگی کے المیہ کے خلاف ان کے غصہ کا جذبہ بتدریج بڑھ رہا ہے اور طنز کے نشتر اور تیکھے ہو رہے ہیں۔

۱۴۸۔ نذیر احمد۔ ڈاکٹر:

مینا بازار

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۲۵۹-۲۸۴)

مینا بازار کے انعقاد اور وجہ تسمیہ سے بحث کرتے ہوئے اس کے واقعی مصنف کو بتانے اور مدلل طور پر ظہوری کو اس کا مصنف نہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۴۹۔ نظیر صدیقی:

کچھ "گنجے فرشتے" کے بارے میں

(نگار لکھنؤ ۵۵ جون ۳۲-۳۵)

"گنجے فرشتے" میں منٹو کے بارہ مضامین ہیں جو بارہ شخصیتوں کے مرقعے ہیں لیکن منٹو نے نہ تو ان شخصیتوں کا پرستار بن کر مضامین لکھے ہیں اور نہ ان سے بیزار ہو کر۔ حالات کے بجائے سیرت اور کارناموں کے بجائے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ شخصیتوں کو سمجھنے اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی مرقع نگاری میں افسانہ نگار کا قلم کارفرما نظر آتا ہے۔ اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے ساتھ ہی دلکش اور دل نشین بھی۔

۱۵۰۔ نور الحسن برلاس:

جاپانی ادب کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۳۵۱-۳۵۸)

جاپانی ادب کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۵۱۔ وزیر آغا:

اُردو ادب کے دو مزاحیہ کردار
(حاجی بغلول اور چچا چھکن)

(ادب لطیف لاہور ۵۵ اپریل مئی ۱۲-۱۹)

سرشار کا خوجی اور سجاد حسین کا حاجی بغلول ایک ہی زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان دونوں کرداروں اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن میں تقریباً نصف صدی کا وقفہ ہے۔ تاہم اردو ادب میں مزاحیہ کردار کی تعمیر کے سلسلے میں یہ تینوں کردار ایک تدریجی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں۔ خوجی ہمہ تصنع اور بناوٹ ہے۔ حاجی بغلول اس کا اگلا قدم ہے۔ یہ مسخرہ پن سے الگ مزاحیہ کردار کے صحیح تصور سے بہت قریب ہے۔ چچا چھکن میں ہم پہلی بار اپنے ادب کے صحیح ترین مزاحیہ کردار سے متعارف ہوتے ہیں۔

۱۵۲۔ وقار عظیم:

اندر سبھا کی غزلیں اور گیت

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۱۲-۲۱)

اندر سبھا کی غزلوں اور گیتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کے فرق کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ غزلیں لکھنوی مذاق کے مطابق پر تصنع ہیں لیکن گیتوں میں سادگی خلوص اور صداقت ہے جو غزلیں مترنم بحروں میں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ امانت نے رقص و موسیقی کو اندر سبھا کی بنیاد

بتایا ہے۔ جو اندر سبھا کے فن کا ایک نمایاں پہلو ہے۔

۱۵۳۔ وقار عظیم:

اُردو افسانے کے پچیس سال

(ساقی، کراچی ۵۵ جوبلی نمبر ۵۴-۸۰)

اُردو افسانے کے پچیس سال کا جائزہ۔

۱۵۴۔ ہاشمی، نصیر الدین:

حیدر آباد (دکن کے عجائب خانہ کی اُردو کی قلمی کتابیں

(نوائے ادب بمبئی ۵۵، اپریل ۴۱-۵۶)

(مسلسل)

اس قسط میں پنچھی باچا سحر البیان دو نسخے، چہار درویش اوصاف سبحانی، اور دریائے عشق کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۱۵۵۔ ہاشمی نصیر الدین:

ملک محمد جائسی کی ایک نایاب تصنیف

(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۶-۷)

اس میں ملک محمد جائسی کی تصنیف "چیتر ریکھا" کا جو اب تک شائع نہیں ہوئی ہے تعارف کرایا گیا ہے اس کا قلمی نسخہ مصنف کو مرحوم نواب سالار جنگ کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا ہے۔

۱۵۶۔ ہاشمی نصیر الدین:

مقالہ وجیہہ الدین وجدی کے متعلق چند اضافے

(شاعر بمبئی ۵۵ جون ۱۴-۱۸)

وجیہہ الدین وجدی مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر ایم اے

اس کتاب میں عنوانات ذیل کے تحت وجدی کے حالات، تاریخی اور ادبی پس منظر، وجدی کے معاصرین وجدی کی تصانیف پنچھی باچھا، تحفہ عاشقاں، مخزن عشق، بعض فروگزاشتیں رہ گئی تھیں جن پر مقالہ نگار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

آرٹ

۱۵۷۔ ابو سعید قریشی:

کاف تا کاف

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۷-۳۷-۱۴)

کاف تا کاف یعنی کشمیر سے کراچی تک پاکستان کے فن تعمیر کا جائزہ لیا گیا ہے اس قسط میں پشاور اور ٹیکسلا کی عمارتوں کا بالتفصیل بیان ہے۔ (باقی)

۱۵۸۔ سجاد حسین: مترجم شجاع احمد زیبا۔

عوامی ناٹک (مشرقی پاکستان)

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۲۴-۴۴)

بنگال کے عوامی ناٹکوں کو جاترا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جاترا میں کوئی مشہور کہانی اسٹیج پہ پیش کی جاتی ہے اس میں ناٹک کی مسلمہ تین وحدتوں کو برقرار نہیں رکھا جاتا ان ناٹکوں کا لکھنے والا کوئی مخصوص شخص نہیں ہوتا اس کا تانا بانا ہر دلعزیز گیتوں اور باروں سے بنتا ہے۔ مضمون میں جاترا سے متعلق اور بھی کچھ دلچسپ باتیں بتائی گئی ہیں۔

۱۵۹۔ بشومبھر ناتھ پانڈے:

عربی گان ودیا اور ہندوستان

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ اپریل ۲۵۱-۲۵۴)

عربی علم موسیقی کی مختصر تاریخ، عربی آلات موسیقی عربی موسیقی پر ایرانی و یونانی موسیقی کا اثر اور عربی موسیقی کا یورپی موسیقی پر اثر کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ موسیقی کی ایرانی، عربی و تورانی آمیزش مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئی اور اس نے مسلم عہد میں ہندوستانی موسیقی پر گہرا اثر ڈالا۔

۱۶۰۔ چیٹرجی۔ نند لال:

مغلوں کی عمارت بنانے کی کلا

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ اپریل ۲۳۱-۲۳۴)

اولاً ان دلائل کو کہ آگرہ اور دلّی کی کچھ عمارتوں خصوصاً تاج محل کی تعمیر میں پچّی کاری کا فن اطالوی کاریگروں کا روشناس کیا ہوا ہے پیش کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پچّی کاری او پتھروں کی نقاشی میں ہندو کاریگروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اطالوی فن کاروں نے کچھ ڈزائنیں بنائی ہوں۔

۱۶۱۔ عبد اللہ چغتائی:

بادشاہی مسجد

(اورینٹل کالج میگزین ۵۵ فروری ۳-۴۶)

لاہور شہر میں یہ مسجد قلعہ لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے جلو خانہ (حضوری باغ (حضوری باغ موجودہ) کے مغرب میں واقع ہے۔

تصویروں کے ساتھ اس مسجد پر فنی اور تاریخی معلومات بہم پہنچا کر تبصرہ کیا ہے۔

۱۶۲۔ محمد شفیع:

مرقع دارا شکوہ

(اورینٹل کالج میگزین ۵۵ فروری ۱-۳۵)

یہ مرقع مرتبہ دارا شکوہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے مگر مطبوعہ فہرست میں شامل نہیں۔

اس میں متعدد خطوط اور تصویریں ہیں جن کا تعارف اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں وہاں تصویریں بھی شامل ہیں۔

+ + +

معاشرتی حالات

۱۶۳۔ بھگوان داس۔ ڈاکٹر:

سچا سماج واد

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ جون ۲۸۵-۲۹۳)

مضمون نگار نے ابتدا میں دنیا کی قوموں میں رام راج یا آسمانی حکومت کے جذبۂ قیام کی طرف دنیائی مذہبی کتابوں سے اقتباسات دے کر، پروفیسروں لیڈروں، سائنسدانوں سے التجا کی ہے کہ وہ دل میں خوف خدا رکھتے ہوئے صحیح انسانیت کی تعلیم دیں۔ دنیا اور سماج کی زندگی اور ترقی کا انحصار ان کی اچھی تعلیم پر ہے۔ ورنہ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ انسانیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۶۴۔ رام لال ورما:

گاؤں:

(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۳۰-۳۲)

ہندوستان کی تقریباً ۸۵ فی صدی آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترقی سارے ہندوستان کی ترقی ہے انگریزوں نے دیہات کی خود کفیل معاشیات کو تباہ کر دیا اور زمینداروں اور تعلقہ داروں کا درمیانی طبقہ پیدا کر کے کسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ دیہاتی پنچایتوں کے نظام کو درہم برہم کر دیا وغیرہ۔ آزاد ہندوستان میں گاؤں کو سدھار کے سلسلے میں حکومت ہند جو جو کام کر رہی ہے اس کا مضمون میں جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۶۵۔ سونیت کمار چیٹرجی ڈاکٹر:

مترجم۔ ادارہ:

افریقہ

(نیا ہند الہ آباد ۵۵ جون ۳۹۴-۴۰۱)

لیکھک کلکتہ یونی ورسٹی کے کمپریٹیو فائیلالوجی کے پروفیسر۔ ویسٹ بنگال لیجیسلیٹو کونسل کے صدر ہیں

رام کرشن مشن انسٹی ٹیوٹ آف کلچر میں یہ مضمون پڑھا گیا تھا مغربی افریقہ میں بسنے والوں اور ان کی تہذیب پر روشنی ڈالی ہے۔

اقتصادیات

۱۶۶- عزیز محمد۔ ایم۔ اے:

مشرقی بنگال کی اقتصادی تاریخ کا ایک ورق

(۱۵ صدی سے ۱۷ صدی تک)

(ریاض کراچی ۵۵، اپریل، مئی ۱۹)

پندرھویں صدی عیسوی مشرقی ۔۔۔ عہد زریں تھا، اس کی قوت خرید بہت بلند تھی۔ چیزیں بہت سستی تھیں، عمدہ قسم کے ریشمی اور سوتی کپڑے بنائے جاتے تھے۔ چین کے بارے میں غیر ۔۔۔ سیاحوں نے بھی شہادت دی ہے۔ مقامی اور بیرونی تجارت، بڑے اعلیٰ پیمانے پر تھی۔ اسی وجہ سے امارت اور خوشحالی شروع ہی سے بنگال کی روایات رہی ہیں اور اسی وجہ سے بنگال دوسری قوموں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔

نسائیات

۱۶۷- سلیم احمد:

صنفی تقابل

(ریاض کراچی ۵۵ اپریل، مئی ۱۲-۱۵)

مولانا ارشد تھانوی نے "زن و مرد" کے تفاوت مدارج اور مروجہ پردہ کی حدود کے موضوع پر ایک نظم لکھی تھی جو ایک قدامت پرست مولانا اور ایک جدت پسند مسٹر کے مکالمہ و مباحثہ کی صورت میں تھی۔ اسی نظم پر سلیم احمد صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مولانا کی نظم کو سراہا ہے کہ انھوں نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس اختلافی مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی خوبیوں کے باعث یہ نظم نوجوانوں کے طبقہ میں بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور رہنما گوں میں تو خیر اس کا شہرہ ہونا ہی ہے۔

۱۶۸- یونیس:

مس ہیلن کیلر

(ہندوستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۵ اپریل ۲۹-۳۰)

اندھوں، گونگوں اور بہروں کی بہترین ہمدرد اور رہنما مس ہیلن کیلر ۱۸۸۰ء میں تسلیمیا الباما (امریکہ) میں پیدا ہوئیں چھ مہینہ کی عمر میں بولنے لگی تھیں مگر سرسام کی بیماری کے سبب ڈیڑھ برس کی عمر میں اندھی، گونگی اور بہری ہو گئیں۔ ۷ سال کی عمر میں بوسٹن کے اندھوں کے اسکول میں داخل ہوئیں اور ذکاوت کے سبب ترقی کرتی چلی گئیں۔ ۱۰ سال کی عمر میں بولنا سیکھ لیا۔ انگریزی، اطالوی، فرانسیسی اور جرمن جانتی ہیں اور صاحب تصانیف ہیں۔ مس ہیلن کیلر ہندوستان آئی تھیں۔ دنیا کے کئی چکر لگا چکی ہیں اور اندھوں گونگوں اور بہروں کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ ادبیات اور فنون کا بہت شوق ہے۔

فلسفہ

۱۶۹- اسرار احمد سہارنپوری:

فلسفۂ مسرت

(رفتار کراچی ۵۵، اپریل ۲۵-۳۳)

ابتدائیہ ۔ مسرت، نوع انسانی میں مسرت کے حصول کے بنیادی اصول، مختلف مذاہب کے تصورات مسرت۔ فلسفیوں کے افکار و خیالات سے اقتباسات پیش کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ مسرت اسی معاشرے میں بدرجہ اتم حاصل کی جا سکتی ہے اور لطف اٹھایا جا سکتا ہے جہاں اخلاقیات کا جنازہ نہ نکل گیا ہو۔ اور جہاں لوگوں کے اخلاق و عادات، ان کی خواہشات

کو اعتدال پر رکھنے کے لئے ما فوق طاقت کا تصور ہو۔

۱۷۰۔ ایم۔ ایم شریف:

اجتماعی نشوونما کے اسباب

(ماہ نو کراچی ۵۵، اپریل ۲۶-۳۰، ۵۲)

اجتماعی نشوونما یا ارتقا محض سماجی ضرورتوں کا پورا کرنا ہی نہیں بلکہ کامیاب تقاضوں کے کامیاب جواب کا ایک طویل سلسلہ ہے جس پر طبعی موسمی اور سیاسی (اندرونی و بیرونی) داعیات اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے لئے تخلیقی ذہن۔ امن و عافیت اور روحانی تصور ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک جامع مقصود پر بند کا بھی ہو۔ تب کہیں جاکے اجتماعی نشوونما ممکن ہے۔

وفیات

۱۷۱۔ انظر شاہ:

اسلاف کی ایک سچی یادگار

(الفرقان لکھنؤ ۵۵، اپریل ۸۸-۹۳)

مولوی اعزاز علی مرحوم کی خدمت علم، شفقت، تواضع، مروت اور تقویٰ و تورع پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ دفن کرنے والوں نے "اعزاز علی" کو دفن نہیں کیا بلکہ ادب و فقہ، معانی و شعر، صرف و نحو، تفسیر و حدیث کے ایک گنج گراں مایہ کو دفن کیا ہے۔

۱۷۲۔ عبدالعلی خاں:

شمس العلماء مولانا عبدالرحمن صاحب

(ریاض کراچی ۵۵، اپریل مئی ۳۵-۳۶)

شمس العلماء مولانا عبدالرحمن سابق پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی و پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور کے حالات زندگی اور کراچی میں ان کی علالت و وفات (۳ جولائی ۱۹۵۴ء) تک کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔

۱۷۳۔ فرید الوحیدی:

شیخ الادب
سیرت کا ایک ہلکا سا خاکہ

(الفرقان لکھنؤ ۵۵، اپریل مئی ۷۲-۸۶)

یہ لکھنے کے بعد کہ دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاذ اور عالم مولوی اعزاز علی صاحب (متوفی ۱۹۵۵ء) کو تعلیم و تعلم سے حد درجہ شغف تھا ان کی "عام زندگی کا خاکہ" پیش کیا ہے جس سے مرحوم کی سیرت کے متعدد پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ آخر میں تجہیز و تکفین کی روداد بھی ہے۔

۱۷۴۔ نجیب اشرف ندوی:

سید مقبول احمد صمدنی

(نوائے ادب بمبئی ۵۵، اپریل ۵)

سید مقبول احمد صمدنی شبلی، مہدی افادی اور سید سلیمان ندوی وغیرہ کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے بڑے سنجیدہ و متین اور با اخلاق انسان تھے۔ اردو فارسی اور عربی ادب کے عالم اور شیدائی تھے۔ زیادہ تر محققانہ مضامین لکھے۔ ان کی کتابوں میں تاریخ الہ آباد اور حیات جلیل (عبدالجلیل بلگرامی) بہت مشہور مقبول ہوئیں۔ شستہ اور نستعلیق انشا پرداز تھے۔ تقریباً چار برس کی عمر پائی۔

۱۷۵۔ نجیب اشرف ندوی:

پنڈت کشن پرشاد کول

(نوائے ادب بمبئی ۵۵، اپریل ۵)

پنڈت کشن پرشاد کا وطن اگرچہ آگرہ تھا مگر وہ پچھلے پچاس سال سے لکھنؤ ہی میں رہتے تھے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے شیدا، زبردست ریفارمر، اور اردو کے خادم و فدائی تھے۔ علمی و ادبی ذوق بہت وسیع اور اعلیٰ پیمانہ کا تھا۔ تقریباً ایک درجن کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا موضوع ادب، سیاست، اور معاشرت ہے۔ انھوں نے بعض نہایت عمدہ اصلاحی ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔

۱۷۶۔ نسیم احمد فریدی امروہی:
اعزاز العلماء کی عنایتیں اپنے ایک حقیر خادم پر
(الفرقان لکھنؤ ۵۵ اپریل مئی ۹۶-۱۰۳)
اپنے شفیق استاد مولوی اعزاز علی صاحب کی موت پر آنسو بہائے ہیں اور ان کے مکاتیب سے اقتباسات کی صورت میں) ان کی عنایتوں کے نقوش الفرقان کے صفحات پر منتقل کیے ہیں۔

✣　✣　✣

متفرقات

۱۷۷۔ اسلم فاروقی فریدی:
انسانی ارتقا (حیاتیاتی نقطۂ نظر سے)
(ہمایوں لاہور ۵۵ جون ۱۸۹-۱۹۴)
انسانی ارتقا سے متعلق امریکی و روسی نظریات کی انتہا پسندی کو خدمت کرنے کے بعد غیر جانبدار نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہمیں توانائی کے صحیح استعمال پر زور دینا، صبر و تجربات سے کام لینا اور ارتقا کو قابو میں لانے کی تدابیر پر غور کرنا چاہیئے۔

۱۷۸۔ شائستہ اکرام اللہ سہروردی۔ بیگم:
اخلاقی احساس
(ہمایوں لاہور ۵۵ جون ۱۹۵)
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اخلاقی اصولوں کی پیروی سے آدمی گھاٹے میں نہیں رہتا اس لئے کہ اخلاقی احساس کے ارتقا کا نام ہی تمدن ہے۔

۱۷۹۔ عطیہ حبیب اللہ:
زنانخانے کی قیدی
(نیا ہند الہ آباد ۵۵ اپریل ۲۵۴-۲۶۰)
رسم پردہ کی ترویج پر روشنی ڈالنے کے بعد اسے عمرانی اخلاقی، سیاسی و اقتصادی لحاظ سے نقصان دہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نسوانی ترقی میں اسے سب سے بڑی رکاوٹ بتایا ہے۔

۱۸۰۔ محمد عبد اللہ الہ آبادی:
طیور اور نقل وطن یعنی مہاجر چڑیاں
(آج کل دہلی ۵۵ مئی ۳۷-۳۸)
پرندوں کا نقل وطن ایک موسمی تحریک ہے جو ان کے تولیدی مقامات سے جو کہ عموماً سرد خطوں میں ہوتے ہیں ان مقامات تک جو کہ بالعموم گرم خطوں میں ہوتے ہیں محدود ہے جس کا مقصد ہر زمانے میں معتدل زندگی بسر کرنا ہے۔ اس نقل وطن کی دو بڑی وجہیں ہیں (۱) بیرونی ماحولی اثر شلاً موسم کی تبدیلی وغیرہ (۲) اندرونی تحریک جو تولیدی اعضا کی صحت کے لئے ضروری ہے۔

۱۸۱۔ مکرجی۔ رادھا مکند:
جاوا۔ پراچین بھارت کا اپنسویش
(نیا ہند الہ آباد ۵۵ اپریل ۲۴۸-۲۵۰)
تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جاوا قدیم بھارت کی نوآبادی رہ چکا ہے۔

✣　✣　✣

تبصرے

۱۸۲۔ ادارہ:
بزم مملوکیہ
(آج کل دہلی ۵۵ جون ۴۸)
از سید صباح الدین قیمت پانچ روپئے آٹھ آنے پتہ۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔
اس کتاب میں خاندان غلامان کے سلاطین، امراء اور شہزادوں کی عرفان دوستی، مسلم نوازی، ادب معارف پروری کے حالات اور ان کے دربار سے متوسل علما، فضلا، ادباء اور شعرا کے کمالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے، تاریخی اور ادبی اعتبار سے یہ کتاب ایک

نادر اضافہ ہے۔ اس موضوع پر اتنی جامع کتاب کسی دوسری زبان میں بھی موجود نہیں۔

۱۸۳- ادارہ:

ذکر غالب

(آج کل دہلی ۵۵ جون ۴۸)

از مالک رام۔ قیمت تین روپئے۔

پتہ مکتبہ جامع لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔

غالب کی سیرت پر اس سے قبل دو اچھی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ غالب نامہ از اکرام اور غالب از غلام رسول مہر۔ یہ کتاب جابجا علمی نکتوں اور دلچسپ واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ سیرت غالب ہی نہیں اس عہد کی ثقافتی اور علمی تاریخ بھی ہے۔

۱۸۴- ادارہ:

میر تقی میر

(برہان دہلی ۵۵ اپریل ۶۲)

از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ قیمت بارہ روپئے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ۔

میر کی حیات اور شاعری پر کافی مقالات و مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن ضرورت تھی کہ کوئی ایسا صاحب نظر ہوتا جو اس عہد کی تاریخ ادب تہذیب اور فن پر یکجائی گفتگو کرکے ان میں باہم جو ربط و تعلق ہے اس کی نشان دہی کرتا۔ یہ فخر خواجہ احمد فاروقی کے مقدر میں تھا۔ موصوف نئی نسل کے ادیبوں میں اپنی سنجیدہ نگاری اور میانہ روی کے لئے مشہور رہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے تلاش و تحقیق اور تنقید و تبصرہ کا جو کمال دکھایا ہے اس نے کتاب کو اردو ادبیات عالیہ کا شاہکار بنا دیا ہے۔ میر کی حیات اور شاعری سے کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مقالہ یا کتاب ایسی نہیں ہے جس کو انھوں نے نہ پڑھا ہو۔ میر پر یہ ایک کتاب نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہے اور ہر اعتبار سے بے حد قابل قدر اور لائق داد ہے۔

۱۸۵- ادارہ:

نقد اقبال

(ماہ نو کراچی، ۵۵ اپریل ۵۳)

از میکش اکبرآبادی۔ قیمت تین روپئے۔

ملنے کا پتہ۔ مصنف میوہ کٹرہ آگرہ۔

مصنف نے اقبال کی خودی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی خودی کو فراموش نہیں کیا اور ان کے نظریات و اقوال کو ذخیرۂ علم و حکمت کی روشنی میں پرکھا ہے۔ یہ ایک بڑی کٹھن مہم تھی جسے مصنف نے بڑی کامیابی سے سر کیا ہے۔ اقبال کے ارشادات پر مدلل بحث بھی کی ہے۔ ان کے نتائج بالعموم صحیح ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اقبال کے افکار و پیام کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۱۸۶- ادارہ:

کلیات ولی

(تیسرا اڈیشن)

(ماہ نو کراچی ۵۵ اپریل ۵۳)

مرتبہ۔ سید نور الحسن ہاشمی، قیمت پانچ روپئے۔

پتہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی،

یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کے سلسلۂ مطبوعات کی اہم کڑی ہے۔ جس میں ولی دکنی کے کلام کا مناسب انتخاب تحقیق اور چھان بین کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ "مقدمہ" کے زیر عنوان ولی کے حالات، کلام اور زبان پر سرسری بحث کی گئی ہے۔

۱۸۷- ادارہ:

اردو میں تنقید

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۵۷)

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ قیمت ۴ر

پتہ۔ ادارۂ فروغ اردو ۱۴ امین آباد پارک لکھنؤ

ڈاکٹر فاروقی ان لوگوں میں ہیں جن کی عمر دشت تنقید

کی سیاحی میں گزری ہے۔ انھوں نے مشرقی ادبیات کے علاوہ مغربی ادبیات کا بھی کافی بسیط مطالعہ کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں ایک نہایت اہم موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی اردو کے سرمایۂ تنقید کا ناقدانہ جائزہ۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ فن ہمارے یہاں کس حد تک ترقی کر چکا ہے اور کن ترقیات کی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے صرف عہد آخر میں شخصیتوں اور ان کے تنقیدی کارناموں ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔ صاحب موصوف کی اکثر آراء بہت پُر مغز اور خیال افروز ہیں۔ ان سے ہم نقد و ادب کے نئے نئے چراغ جلا سکتے ہیں۔

۱۸۸۔ ادارہ:

سرگزشت

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۵۶)

از عبد المجید سالک۔ قیمت چھ روپئے۔

پتہ۔ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔

آپ بیتی اور جگ بیتی کا یہ مجموعہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسے صحافی کی روداد ہے جس کی چشم جہاں بیں نے دنیا کے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ وہ محض تماشائی نہیں رہا بلکہ اپنے عہد کے ہنگاموں میں شد و مد سے حصہ بھی لیتا رہا ہے۔ ایک طرف کتاب کا موضوع دلچسپ اور پھر دہ خوش بیانی جس کے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں وہ بذلہ سنجی جو دل میں بشاشت کی لہر دوڑا دے سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔

۱۸۹۔ ادارہ:

اردو کی نثری داستانیں

(ماہ نو کراچی ۵۵ جون ۵۶)

از ڈاکٹر گیان چند جین۔ قیمت نو روپئے۔

پتہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

اردو نظم و نثر میں داستانوں کا ایک وسیع سرمایہ ہے۔ جہاں تک نثری داستانوں کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کی شیرازہ بندی کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کی بنا پر الہ آباد یونی ورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل ہوئی۔ انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو مطبوعہ شکل میں پیش کر کے ایک اہم خدمت انجام دی۔

یہ کتاب محض داستانوں کی فہرست نہیں بلکہ ان کا پورا پورا تعارف بھی ہے۔ ابتدا میں مصنف نے فن قصہ گوئی کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اردو کی نثری داستانوں کے ارتقا کا خاکہ کھینچا ہے۔ کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر اور کردار نگاری وغیرہ پر تحقیق کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جین کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

۱۹۰۔ ادارہ:

زجاجۃ المصابیح (اول دوم)

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۳۱۴)

از سید عبد اللہ شاہ۔ قیمت فی جلد ۶ روپئے۔

ملنے کا پتہ۔ مولف، حسینی علم جوبلی پوسٹ آفس نمبر ۳۔ حیدر آباد۔ دکن

حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کی فقہ پر پرانا اعتراض ہے کہ وہ احادیث نبوی کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر ہر زمانہ میں اس کے جوابات دئے جا چکے ہیں۔ اب عبد اللہ شاہ صاحب نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے اور ہر باب سے متعلق فقہی مسائل کی تائید میں احادیث و سنن اور اقوال و آثار صحابہ کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ فقہ حنفی کے جن مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے۔

+　+　+

۱۹۱- ادارہ:

مشاہیر اسلام

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۳۱۵)

مولف ڈاکٹر حسن ابراہیم۔ قیمت پانچ روپئے۔

پتہ۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۳۰ نیو کراچی

ڈاکٹر حسن ابراہیم فواد یونی ورسٹی کے تاریخ کے استاذ ہیں اور مشہور صاحب قلم پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر فضل الرحمٰن کی فرمائش پر انھوں نے اسکولوں اور کالج کے طلبہ کے لئے مشاہیر اسلام پر ایک کتاب "اعلام الاسلام" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ اسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں انیتیس اکابر اسلام کے مختصر حالات ہیں۔ ان کے علم و فضل شجاعت و شہامت، سیاسی و تمدنی کارناموں وغیرہ مختلف اوصاف و کمالات پیش کئے ہیں۔

۱۹۲- ادارہ:

یاد رفتگاں

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۳۱۶)

از مولانا سید سلیمان ندوی۔ قیمت مجلد ۸ روپئے۔

پتہ۔ مکتبہ الشرق آرام باغ کراچی۔

اس کتاب میں ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کے مختلف طبقوں کے ۱۳۰ اصحاب علم و کمال کی موت پر جذبات و تاثرات اور ان کے مختصر مفصل حالات درج ہیں اور متوفی کے کمالات اور کارناموں کے سلسلہ میں مختلف علمی و مذہبی، قومی و سیاسی حالات درج ہیں یہ مضامین مصنف کے علمی مضامین کی طرح اپنے تنوع، معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

۱۹۳- ادارہ:

نقوش شخصیات نمبر

(معارف اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۳۱۷)

مرتبہ محمد طفیل۔ قیمت چھ روپئے۔ پتہ ادارہ فروغ اردو۔ ۱۲ ماڈل روڈ۔ لاہور۔

نقوش کا یہ نمبر ایک مستقل اور مفید تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سر سید سے لے کر موجودہ دور تک ۸۶ اصحاب علم و قلم ادیبوں مصنفوں اور چند شعراء کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ یہ نمبر انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک کے ادیبوں اور مصنفوں کے تذکروں سے مملو ہے۔ لائق مرتب نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید اور علمی خدمت کی ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ خامیاں اور فروگزاشتیں بھی ہیں.... مگر بعض اکابر مصنفین کے حالات حاصل کرنے کی نقوش نے کوشش بھی نہ کی مثلاً مولوی عبد السلام ندوی۔ جن کی شعر الہند نے کتنے لوگوں کو ادیب و ناقد بنایا۔

۱۹۴- ادارہ:

البلاغ تعلیمی نمبر

(معارف۔ اعظم گڈھ ۵۵ اپریل ۳۲۰)

مرتبہ محی الدین منیری۔ قیمت تین روپئے۔

پتہ۔ انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ کرناک بندر روڈ بمبئی ۱

انجمن خدام النبی کے ماہانہ رسالے البلاغ نے جمعیتہ العلماء کے دینی و تعلیمی کنونشن منعقدہ بمبئی کی یادگار میں اپنا تعلیمی نمبر نکالا ہے۔ اس میں دینی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر علماء کے خیالات مختلف علمی و دینی موضوعوں پر اصحاب قلم کے مضامین اور اس دور کے بعض نامور متوفی علما اور ہندستان کی دینی درس گاہوں کے حالات جمع کر دئے ہیں البلاغ نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے۔

پرنٹر، پبلشر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی مطبوعہ اجمل پریس بمبئی

Vol. 6] October-November 1955 [No. 4

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL
OF
THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Published Every

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Annual Subscription

Inland & Pakistan :	Foreign :	Price each Copy:
Rs 3/- postage extra	Shilling 8	Re. 1/-

All Remittances to be made to:

The Writers' Emporium Limited

PEOPLES' BUILDING, SIR PHIROZSHAH MEHTA ROAD, BOMBAY 1.